آثارِ محروم

(" پگڈنڈی " امرتسر کا محروم نمبر)

مرتبہ

امریک آنند

مکتبۂ علم و دانش لاہور، پاکستان

سنہ ۱۹۴۵ء کی ایک یاد

اُردو کی ادبی دُنیا میں راول پنڈی کی سب سے مشہور ہستی پنڈت تلوک چند محروم کی تھی۔ پنڈی کی انجمن یا گارڈن کالج کی اُردو سوسائٹی کی جانب سے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ترقّی پسند ادب کی تحریک پر مجھے تقریر کرنا تھا، مجھے بے حد مسرت ہوئی، جب میں نے جلسے میں پہنچنے کے بعد دیکھا کہ حضرتِ محروم اس کے صدر ہیں۔ وہ غالباً گارڈن کالج میں اُردو، فارسی کے پروفیسر تھے اور اُن کی عُمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ ایسے زبان داں اور قدیم مکتبِ خیال کے قابلِ احترام اُستاد کے سامنے زبان کھولتے ہوئے مجھے کافی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ میں بڑی احتیاط سے بولا۔ میری تقریر کے خاتمے پر پنڈت جی نے فرمایا کہ میں ترقّی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں دوسرے خیالات رکھتا تھا۔ لیکن اگر اس کے مقاصد وہی ہیں جو اس جلسے میں بیان کئے گئے تو اس سے بھلا کسے اختلاف ہو سکتا ہے۔

میں نے اُن کے اس جملے کو تحریک کے اور اپنے لئے باعثِ برکت سمجھا۔

سجاد ظہیر

("روشنائی" کا ایک صفحہ)

مرتبہ

امریک آنند

اڈیٹر ماہنامہ ''پگڈنڈی'' (امرتسر)

مکتبۂ علم و دانش لاہور، پاکستان

پہلی طباعت : ۱۹۶۹ء
دوسری طباعت : ۱۹۷۸ء
تیسری طباعت : ۱۹۸۹ء
چوتھی طباعت : ۲۰۰۳ء
قیمت : .... ۳۰۰ روپے
طباعت : .... مرکنٹائل پریس، لاہور (پاکستان)

ہندوستان میں ملنے کا پتا:

انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایوینیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

فہرست

پیغامات

مقالات

HaSnain Sialvi

منظومات

مکتوبات

تضمینات

تقریبات

اقتباسات

نیا دور	لکھنؤ
معارف	اعظم گڑھ
ہمایوں	لاہور
آج کل	دہلی
ہند	کلکتہ
قومی زبان	کراچی
نگار	لکھنؤ
معارف	اعظم گڑھ
نوائے وقت	لاہور
الحمراء	لاہور
قندیل	لاہور
پیام مشرق	دہلی
صدق جدید	لکھنؤ
آج کل	دہلی
آل انڈیا ریڈیو (خورشید الاسلام)	نئی دہلی
ادبِ لطیف	لاہور
الجمعیۃ	دہلی
ایوننگ	نئی دہلی
ٹریبیون	انبالہ
انڈین پی ای این	بمبئی
سیاست	حیدرآباد
کاروان	لکھنؤ
سب رس	حیدرآباد
ادبِ لطیف لاہور	لاہور
نئی دنیا	دہلی
شاہراہ	دہلی
تعمیر	سری نگر
خدمت	سری نگر
نیا دور	لکھنؤ
اردو ٹائمز	بمبئی
آل انڈیا ریڈیو (آلِ احمد سرور)	نئی دہلی
جامعہ	نئی دہلی
بیباک	سہارنپور
شاعر	بمبئی
آل انڈیا ریڈیو (محمد عتیق صدیقی)	نئی دہلی
سب رس	حیدرآباد
آل انڈیا ریڈیو (نثار احمد فاروقی)	نئی دہلی
نئی دنیا	دہلی
نیرنگِ خیال	لاہور
تحریک	دہلی
تیج	دہلی
سریتا	دہلی
قومی آواز	لکھنؤ

سپاس نامے

۱- ڈائریکٹر جنرل السنۂ پنجاب چنڈی گڑھ
۲- انجمن تعمیر اردو- دہلی
۳- بزم سخن موتی باغ- نئی دہلی
۴- گورنمنٹ ایمپلائز ایسوسی ایشن موتی باغ دہلی

☆☆☆☆☆
☆☆☆
☆

پیغامات

راشٹرپتی ڈاکٹر رادھا کرشنن

سکریٹری صدر ہند
راشٹرپتی بھون
نئی دہلی۔ نمبر ۴
۲۰ نومبر ۱۹۶۳ء

صدرِ مملکت کو یہ جان کر ازبس مسرت ہوئی ہے کہ "پگڈنڈی" شری تلوک چند محرومؔ کی اُردو ادب کے تئیں خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اپنا ایک خاص شمارہ شائع کر رہا ہے۔ وہ (صدرِ مملکت) شری محرومؔ کو اس موقع پر اپنی نیک تمنا پیش کرتے ہیں۔

دستخط (ایس۔ دت)

شری جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان

پرائم منسٹرز سکریٹریٹ
نئی دہلی
۴۔ مارچ ۱۹۶۲ء

میں ماہ نامہ "پگڈنڈی" کو جو شری تلوک چند محرومؔ کی چھہترویں سالگرہ کے موقع پر خاص نمبر شائع کر رہا ہے، اپنی نیک خواہشات بھیجتا ہوں۔

جواہر لال نہرو

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بالقابہ گورنر بہار، پٹنہ

راج بھون، پٹنہ
۲۲ اکتوبر ۱۹۶۱ء
مجتبیٰ آزاد صاحب۔ تسلیم

نوازش نامہ ملے دو ہفتے ہو گئے۔ ان دنوں کچھ سفر میں رہا، کچھ یہاں کے طوفان اور اس سلسلہ کو دوڑ دھوپ نے مہلت نہ دی۔ آپ کی بھیجی ہوئی تینوں کتابیں بھی مل گئیں۔ کس طرح شکریہ ادا کروں۔ من ہبوئے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را!
"نیرنگِ معانی" کا انتساب اپنے نام سے دیکھ کر شرم سے گڑ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس قابل کیسے سمجھا گیا۔ شاید فرطِ کرم اور غریب نوازی میں یہ بھی ہو جاتا ہو۔

"پگڈنڈی" کے لیے پیام ضرور بھیج دوں گا۔ مگر کئی سفر در پیش ہیں، ان سے فارغ ہو کر۔

اس پر ایک قصہ یاد آیا۔ صحت درایت کا ضامن نہیں ہوں، مگر قصہ دلچسپ ہے۔ لاہور کے کسی جلسہ میں ڈاکٹر اقبال صدارت کر رہے تھے، گاما پہلوان بھی جلسہ میں حاضر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انھوں نے اعلان فرما دیا کہ پہلوان بھی کچھ فرمائیں گے۔ غریب اُٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر دیکھا، اُدھر دیکھا، ہاتھ آگے باندھے، پھر پیچھے باندھے اور سب نے دیکھا کہ سخت کرب کا عالم ہے۔ بالآخر قوتِ ارادی نے فتح پائی اور پہلوان نے یہ مختصر مگر بلیغ خطبہ دیا۔ "بابُو، ورزش کیا کرو" اور بیٹھ گئے۔ کہتے ہیں کہ جب بیٹھے ہیں تو پیشانی ہی نہیں باریک کُرتا بھی پسینے سے نم تھا۔

آپ کو ایک مختصر سی تحریر کے لیے یہ مہلت طلبی عجیب سی معلوم ہو گی۔ یہاں دو سطریں لکھنے میں پسینہ بہہ نکلتا ہے۔ آپ قادر الکلام لوگوں کو اس کی کیا خبر۔

اچھا اس وقت رخصت۔ انشاء اللہ پھر ملوں گا۔ خدا حافظ

مخلص

ذاکر حسین

اپنے والد صاحب قبلہ کی خدمت میں آداب نیازمندانہ پہنچا دیجیے۔
ذاکر حسین

سردار سورن سنگھ وزیر حکومتِ ہند

نئی دہلی

۰ مارچ ۱۹۶۲ء

حکومتِ پنجاب نے آپ کے والد جناب تلوک چند محروم کی جو عزت افزائی کی ہے اُس پر میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

آپ کا مخلص
سورن سنگھ

ڈاکٹر بی، گوپال ریڈی وزیر اطلاعات و نشر و اشاعت حکومتِ ہند

۵ ڈوپلے روڈ

نئی دہلی

۲۵ مئی ۱۹۶۲ء

مجھے مسرّت ہے کہ رسالہ "پگڈنڈی" محروم نمبر کی صورت میں جناب تلوک چند محرومؔ کی خدمات کا اعتراف کر رہا ہے۔ جناب محرومؔ اُن بزرگ شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے نوجوان نسلوں کی ذہنی تربیت میں عملی حصّہ لیا ہے۔ اُن کی کتاب "کاروانِ وطن" کی اکثر نظموں کو میں نے پڑھا ہے۔ مجھے توقع ہے "پگڈنڈی" کا یہ خصوصی نمبر جناب محرومؔ کی زندگی اور شاعری سے متعلق بیش بہا مضامین شائع کرے گا۔

گوپال ریڈی

جناب بخشی غلام محمد وزیرِ اعظم جمّوں و کشمیر

جناب تلوک چند محرومؔ کی ذاتِ گرامی اُردو ادب کے لیے خیرِ جاری کا مرتبہ رکھتی ہے۔ انھوں نے عمر کا بیش بہا حصّہ زبان و ادب کی خدمت میں صرف کیا ہے اور کوئی صنفِ سخن ایسی نہیں ہے جس میں انھوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ اُن کے طرزِ ادا کی سادگی، زبان کی نمکینی اور بیان کی روانی نے اُن کے بہت سے مدّاح پیدا کیے ہیں۔ جن میں اُردو کے صاحبِ طرز ادیب اور شاعر اور بلند پایہ نقّاد شامل ہیں۔ اُن کا حلقۂ تلامذہ بھی بہت وسیع ہے۔ جن لوگوں نے پنجاب کو اُردو کا ایک اہم مرکز بنا دیا تھا اُن میں سر عبد القادر، علّامہ تاجور نجیب آبادی، سالک، محرومؔ اور جوش ملسیانی کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

قومی شاعری کے میدان میں محرومؔ، چکبست اور سرور جہاں آبادی کے روایات کے امین ہیں اور بچّوں کے ادب میں اُن کے قلم کی گُل کاریاں ہمیں اسماعیل میرٹھی کی یاد دلاتی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اُن کی ذات کی ہمہ گیری اور اُن کی شاعری کا تنوع اس صدی کے شعرا میں غالباً اپنی آپ نظیر ہے۔ میں نے کبھی کبھی اُن کا فارسی کلام بھی سُنا ہے۔ یہاں بھی اُن کی شگفتہ گفتاری اپنا رنگ دِکھاتی ہے۔

ایسے شاعر کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ماہنامہ "پگڈنڈی" امرتسر اور "اقدام" لاہور کا خاص نمبر

شائع کرنا ایک اہم ادبی فریضہ کی ادائیگی کے مترادف ہے۔ میں ان دونوں ماہناموں کے اس نیک اقدام کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

غلام محمد

سردار پرتاپ سنگھ کیروں وزیرِ اعلیٰ پنجاب

جناب منشی تلوک چند محروم کا نام نامی زبان پر آتے ہی ہمارا سر از خود عقیدت سے جھک جاتا ہے۔ کیونکہ وہ نہ صرف ایک عظیم شاعر ہیں بلکہ اُنھوں نے وطن کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے جو وطن پرستانہ نغمے گائے ہیں، وہ ہندوستان کی تاریخ میں زندۂ جاوید رہیں گے۔ جدّ وجہدِ آزادی کو جن فن کاروں نے اپنی تحریروں سے جوش اور جذبہ بخشا، منشی تلوک چند محروم کا نام اُن میں سرِ فہرست رہے گا۔

آپ کی کہنہ مشقی اور پختہ کلامی کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ آپ گذشتہ ساٹھ سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اور اہلِ ذوق سے داد حاصل کر رہے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر اشخاص نے اپنے زمانۂ تعلیم میں محروم صاحب کی نظمیں اُردو ریڈرز میں پڑھی ہوں گی اور اُن کی سادگی و بیان کا لُطف اُٹھایا ہوگا۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ یہ بزرگ شاعر اس وقت بھی ادبی خدمت میں اسی سرگرمی سے مصروف ہیں۔

جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے باکمال فن کار نامساعد حالات میں ہی پروان چڑھتے ہیں۔ آپ کو بھی بچپن میں سخت مشکلات کا سامنا ہوا۔ آپ کی پیدائش کے چند سال بعد ہی آپ کا آبائی گاؤں گوجراں سیلاب میں بہہ گیا اور آپ کا کنبہ عیسیٰ خیل میں منتقل ہو گیا۔ اُن ہی ناموافق حالات سے متاثر ہو کر آپ نے یہ لافانی شعر کہا تھا ؂

قابل تھے ہم اسی کے مقدر میں تھا یہی　　　کچھ صانعِ ازل سے نہیں ہے گلہ ہمیں

آپ نے ۱۹۰۰ء میں بنّوں سے میٹرک پاس کیا اور لاہور کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول سے وابستہ ہو گئے۔ اسی دوران میں آپ نور جہاں کا مقبرہ دیکھنے گئے، جس کی ناگفتہ بہ حالت سے متاثر ہو کر آپ نے وہ نظم لکھی جو اس موضوع پر لامثال ہے۔ اس کا ایک نہایت ہی پُر تاثیر شعر یہ ہے ؂

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا گماں ہے　　　کہتے ہیں یہ آرام گہہِ نُور جہاں ہے

بیسویں صدی کے آغاز میں گُلستانِ شاعری پُر بہار تھا۔ حالیؔ، حسرتؔ، اقبالؔ، چکبستؔ اور سرورؔ جیسے اُستادانِ فن

اپنے کلام سے دامانِ شاعری کو مالا مال کر رہے تھے۔ حضرت محروم سب سے زیادہ مولانا حالی کے کلام سے متاثر ہوئے اور جس وطن پرستانہ شاعری کی داغ بیل مولانا حالی نے ڈالی تھی اُسے محروم صاحب نے پروان چڑھایا۔ آپ ایک راسخ الاعتقاد شاعر ہیں اور جو کچھ محسوس کرتے ہیں اُسے کمال بے باکی سے کہہ دیتے ہیں۔ جلیانوالہ کے سانحۂ عظیم سے متاثر ہو کر آپ نے ڈائر سے متعلق جو نظم لکھی وہ اُردو شاعری کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ اُس کا ایک شعر خصوصاً قابلِ ملاحظہ ہے ؎

ڈائر کے قتلِ عام نے خونِ وفا کیا   لو ہو سے لال دامنِ برطانیہ کیا

محروم صاحب کی شاعری میں دیش پتا مہاتما گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد کی جھلک بھی ملتی ہے۔ وہ کٹر وطن پرست ہیں اور شروع میں ہی آپ نے اپنا جو مطمحِ نظر قائم کر لیا تھا اُس پر اب تک سختی سے قائم ہیں۔ آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ (۱) کلامِ محروم (حصہ اول، دوم و سوم) (۲) گنجِ معانی (۳) رباعیاتِ محروم (۴) کاروانِ وطن (قومی نظموں کا مجموعہ) (۵) نیرنگِ معانی (۶) شعلۂ نوا (غزلوں کا مجموعہ) (۷) بہارِ طفلی (بچّوں کے لیے نظمیں) وغیرہ۔

یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ اس سال محکمۂ السنہ پنجاب نے ایک خاص تقریب میں محروم صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کی عزت افزائی کی۔

اُن کی سال گرہ کی مبارک تقریب پر میں خلوصِ دل سے اُن کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ ابھی مزید بہت سے سال اپنی روح پرور شاعری سے ہماری زندگیوں کو گرماتے رہیں اور اس کے ساتھ ہی میں اُمید رکھتا ہوں کہ مُلک کے دیگر باکمال شعرا بھی اُن کی پیروی کرتے ہوئے اپنے تعمیری کلام کے ذریعے سے ملک کی ترقی و خوش حالی میں حصہ ڈالیں گے۔ جیسا کہ ممدوح کے فرزند ارجمند جناب جگن ناتھ آزاد اس سلسلے میں گراں قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

پرتاپ سنگھ کیروں

ڈاکٹر سید محمود ایم۔ پی بالقابہ

آپ کی بھیجی ہوئی کتاب "کاروانِ وطن" ملی۔ میری طرف سے اپنے والدِ محترم کا اور اُن کے اس نایاب تحفے کا بہت بہت شکریہ عرض کیجئے۔ میں نے کافی نظموں کو پڑھا، گو آج کل میرا لکھنا پڑھنا آنکھوں کی وجہ سے بند

ہے۔ لیکن شوق میں میں نے بہت سی نظمیں پڑھ ڈالیں۔ یہ کتاب ثابت کرتی ہے کہ ہمارے اُردو شعرا نے اور اُردو شاعری نے ملک کی آزادی حاصل کرنے میں کتنا نمایاں حصّہ لیا ہے۔ مجھے تو اس کا ذاتی علم ہے کہ جب اندولن کے زمانہ میں ایسی نظمیں پڑھی جاتی تھیں تو جلسہ کا جوش و لولہ اور ایثار کی طاقت کس درجہ اور کس حد تک بڑھ جاتی تھی۔ زبان کس درجہ شُستہ اور سلیس ہے اور معنی آفرینی کا کیا کہنا۔ آپ باپ بیٹوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ملک کی جو خدمت کی ہے اس کا شکر یہ ملک مشکل سے ادا کر سکتا ہے۔

منشی تلوک چند محروم نے یہ نظمیں لکھ کر اپنا نام ہمیشہ کے لیے روشن کر دیا ہے، خدا اُن کو صحت کے ساتھ ایک زمانہ دراز تک زندہ و سلامت رکھے، تاکہ وہ ادب اور ملک کی خدمت انجام دیتے رہیں۔ زیادہ والدعا،

خاکسار

سید محمود

نوّاب مہدی نواز جنگ بہادر گورنر گجرات

احمد آباد

۳؍مارچ ۱۹۶۲ء

پروفیسر تلوک چند محروم نے ادب کے ذریعہ سے ملک کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ میں اس موقع پر اپنی دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور بارگاہ ایزدی میں دُعا گو ہوں کہ اُنھیں عمرِ دراز عطا ہو تاکہ وہ اپنی ادبی خدمات اسی طرح سے جاری رکھ سکیں۔

مہدی نواز جنگ

شری بھیم سین سچّر گورنر آندھرا پردیش

مجھے یہ جان کر مسرّت ہوئی ہے کہ ماہنامہ پگڈنڈی پروفیسر تلوک چند محروم کی چھہترویں سالگرہ کے موقع پر محروم نمبر شائع کر رہا ہے۔ جناب محروم نے اپنی ولولہ انگیز شاعری کے ذریعے سے ملک کی جو خدمات انجام دی ہیں اُن کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ محروم کا نام آج بچّے بچّے کی زبان پر ہے۔ اُن کی حبُّ الوطنی ہمیشہ تر و تازہ ہے اور ہمارے جذبۂ حُبِّ وطن کو وہ جس طرح اُبھارتے ہیں وہ کیفیت کچھ اور زیادہ تر و تازہ اور شاداب ہے۔

آپ کا کلام چوں کہ ایک جذبۂ خلوص، بے تاب حُبّ وطن اور گہرے مشاہدے سے لبریز ہے، اس لیے وہ براہ راست ہمارے دل پر اثر کرتا ہے۔ اُن کی وسیع النظری ہر دور میں اُن کا سرمایہ رہی ہے اور یہی سبب ہے کہ بہتّر برس کی عمر میں بھی اُن کے کلام میں نوجوانی کے کلام کی تازگی ہے۔ میں جناب محروم کے ہزاروں مداحوں میں شریک ہو کر دست بدعا ہوں کہ وہ ایسی کئی اور سال گرہیں دیکھیں۔

بھیم سین سچر

سردار گورمکھ نہال سنگھ صاحب گورنر راجستھان

جے پور

۱۰ر مارچ ۱۹۶۲ء

مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی ہے کہ "پگڈنڈی" امرت سر، پروفیسر تلوک چند محروم کی شان میں ایک خاص "محروم نمبر" شائع کر رہا ہے، جس میں پروفیسر محروم کی زندگی، انشا پردازی و سخن پروری پر روشنی ڈالی جاوے گی۔ میں پروفیسر محروم اور "پگڈنڈی" کو اس موقعہ پر مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ اس نمبر کا کافی پرچار ہوگا اور عوام کو رہنمائی ملے گی۔

گورمکھ نہال سنگھ

جناب احمد محی الدین ڈپٹی منسٹر حکومتِ ہند

نئی دہلی

۹ر مارچ ۱۹۶۲ء

یہ اطلاع میرے لیے بڑی خوشی کا باعث ہوئی ہے کہ عنقریب حکومتِ پنجاب آپ کے والد محترم جناب محروم کی جو ایک نامور شاعر ہیں عزت افزائی کرنے والی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُنھیں طویل عمر عطا فرمائے اور وہ دیر تک اُردو کی خدمت کرتے رہیں۔

آپ کا مخلص

احمد محی الدین

شری شام ناتھ میئر دہلی کارپوریشن دہلی

دہلی

۱۳ر مارچ ۱۹۶۳ء

اُردو کے ادبی حلقوں میں جناب تلوک چند محروم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ صنعتی دور کی اس نفسا نفسی میں ہمارے لیے آپ کی ذات اُن قدروں کی علامت ہے جن سے زندگی میں خلوص اور رواداری جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ محروم صاحب نے نام ونمود کی پرواکئے بغیر بڑی خاموشی سے ادب کی خدمت کی ہے۔ ہمارے ان شاعروں کو آپ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے جو بغیر محنت کئے شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت محروم صاحب کا شمار ہندوستان کے چیدہ شعرا اور ادیبوں میں ہے۔

مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ ماہنامہ "پگڈنڈی" امرت سر کا محروم نمبر نکل رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ خاص نمبر ہر طرح کامیاب ہو۔

شام ناتھ

شریمتی تارکیشوری سنہا، نائب وزیر مالیات حکومت ہند

نئی دہلی

۱۴ر مئی ۱۹۶۲ء

مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی ہے کہ اُردو ماہنامہ "پگڈنڈی" امرت سر عنقریب ہی شری تلوک چند محروم کے ۷۶ ویں جنم دن کے موقع پر ایک خاص نمبر شائع کر رہا ہے۔ شری تلوک چند محروم عصرِ حاضر کے سرکردہ اُردو شعراء میں سے ایک ہیں اور اُردو ادب کو اُنھوں نے جو کچھ دیا ہے اُس کی اہمیت کوئی معمولی نہیں ہے۔ لوگوں کو جب پتا چلتا تھا کہ مشاعرے میں حضرت محروم شریک ہو رہے ہیں تو وہ جوق در جوق وہاں آیا کرتے تھے۔ ذاتی طور پر میں نے وزارتِ داخلہ کی طرف سے دہلی میں کئے جانے والے مشاعروں میں محروم صاحب کا کلام سُنا ہے۔ اُردو شاعری کی اس گرانقدر خدمت پر حال ہی میں حکومتِ پنجاب نے محروم کو خلعت اور ایک تھیلی پیش کی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اُردو ادب کے تمام پرستار میرے ساتھ مل کر شری تلوک چند محروم کے لیے توانائی اور

درازئ عمر کی دعا کریں گے تاکہ وہ آئندہ سالوں میں ہمارے مشاعروں کو مزید تابانی بخشتے رہیں۔

تار کیشوری سنہا

سردار ہربنس سنگھ آزاد، لیجسلیٹو اسمبلی جمّوں و کشمیر

جمّوں توی

۱۹ اپریل ۱۹۶۲ء

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ رسالہ "پگڈنڈی" نے محروم نمبر شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ محروم کا کلام اُردو ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ میں ادارہ "پگڈنڈی" کو اِس نیک کام کے لیے مبارکباد بھیجتا ہوں۔

سردار ہربنس سنگھ آزاد

میاں عظیم حسین صاحب سفیر حکومتِ ہند برائے مصر

قاہرہ

۱۷ جون ۱۹۶۲ء

مجھے ایک مدّت سے جناب تلوک چند محروم کا کلام پڑھنے کا فخر حاصل ہے۔ مشاعروں میں اُن کا کلام سُننے کا شرف بھی مجھے مِلا ہے۔ اُن کی وسیع النظری اور کشادہ دلی نے جو ذات، مسلک، رنگ، نسل اور مذہب میں کسی طرح کی حد بندیاں قائم نہیں کرتی مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ محروم صاحب کے سامنے ایک ایسے سماج کی تعمیر کا مطمحِ نظر ہے جو ہم سب کی منزلِ مقصود ہے۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری خامیاں اور کمزوریاں کس بُری طرح سے اس حصولِ مقصد کی راہ میں حائل ہیں۔ تلوک چند محروم کا کلام اس مقصد کی تلاش کے لیے ایک چراغِ راہ کا کام دے رہا ہے۔
آپ نے اُردو ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے اس کے خزانے کو مالا مال کیا ہے۔

ایم۔ اے۔ حسین

نوّاب سعادت علی خاں سفیرِ حکومتِ ہند برائے عراق

بغداد

۱۲؍مئی ۱۹۶۲ء

ڈیر جگن ناتھ!

تمھارے خط اور ”نیرنگِ معانی“ کا شکریہ۔

حضرت محروم نے اُردو زبان کو نوازا ہے۔ میں نیرنگِ معانی کے اوراق اُلٹ رہا تھا کہ میری نظر اس غزل پر پڑی جس کا مطلع ہے ؎

گھبرائیے کیوں زندگی بے کیف اگر ہے　　آخر شبِ تاریک کا انجام سحر ہے

کیا کہنے! ساری غزل مرصع ہے۔ زبان کی سلاست، روانی اور مٹھاس پھر خیالات کی گہرائی۔ یہ عمر بھر کی محنت اور جاں فشانی کا پھل ہیں۔ خدا اس کشت کو سرسبز و شاداب رکھے۔

مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ عنقریب ہی محروم نمبر شائع ہونے والا ہے۔ یہ ایک اچھا اقدام ہے، جس سے اُردو زبان کو تقویت پہنچے گی اور اُردو والوں کی ہمت افزائی ہوگی۔

بغداد ضرور آؤ مگر ۱۲؍جون کے بعد۔ میں ۲۱؍مئی کو ایک کانفرنس میں شرکت کرنے بیروت جاؤں گا۔

نیازمند

سعادت علی خاں

جناب ہارون خاں شروانی ایم،ایل،سی (آندھرا)

مصطفےٰ منزل

حمایت نگر

حیدر آباد دکن

۶؍مئی ۱۹۶۲ء

میرے مخدوم و مکرّم۔ تسلیم و نیاز

آپ کا خط جو ۳/۷/۱۹۶۱ء کا لکھا ہوا ہے، مجھے کل ہفتے کے دن ۵ مئی ۱۹۶۲ء کو ملا۔ میں سخت نادم ہوں کہ آپ نے دس ماہ سے زیادہ اس کے جواب کا انتظار کیا ہوگا۔ اور خط جو ملا وہ اس نوع سے کہ کونسل سے ایک لفافہ جس میں کچھ اطلاعیں تھیں کل آیا تو اس کے اندر یہ خط ملا۔ ہر کا برکا ہو گیا کہ ایک عظیم ہستی کے متعلق ایک دوسری عظیم ہستی کا خط آخر کیا ہوا اور کہاں رہا۔ لطف یہ ہے کہ لفافے پر جو ٹکٹ تھا وہ کسی شوقین نے پہلے ہی سے چھٹا لیا تھا۔ یہ ہیں ہماری قانون ساز جماعتوں کے زندہ کارنامے۔

شاید اس دوران میں محروم نمبر شائع بھی ہو گیا ہوگا اور اب اس کی بابت کچھ سوچنا بے کار ہے۔ میں آپ کے والد ماجد سے پہلی مرتبہ سال گزشتہ ملا تھا جب وہ یہاں کسی مشاعرے کو زینت دینے کے لیے تشریف لائے تھے۔ میں ان کا کلام مختلف مجموعوں میں چالیس۔ برس سے پڑھتا آیا ہوں۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ سوائے ان نظموں، رباعیوں اور نعتوں کے جو مختلف مجموعوں میں طبع ہوئی ہیں، میرے پاس محترم کی کوئی جداگانہ تصنیف نہیں۔ میں نہ شاعر ہوں نہ ادیب، لیکن شعر لکھنے کا نہیں تو پڑھنے کا ضرور ذوق ہے اور کون ایسا ہے جو حضرت محروم کی طبع آزمائیوں کا مطالعہ کرے اور ان سے لطف اندوز نہ ہو۔ جیسا اوپر عرض کر چکا ہوں، غالباً یہ سب بعد از وقت ہے اور رسالہ "یگڈنڈی" کا محروم نمبر چھپ بھی چکا ہوگا۔

ہارون خاں شروانی

نواب علی یاور جنگ بہادر

سفارت خانہ

پیرس

۳ اکتوبر ۱۹۶۳ء

مائی ڈیر جگن ناتھ آزاد

یہ معلوم کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ کے والدِ محترم کی بہترویں سال گرہ کے موقع پر ماہنامہ "پگڈنڈی" کا ایک ضخیم خاص نمبر شائع کر کے اُن کی خدماتِ اُردو ادب کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا جائے گا۔ اُن کی یہ خدمات بہت اہم ہیں۔ اور اُردو زبان کے ساتھ امر رہیں گی۔ میری دعا ہے کہ وہ اُردو کی خدمت و بقا کا کام کرنے کے لیے تادیر زندہ رہیں۔

نیک تمنّاؤں کے ساتھ
آپ کا مخلص
دستخط (علی یاور جنگ)

شری ٹی، این، کول سفیر حکومتِ ہند مقیم ماسکو

سفارت خانۂ ہند
ماسکو

یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ پگڈنڈی شری تلوک چند محرومؔ کو اُن کے گراں قدر اور شاندار خدمات کے لیے جو اُنھوں نے اُردو ادب کے واسطے انجام دیں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے اپنا ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔ چند سال قبل مجھے اُن سے شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا، جب اُنھوں نے اپنا وجد آفریں کلام سُنا کر مجھے محظوظ کیا۔ اُن کا بہت سا کلام میرے مطالعہ میں آیا ہے جس سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ خاص طور پر اُن کا مجموعۂ کلام "کاروانِ وطن" ہر محبِ وطن نوجوان (مرد و زن) کے مطالعہ کی چیز ہے۔ میں اُن کی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر جو "پگڈنڈی" کے اس خاص نمبر کی تاریخِ اشاعت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے، دست بدعا ہوں کہ قادرِ مطلق اُنھیں صحت، مسرّت اور کامرانی عنایت کرے۔

میں ادارۂ پگڈنڈی کو بھی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اُس نے اس موقع پر خصوصی شمارہ شائع کرنے کا اہتمام کیا۔

دستخط (ٹی۔ این۔ کول) سفیرِ ہند

شری وائی، کے پُوری ہائی کمشنر ہندوستان مقیم کوالالامپور

ہائی کمشنر فار انڈیا
کوالالامپور
۱۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء

مجھے یہ معلوم کرکے بے حد مسرّت ہوئی ہے کہ ماہنامہ "پگڈنڈی" امرت سر محرومؔ صاحب کی اُردو ادب کے تئیں خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔ میں تو یہ کہنا پسند کروں گا کہ یہ اُن

کی ملکی خدمات کے تیئں خراجِ تحسین ادا کرنے کی سعئ مشکور ہے۔ اُنھوں نے غزل میں حُبّ الوطنی کا موضوع شامل کر کے جس سے غزل عام طور پر بے گانہ ہے، بلاشبہ اُردو شاعری کو ایک نیا اسلوب عطا کیا ہے۔ میں دست بدعا ہوں کہ وہ تادیر سلامت رہیں اور مزید اعزاز حاصل کریں۔

(وائی، کے، پوری)

جناب نورالدّین احمد میئر دہلی

ٹاؤن ہال

دہلی

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ ماہنامہ "پگڈنڈی" جلد ہی محروم نمبر نکال رہا ہے۔ اُردو ادب میں تلوک چند محرؔوم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مشاعروں میں ہم نے اُنھیں نہ دیکھا ہو یا کم دیکھا ہو، مگر جو لوگ شعر و ادب کا صحیح ذوق رکھتے ہیں اُنھیں یقین ہے کہ اُن کے کلام کی متانت اور سنجیدگی قابلِ ستائش ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہنگامہ آرائیوں کے دَور میں جب اُردو کے شعراء نے مشاعروں کو اکھاڑہ بنا دیا تھا محروم صاحب نے سالہا سال تک شمالی پنجاب کے قصبات کی غیر ادبی فضا میں رہ کر بڑی خاموشی سے ادب کی خدمت کی۔ اِس بات کی اشد ضرورت ہے کہ جن لوگوں کو پروپیگنڈے اور پبلسٹی کا لالچ بھی ہنگاموں کی طرف مائل نہ کر سکا۔ اُن کی خدمت کا اعتراف اب کیا جائے۔

مجھے اُمید ہے کہ "پگڈنڈی" کا محروم نمبر کامیاب رہے گا اور اہلِ ذوق اُسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

(دستخط) نورالدین

(میئر)

خواجہ احمد عباس

فلومینا لاج

چرچ روڈ۔ جوہو

بمبئی۔ ۵۴

رسالہ "پگڈنڈی" قابلِ مبارک باد ہے کہ محروم نمبر نکال رہا ہے۔

اُردو زبان کا جنازہ تو کئی بار نکل چکا ہے (اور اس کی موت کا قبل از وقت اعلان کرنے والوں میں دشمن بھی ہیں اور دوست بھی ہیں) مگر پھر بھی یہ "بے حیا" زبان آج بھی زندہ ہے۔ اِس زبان کو زندہ رکھنے والوں میں جن کے نام نامی یاد کئے جا سکتے ہیں اُن میں جناب محروم کی شخصیت صفِ اوّل میں ہے۔ اُنھوں نے اپنے قلم سے نہ صرف شعر و ادب کی خدمت کی ہے بلکہ اپنی شاعری میں قومی احساسات اور جذبات ادا کر کے اُردو شاعری کی بہترین روایات کو بھی نبھایا ہے۔

آج ہم اُردو کے اتنے بڑے محسن کی خدمت میں عقیدت کے چند پھولوں کے سوا اور کیا پیش کر سکتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس

شری جے کرشن چودھری

مکرمی آزاد صاحب!

محروم نمبر کے متعلق خط لکھ کر آپ نے میری بچپن کی یاد تازہ کر دی، جب میں چالیس سال قبل ایامِ طالب علمی میں اُن کی نظموں کو مزے لے لے کر پڑھتا تھا اور جھُوم جھوم کر گاتا تھا۔ اُن میں کتنی کشش، تاثیر اور جاذبیت تھی۔ زبان کی کتنی سادگی اور بے ساختہ پن تھا۔ زندگی کے شیریں اور تلخ تجربوں کا کتنا پُر لطف بیان اور زندگی کا کتنا گہرا مطالعہ تھا۔ ہر نظم ایک مشعلِ راہ تھی اور ہر ایک مصرعہ سبق آموز۔ میرے بچپن کے یہ تاثرات وقت اور عمر کے ساتھ اور گہرے ہوتے گئے۔ اور میں نے زندگی کے ہر دَور میں اُن کی نظموں کی روشنی میں زندگی کے مسائل کا کامیابی سے حل تلاش کیا ہے۔ اُنھوں نے اُردو ادب کو ایک لازوال دولت دی ہے۔ مجھے اُن کی صحبت کا فیض حاصل رہا ہے اور اُن کے بے پایاں خلوص و محبت کا دل پر گہرا اثر پڑا ہے۔ میں جب بھی اُن سے ملا ہوں میرا سر ہمیشہ اُن کے سامنے عزّت و احترام سے جھک گیا ہے۔

آپ نے یہ بہت اچھا کیا کہ والد صاحب کا سارا کلام مرتّب اور شائع کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔ اس سے جہاں آپ نے اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا ہے وہاں اُردو ادب کی بھی بے نظیر خدمت کی ہے۔

جے کرشن چودھری

مقالات

تلوک چند محروم

میری ادبی و شاعرانہ زندگی کی نشوونما

شمع اخیر شب ہوں، سن سرگزشت میری
پھر صبح ہونے تک تو قصّہ ہی مختصر ہے
(میر)

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کی فرمائش پر مجھے اپنی شاعرانہ زندگی کا جائزہ لینے کا خیال آیا تو تصور مجھے اپنے بچپن کے ماحول کی طرف لے گیا۔ آج سے ستر برس پہلے پچیس تیس خس پوش گھروں کا ایک گاؤں سرسبز کھیتوں کے درمیان دریائے سندھ کی ایک شاخ کے کنارے آباد تھا۔ اس میں میرے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ گزرا۔ اگرچہ اس سرزمین کے قدرتی مناظر شاداب میدانوں اور سرسبز کھیتوں تک ہی محدود تھے۔ اور کبھی کبھی بادو باراں کی ستم رانی اور دریائے سندھ کی طغیانی ناقابل برداشت بھی ہو جاتی۔ لیکن یہ مناظر میرے لیے نت نئی دلچسپی کا باعث ہوتے اور میں اکثر ان میں کھو جاتا یا دل میں ایک بے نام سی امنگ پیدا ہوتی۔ جب ساون بھادوں میں دریا چڑھاؤ پر ہوتا تو میرے دل میں بھی ایک عجیب سا تموّج پیدا ہوتا۔ گویا شعر کہنے سے پہلے طبیعت نامعلوم طور پر شعر گوئی کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ چنانچہ سن شعور پر پہنچ کر کئی نظموں میں ان جذبات کا اظہار ہوا۔ مثلاً یہ رباعی

کچھ تازہ نہیں شعر کا سودا مجھ کو
ہوتی بھی تو کیوں اس کی تمنا مجھ کو
گہوارے میں نالہ مرا موزوں نکلا
قدرت نے یہ بچپن سے سکھایا مجھ کو

دیہات میں عام دستور ہے کہ بچوں کو جہاں میلوں تک کوئی اسکول موجود نہ ہو، چھوٹی عمر میں تعلیم شروع نہیں کرائی جاتی۔ مجھے بھی پانچ کے بجائے سات سال کی عمر میں اسکول میں بٹھایا گیا۔ اس زمانے میں اردو نصاب کا بیشتر حصہ مولوی محمد حسین آزاد کے قلم سے نکلا ہوا تھا۔ پرائمری درجوں ہی سے مجھے آزاد کے دل کش طرز بیان سے انس پیدا ہو گیا کیا نظم اور کیا نثر دونوں میں شیر و شکر کا مزا ملنے لگا۔ اسی دور میں ایک منظوم کتاب مجموعۂ قصص نام کی کہیں سے ہاتھ آگئی۔ اس میں چند منظوم قصے سہل زبان اور خفیف بحر میں تھے۔ انھیں بار بار پڑھنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ خود بخود زبان پر موزوں مصرعے آنے لگے اور پانچویں درجے میں پہنچا تو چھوٹی چھوٹی نظمیں غلط سلط زبان اور درست بحر میں موزوں ہونے لگیں۔ ابتدا میں وزن کا غلط نہ ہونا موزونیٔ طبع کی دلیل ہے۔ لیکن زبان پر قدرت حاصل کرنا نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں زبان کے متعلق کچھ عرض کردوں۔

میری مادری زبان اردو نہیں ملتانی ہے۔ جو پنجابی سے بھی قدرے مختلف ہے۔ پڑھے لکھے لوگ خط کتابت اردو میں کرتے تھے۔ گویا میرے ضلع میانوالی (واقع مغربی پاکستان) کی کاروباری زبان اردو ہی تھی۔ لیکن درست نادرست میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ میں نے شعر کہنا تو اردو میں شروع کر دیا۔ لیکن درست زبان پر عبور حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہ تھا۔ وہ وقت تو دور رہا آج پچھتر برس کی عمر میں بھی میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اردو زبان پر مجھے پوری دسترس حاصل ہے۔ اگرچہ کئی حضرات نے میری شاعرانہ زبان کو سراہا ہے۔ جیسا کہ سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے "گنجِ معانی" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ جب تک انھوں نے مجھے دیکھا نہ تھا وہ مجھے یوپی کے کسی شہر کا باشندہ سمجھتے تھے۔ میں نے اپنی اس خامی کا اعتراف کلامِ محروم حصہ اوّل میں جو آج سے چھیالیس برس پہلے شائع ہوا تھا۔ عرضِ حال کے زیرِ عنوان اس طرح کیا ہے۔

حضراتِ ناظرین مجھے دعویٰ نہیں کہ میں — صاحب سخن ہوں شاعرِ معجز نگار ہوں
دیکھی ہے میں نے دلی نہ دیکھا ہے لکھنؤ — خود رو بروئے اہلِ زباں شرمسار ہوں

یہی وجہ ہے کہ باوجود بیسیوں درخواستوں کے میں نے کسی کو مستقل طور پر اپنا شاگرد نہیں بنایا۔ البتہ جیمنی سرشار کے بے حد اصرار پر ان کا کلام کئی سال تک دیکھتا رہا ہوں۔

زبان کے معاملہ کو یہیں چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ پانچویں درجے کا امتحان پاس کر کے طبقۂ مڈل میں داخل ہوا۔ اور چھٹے ساتویں اور آٹھویں درجے میں اردو اور فارسی میں خاص دلچسپی لی۔ اردو کورسوں میں شعرائے قدیم و متاخرین میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، مومنؔ وغیرہ کے علاوہ شعرائے جدید حالیؔ، آزادؔ، افقؔ، اسمٰعیل میرٹھی کا کلام بھی موجود تھا۔ میری طبیعت دونوں سے متاثر ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں جب ساتویں درجہ میں تھا۔ قیصرۂ ہند ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا۔ ملک بھر میں ماتمی جلسے ہوئے۔ ہمارے اسکول میں بھی جلسہ منعقد ہوا۔ میں نے مسدس کی صورت میں ایک مرثیہ پڑھا، جس کا ایک شعر اب تک حافظے میں ہے ؎

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں گل گریباں چاک ہیں
نوجوانانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

اُنہی دنوں ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز سالانہ معائنہ کے لیے اسکول میں تشریف لائے۔ آپ ادبی ذوق رکھنے والے ایک علوی بزرگ تھے۔ میرے اساتذہ نے مجھے ان کے سامنے پیش کر دیا۔ انھوں نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے وہ مرثیہ اور ایک نظم بہ عنوان خدمتِ والدین عرض کر دی۔ نظم کا مقطع تھا ؎

گو ضعیف العمر ہیں پر حق نہیں ان کا ضعیف
ہے نصیحت کام کی محرومؔ اس سے مت گزر

سن کر بہت خوش ہوئے۔ تعریف اور انعام سے میری ہمت بڑھائی۔ مرثیہ کی نقل ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کو بھجوائی۔ وہاں سے ایک پروانہ خوشنودی کا ڈپٹی کمشنر بنوں کی معرفت میرے نام آیا۔ اس واقعہ نے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔

اس طرح میری شاعری کی ابتدا بغیر کسی رہبر یا رہنما شروع ہوئی۔ بے جا نہ ہوگا اگر یہاں یہ عرض کردوں کہ میں نے کسی استاد سے اصلاح نہیں لی۔ ممکن ہے اگر کوئی شاعر ان اطراف میں ہوتا تو میں بخوشی اس کا شاگرد ہوجاتا۔ لیکن شاعر تو کیا شعر میں دلچسپی لینے والے بھی عنقا تھے۔ مجھے نہ تو یہ معلوم تھا کہ بذریعہ خط و کتابت بھی اصلاح کی جاسکتی ہے اور نہ یہ کہ کون حضرات ہیں جن سے فیض حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اسکول کی یہ حالت کہ نہ لائبریری، نہ اخبار، نہ رسالہ لے دے کے درسی کتابیں ہی میرے لیے شمعِ ہدایت تھیں۔

مڈل اسکول کا امتحان پاس کرنے پر ہائی اسکول میں داخل ہوا تو میرا نام اساتذہ اور تلامذہ میں بطور شاعر مشہور ہوچکا تھا اور مجھے اس پر طفلانہ قسم کا کچھ فخر بھی تھا۔ کیوں کہ اساتذہ کی طرف سے میرے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا تھا۔ یہ ہائی اسکول شمال مغربی سرحدی صوبہ کے شہر بنوں میں تھا۔ زبان یہاں کی پشتو تھی۔ قبائلی لڑکے یہاں تعلیم پاتے اور ہمارے ساتھ بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ جب وہ اردو بولنے پر آتے تو "پتلی دال" کو "دبلا دال" کہتے۔ زبان کے معاملہ میں کسی کا یہ مصرع میرے حسب حال تھا ؎

ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تریں ہم

لیکن سرسبزی اور شادابی میں یہ خطّہ نہایت دل کش اور دل آویز تھا۔ شاعری کا جو چسکا پڑ چکا تھا اس میں عمر اور ماحول نے کچھ اضافہ کردیا۔ یہاں اسکول کے ماہانہ جلسوں میں مجھے کچھ نہ کچھ سنانا پڑتا تھا۔ اساتذہ میں بھی ایک صاحب شعر و سخن میں دلچسپی لینے والے نکل آئے۔ علاوہ ازیں منشی پیارے لال شاکر میرٹھی جو مشن احاطہ میں رہتے تھے، اور ایک مذہبی ہفتہ وار پرچہ "تحفۂ سرحد" چرچ مشن کی طرف سے مرتب کرتے تھے، شاعرانہ ذوق کے حامل تھے۔ نیز ایک اور نوجوان تھے۔ اپیل نویسی ان کا پیشہ تھا اور دیوان گویا از بر تھا۔ ان دونوں سے واقفیت کے بعد بے تکلفانہ میل جول ہوگیا۔ اکثر مدرسہ کے اوقات کے بعد اور بعض دفعہ مدرسہ سے روپوش ہوکر ان کے ساتھ شعر بازی اور شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی رہتی۔ ان ایام میں کئی تفریحی نظمیں کہیں اور چھوٹی چھوٹی انگریزی نظموں کے ترجمے کیے۔ ۱۹۰۶ء میں دسویں درجے میں تھا کہ "زمانہ" کان پور اور اس کے بعد "مخزن" لاہور میں نظمیں شائع ہونا شروع ہوگئیں۔ منشی دیا نرائن نگم نے اپنے خطوط میں میرا دل بڑھایا۔ یہیں سے میں نے اپنا کلام محفوظ رکھنا شروع کردیا۔ یہاں چند اخبار اور رسالے بھی پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ اس ملک کے سیاسی حالات سے بھی کچھ واقفیت ہوتی رہتی تھی۔ حب وطن کا جذبہ فطری ہے۔ اور شاعرانہ طبیعت کے عین موافق۔ لہٰذا اسی طالب علمی کے زمانے میں سیاسی

اور قومی نظمیں بھی کہنا شروع کر دیا۔ "سدیشی تحریک"، "مہاتما گاندھی"، "جنوبی افریقہ کے ہندوستانی" جیسے موضوعوں پر طبع آزمائی کرتا رہا، اور پنجاب کے اخباروں میں اس نوع کا کلام شائع ہونے لگا۔ اس وقت سے آج تک وطن اور حبِّ وطن کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتا آیا ہوں جس کا نتیجہ ۱۹۰۶ء سے تقسیم وطن کے بعد تک، قومی اور سیاسی کلام پر مشتمل "کاروانِ وطن" نام کی کتاب ہے، جو پچھلے سال دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

طالب علمی کے انہی ایام میں رسالہ "مخزن" اور "زمانہ" میں ڈاکٹر اقبالؔ، سرورؔ جہاں آبادی، اور نادرؔ کاکوروی کا کلام شوق سے پڑھتا رہا اور اس سے متاثر اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش میں بھی ایسا ہی کہہ سکوں۔

اسکول کی طالب علمی کا مرحلہ ۱۹۰۷ء میں طے ہوا تو ایک سال کے لیے لاہور سنٹرل ٹریننگ کالج میں مدرسی کی تربیت کے لیے داخل ہوا۔ یہاں پہلی بار ایک مشاعرے میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ اخبار "صدائے ہند" کے ایڈیٹر اور مالک منشی محمد دین فوق یہ مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ طرحی کلام پڑھا جاتا تھا اور غزلیات تمام تر عاشقانہ ہوتی تھیں۔ میں اس مشاعرہ میں دو تین بار شامل ہوا۔ منشی نرائن ارمان دہلوی اسٹیج کے پاس بیٹھے ہوئے مصرع اٹھاتے تھے اور نہایت جوش و خروش سے داد دیتے تھے جس سے سامعین شاعر کے شعر سے زیادہ ان کے داد دینے پر ہاؤ ہو کرتے تھے۔

یہ ۰۸-۱۹۰۷ء کا زمانہ تھا اور لاہور میں سیاسی تحریک زوروں پر تھی۔ میں نے بھی کئی سیاسی نظمیں کہیں اور اخباروں اور رسالوں میں بھی شائع ہوئیں۔ لیکن چونکہ لب و لہجہ معتدل تھا، سرکار کی طرف سے گرفت نہ ہوئی۔ ہاں ایک نظم پر رسالہ "آزاد" لاہور کے ایڈیٹر منشی بشن سہائے آزادؔ کو بلوا کر پُرسش کی نظم کا عنوان تھا۔ ع

اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

انھوں نے نظم کی الٹی سیدھی توضیح کرکے مخلصی پائی۔ انہی دنوں لالہ لاجپت رائے مانڈلے سے چھ ماہ کی جلاوطنی کاٹ کر لاہور واپس آئے۔ اور اہل لاہور نے ڈی اے وی کالج میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کرکے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس تقریب پر میں نے ایک طویل نظم کہی تھی۔ وہ ایجنڈا میں شمولیت کے لیے مہاتما ہنس راج کو پیش کردی۔ انھوں نے نظم شامل تو کرلی لیکن کئی اشعار خطوط وحدانی میں دیدئے اور فرمایا کہ یہ نہ پڑھے جائیں لیکن جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو خطوط وحدانی کو روندتا چلا گیا۔ جب پڑھ کر اسٹیج سے اترا تو ٹریننگ کالج کے پروفیسر سید محمد حسن مرزا دہلوی نے مجھے بغل میں لے لیا اور انگریزی میں کہا میں تمھیں اس کامیابی کی مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ واقعہ بھی میری آئندہ شاعری کے لیے جرأت آزما ثابت ہوا۔

قیام لاہور کے زمانے میں منشی سورج نرائن مہرؔ دہلوی کے علاوہ کسی ادبی شخصیت یا شاعر سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔ مہر صاحب سے بھی ملاقات صرف رسمی طور پر کالج میں ہوئی۔ سالانہ امتحان ہو رہا تھا اور میں طلبا کو اپنا امتحانی سبق پڑھا رہا تھا۔ وہ بطور ممتحن

معائنہ کرتے ہوئے آئے۔ چند منٹ مجھ سے پرسشِ حال کی اور مسکراتے ہوئے واپس چلے گئے۔

لاہور کے سنٹرل ٹریننگ کالج سے فارغ ہو کر ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے مشن ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کر لی اور زندگی کے نئے میدان میں قدم رکھا۔ ملازمت اور خانہ داری کے فرائض کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رہی۔ اور حسبِ معمول اخبارات اور رسائل مثلاً "ادیب"، "العصر"، "زمانہ"، "مخزن" وغیرہ میں کلام شائع ہوتا رہا۔ یہیں سے ۱۹۱۶ء میں اخلاقی، جذباتی اور کلچرل نظموں کا مجموعہ موسوم بہ کلام محروم حصہ اول مرتب کر کے شائع کرایا۔ جس پر ملک کے بیشتر اخباروں اور رسالوں کے علاوہ حضرت اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر سر محمد اقبال اور حضرت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی ایسے مشاہیر ادب نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اکبر مرحوم نے تو ایک رباعی بھی براہ راست رسالہ زمانہ کان پور میں شائع کرائی تھی جو اب تک میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ وہ رباعی یوں ہے۔

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم ۔۔۔ لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز ۔۔۔ ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

اس پر بطور شکریہ میری طرف سے یہ رباعی رسالہ "زمانہ" میں شائع ہوئی۔

طبع موزوں خدائے برتر سے ملی ۔۔۔ تاثیرِ کلام قلبِ مضطر سے ملی
آیا مجھ کو یقیں کہ شاعر ہوں میں ۔۔۔ جب دادِ سخن جناب اکبر سے ملی

کلام محروم حصہ اول کا دیباچہ میر کرامت اللہ میر امرتسری نے لکھا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت پر مقررہ انعام کے علاوہ پنجاب گورنمنٹ نے کتاب کی دو سو جلدیں بھی خرید کر حوصلہ افزائی کی۔ بعد میں کلام محروم کے دو اور حصے بھی شائع ہوئے ایک قومی اور دوسرا عاشقانہ۔

نصف صدی کی طویل ملازمت کے دوران میں بعض ناخوشگوار حالات اور کچھ ذاتی رنجدہ واقعات پیش آئے۔ طبیعت شروع سے رقت آشنا تھی۔ حالات نے میری شاعری میں غم واندوہ کا عنصر شامل کر دیا۔ چنانچہ "گنج معانی" کے دیباچہ میں سر شیخ عبدالقادر نے اس پہلو پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں نے عملاً کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اساتذہ کے کلام پر ضرور نظر رہی ہے اور مولانا حالیؔ آزاد کی ادبی تصانیف، مولانا شبلی کی شعر العجم اور حسرت موہانی، چکبست لکھنوی اور اثر لکھنوی، جوش ملسیانی کے ادبی اور تنقیدی مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

چونکہ ایف اے اور بی اے کے امتحانوں میں جو میں نے ملازمت کے دوران میں پرائیویٹ طور پر پاس کئے، میرا ایک لازمی مضمون فارسی بھی تھا۔ لہٰذا اس زبان میں کچھ شد بد ہو گئی، اور چند غزلیں، رباعیاں اور قطعے فارسی میں بھی

کہہ چکا ہوں۔ نیز انہی امتحانوں کے طفیل انگریز شعرا مثلاً ورڈز ورتھ، کیٹس، شیلے، سر والٹر سکاٹ اور شیکسپیئر کے انتخابات کا مطالعہ بھی کیا۔ اور ان کی کئی نظموں کے اردو نظم میں ترجمے بھی کئے جو میرے مجموعہ ہائے کلام میں شامل ہیں۔

اب تک میری نظموں کے چھ مجموعے گنج معانی، رباعیات، کاروان وطن، نیرنگ معانی، بہار طفلی، اور شعلۂ نوا شائع ہو چکے ہیں۔ ایسا کلام بھی جو رسالوں میں تو شائع ہو چکا ہے لیکن کتابی صورت میں نہیں آیا، خاصی مقدار میں موجود ہے۔ کچھ حصہ ایسے کلام کا مکان اور سامان کے ساتھ تقسیم وطن کی نذر ہو گیا، اس کا مجھے افسوس نہیں کیونکہ عمر کا آخری حصہ آزاد ہندوستان میں آرام کے ساتھ گزر رہا ہے۔

رباعیات

واللہ کہ ہے عجیب شے آزادی　　طاقت کی مگر کنیز ہے آزادی
بن جاتی ہے زہر ناتواں کے حق میں　　از بسکہ ہے تیز و تند مے آزادی

حیران ہوں، کیا کیا خدایا میں نے　　بے فائدہ عمر کو گنوایا میں نے
پیری بھی قریب خاتمہ آ پہنچی　　منزل کا نشاں ابھی نہ پایا میں نے

دم اکثر پارسائی کا بھرتا ہے　　حیراں ہوں کہ دل مرا یہ کیا کرتا ہے
خوف اِس کو گناہ سے نہیں ہے لیکن　　الزامِ گناہ سے بہت ڈرتا ہے

محروم

فراق گورکھ پوری
(مترجم ، راج نرائن راز)

اردو ادب میں محرومؔ کا حصّہ

گزشتہ نصف صدی سے حضرت تلوک چند محروم اردو ادب میں بے عیب اور گراں مایہ اضافے کر رہے ہیں۔ عام قاری انھیں شوق سے پڑھتا اور اعلیٰ ادبی حلقے ان کا لوہا مانتے ہیں۔ ہم ان کے صغیر و سن معاصر ابھی ٹوٹے پھوٹے اشعار ہی کہہ رہے تھے کہ ان کی نظمیں ملک کے مختلف رسائل میں باقاعدہ شائع ہونے لگ گئی تھیں۔ ہم انھیں پڑھا کرتے تھے۔ اب تک ان غزلوں اور نظموں کے چھ ضخیم مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ گنج معانی، رباعیات محروم، کاروان وطن، نیرنگ معانی، شعلۂ نوا اور بہارِ طفلی ہیں۔ ہند و پاک میں شاید ہی کوئی زندہ شاعر ایسا ہو جسے مقدار میں اتنا زیادہ اور معیار میں اتنا اعلیٰ کہنے کا شرف حاصل ہوا ہو۔ جہاں تک ان کے موضوعات کا تعلق ہے وہ رنگا رنگ ہیں۔ ان کا کلاسیکی انداز نکھرا ستھرا اور اسلوب پختہ ہے۔ ان کے ہاں الفاظ و معنی کی وضاحت و فصاحت دیدنی ہے۔ ان کی فکر پُر وقار ہے۔ انھیں متنوع موضوعات چابکدستی سے نظم کرنے کی قدرت حاصل ہے۔ انھیں خوبیوں کی بدولت ان کا شمار اردو نظم کے معدودے چند غیر فانی شعراء میں ہوتا ہے۔

حضرت محرومؔ نے غیر معمولی کامیابی کے ساتھ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ دورِ حاضر کے اردو شعراء میں سب سے زیادہ صحیح گو ہیں۔ ان کے افکار و اشعار میں علمیت کی شان ہے۔ ان کے فارسی اشعار، ان کی استادانہ مہارت اور قدرت کے بیّن ثبوت ہیں، اور پھر ایسا بھی نہیں کہ انھیں سراہا نہ گیا ہو۔ ورڈز ورتھ کے بعد جب ٹینی سن کو قومی شاعر کا اعزاز ملا تو اس نے کہا تھا "سرفرازی کا یہ تاج اس بشر سے میرے حصّے میں آیا ہے جس کی نوکِ زبان پر کبھی کوئی بات معمولی یا سطحی نہیں آئی"۔ ہم حضرت محرومؔ کے بعد کی نسل کے شعراء ان کے بارے میں یہی بات بآسانی کہہ سکتے ہیں۔

حضرت محرومؔ نے بہت سی نظمیں ان موضوعات پر کہی ہیں جو پہلی نظر میں معمولی اور شعریت سے عاری دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بظاہر ایسے لگتے ہیں کہ ان پر آسانی کے ساتھ کامیاب نظمیں نہیں کہی جا سکتیں۔ اس ضمن میں حضرت محرومؔ کی قوّت نظم دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے بڑے غیر محسوس لیکن حیران کن طریق پر اپنا مقصد حاصل

کیا اور ان موضوعات پر بڑی کامیاب نظمیں کہی ہیں۔ ان کی تصنیف "بہار طفلی" کو دیکھ کر معًا ہمارا ذہن سٹی وَن سَن کی تصنیف "اے چائلڈ گارڈن آف ورسسز" کی طرف پلٹتا ہے۔ ہین کی تصنیف "اینڈرسنز فیری ٹیلز" کے بارے میں کہا گیا ہے "کون ہے جو انھیں پڑھنے کے لیے بچہ بننا پسند نہ کرے گا" سچ تو یہ ہے کہ محروم صاحب کی "بہار طفلی" سے صحیح صحیح لطف اٹھانے کے لیے ہم بچپن کی وادیوں میں لوٹ جانے کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔ اس مجموعے کی ہر نظم ہمارے دل و دماغ کی تربیت کرتی، ہماری مسرت کا سبب بنتی اور ہمیں رفعت بخشتی ہے۔ "بہار طفلی" کا اسلوب اتنا ہی سادہ ہے جتنا جواہرلال نہرو کی تصنیف "لیٹر فرام فادر ٹو ہز ڈاٹر" (باپ کا خط بیٹی کے نام) کا ہے۔ اس مجموعے میں فکر، تخیل اور حقیقت پسندی کا بڑا ہی حسین امتزاج آپ کو نظر آئے گا۔

"نیرنگ معانی" حضرت محروم کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی نظمیں اس اعتبار سے بڑی نمایاں ہیں کہ وہ شاعر کی ہمہ گیر فکری اور تخلیقی قوتوں کا رچاؤ لیے ہوئے ہے۔ عبدالقادر سروری نے اپنے مختصر مگر نہایت جامع دیباچے میں نظمیاتِ محروم کے ان اوصاف پر بڑے مؤثر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس مجموعے میں اسی موضوعات پر نظمیں شامل ہیں۔ یہ بے نقص اور بے عیب مہارت کا آئینہ ہیں۔ اِن نظموں کا تیکھا پن بھی خوب ہے۔ ان میں شدت احساس تو ہے لیکن شعری بصیرت کے بغیر نہیں۔ یہ نظمیں ہمارے اندازِ فکر کی تربیت کرتی ہیں۔ ہمارے نفس کو شریف تر بناتی ہیں۔ ہمارے ممتاز نقادوں نے اعلیٰ نظم کے جو معیار مقرر کیے ہیں۔ محروم کی نظمیں ہمیشہ ان پر پوری اترتی ہیں۔

"شعلۂ نوا" محروم صاحب کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ محروم صاحب کی غزلیں مریضانہ جذبات سے پاک صاف ہیں وہ جنازہ بردوش شاعر نہیں۔ ان کے ہاں نزع کی ہچکیوں، ڈوبی ہوئی نبضوں، پتھرائی ہوئی آنکھوں اور اکھڑی ہوئی سانسوں کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ محروم "طوفانی جذبات" اور "ہیجانی طوفان" کے شاعر نہیں۔ ان کی غزلوں کا کلاسیکی رکھ رکھاؤ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان غزلوں کا مطالعہ تعلیم کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے بیشتر اشعار میں بیک وقت نغمگی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔ وہ اخلاقی قدروں کے حامل ہوتے ہیں۔ اور اکثر زباں زد ہو جاتے ہیں ایک تربیت یافتہ احساس، ایک پُروقار ضبط ان کا خاصہ ہے۔ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ بہت سے غزل گو شعرا انتہائی مبالغے سے کام لیتے ہوئے جذبات کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں۔ وہ اپنے تخیل کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور تخیل کی اس دھما چوکڑی میں ان کے منہ زور جذبات آڑے سیدھے اور سیدھے آڑے الفاظ کا قالب اختیار کر لیتے ہیں ایسی شاعری شاعر کو اور قاری کو ایسی ذہنی کیفیت کے زیر اثر لے آتی ہے۔ جس کے لیے موزوں ترین جگہ اعصابی امراض کا ہسپتال ہی ہو سکتا ہے، اس کے برعکس محروم کی غزل میں ہوشمندی، سنجیدگی اور توازن ہے۔ جذباتی انتشار کے

دور میں یہی اوصاف توازن کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

اردو شاعری میں صنف رباعی کو بہت کم فروغ ملا ہے۔ رباعی کی تکنیک ہر شاعر کے بس کی نہیں۔ اردو اور فارسی رباعیات کا مجموعہ "رباعیات محروم" اس صنف میں محروم صاحب کی قدرت اور کمال کا نمایاں ثبوت ہے۔ یہ ان شاعروں کے لیے رشک کا باعث ہو سکتا ہے جو شاعر تو اچھے ہیں لیکن رباعی پر کوئی قدرت نہیں رکھتے۔ موضوعات کی رنگارنگی ان رباعیات کا وصف ہے۔ یہ رباعیاں انتہائی سنجیدہ کیفیات اور نکھرے ستھرے شعری مزاج کا آئینہ ہیں۔ ایسی کیفیات اور نکھرا ستھرا مزاج خال خال ہی شعراء کا حصہ ہوتا ہے۔ ان رباعیات کی ایک بڑی تعداد بلا شبہ ایک استادانہ چھاپ لیے ہوئے ہے۔ اس مجموعے میں ہمیں بے مثل نگینے ملتے ہیں۔

"کاروانِ وطن" کو بلا خوف تردید ۱۹۶۰ء کا بہترین شعری مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس عرصے میں اس پایہ کا ایک شعری مجموعہ بھی ہندو پاک سے شائع نہیں ہوا۔ اس میں ۱۸۸ نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں کیا ہیں؟ قومی بیداری، جہدِ آزادیٔ ہندوستان کی تحریک آزادی کی روحانی تاریخ کی جھانکیاں ہیں۔ یہ منظوم صحافت نہیں۔ عصر حاضر کے موضوعات اور مسائل ان نظموں میں بار پانے کے بعد ایسی اہمیت اختیار کر گئے ہیں جس میں کبھی کمی واقع نہ ہوگی۔ یہ نظمیں سیاسی نعرہ بازیوں سے یکسر عاری ہیں۔ حضرت محروم کسی ایسے موضوع کو ہاتھ میں نہیں لیتے جو ان کے دل کے قریں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حب الوطنی کی یہ اعلیٰ نظمیں ہیجان، تعصب اور جذباتیت سے پاک صاف ہیں۔ دھیمے دھیمے سوز و گداز نرمی اور غنائیت کے طفیل ان میں سے بیشتر نظمیں ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک گراں مایہ انسانی دستاویز ہے۔

مولانا حالیؔ اور ان کے ہم عصروں نے جس نئے دبستانِ شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی "گنجِ معانی" اسی دبستاں کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ کوئی بیس پچیس برس پیشتر شائع ہوا تھا۔ "گنجِ معانی" کی اشاعت نے محروم صاحب کو شعرا کی اولیں صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اردو شاعری کو رفیع و وقیع بنانے میں جو ادبی کارنامے حضرت محروم نے انجام دیے ہیں اردو ادب کی کوئی تاریخ بھی انھیں نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ان کی انگلیوں میں ایک باکمال ماہرِ فن کا سا جادو ہے۔ فکر اور فن انھیں کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ وہ جوشِ جنوں میں بھٹکتے نہیں۔ ایک سلجھے ہوئے دنیاوی بشر کی سی سنجیدگی اور متانت ان کا حصہ ہے۔ صحت مندی ان کی شاعری کا وصفِ اعلیٰ ہے۔ محروم صاحب نے اب تک کوئی ایک ہزار منظومات کہی ہیں۔ ان میں شاعر کی ذات بہ نفسِ نفیس موجود ہے۔ محروم صاحب نے اردو شاعری کی جو خدمت کی ہے اس کے اعتراف کا یہ موزوں ترین وقت ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

نیاز فتحپوری

کاروانِ وطن

جب مجھ سے کسی شاعر کے کلام پر اظہار خیال کی فرمائش کی جاتی ہے تو سب سے پہلے میں یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر مجھ سے عمر میں بڑا ہے یا چھوٹا ——— اگر بڑا ہوتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھے غالباً اس کے کلام پر رائے زنی کا کوئی حق حاصل نہیں، اور اگر چھوٹا ہوتا ہے تو میں خوش ہوتا ہوں، کیونکہ اس طرح اپنی بزرگی ——— نہیں ——— محض طوالتِ عمر سے فائدہ اٹھانے کو میرا جی چاہتا ہے ——— اور خیال کرتا ہوں کہ جس طرح میں اپنے بزرگوں کا احترام کرتا ہوں وہ بھی اسی طرح میرا احترام کرے گا۔ اور جو کچھ میں کہتا ہوں ——— خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو ——— اسے اگر وہ مان نہیں لے گا تو کم از کم اس کی تردید میں گستاخی سے بھی کام نہیں لے گا، حالانکہ اس زمانہ میں جب کہ

دشنام حلال است و شکر خند حرام است

اس اخلاق کی توقع کسی کی طرف سے قائم کرنا، کوئی معنی نہیں رکھتا۔

جس وقت جگن ناتھ آزادؔ نے (صاحب کا اضافہ ان کے نام کے ساتھ مجھے پسند نہیں، کیوں کہ ان کو چھوٹا سمجھنے اور چھوٹوں ہی کی طرح ان سے خطاب کرنے میں مجھے زیادہ لطف آتا ہے) مجھ سے اپنے والد محترم جناب محرومؔ کے مجموعۂ کلام "کاروانِ وطن" پر اظہارِ خیال کی درخواست کی تو مجھے قدرے تامل ہوا، کیونکہ میں سمجھتا تھا وہ مجھ سے عمر میں بڑے ہوں گے اور ان کی بزرگی کے پیشِ نظر صاف صاف کہنا میرے لیے غالباً مشکل ہوگا۔ لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹے ہیں تو میرا یہ پس و پیش دور ہوگیا۔ لیکن نہایت قلیل عرصے کے لیے بالکل عارضی طور پر، کیونکہ اس کے بعد جب میں نے ان کے کلام پر نگاہ ڈالی تو یہ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا اور بزرگی وزرگی کا سارا ڈھکوسلا ختم ہوگیا۔ میں اِس کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود، ذہن و فکر کے لحاظ سے وہ مجھ سے بہت بڑے نکلیں گے۔ اتنے بڑے کہ ان کی بالکل ابتدائی نظموں کے سمجھنے کے لیے بھی مجھے ایک قرن پہلے یا ایک قرن بعد پیدا ہونا چاہیے تھا۔

پھر اگر ان کے منظومات صرف غزلوں یا منظری نظموں تک محدود ہوتے تو شاید میں اس قدر مرعوب نہ ہوتا لیکن جب میں نے دیکھا کہ وہ ۱۹۰۶ء میں بھی (جب کہ ان کی عمر ۱۹ سال کی تھی اور میری ۲۱ سال کی)، وہ اپنی ایک وطنی نظم میں

اتنی اونچی بات سوچ سکتے تھے کہ

اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کردے

تو میں اپنے اندر بڑا احساسِ کمتری پاتا ہوں، کیوں کہ اس وقت کیا، اس وقت بھی یہ بات میرے ذہن میں نہیں آسکتی کہ کوئی نوجوان شاعر حسن وعشق کے علاوہ کچھ اور سوچ بھی سکتا ہے اور محض سوچنا ہی نہیں بلکہ حد درجہ خلوص و صداقت کے ساتھ کہہ بھی سکتا ہے۔ اچھا ہوا کہ ان کی اس نوع کے منظومات میری نظر سے نہیں گزرے۔ ورنہ میں یقیناً ان کو سخت قابلِ رحم سمجھتا، اور ان کی زندگی کو لائق افسوس۔

میری ان کی ذہنیت میں اتنا فرق کیوں تھا؟ اس کا سبب اس وقت تو میں سمجھ ہی نہ سکتا تھا۔ لیکن اب میری سمجھ میں آیا ہے اور وہ یہ کہ میں مسلم گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور وہ ہندو گھرانے میں۔ میں مذہب کی روایتی تعلیم سے حد درجہ متاثر تھا اور ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ معلوم نہیں کس وقت کافر کہہ کر شہر بدر کر دیا جاؤں اس لیے جب میں اس گھٹی ہوئی فضا سے کچھ دیر کے لیے علیحدہ ہو جاتا تو حسن وعشق ہی کی باتوں سے اس زنگ کو دور کرتا ـــــ برخلاف اس کے جناب مرحوم کی تعلیم و تربیت ہندو گھرانے میں ہوئی اور چونکہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ محض ایک عمرانی نظام ہے جس کی عدم پابندی پر کوئی ہندو کافر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جناب مرحوم جو بات اب سے پچاس سال پہلے سوچ سکتے تھے میں شاید آئندہ پچاس سال کے بعد بھی اتنی صداقت کے ساتھ نہ سوچ سکوں گا۔ یہی فرق تھا میرے ان کے ماحول کا، کہ جب دورانِ تعلیم یا عنفوان شباب ہی میں شاعری شروع کی تو ان کے ہاتھ میں دامنِ وطن تھا۔ اور میرے ہاتھ میں دامنِ حسن وعشق۔ یعنی ٹھیک اس زمانے میں جب وہ مظلومیت وطن کی داستان سناتے ہوئے یہ دعا مانگتے تھے کہ

اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کردے

تو میں صرف اس تمنا پر جان دیتا تھا۔

میں ہوں گا، رات ہوگی، وہ مہ جمال ہوگا
ساعت وہ آئے تو، جب جینا محال ہوگا

کتنا فرق تھا میرے ان کے احساس میں اور بلحاظِ فکر و نظر میں ان سے کتنا فروتر تھا اور وہ چھوٹے ہوتے ہوئے بھی مجھ سے کتنے بڑے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب "مخزن" "زمانہ" عروج پر تھے۔ آزاد و حالی کی قائم کی ہوئی شاہراہ پر متعدد شعرا چل پڑے تھے

جن میں سے ایک محرومؔ بھی تھے۔

اکبرؔ کے طنزیاتی تنبیہات، اقبالؔ کے مفکرانہ نصائح، اسمٰعیل میرٹھی کی سنجیدہ حقیقت نگاری اور سرورؔ کے ادیبانہ مطالعہ فطرت سے اس وقت کی فضائے شاعری گونج رہی تھی، اور انھیں آوازوں میں ایک آواز محروم کی بھی تھی۔ لیکن ان سے ذرا مختلف۔ اس میں نہ اقبالؔ کے فلسفے کی گونج تھی نہ اکبرؔ کے طنزیاتی نشتر کی سی تیزی، نہ اسمٰعیل و سرورؔ کی سی مادّی یا تمثیلی نقاشی، بلکہ ایک مجروح احساس کی سی درد انگیزی، ایک اجتماعی درد و غم کی سی کسک اور ایک ٹھہرا ہوا شعورِ مداوا، جو صلائے جنون و گریباں چاکی نہ تھا بلکہ ایک نوع کی دعوت بخیہ گری تھی۔

پھر یہ تو نہیں کہ میں نے آوازوں کی طرف سے کان بند کر لیے ہوں۔ میں بھی اس شور کو سنتا تھا، چونک چونک پڑتا تھا، لیکن اس کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

ہر چند کچھ زمانے کے بعد میں بھی چونکا اور ۱۹۱۵ء سے میری قومی نظمیں بھی "زمیندار" اور "الہلال" میں شائع ہونے لگیں۔ لیکن میری یہ بیداری بھی خواب ہی سی تھی، کیونکہ جو کچھ میں سوچتا اور کہتا تھا اس کا تعلق زیادہ تر بیرونی سیاست اسلامیہ سے تھا اور وطن پرستی کا کوئی جذبہ میرے اندر پیدا نہ ہوا تھا ——— اس لیے میری ان کی ذہنیت کے اس عظیم فرق کو دیکھ کر بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بلحاظ فکر و نظر وہ مجھ سے کتنے بڑے ہیں اور ان کے ملّی و وطنی شعور کی حقیقی داد دینے کی صلاحیت مجھ میں کتنی کم پائی جاتی ہے۔

اگر جناب محروم کی تمام شاعرانہ تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پورے ایک قرن کی تاریخ ادب کو سامنے رکھ کر ان کے نقوشِ فکر کا مرتبہ متعین کیا جائے، اور یہ کام آسان نہیں۔ کیوں کہ اس سلسلے میں یہ سوال ہمارے سامنے نہیں آتا کہ اس وقت تک انھوں نے کیا کیا لکھا بلکہ یہ کہ انھوں نے کیا نہیں لکھا۔

یوں تو بہ لحاظ اصناف سخن ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے غزلیں بھی لکھیں، قطعے اور رباعیاں بھی لکھیں، لیکن یہ بات اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ہم کو یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ وہ ان تمام منازل سے کیوں کر گزرے کن خصوصیات کو لیے ہوئے گزرے اور اپنی انفرادیت کے کیا کیا نقوش چھوڑتے ہوئے گزرے۔ لیکن مجھے اس وقت ان کی شاعری کے ان تمام وسیع حدود کو نہیں دیکھنا ہے بلکہ صرف ان نظموں کو دیکھنا ہے جن کا موضوع صرف "وطن حبِّ وطن" ہے، جو میری رائے میں ان کی تمام کارگاہِ شاعری کا NUCLEUS ہے، اور اسی کے چاروں طرف ان کے دوسرے اصنافِ سخن

بھی گردش کرتے ہیں۔

شاعروں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو خود قصد کر کے شعر تک پہنچتے ہیں، دوسرے وہ جن تک شعر خود پہنچتا ہے۔ اس کا جذبہ و خیال صرف شعر ہی کی صورت میں ہم کو اپیل کر سکتا ہے اور اس کے فکر و احساس کی بلندی و پاکیزگی (شاعری سے قطع نظر)، بجائے خود اتنی دلچسپ ہوتی ہے کہ شعر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

عربی میں اعلیٰ قدر مراتب شاعر کی کئی قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ شعرور، شُویعر، متشاعر، شاعر اور خنذیذ۔ اول الذکر دو قسمیں وہ ہیں جن کا تعلق شاعری سے نہیں بلکہ اتہام شاعری سے ہے۔ متشاعر وہ جس کو دوسرے الفاظ میں شعر فروش یا محض ردیف و قافیہ کا شاعر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد حقیقی شاعری کے حدود شروع ہوتے ہیں، جس میں شعور انسانی بھی شامل ہوتا ہے اور فنی خوبی کے ساتھ حسن فکر بھی پایا جاتا ہے اور اسی کی انتہائی ارتقائی منزل وہ ہے جب ایک شاعر خنذَیذ یا نابغہ ہو جاتا ہے

بہر حال اس میں شک نہیں کہ شعر محض فنی تار و پود کا نام نہیں بلکہ اس کا حقیقی تعلق فکر و خیال سے ہے اور انھیں دونوں کے امتزاج سے مراتب شاعری کی تعیین ہوتی ہے۔

ادبیات میں دو چیزیں اور بھی قابل لحاظ ہیں، تفصیل و ایجاز، اور شاعری میں ان دونوں کا صرف بڑا سلیقہ چاہتا ہے کیوں کہ بسا اوقات ایک شاعر تفصیلی جزئیات کی کوشش میں اطناب تک پہنچ جاتا ہے۔ اور ایجاز کی سعی میں اہمال تک ——— پھر جب ہم ان تمام خصائص شاعری کو (جن میں فنی شعور، فکر و خیال، اسلوب بیان، صداقت و حقیقت اور تفصیل و ایجاز سب کچھ شامل ہے)، سامنے رکھ کر جناب محرومؔ کی شاعری پر غور کرتے ہیں تو اس میں یہ تمام باتیں بڑے اچھے توازن کے ساتھ ہم کو مل جاتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ موقع و محل کے لحاظ سے مناسب الفاظ کا استعمال جو بلاغت کی شرطِ اولین ہے۔ کہ یہ محرومؔ کا خاص فن ہے۔ ملک میں جناب محروم کی رباعیاں بہت مشہور ہوئیں۔ یہاں تک کہ رباعی کے ذکر میں محرومؔ کا نام اور محرومؔ کے ذکر میں رباعی کا تصور ناگزیر سی چیز ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ ایجاز گوئی میں انھیں بڑا سلیقہ حاصل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے قطعات بھی اس خصوصیت سے خالی نہیں اور غزلوں میں بھی۔ (حالانکہ وہ غزل گو شاعر نہیں ہیں)، وہ غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں۔

محروم جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ شاعری کا بڑا عجیب و غریب دور تھا۔ ایک طرف روایتی شاعری گریباں گیر تھی۔ دوسری طرف آزاد و حالی کی درایتی شاعری دامن گیر۔ ایک طرف نشاط از دست رفتہ کی یاد تھی۔ دوسری طرف اندیشۂ حال و مستقبل کی فریاد۔ ایک طرف داستان سرائی تھی، دوسری طرف حقیقت آرائی، ایک طرف "عشرتِ دیر غنودن" تھی، دوسری

طرف صلائے بیداری وراہ پیمودن" ایک طرف محض عشرت شبانہ تھی، دوسری طرف نفیر زمانہ ــــــ کچھ لوگ ہنوز محو خواب تھے، کچھ چونک پڑے تھے، اور کچھ انگڑائیاں لے کر چل پڑنے والے بھی تھے ــــــ انھیں میں ایک محروم بھی تھے، جنھوں نے جادۂ نو پر قدم رکھا، اور اس انداز سے گویا وہ پہلے کبھی گمراہ ہی نہ ہوئے تھے۔ جسے اگر ہم چاہیں تو ان کی زندگی کا المیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر فکری تقدس کے لیے جذبات کی لذتیت کی قربانی بھی ضروری قرار دی جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ عنفوان شباب ہی میں اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھنا محروم کو کس نے سکھایا اور ان کی اس سلامت روی کے کیا اسباب تھے ــــــ مجھے ان کے ماحول، ان کی تربیت اور خاندانی روایات کا علم حاصل نہیں، ورنہ شاید میں سمجھ سکتا کہ قبل از وقت ان کی ذہنی پختگی کے کیا اسباب تھے۔ وہ کونسا ذہنی اضطراب تھا جس نے انھیں اس قدر جلد مصلحانہ سنجیدگی کی طرف مائل کر دیا، اور وہ کون سی ناآسودگیاں تھیں جنھوں نے محروم تخلص رکھنے پر انھیں مجبور کیا۔ کاش کہ اس سلسلے میں ہم کچھ اور بھی کہہ سکتے۔

جیسا کہ اس سے قبل ظاہر کر چکا ہوں، رباعی نگاری، محروم کا خاص رجحان تھا، جو شاعری میں فنی و ذہنی استعداد کی بڑی کسوٹی سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے اگر اس سلسلے میں یا اس سے پہلے ہی انھوں نے ملی و وطنی شاعری کو اختیار کر لیا تو ان کی فطری متانت و افتاد طبع کے لحاظ سے تو کوئی عجیب بات نہ تھی۔ لیکن اس پر شدید استقامت ضرور ایک حد تک تعجب انگیز ہے۔

اس وقت ان کی رباعیوں یا غزلوں پر اظہار خیال مقصود نہیں بلکہ صرف وہی منظومات سامنے ہیں جو جذبۂ وطنیت سے تعلق رکھتی ہیں، اور جن کا مجموعہ "کاروان وطن" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔

کلاسیکل اردو شاعری میں وطنیت کا عنصر ہم کو بہت کم یا بالکل نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ عہد میرؔ و سوداؔ میں یا اس سے قبل خال خال کوئی ایسا شعر مل جائے جس کو ہم کھینچ تان کر جذبۂ وطنیت سے منسوب کر سکیں۔ لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ "ملت و وطن" ہمارے کلاسیکل شعراء کا موضوع کبھی نہیں رہا ــــــ غالباً اس لیے کہ اردو غزل گوئی، فارسی غزل گوئی کا چربہ تھی، اور ایرانیوں میں اس وقت غزل نام تھا ایک خاص لب و لہجہ میں ذکر محبوب کا اور محافل مے و مینا کا، جو جذبات محبت کی آسودگی و ناآسودگی دونوں حالتوں میں بڑی محرک ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے امیال و عواطف، ان کے شاعرانہ تعبیرات، ان کے رموز اور سوچنے کے طریقے سب غیر وطنی تھے۔ اپنے ملک، اپنے ملک کی چیزوں سے دلچسپی لینے کا ذوق ان میں پیدا نہ ہوا تھا ــــــ یقیناً یہ بڑی افسوسناک بات تھی۔ لیکن یہ لازمی منطقی نتیجہ تھا مسلم حکومتوں کے ماحول کا جو اپنے زوال کے بعد بھی مسلمانوں کے ذہن و دماغ پر بڑا دیرپا اثر چھوڑ گئیں۔

کلاسیکل شعرا میں سب سے پہلا شاعر جس کو احساس کی اس گمراہی سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے، نظیر اکبر آبادی تھا۔ اس کو بیشک اپنے وطن، اپنے وطن کی چیزوں، اپنے وطن کی روایات سے بڑی محبت تھی، اور جس طرح لہک لہک کر اس نے ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑا وطن پرست شاعر تھا۔

اس کے بعد عرصے تک کوئی شاعر اس ذوق کا نہیں ابھرا، یہاں تک کہ غالب کا دور آگیا، اور اس وقت سب سے پہلے حالی نے وہ قدم اٹھایا جسے اردو شاعری میں وطنیت پرستی کی پہلی بنیاد سمجھنا چاہیے۔

ہر چند اس وقت ملک کے حالات کا اقتضا یہی تھا کہ ذہن انسانی قدرتاً حسن و عشق کی باتوں سے گزر کر کام کی باتوں کی طرف متوجہ ہو۔ کیونکہ بقول غالب عشرت ماضی کا تمام سوز و سرور اور جوش و خروش ختم ہو چکا تھا اور شاہ ظفر کے ساتھ صحبت شب کی آخری شمع بھی گل ہو چکی تھی۔ غیر ملکی حکومت کے شدائد کافی عبرت انگیز حد تک پہنچ چکے تھے اور ان مصائب کا احساس سبھی کو تھا لیکن معاشرہ کی اس دکھتی ہوئی رگ کو حالی کے سوا کوئی نہ پکڑ سکا۔ تاہم، چونکہ حالی کی آواز وقت کی آواز تھی، حال و مستقبل کی آواز تھی، اس لیے وہ بالکل بے اثر نہ رہی اور آخر کار اس دور شاعری کا آغاز ہو گیا جس نے اقبال، اکبر، اسمٰعیل میرٹھی، چکبست اور محروم ایسے شاعر پیدا کیے۔

ہر چند ان سب کا نصب العین ایک ہی تھا، منزل ایک ہی تھی، لیکن راستے مختلف تھے، جن سے ہر ایک کی انفرادیت الگ الگ پہچانی جا سکتی ہے۔ اقبال کی حیثیت ایک بلند بانگ نقیب کی سی تھی۔ اور اکبر کی ایک نشترِ فصّاد کی سی۔ اسمٰعیل نے مطالعۂ حقائق پر زیادہ زور دیا۔ اور چکبست نے رجز خوانی پر۔ لیکن محروم کا رنگ ان سب سے علیحدہ تھا، اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حالی کا اثر سب سے زیادہ محروم ہی نے قبول کیا۔ وہی سادگیِ بیان، وہی پرخلوص لب و لہجہ وہی صداقت جذبات اور وہی سب کچھ جو ایک مخلص دوست کہہ سکتا ہے۔ ان کے یہاں نہ مجاہدانہ جوش و خروش ہے، نہ سرفروشانہ تبلیغ۔ لیکن صداقت اتنی زبردست پائی جاتی ہے کہ اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں۔

ان کے جذبات کا خلوص، اندازِ بیان کی متانت، گویا ایک ٹھہرا ہوا سمندر ہے جو طوفان سے زیادہ گہرائی اپنے اندر رکھتا ہے اور ان کی شاعری محض ماتمِ ملک و ملت نہیں بلکہ مکمل داستان ہے۔ ان کے دردمندانہ احساسات کی اور خود ان کے نفسیات و بطون کی جس کی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔

یہ مجموعہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات و واقعات سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حصہ حصولِ آزادی کے بعد سے لے کر اس وقت تک کے تاثرات سے ــــ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی گزشتہ نصف صدی کی تاریخ بھی ہے، جذباتی تصویر بھی، اور اس میں جس سچائی سے کام لیا گیا ہے

اسے اگر

ورائے شاعری چیزے دگر ہست

کہا جائے تو یقیناً غلط نہ ہوگا۔

آخر میں پھر ایک بار عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ محروم کے بلند جذباتِ وطنیت کا صحیح اعتراف مجھ سے ممکن نہیں۔ تاہم اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اگر میں محروم کو اچھی طرح نہیں جان سکتا تو نہ جانوں باغ تو سارا جانے ہے۔

ضیاء احمد بدایونی

گنجِ معانی

محروم صاحب کا شمار اردو کے کہنہ مشق استادوں میں ہے۔ وہ تقریباً نصف صدی سے اردو کے مشہور رسائل میں لکھتے رہے ہیں۔ چنانچہ راقم الحروف اپنے اسکول میں طالب علمی ہی سے ان کے نام اور کلام سے آشنا ہو گیا تھا خود محروم صاحب بھی اپنے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان کی مشقِ سخن کب سے جاری ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سودا کب سے ہے شاعری کا مجھ کو
مدت اتنی ہوئی کچھ یاد نہیں

گنجِ معانی ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں تقریباً ہر صنف میں دادِ سخن دی گئی ہے۔ جن عنوانات پر انھوں نے اظہارِ خیال کیا ہے ان کی تعداد چودہ ہے۔ اور وہ حمد و معرفت سے لے کر جذباتِ فطرت، مناظرِ قدرت، پند و نصائح، تغزل وغیرہ پر محتوی ہیں۔ ان کی غزلیں بھی جاندار ہیں۔ اور ان کے اندر خیال کی پاکیزگی اور بیان کی صفائی ہے۔ مگر ان کا خاص میدان نظم ہے۔ جس میں انھوں نے بعض نہایت عمدہ اور کامیاب چیزیں پیش کی ہیں۔ چند اخلاقی نظموں کو چھوڑ کر جو قدرے پھیکی اور شاید ابتدائی مشق کی یادگار ہیں۔ ان کے اکثر منظومات میں جذبات کی صداقت اور طرزِ ادا کی لطافت پہلو بہ پہلو ہیں۔ خصوصاً "رامائن کے سین" اور "طوفانِ غم" کی نظمیں، جو محروم نے اپنے رفیقۂ حیات کی دائمی مفارقت سے متاثر ہو کر لکھی ہیں، دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہتیں۔ بعض حصے غم کا ایک ایسا مرقع سامنے کر دیتے ہیں جو دردمند دلوں کو بے چین کر دینے کے لیے کافی ہے۔ "طوفانِ غم" کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی
بچھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی

محروم صاحب اپنے پہلو میں ایک شریف دل رکھتے ہیں جو تعصب سے پاک اور خلوص سے لبریز ہے۔ "یادِ رفتگاں" کے عنوان کے تحت دوسرے مشاہیر کے ساتھ انھوں نے شہنشاہ جہانگیر، ملکۂ نورجہاں، مرزا غالب، نادر کاکوروی، مولانا گرامی کے حضور بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اور ہر ایک کے محاسن گنائے ہیں۔ "اردو کا نوحہ" ان کے دردمند اور پُرخلوص دل کی پکار ہے جس میں وہ کہتے ہیں اور کس حسرت سے کہتے ہیں ؎

دل شاہدِ اردو سے بہلتا تھا ہمارا   شادی و مسرت میں غم و رنج و محن میں
جب ہم کو مقدّر نے دیا دیس نکالا   دم ہم نے لیا آن کے اردو کے وطن میں
ہم آئے تو اردو کی یہ حالت ہوئی جیسے   بَن میں گل پژمردہ ہو یا چاند گہن میں

دوسری جگہ اردو کی زبان سے فرماتے ہیں ؎

پا سکے انگریز پر قابو نہ مسلم لیگ پر
لے رہے ہیں مجھ سے تقسیمِ وطن کا انتقام

درحقیقت آج سے چند سال پہلے دہلی اور یوپی سے اردو کی غیر منصفانہ بے دخلی کا کون تصور کر سکتا تھا۔
تلوک چند محرومؔ صاحب اہل زبان کی طرح اردو پر قدرت رکھتے ہیں۔ جس کے مدنظر ان کا یہ کہنا شاعرانہ انکسار سے زیادہ نہیں ؎

ہے طبیعت تری رسا محرومؔ
تجھ کو اردو مگر نہیں آتی

متروکات و معائب فن پر بھی محروم صاحب کی اچھی نظر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کی توسیع کے مقصد سے انھوں نے "کہیں کہیں" آئے جائے" "یا طفلی بے فکری" جیسے قافیے نظم کیے ہیں۔

آخر میں کچھ فارسی منظومات اور قطعات "قند پارسی" کے عنوان سے درج ہیں۔ البتہ بعض الفاظ و محاورات کا استعمال محلِ نظر ہے۔ مثلاً مسمار بمعنی منہدم۔ ملازمت بمعنی ماموریت۔ ایک جگہ نہایت خوبی و ایجاز سے اپنی سرکاری خدمت کے زمانے کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

لیکن یہاں ادب نمودن کا محاورہ مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ اگر تعظیم کرنے کے معنی میں ہے تو درست ہے اور تہذیب سکھانے کے مفہوم میں ہے تو درست نہیں[1]۔ ہاں ادب کردن یا ادب دادن ضرور فارسی کا محاورہ ہے مگر وہ اصلاح کرنے اور سزا دینے کے معنی میں آتا ہے۔

٭٭٭

---

[1] "ادب نمودن" تعظیم کرنے ہی کے معنی میں آیا ہے۔ فاضل مبصرہ نگار کا پہلا خیال درست ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین ایم اے ڈی لٹ

محروم کی غزل گوئی

اگر کوئی صنفِ شاعری بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی، تنگ داماں بھی ہے اور بے پایاں و وسیع بھی تو وہ صنف غزل ہے۔ کچھ بندھے ٹکے اصول ہیں اور بظاہر چند وہ مخصوص و محدود موضوعات، جن کو ہر شخص بھی قلم بند کرسکتا ہے جس کو عرف عام میں "تک بند" کہا جاتا ہے لیکن فن کاری اور شاعرانہ عظمت کے ساتھ انھیں مخصوص و محدود مضامین پر طبع آزمائی کرنا اور جدت و تازگی سے غزل کو حسین و دل کش بنانا اتنا ہی دشوار مرحلہ ہے جتنا روایات کا سہارا لے کر ایک غزل کہدینا۔ غزل کی تنگ دامانی کا گلہ اپنی تنگ نظری کا پرتو ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں زیادہ تر حسن و عشق کی باتیں ملتی ہیں۔ مگر اس واقعہ سے بھی انکار ناممکن ہے کہ دین و دنیا کی کوئی معقول بات ایسی نہیں جو غزل کے خزانہ میں نہ ہو۔ سیاست، مذہب، فلسفہ، اخلاق، تمدن غرض کہ زندگی کے متعلق جتنے اہم پہلو ہیں سب اس کی وسیع دنیا میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ سوال صرف اندازِ بیان کا ہوتا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے وہ کتنی دل کش ہے، غزل اس کو اپنے دائرہ میں لینا قبول بھی کرتی ہے یا نہیں۔

غزل کا تو ذرا ایک مزاج ہے۔ اختصار، نرمی، اشارہ، کنایہ، معنویت اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اگر غزل گو اس راز سے واقف نہیں تو چاہے کتنے دقیق مسائل، کتنے ہی کارآمد نظریات، وہ کیوں نہ قلم بند کرے، دنیائے غزل سے "دور باش" کی صدا آتی رہے گی۔

ظاہری خدوخال، عروض و ہیئت کے خیال سے ہم اس کے کلام کو غزل کے خانہ میں رکھ لیں گے، لیکن کوئی مخصوص جگہ نہ دی جا سکے گی۔ اس "فن شریف" کو نباہنے کے لیے صاحب دل، اور صاحب زبان اور اہل ہمت کی ضرورت ہے۔ ہمت کا مطالبہ اس لیے ضروری ہے کہ اسے مسجد و مندر سے خانقاہی رشتہ توڑنا ہوگا۔ شیخ و برہمن تسبیح و زنار سے رسمی لگاؤ ترک کر کے دوسروں کی نظر سے نہیں دنیا کو اپنی آنکھ اور اپنے تجربات سے دیکھنا اور سننا پڑے گا اور دل پر جو بے ساختہ گزرتی ہو اسے بغیر مذہب و ملت، رسوم و ہراس کے بے تکلف زبان سے ادا کرنا ہوگا۔ غزل گو کو اپنی دنیا آباد کرنا ہے۔ اپنے جذبات و خیالات سے دل کش و ہمہ گیر بنانا ہے۔ یہ بیان میرا معروضہ نہیں بغزل

کی دنیا اس نظریے سے معمور ہے اور غزل گوئی ابتدائے آفرینش سے اس پر کاربند ہے، جو غزل گو اس اصول کو جتنی انفرادیت عطا کر سکا اتنا ہی وہ کامیاب و قابلِ احترام سمجھا گیا۔ یہ اور اس قسم کی دوسری خصوصیات جو جانِ غزل اور ایمانِ غزل ہیں ان کو مدّنظر رکھ کر جب ہم تلوک چند محروم کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کا کلام مجموعی حیثیت سے قابل قدر نہیں قابل احترام بھی ہے۔ ان کی بیباکی چاہے کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو مگر حسن بیان سے ہر جگہ قابل قبول ہو گئی ہے۔ جا بجا اشارے کنائے کی آمیزش لذت و شعریت سے ہمکنار ہو کر دیر تک لطف لینے کا سامان مہیا کر دیتی ہے۔

محروم صاحب کی غزلوں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ غزل گو کے لحاظ سے وہ دورِ جدید و دورِ حاضر کے سنگم پر کھڑے ہیں۔ کبھی وہ حالیؔ، اکبرؔ، صفیؔ، سائلؔ اور چکبستؔ کی صف میں نظر آتے ہیں اور کبھی جوشؔ، اقبالؔ، فراقؔ جگرؔ کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔

کلام میں فارسی کی دلآویز ترکیبیں، پختگی کلام کے ساتھ ہی ساتھ پند و اخلاق کی باتیں بھی ہیں۔ سادگی و رنگینی کا حسین امتزاج بھی ہے۔ سہل ممتنع کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ اور آج کے خیالات و نظریات، تفکر و آزادیِ خیال، نئے رجحانات کے نمونے بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ منتخب مذاق اور کارآمد خیالات کا مطالعہ نہایت غور و فکر سے کرتے رہتے ہیں اور جس بات کو اپنے طور پر صحیح سمجھتے ہیں اس کو بے تکلف قلم بند کر دیتے ہیں۔ وہ ان شعراء میں نہیں ہیں۔ جو ماضی کی صحت مند روایات سے صرف اس لیے بیزار ہو جائیں کہ وہ عہدِ قدیم کی پیداوار ہیں۔ یا آج کے خیالات اور بدلے ہوئے رجحانات سے باوجود صالح اور مفید ہونے کے اس لیے کنارہ کش ہو جائیں کہ یہ عہد قدیم کے مطابق نہیں یا بزرگوں نے ان کو کہیں قلم بند نہیں کیا۔ محروم کا شعور پابندِ روایتی رسوم و قیود نہیں۔ لیکن جہاں کہیں آج کے شعراء کے کلام میں بے راہ روی ان کو نظر آتی ہے۔ اس پر بزرگانہ انداز میں صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں جیسے ان کا دل کڑھتا ہے اور بے چین ہو کر کہہ اٹھتے ہیں۔

آزاد قید و بند سے ہیں آج اہلِ فن — پابند یعنی کوئی کسی بات میں نہیں
جو جس کے جی میں آئے لکھے اور چھاپ دے — کچھ فرق شعر اور خرافات میں نہیں

اس وسیع النظری نے ان کے کلام کو ہر دل عزیز بنا دیا ہے۔

یوں تو شاعری کے لیے ہی الفاظ اور زبان کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ لیکن زبان کا خیال رکھنا اور صحت الفاظ کا لحاظ رکھنا غزل کے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر غزل گو بازارِ غزل میں صرف اسی جنس کے

بھروسے زندہ رہنا چاہتا ہے تو کامیاب ہونا مشکل ہے۔ وقتی شہرت اور سستی ہر دل عزیزی ممکن ہے اس مال کی قیمت میں مل جائے مگر دیر پا اثر نصیب ہونا مشکل ہے۔ اس کے لیے زبان کے ساتھ ساتھ بلند خیالی کو بھی کلام میں جگہ دینی پڑے گی۔ محروم صاحب کے کلام میں ہر جگہ آپ کو منتخب الفاظ اور حسین انداز بیان ملے گا۔ اور ہر جگہ تو نہیں مگر اکثر فکری عنصر کی آمیزش اور ذاتی تجربات خوب صورتی کے ساتھ اشعار میں جلوہ گر نظر آئیں گے مثال کے طور پر چند اشعار دیکھتے چلیے ؎

ہم کیوں کریں ذلیل جبینِ نیاز کو — شایانِ سجدہ جب نہ کوئی آستاں ملے
پھینکا ہے مجھ کو وادیٔ وہم و گماں میں کیوں — جس میں ترا سراغ نہ اپنی خبر ملے
یوں زندگی سے مل کے جوانی جدا ہوئی — جیسے کسی سے کوئی سرِ رہ گزر ملے

اس میں اے معمارِ ہستی مصلحت تھی کونسی — ایسا قصرِ خوشنما اور ریت کی بنیاد پر

بے مہریٔ بتاں سے خدا یاد آگیا — محرومؔ کس کو یاد کرو گے خدا کے بعد

عقل کو کیوں بتائیں عشق کا راز — غیر کو راز داں نہیں کرتے

ہے ابتدائے شام سے ظلمات کا سفر — ہوتی ہے دیکھیے شبِ غم کی سحر کہاں؟

محروم کی غزلیں تین دور پر منقسم ملیں گی، جس سے ان کے کلام و ذہن کے ادبی و فنی ارتقا کا اندازہ ہوگا۔ آپ بھی غالباً مجھ سے متفق ہوں گے کہ محروم صاحب کو زبان و بیان کا ہمیشہ خیال رہا ہے۔ وہ غزل کے مزاج کو پوری طرح سمجھ کر اس میدان میں آئے تھے۔ اس کی نزاکت و لطافت سے ایسی ذہنی وابستگی تھی جو روز افزوں ترقی کے ساتھ کلام میں جلوہ گر ہوتی رہی۔

ابتدائی کلام میں کسی قدر رنگینی و شوخی زیادہ ہے تو تعجب کی بات نہیں بلکہ اقتضائے فطرت ہے۔ غزل درحقیقت اپنی فطرت کے لحاظ سے جوانی کا ہر قدم پر مطالبہ کرتی ہے۔ جوانی خود غزل بن کر آتی ہے پورا ماحول اپنے ساتھ لاتی ہے۔ شاعر کو مجبور کرتی ہے کہ محسوسات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر اصناف سخن کے لحاظ سے غزل بنادے۔

غرض جوانی و غزل کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ مخدوم نے اس عہد کی شاعری کو اپنے جذبات و تجربات سے اس منزل پر رکھنے کی کوشش کی ہے جو اس کا فطری تقاضا تھا۔ بعد کے کلام میں یہ خصوصیت نسبتاً کم ہوتی گئی ہے۔ غم دنیا و غم جاناں نے متوازن ہو کر کلام میں حسین اعتدال پیدا کر دیا ہے۔ اپنے سوا وہ کچھ دوسروں کا خیال زیادہ کرنے لگے ہیں، اور غزل میں جتنی گنجائش ہو سکتی ہے ان جذبات کو جا بجا خوبی سے سموتے جاتے ہیں۔ آخر میں سب سے بڑا غمناک واقعہ تقسیم ہند کا سامنے آتا ہے۔ وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ سانحہ ایک داغ بن کر ان کی غزلوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن وہ داغ نفسیاتی اعتبار سے تکلیف دہ جتنا بھی رہا ہو مگر میرے خیال سے ان کے کلام کو اور زیادہ روشن کر گیا ہے۔ اشعار میں سوز و گداز ہمیشہ سے زیادہ ہو گیا۔ تجربات وسیع تر ہو گئے۔

مخدوم صاحب عمر کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ حسن و عشق کے رموز، معشوق سے چھیڑ چھاڑ اور اس قسم کے دوسرے عناصر جو ہیجانی کیفیت پیدا کر کے ایک طبقہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں ان کی غزلوں میں کم نظر آئیں کیوں کہ بجائے اس کے صحت مند اور حکیمانہ خیالات زیادہ ہو گئے ہیں۔ لیکن حقیقت اور کارآمد باتوں پر نظر رکھنے والے اس کمی کو کوئی خاص کمی نہ سمجھیں گے بلکہ احساس و شعور کی بڑھتی لہر سے مستفید ہونے کی مسرت حاصل کریں گے۔

غزل

کسی کی یاد کو ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
اسی کو راحتِ جاں اور سکونِ دل سمجھتے ہیں

سہارا ہے کہاں یارب ترے کشتی شکستوں کا
نکل آتی ہے موج آخر جسے ساحل سمجھتے ہیں

یہ ہے دورِ حقائق سحر و افسوں ہو گئے باطل!
مگر کم ہیں جو سحرِ حسن کو باطل سمجھتے ہیں

کہاں ذرہ کہاں خورشید، خوش فہمی ہے یہ اپنی
کہ خود کو جلوہ گاہِ دوست کے قابل سمجھتے ہیں

عدم ہے اک نفس کا فاصلہ ہستی سے، لیکن ہم
وہ غافل ہیں کہ اس کو دور کی منزل سمجھتے ہیں

کبھی مخدوم ہم بھی زندگی پر جان دیتے تھے
مگر اب موت سے اس کو سوا مشکل سمجھتے ہیں

مخدوم

ڈاکٹر محی الدین قادری زور

بہارِ طفلی

حضرت تلوک چند محرومؔ اردو شاعری کے ان استادوں میں سے ہیں جن سے اردو دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ اردو پڑھنے والے بوڑھوں اور بچوں میں سے کون ہے جو ان سے واقف نہیں ــــــ ان کے لائق اور سعادت مند فرزند جگن ناتھ صاحب آزادؔ نے جو خود بھی ایک بہت اچھے اور مقبولِ عام شاعر ہیں مجھ سے خواہش کی ہے کہ حضرت محرومؔ کے زیر نظر مجموعے "بہارِ طفلی" پر دیباچہ لکھوں۔

"بہارِ طفلی" بچوں، طالب علموں اور کم پڑھے لکھے بالغوں کے لیے لکھی ہوئی نظموں کا ایک دلچسپ اور مفید مجموعہ ہے۔ جس میں بچوں کی نفسیات کے عین مطابق اردو کے ایک بزرگ اور قابلِ احترام شاعر نے اپنے خیالات نظم کیے ہیں۔

حضرت محرومؔ کی زندگی کا ایک بڑا اور قابل قدر حصہ محکمۂ تعلیمات میں بسر ہوا ہے۔ انھوں نے تعلیم و تدریس کے ذریعے سے آنے والی نسلوں کو تہذیب و ادب سکھایا اور انھیں ملک کا ممتاز شہری بنانے میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔

بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے یعنی نثر اور نظم لکھنے میں ان کی نفسیات کے ساتھ انصاف کرنا بڑا مشکل ہوجاتا ہے۔ اس میدان کے قائد کی حیثیت سے مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے بعد مردِ مجاہد کی حیثیت سے اردو شاعری میں حضرت محرومؔ کا نام نامی لیا جا سکتا ہے۔ ان کے کلام میں جو بنیادی خصوصیت ملتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے کلام سے صلح و محبت اور پریم و آشتی کے جذبات کا پرچار کرتے ہیں۔ آج کے اس زمانے میں اسی جذبہ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ حضرت محرومؔ اس پیرانہ سالی میں بھی شعر و ادب کے ذریعے آج کی اور آنے والی نسلوں کو پیامِ جانفزا دے رہے ہیں۔ گفتار و کردار کے صحیح معنوں میں وہ غازی اور مجاہد رہے ہیں۔

بقول سر شیخ عبدالقادر مرحوم (مدیر مخزن لاہور) "آپ کے کلام میں الفاظ کی برجستگی، بندش کی چستی اور خیالات کی پاکیزگی ملتی ہے اور جناب محرومؔ ان ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی عمر بھر کی محنت سے یہ ثابت

کیا ہے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔"

"بہار طفلی" چوبیس نظموں اور پانچ ترجمہ کی ہوئی نظموں اور چھ قطعات پر مشتمل ہے۔ آخر میں فرہنگ کے ذریعے سے مشکل لفظوں کے معنی بھی دیے گئے ہیں۔

اس چمنستان سخن کا ہر ورق ایک "دبستان" بنا ہوا ہے۔ ہر نظم ایک سدا بہار گلستاں کا منظر پیش کرتی ہے۔ شاعر ہر نظم کے موضوع کے ساتھ خود کو اس سلیقے سے وابستہ کرتا ہے کہ وہ بھی بچوں کی برادری کا ایک فرد معلوم ہوتا ہے۔ نظم "ہمارا دیش" میں حب الوطنی کے پاکیزہ خیالات کو جس قرینے سے نظم کا پیرہن دیا گیا ہے، اور جن سادہ اور سلیس لفظوں کے تانے بانے سے اسے شگفتہ بنایا گیا ہے، اس کے لیے حضرت مرحوم مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس نظم کے یہ دو بند کتنے صاف اور سلیس ہیں ؂

اونچے اونچے پربت اس کے　　لہراتے ہیں جن پر جنگل
مور پپیہے اور کوئل سے　　جنگل میں ہوتا ہے منگل

کیسا خوب نظارا ہے
بھارت دیش ہمارا ہے

اس کی خاک سے ہو کر پیدا　　ہم نے سدھ بدھ پائی ہے
کیوں نہ کریں گے اس کی سیوا　　اپنی اسی میں بھلائی ہے

اس کے سوا کیا چارہ ہے
بھارت دیش ہمارا ہے

ایک نظم "کتاب" ہے، جس میں شاعر نے کتاب کو رفیق و شفیق بتاتے ہوئے اس کی تمام خوبیاں بیان کی ہیں اور بچوں کو کتابوں سے رغبت کا وہ درس سنایا ہے کہ کیا بڑا اور کیا بچہ ہر فرد اس نظم کی مٹھاس میں گم ہو جاتا ہے۔ نظم شروع سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے۔ بچوں کے لیے یہ نظم موضوع کے اعتبار سے بلند اور بڑی خوب صورت ہے۔ چند شعر سنیے ؂

لڑکو برے بھلے کی جنھیں کچھ تمیز ہے　　کیا چیز انھیں کتاب سے بڑھ کر عزیز ہے

بہتر کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے　　اچھا کوئی شفیق نہیں ہے کتاب سے

روئے زمیں کے سارے مظاہر اسی میں ہیں ‏ ‏ باغِ جہاں کے سارے مناظر اسی میں ہیں

دیکھا ہے سب کتاب میں جو کچھ جہاں میں ہے ‏ ‏ موجود ہے زمین پہ یا آسماں میں ہے

سب کچھ کتاب ہم کو دکھاتی ہے ہو بہو ‏ ‏ ان سب کا حال ہم کو سناتی ہے مو بمو

کھولو اسے کہ اس میں خزانہ ہے علم کا ‏ ‏ اٹھو پڑھو پڑھو کہ زمانہ ہے علم کا

بے علم کی ذرا بھی ضرورت یہاں نہیں
کچھ بھی نہیں جو علم کی دولت یہاں نہیں

بچوں کے ذہن میں محنت کی عظمت اور اس سے حاصل ہونے والے خوش آئند نتائج کا جو خوب صورت مرقع شاعر نے اپنی نظم میں پیش کیا ہے وہ بچوں کے تحت الشعور میں منفی تاثر پیدا نہیں کرتا، بلکہ دھیمے دھیمے تصور کی پرچھائیوں کو ان کے ذہن میں اس طرح جاگزیں کرتا ہے کہ محنت کا یہ جذبہ ایک قابل قبول اور لازمی عنصر بن کر پیش ہوتا ہے جس سے مفر ناممکن ہے۔ اگر بچوں کو ناصحانہ انداز میں محنت کے لیے کہا جائے تو ان پر اس کا منفی اثر مرتب ہوتا ہے۔ لیکن جناب محروم نے اس خوبصورت نظم میں جس دل کش اندازِ فکر سے بچوں کے ذہنوں میں موضوع کی مکمل اہمیت کو مختلف مثالوں سے ثابت کرنے کی خوش گوار کوشش کی ہے، اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ پوری کی پوری نظم اس قابل ہے کہ یہاں لکھی جائے۔ چند ایک شعر درج ذیل کیے جاتے ہیں ؎

تم کو خیالِ محنت گر صبح و شام ہو گا ‏ ‏ کہتے ہیں بخت جس کو اگر غلام ہو گا

جو دل کا مدعا ہے حاصل تمام ہو گا ‏ ‏ محنت سے کام ہو گا محنت سے نام ہو گا

محنت کرو عزیزو محنت سے کام ہو گا

محنت بغیر جینا ممکن نہیں جہاں میں ‏ ‏ محنت سے وہ بنا ہے رہتے ہو جس مکاں میں

محنت کا پھل ہیں پودے جتنے ہیں گلستاں میں ‏ ‏ محنت لگی ہوئی ہے بلبل کے آشیاں میں

محنت کرو عزیزو محنت سے کام ہو گا

محنت سے اے عزیزو غافل کبھی نہ ہونا ‏ ‏ ہشیار و چست رہنا کاہل کبھی نہ ہونا

گر کام سخت بھی ہو بے دل کبھی نہ ہونا ‏ ‏ دیکھو اپاہجوں میں شامل کبھی نہ ہونا

محنت کرو عزیزو محنت سے کام ہو گا

اسی طرح صفائی، تندرستی، جھوٹ اور ادب پر حضرت محروم کی نظمیں بڑی ہی عمدہ، معیاری اور بچوں کے اخلاق و

اطوار کو سنوارنے والی ہیں۔ "محنت" عنوان والی نظم کو درس میں شامل ہونے کے سبب بچوں میں کافی مقبول رہی ہے۔ ویسے ان کی بیشتر نظمیں درسی کتابوں اور بچوں کے رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ جن سے استفادہ کر کے آج کے بچے کل کے اچھے شہری بن رہے ہیں۔

منظوم حکایتوں اور نصیحتوں کے علاوہ انگریزی نظموں کے ترجمے اور قطعے بھی قابل ذکر ہیں۔ حضرت محروم کے اس مجموعے کے ایک ایک مصرعے میں بچوں کے لیے زندگی کا درس ملتا ہے۔ چونکہ خود ان کی زندگی مختلف تجربات سے ہو کر بنی ہے، اور اس عمر میں جب کہ غور و فکر پختہ اور شاعری گہری ہوتی ہے، حضرت محروم کا بچوں کے لیے شاعری کرنا اور زبانِ اردو کے حق میں اسی تن دہی اور جاں فشانی سے مصروف رہنا بجائے خود ایک بہت بڑا احسان ہے۔

بچوں کی ذہنی تربیت میں "بہار طفلی" صحیح معنوں میں نوید بہار ثابت ہوگی۔ امید ہے کہ اہل اردو اس مجموعے کا شایانِ شان خیر مقدم کریں گے۔ یہ کتاب کھلے حروف اور جلی خط میں اچھے کاغذ پر چھاپی گئی ہے، اور یقین ہے کہ بچے اس کو شوق سے پڑھیں گے۔

نہ صرف ہر مدرسے کے کتب خانے میں اس کا موجود رہنا ضروری ہے، بلکہ میری رائے ہے کہ اچھے بچوں کو مدرسوں کی طرف سے جو انعامات دیے جاتے ہیں ان میں بھی اس کتاب کو شامل رکھنا چاہیے۔

میں اردو دنیا کے بچوں کی طرف سے حضرت محروم کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں اور دست بدعا ہوں کہ وہ عرصے تک اسی طرح اپنے کلام سے ہم کو فیضیاب کرتے رہیں۔

غزل

بدل گئی ہے کچھ ایسی ہوا زمانے کی — خوشی کسی کو نہیں فصلِ گُل کے آنے کی
نہ بچ سکا یہ کبھی انقلاب کی زد سے — بشر کے ساتھ رہیں گردشیں زمانے کی
دلِ ستم زدہ پر بجلیاں گراتی ہے — قفس میں یاد جو آتی ہے آشیانے کی
جو نیک نام رہا زندگی اسی کی ہے — وہ کیا جیا جو کسی سے نہ کر سکا نیکی

عدم کو جائیں ہمیں، اُن سے جا ملیں محرومؔ
ہمیں سنا کے گئے ہیں جو پھر نہ آنے کی

محرومؔ

ڈاکٹر محی الدین قادری زور

کاروانِ وطن

منشی تلوک چند محروم کے کلام کے کئی مجموعے اِس وقت تک شائع ہو چکے ہیں، اور ان کا پہلا مجموعہ "گنجِ معانی" تو ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا ہے اور اسی پر ۱۹۳۲ء میں سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے ایسی پچی تلی رائے ظاہر کی تھی کہ اس کے بعد سے اب تک محروم کی شاعری اور شہرت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ وہ اردو کے ان شاعروں میں سے ہیں، جنھیں صحیح معنوں میں فطری شاعر اور سخن گستر کہا جا سکتا ہے۔ ان کی پیدائش اور نشوونما ایک ایسے دور افتادہ علاقہ میں ہوئی تھی جہاں شعر و سخن اور علم و فضل پہنچنے سے گھبراتے تھے، لیکن منشی تلوک چند محروم کے فطری ذوق اور دلی لگن نے ان کی ذہنی تخلیقات کو اتنا سر بلند بنا دیا کہ وہ آج اردو کے اساتذۂ سخن میں شمار پاتے ہیں۔ وہ جوش ملیح آبادی کی طرح نظم نگاری کی بلندی اور طمطراق کو بھی نباہتے ہیں اور جگر مراد آبادی کی طرح غزل کی آسودگی اور استواری کو بھی سنوارتے ہیں۔ ان کے زیر نظر مجموعہ "کاروانِ وطن" کو ان کے فرزند جگن ناتھ آزاد نے مرتب کیا ہے اور یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ "فریادِ جرس" ہے جس میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیانی زمانے کی لکھی ہوئی نظمیں شریک ہیں دوسرا حصہ "منزل" کے نام سے موسوم ہے، اور اس میں ۱۹۴۷ء سے زمانۂ حال تک کی نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کے آغاز میں "حرفے چند" کے عنوان سے نیاز فتح پوری نے ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں محروم کے نام اور کام کے بارے میں عمدہ پیرائے میں خیالات ظاہر کئے گئے ہیں اور اس کے آخر میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "محروم کے بلند جذباتِ وطنیت کا صحیح اعتراف مجھ سے ممکن نہیں تاہم اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اگر میں محروم کو اچھی طرح نہیں جان سکتا تو نہ جانوں،

باغ تو سارا جانے ہے

محروم کے اس قسم کے کلام میں زیادہ تر نظمیں بھگت سنگھ۔ مہاتما گاندھی، سردار پٹیل اور ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی اور جواہر لال سے متعلق ہیں۔ اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وقتی جذبات اور خیالات کی آئینہ دار ہیں۔ مگر موجودہ ہندوستان کی سیاست کی نبّاضی اور حالاتِ حاضرہ کی اداشناسی بھی تو شاعری کا ایک جزو ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے کلام سے اردو شاعری پر لگائے ہوئے اس دیرینہ الزام کی تردید بھی

ہو سکتی ہے جس میں اردو کو ایک غیر ملکی زبان اور ایک اردو شاعر کو ایک اجنبی ملک کا باشندہ اور اس کے خیالات کو ایران و توران اور جیحون و سیحون کا آفریدہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر تلوک چند محروم کی یہ دو چھوٹی نظمیں ملاحظہ ہوں۔

ابوالکلام آزاد پر لکھا ہے ؎

بادِ سموم جس پہ اثر کچھ نہ کر سکی — اس نخلِ پُر بہار کے سائے میں کیوں نہ آئیں
اسلامیانِ ہند کو کہتے ہیں جو غلام — وہ اپنی مملکت میں اک آزاد تو دکھائیں

لالہ لاجپت رائے کو یوں یاد کرتے ہیں ؎

موہوم تھی آزادیٔ ابنائے وطن جب — جب قوم تھی پا بستۂ زنجیرِ غلامی
اے لاجپت اے فخرِ وطن نازشِ ملت — تھی آبروئے قوم تری ذاتِ گرامی

غزل

نہ سوز و ساز کے پیری میں چھیڑ افسانے — سحر ہے، شمع کہاں اب، کہاں ہیں پروانے
بگڑ گئے ہیں وہ نقشے، بدل گیا عالم — اُجڑ گئے ہیں خیالات کے پری خانے
خزاں فسردگی کس کی ہے، کوئی کیا سمجھے — بہار کس کا تبسم ہے، کوئی کیا جانے
خرد پناہ اسیرِ امید و یاس رہے — نجات پا گئے اِن الجھنوں سے دیوانے
بہت عزیز نہ تھے غربت کے سبزہ زاروں سے — جنوں نواز وہ اپنے وطن کے ویرانے
جو دل کی بات زباں تک نہ آئے تو اچھا — کہ اس سے اپنے بھی اکثر ہوئے ہیں بیگانے

دیارِ غیر ہو محروم، یا وطن اپنا
وہی ہے دوست ہمارا جو ہم کو پہچانے

محروم

عبدالقادر سروری

نیرنگِ معانی

حضرت محروم، خدا انھیں تادیر . . . . . . رکھے، ان اساتذہ میں سے ہیں جنھوں نے ایک طویل عرصہ تک اردو شاعری کو فکر اور فن ہر لحاظ سے سینچا، اور اس کی خدمت کی ہے۔ آج سے کوئی تیس برس قبل جب میں اپنی تصنیف جدید اردو شاعری کے لیے مواد اکٹھا کر رہا تھا مجھے پہلے پہل حضرت محروم کے کلام کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع ملا تھا۔ اس وقت بھی وہ اردو کے سر برآوردہ شاعر تسلیم کیے جاتے تھے۔ اس وقت سے لے کر آج تک زمانے نے کئی کروٹیں بدلیں بہت سے انقلابات آئے، زندگی، ادب اور آرٹ کے بارے میں تصورات میں تبدیلی ہوئی اور سخن سنجوں کے انداز فکر نے بہت سی منزلیں طے کیں۔ جناب محروم کی شاعری بھی گرد و پیش کی ان ساری تحریکوں سے گزرتی رہی، لیکن ان کا انداز فکر ان کا اپنا تھا اور وہ مستحکم بنیادوں پر ٹکا ہوا تھا، وہ ان انقلابات سے گزرتے رہے لیکن انداز سخن سنجی نے ماحول کی تحریکوں کے اثر کو اپنے طور پر جذب کیا۔ اصل میں حضرت محروم کی حالت ایک ایسے تناور درخت کی ہے جو آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے گو اس کے اطراف کے اثرات سے بیگانہ نہیں۔

یہ تاثر میں نے "گنج معانی" سے لے کر زیر نظر مجموعہ "نیرنگ معانی" تک ان کے سارے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اخذ کیا ہے۔ اس ربع صدی سے زیادہ عرصے کے دوران میں۔ شاعر کے ادراک اور اس کے اظہار نے فطرۃ رفعت اور بلندی کے بہت سے مدارج طے کیے ہیں اور اس کے سارے خدوخال "نیرنگ معانی" میں نمایاں ہیں۔

"نیرنگ معانی" کا خالق، ادبی تربیت اور شعری تصورات اور روایات کا ایک پس منظر رکھتا ہے، ان قدروں کو وہ جانچتا آیا ہے اور بظاہر اس کے شعری تجربات کے طویل عرصہ میں کسی مرحلے پر بھی ان قدروں نے اسے ناکام نہیں کیا۔ چنانچہ اس کی شاعری کی قیمت اس کے وسیع متنوع شعری تجربوں کے اظہار میں کبھی مانع نہیں ہوئی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان قدروں کو جانچنے کے بعد پیدا ہونے والا مستحکم لگاؤ اور ایقان ہے۔ اس خلوص اور ایقان نے اسے گزشتہ سالہا سال کے عرصہ میں اپنے فن کی خدمت پر ابھارا۔ اس بات کا اچھا اندازہ ہم کو

" نیرنگ معانی" کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔

حضرت محروم کے سے ادبی اور شعری ایقانات رکھنے والا سخن سنج ظاہر ہے کہ ماحول کی ہر تحریک سے از پا افتادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ نئے فنی تجربوں کی طرف ان کی طبیعت آسانی سے مائل نہیں ہو سکتی تھی۔ قدیم اساتذہ اور آزمائے ہوئے معیاروں کے مقابلے میں انھوں نے فنی اعتبار سے اگر کچھ تجاوز کیا ہے تو صرف اس قدر کہ علامہ علی حیدر طباطبائی کی طرح قافیوں کے نئے بیٹھ بٹھاؤں سے اپنی بعض نظموں میں اسٹانزا کی شاعری جیسا ایک نیا اور خوش گوار آہنگ پیدا کر دیا ہے۔ اس کا اندازہ ہم کو "نیرنگ" کی نظموں جیسے "مہاتما ہنس راج" کے مطالعے سے ہو سکے گا۔ لیکن میرے خیال میں شاعر کا یہ تجاوز شعوری طور پر ایک نئے تجربے کو آزمانے کے لیے نہیں کیا گیا بلکہ اس کی فکر نے لمحات کے تقاضوں سے یہ راہ اختیار کی۔ یہ تجاوز اس استاد فن کے کلام میں ایک خوش گوار تنوع ہے۔

لیکن یہی بات ہم فکر کے اعتبار سے نہیں کہہ سکتے۔ "گنج معانی" میں شاعر کی طبیعت کا وہ اہتزاز جسے مولوی عبدالحق نے "گلزارِ شاعری کے رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ" سے تعبیر کیا ہے اور سر شیخ عبدالقادر اسے "لطفِ سخن" سے تعبیر کرتے ہیں۔ "نیرنگ" کی نظموں میں گہرائی اور گیرائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت محروم کی طبیعت کا مخصوص رجحان یعنی معنی یابی اور دروں بینی "گنج" اور "نیرنگ" دونوں میں نمایاں ہے۔ لیکن "نیرنگ" میں ان کا عرفان نظر کئی منزل آگے بڑھ گیا ہے۔ مجموعے کے دوسرے حصے "چراغ راہ" میں اکثر نظمیں ایسی ہیں جو بظاہر واقعات کا مرقع ہیں، لیکن ان میں اصل چیز وہ وسعت قلب و نظر اور وہ بصیرت ہے جو واقعات کی تہ سے ابھرتی ہے۔ "آنحضرتؐ اور یہودی کی میت"، "شہادت حسینؓ"، "حضرت علیؓ"، "خوان نعمت" وغیرہ میں بلا شبہ واقعاتی تاثر بھی موجود ہے، لیکن حقیقت میں ان کا معنوی پہلو اور واقعات کی فلسفیانہ تصریح ان نظموں کا ماحصل ہے۔ مثال کے طور پر "ملت اسلامیہ کا ذوقِ سخن" مسلمانوں کے مذاق فن کاری کی ایک نہایت مخلصانہ بے لوث بلکہ بصیرت افروز تشریح ہے۔ میرے خیال میں اس موضوع پر یہ ایک واحد نظم اور نفیس نظم ہے۔ اس نظم سے شاعر کے ادبی اس رجحان کا پتہ چلتا ہے جو اس کی سرشت میں پنہاں ہے اور جس کی بدولت وہ حسن و خوبی کو جہاں کہیں وہ مل سکے، پسند کر سکتا ——— اور اس کی داد دے سکتا ہے۔

حضرت محروم کی شاعری، اپنی وسیع گوناگوں خصوصیات، اپنی متنوع دلچسپیوں اور ہمدردیوں کی بدولت ہمیشہ ممتاز رہی ہے لیکن اس مجموعے میں یہ ساری خصوصیات اور خاص طور پر ان کی آفاقی ہمدردیاں اگلے مجموعوں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہیں۔ یہ کہنا کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ فکرِ لطیف اور حسنِ بیان کا یہ مجموعہ اردو کے شعری سرمایہ میں ایک مستحسن اضافہ ہے، اس لیے دلی خیر مقدم کا مستحق ہے۔

گوپی ناتھ امن لکھنوی

کاروانِ وطن پر ایک نظر

پروفیسر تلوک چند محروم کی وطنی نظموں کا مجموعہ "کاروانِ وطن" اردو ادب کے لیے باعث فخر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری مغل سلطنت کے زوال کے زمانہ میں سنِ بلوغ کو پہنچی اور اسی لیے اس میں طاؤس و رباب ہی نہیں بلکہ بط مے اور زنانِ بازاری بلکہ امرد پرستی کا بھی ذکر بہت ملتا ہے۔ عیش پرستی جب مقصدِ حیات بن جائے تو زندگی کے ہر شعبہ کا موضوع بھی یہی بن جاتا ہے، اردو شاعری میں یہی ہوا زلف و کمر، شبِ وصل و شبِ فراق، تارے گننا، کروٹیں بدلنا، رات بھر نیند نہ آنا یا شبِ وصل کا اینسٹائن کی تھیوری کے مطابق چند لمحوں میں گذر جانا، مرغِ سحر اور موذنوں کو کوسنا، معشوق کے ہرجائی ہونے کی شکایت، نہ صرف اس کی زلفِ مشکیں پر بلکہ سبزۂ خط پر بھی نثار ہونا، بیشتر اردو شاعری یہی تھی یا پھر پھکڑ بازی جس کے نمونے سودا اور انشا کے یہاں ملتے ہیں اور جس کی مثالیں پیش کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ میر صاحب تک

اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

اور کبھی کبھی غالب جیسا بلند خیال بھی دھول دھپہ کرنے لگتا ہے اور زاہد و واعظ پر پھبتیاں کہنے کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ ان کی مذمت اور شراب کی تعریف اب بھی محفلوں کو گرماتی رہتی ہے۔ اگرچہ یہ تاویلیں بہت ہیں کہ نقلی زاہد و واعظ کو کوسا گیا ہے۔ اور شراب سے مراد مے حقیقت ہے۔ لیکن عام مشاعروں میں جو داد ملتی ہے وہ مجازی پہلو کو ہی پیش نظر رکھ کر ہوتی ہے۔ مولانا حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری اور پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ہماری شاعری میں دونوں پہلو پیش کیے گئے ہیں اور ان پر طویل بحثیں بھی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو کا مزاج فارسی نے بنایا۔ لیکن فارسی کی قرونِ وسطیٰ کی شاعری بھی تو زوالِ مملکت کی ہی حالت میں شروع ہوئی تھی۔ البتہ اردو میں نظیر کا کلام ہمہ رنگ نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی جا بجا ابتذال و فواحش موجود ہیں پھر بھی ان کی شاعری میں مقامی رنگ اور مضامین کا تنوع ہے۔ لیکن ستم یہ ہوا کہ دلی اور لکھنؤ کے مقابلہ میں انھیں ٹکسال سے باہر سمجھا گیا، اور انھیں اپنا مناسب مقام نہ مل سکا۔

غدر کے بعد ہندوستان والوں کی آنکھیں کھلیں اور اردو شاعری کا بھی رنگ بدلنے لگا۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی،

ماسٹر پیارے لال آشوب، مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی اور اکبر الہ آبادی پچھلی صدی میں اس صف میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ محروم صاحب نے جب شعر کہنا شروع کیا تو مولوی محمد اسمٰعیل، خواجہ حالی، مولانا آزاد، مولانا شبلی اور اکبر الہ آبادی سب زندہ تھے۔ داغ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اقبال آسمان شاعری پر ابھر رہے تھے لکھنؤ میں مولانا صفی قدیم وجدید کے درمیان ایک کڑی سمجھے جاتے تھے۔ مگر ان کی بھی شہرت غزل میں زیادہ تھی نظم میں کم۔ اسی طرح علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ المتخلص بہ کیفی بھی اگرچہ اچھے شاعر تھے مگر میدان نثر میں زیادہ مشہور ہوئے۔ محروم صاحب نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ لیکن ان کی سیرت نظموں میں زیادہ ہے۔ انھوں نے خود بھی اپنی غزل گوئی کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ یوں تو ان کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ ضخیم "گنج معانی" اور "کاروانِ وطن" ہیں۔ اس مضمون میں صرف "کاروانِ وطن" پر نظر ڈالنا مقصود ہے۔

محروم صاحب کی پہلی نظم ۱۹۰۶ء میں "زمانہ" میں شائع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی سیاسی زندگی میں اتھل پتھل ہو رہی تھی لارڈ کرزن کی مہربانی سے بنگال تقسیم ہو چکا تھا اور اس کے نتیجے کے طور پر بنگال میں جو سیاسی تحریک شروع ہوئی وہ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل رہی تھی۔ پنڈت برج نرائن چکبست کی شاعری بھی اسی دور میں شہرت پانے لگی اور چکبست کا بیشتر کلام وطن اور محبان وطن کے ذکر پر مملو ہے۔ یوں سمجھیے کہ بیک وقت لکھنؤ میں چکبست اور پنجاب میں محروم صاحب وطن کے گیت گا رہے تھے۔ چکبست ۱۹۲۶ء میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ حضرت محروم کے حصہ میں یہ سعادت آئی کہ جس وطن کی آزادی کے لیے انھوں نے نظمیں لکھی تھیں اسے آزاد دیکھیں۔ یہ آزادی اگرچہ انھیں مہنگی پڑی لیکن ہنگامی حالات کے درست ہونے کے بعد انھوں نے آزاد وطن اور اس کے رہنماؤں کے گیت گانے شروع کیے۔ وہ ان شاعروں میں سے نہیں جن کا نامۂ اعمال خود تو بہت سیاہ ہے اور ان پر حالی کی یہ بات صادق آتی ہے کہ

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

لیکن رہنماؤں کو ان رہنماؤں کو جو اس زمانہ میں دار ورسن سے گزر رہے تھے، جب یہ سرکار انگریزی کے گن گا رہے تھے رہزن کہنے سے نہیں چوکتے، بلکہ اس میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ گویا انھوں نے اپنی خدمتِ وطن کی ہے کہ انھیں ان رہنماؤں کو راہ راست پر لانے کا ہی نہیں بلکہ انھیں گالیاں دینے کا حق بھی پہنچتا ہے جنھیں آزادی کی قدر ہے وہ ایسا لب ولہجہ اختیار نہیں کر سکتے۔

حضرت محروم کا مجموعہ "کاروانِ وطن" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک فریادِ جرس جو ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کی

سیاسی نظموں کا مجموعہ ہے۔ دوسرا آزادیٔ وطن کے بعد سے ۱۹۰۸ء تک کا۔ بہتر ہوتا کہ ہر نظم پر اس کی تاریخ درج ہوتی، اور اسی اعتبار سے نظموں کی تقدیم وتاخیر ہوتی۔ مگر شاید محروم صاحب کو خود ہر نظم کی صحیح تاریخ یاد نہ ہو۔ مثلاً اس مجموعہ میں پہلی نظم "دعا" کے عنوان سے ہے اور اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

اے خداوندِ مہر و مہر دعا ہے تجھ سے
اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کر دے

اس کے متعلق میرے دوست ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ صاحب نے بتایا کہ انھوں نے اپنی اسکولی تعلیم کے دوران پڑھی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں وہ کالج میں داخل ہوگئے تھے۔ لہٰذا یہ نظم کم از کم پچاس سال پہلے کی ہے اور اس وقت بھی سکولوں میں اتنی مقبول ہوگئی تھی کہ بچے مل کر اسے گایا کرتے تھے۔ دوسری نظم

بھارت ماتا کیوں روتی ہے؟

کے عنوان سے ہے۔ اس پر ۱۹۰۶ء درج ہے۔ اور اس کے تیور سے تحریک تقسیم بنگال کا احساس صاف نظر آتا ہے۔ اسی طرح "بھارت ماتا" عنوان کی نظم کا یہ شعر

چالیس کروڑ انسانوں میں پیدا کر جذبۂ خودداری
پھر دیکھ کہ کن اوجوں پر ہے عزت کا نشاں بھارت ماتا

چونکہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں ہندوستان کی آبادی چالیس کروڑ کے قریب تھی۔ لہٰذا یہ نظم ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان لکھی گئی ہے۔ جب تک وہ آزادی نہیں آئی تھی جس کے لیے محروم صاحب نے اس نظم میں لکھا ہے۔

قدموں میں ترے آجائے گی خود دوڑ کے منزلِ آزادی

اس مجموعہ میں پہلی غزل سدیشی تحریک کے متعلق ہے اور وہ ۱۹۰۶ء کی ہے۔ غزل کیا ہے نظم باندازِ غزل ہے۔ محروم صاحب کی تقلید میں ایسی غزلوں کا رواج ۱۹۲۰ء کی تحریک ترک موالات کے بعد بہت عام ہوگیا۔ "جلوۂ امید" عنوان کی نظم میں بھی تاریخ نہیں ہے۔ لیکن اس کے اس شعر سے کہ

اے سریندر و ناتھ اے مسٹر تلک اے گوکھلے
سوئے عز و جاہ قوم بے وقار آنے کو ہے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر گوکھلے جنھوں نے ۱۹۱۵ء میں وفات پائی، اس وقت زندہ تھے اور چونکہ ۱۹۰۸ء میں سزا پانے کے بعد مسٹر تلک لوکمانیہ تلک کہلانے لگے تھے۔ اس لیے اس سے پہلے کی نظم ہے۔ لہٰذا یہ نظم بھی ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء کی

ہی ہوسکتی ہے۔

اسیر وکرو کچھ رہائی کی باتیں

پر جو تضمین ہے اس پر ۱۹۰۸ء درج ہے، اور بنگال کی جدوجہد آزادی کا جذبہ اس نظم سے نمایاں ہے۔

بھارت کی جے ہو

کے عنوان کی نظم جب محروم صاحب نے لکھی تب وہ سرکاری ملازم تھے۔ اسی لیے آزادی کا ذکر اس طرح بچ کر کیا ہے۔

ہوں علم وفن میں استاد یا رب
اور مفلسی سے آزاد یا رب

محروم صاحب کی نظم تلک اور گوکھلے ۱۹۰۸ء کی ہے اور اس میں جس طرح ان دونوں کے شمس وقمر ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک مہاتما گاندھی کی شہرت ان دونوں رہبروں کے مقابلے میں نہیں تھی، کیونکہ گاندھی جی کا میدان عمل اس وقت تک ہندوستان نہیں بلکہ دکھنی افریقہ تھا۔ جنوبی افریقہ والوں کے متعلق ایک نظم

جنوبی افریقہ کے مظلوم ہندوستانی

کے عنوان سے ہے۔ یہ نظم ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان کی ہی ہوسکتی ہے۔ ۱۹۱۴ء میں ہی چکبست نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے متعلق اپنی درد انگیز نظم کہی تھی۔

ہندو مسلمان عنوان کی نظم میں بھی تاریخ نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اس نظم سے ظاہر ہے کہ اس وقت جھگڑے ہو رہے تھے اور ہندوستان محکوم تھا۔ لہٰذا یہ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۳۴ء کی نظم ہوسکتی ہے۔ اسی دور کی نظم آئینہ حال بھی معلوم ہوتی ہے۔ انقلابِ دہر بھی اور وہ نظم بھی جس کا عنوان ہے پھر بھی لڑتے ہیں۔ نویدِ مستقبل بھی بغیر تاریخ کی نظم ہے لیکن اس کے اس شعر سے کہ

منزل گہہ تمنا یوں ہی کشش کیے جا
جو آج سست رو ہیں کل تیز گام ہوں گے

اس شعر کو اگر اس شعر کے ساتھ پڑھیے

گاندھی نے کی ہے روشن وہ آگ جس سے اکثر
بغض وعناد ونفرت جل کر تمام ہوں گے

تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی رہبری گاندھی جی کے ہاتھ میں آچکی تھی اور لبرل لیگ کانگریس کے مقابلے میں بن چکی تھی۔

شاید یہ نظم ۱۹۱۹ء کی ہو۔

ترانۂ نوروز میں اس شعر کے نیچے کہ

بجا تمھاری نیند ہے جب جاگ اٹھے بیمار بھی
جاگو اب اے اہل وطن دیکھو فضا نوروز کی

لکھا ہے کہ بیمار سے مراد ترکی ہے۔ جسے اہل یورپ یورپ کا مردِ بیمار کہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ نظم اس وقت کی ہے جب ترکی میں مصطفےٰ کمال کا عمل دخل ہو چکا تھا۔

رام راج عنوان کی نظم میں اس لفظ کی تشریح کی گئی ہے جو مہاتما گاندھی کے اس مضمون سے ملتی جلتی ہے۔

WHAT IS RAM RAJ

جو ۱۹۲۱ء میں لکھا گیا تھا۔ شاید یہ بھی اسی سال کی نظم ہو۔

لالہ لاجپت رائے کی جلاوطنی یقیناً پہلی جنگ عظیم کے دوران کی نظم ہے۔ سوزِ وطن بھی اسی دور کی نظم ہے۔ تاثیر بے گناہی ۱۹۰۸ء کی نظم ہے۔ اس کا آخری شعر

ہم نہ ہوں گے ہم نہ ہوں گے آہ اے چشم خیال
کچھ نظر آتی ہے تجھ کو گردشِ دوراں کی چال

بفضلہ غلط ثابت ہوا۔ حضرت محرومؔ نے دورِ آزادی دیکھا اگرچہ دکھ بھی اٹھائے مگر آج حکومتِ ہند اور حکومتِ پنجاب قومی ہاتھوں میں ہے اور ان دونوں نے محرومؔ صاحب کا ادبی وقار عملاً تسلیم کیا ہے۔ محروم صاحب کا یہ کہنا صحیح ثابت ہوا کہ

بوم و زاغ و زغن کا دور گیا
سنیے بلبل کا نغمۂ دلجو

لیکن ابھی ان کی یہ آرزو باقی ہے۔

رفع ہو جائیں گے نزاع تمام
اب رہے گی نہ میں میں اور تو تو

ڈائر اور نادر کے قتلِ عام کا مقابلہ کرتے ہوئے محروم صاحب نے۔ بجا تفریق کی ہے کہ نادر نے اپنے نزدیک غیروں کا قتل کیا، اور ڈائر نے اپنی رعایا کا۔ اسی دور کے واقعات کے متعلق مناظرہ۔

شیخ سعدی اور اوڈوائر

بھی بہت دلچسپ ہے یہ دونوں نظمیں ۱۹۱۹ء کے واقعاتِ پنجاب کے متعلق ہیں۔

پنجاب ودہلی کے واقعات پر

نظم بھی اسی دور کی ہے اور تاکجا اور نوجوانوں سے خطاب کی، نظمیں بھی اسی دور کی ہیں۔

"خوش مقابلہ" اس کے بعد یعنی ۱۹۲۰ء میں ترکِ موالات کی تحریک شروع ہونے پر کہی گئی نظم ہے۔ اور "زندانیوں کی عید" ۱۹۲۱ء کی کہی ہوئی ہے جب بیشتر رہبرانِ وطن جیل میں تھے۔ "غم زدوں کی عید" بھی اسی دور کی ہے۔

صفحہ ۲۲۳ پر جو نظم مقامِ پست کے عنوان سے ہے وہ اگرچہ ترتیب میں بعد میں دی گئی ہے۔ مگر ان نظموں سے پہلے کی ہے۔ کیوں کہ اس میں شاستری (مسٹر سرینواس شاستری) کے سرنگوں ہونے کا ذکر ہے۔

"آہ موتی لال" ۱۹۳۱ء کی نظم ہے۔ "مقام عبرت کا موضوع بھی یہی ہے"۔ "گول میز کانفرنس" ۱۹۳۱ء کی اور "کمیونل اوارڈ" ۱۹۳۲ء کی نظم ہے۔

اس کے بعد دوسری جنگ عظیم سبھاش چندر بوس آزاد ہند فوج کے متعلق ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک کی نظمیں ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں عارضی قومی حکومت قائم ہونے کے بعد جو فتنہ و فساد ہوا محروم صاحب نے اس کے متعلق بھی کئی نظمیں لکھی ہیں جن میں ابنائے وطن کو بالعموم اور اہلِ پنجاب کو بالخصوص مخاطب کیا ہے۔

قطعات کے بعد اس کتاب کا دوسرا حصہ منزل کے عنوان سے ہے۔ جس میں حصولِ آزادی کے بعد کی نظمیں ہیں۔ اس حصہ میں پہلی نظم "پاکستان کو الوداع" نہایت پُر درد اور پُر سوز ہے۔ اس میں شاعر کے کمالِ فن کے ساتھ اس کا دل بوتا نظر آتا ہے۔

کانگریس نے کیا ہے کام بڑا

ایک طنزیہ نظم ہے۔ جو گائی جانے کے قابل ہے اور کانگریس کے جلسوں میں شوق سے سنی جائے گی۔

گاندھی جی کی شہادت سے محروم صاحب بھی اور محبانِ وطن کی طرح بہت مغموم ہوئے اور اس پر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد کے واقعات ذہنوں میں تقریباً تازہ ہیں۔ اس لیے اس دور کی کہی ہوئی نظموں کی تاریخوں کے متعلق کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان نظموں میں یہاں ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کے جشنوں پر نشاطیہ اشعار ملتے ہیں وہیں سر سپرو مسٹر رفیع احمد قدوائی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ماتم پر بھی نظمیں ہیں۔

پروفیسر تلوک چند محروم سے پہلے بھی قومی نظموں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایسا مجموعہ نہیں جس میں نصف صدی کے واقعات پر سیاسی نظمیں ملتی ہوں۔ مثلاً چکبست کے "صبح وطن" کی نظمیں اس صدی کے

شروع سے اس وقت تک کی ہیں جب ۱۹۲۰ء میں کانگریس کی رہنمائی بلکہ ملک کی آزادی کی تحریک کی رہبری مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں آئی۔ بس یوں سمجھیے کہ تقسیم بنگال سے لے کر ستیا گرہ تحریک کی ابتدا تک ۱۵ سال کے واقعات پر یہ نظمیں لکھی گئی ہیں۔ کاروان و منزل کی نظمیں ۱۹۳۰ء کی تحریک سے لے کر ہندوستان کے نئے آئین کی تشکیل تک یعنی بیس سال کے واقعات کے متعلق ہیں۔ منشی لال چند فلک بھی اس صدی کے پہلے ربع کے بعد خاموش ہو گئے اور اب نہ وہ رسالوں میں نظر آتے ہیں، نہ مشاعروں میں۔ محمود اسرائیلی صاحب کی نظمیں بیش تر تحریک خلافت سے لے کر نمک ستیا گرہ تک کے زمانے کی ہیں۔ جو کوئی گیارہ بارہ سال کا وقفہ ہوتا ہے۔ اقبال کی نظموں کو میں خالص قومی یا وطنی نہیں سمجھتا۔ آج دورِ آزادی میں جو شعرا سورما بنے ہوئے حکومت کو کوستے پھرتے ہیں ان میں سے بیش تر انگریزی دور میں بھیگی بلی بنے ہوئے تھے۔ محروم صاحب کے جذبات اس وقت بھی آزادیِ وطن کے حق میں تھے۔ لیکن ملازمت کی مجبوریوں کی وجہ سے جن کا ذکر انھوں نے اس انداز میں کیا ہے کہ

بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

انھوں نے بہت سی نظمیں گمنام کہیں۔

جس طرح محروم صاحب کی زندگی میں تصنع اور چنیں چناں نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے کلام میں بھی صفائی اور برجستگی ہے ان کے یہاں داخلی اور خارجی دونوں قسم کی نظمیں ملتی ہیں اور علامہ کیفی کی اصطلاح میں داخلی خارجیت اور خارجی داخلیت رکھنے والی بھی۔

اردو ادب آج کل اشتراکیوں کے ہاتھ میں جا رہا ہے اور جو گھٹیا درجہ کا ادب ہے۔ اس پر فرقہ پرستوں کا قبضہ ایسی صورت میں قومی اور وطنی نظموں کی وہ قدر نہیں جو ہونی چاہیے۔ لیکن جب قوم میں صحیح وطنی جذبہ پیدا ہوگا اور جب وہ نسل آئے گی جو اپنے ہندوستانی ہونے پر ناز کرے گی تو مشاعروں کا رنگ بھی بدلے گا اور نظموں کا بھی۔ اسی وقت اردو کو اس کا صحیح مقام حاصل ہوگا، اور اسی زمانے میں اس مجموعے کی وہ قدر ہوگی جس کا وہ مستحق ہے۔ چونکہ میں اپنے وطن کے مستقبل کے بارے میں پُر امید ہوں۔ لہٰذا میں یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ دور ضرور آئے گا اور اس دور میں نہ صرف ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس مجموعے کے یا اس کی نظموں کے ترجمے ہوں گے بلکہ غیر ملکی زبانوں میں بھی۔ خدا کرے کہ حضرت محروم وہ دن دیکھنے کے لیے زندہ رہیں اور اس صدی کے آخر میں انھیں "کاروانِ وطن" کے مختلف زبانوں کے ترجمے نذر کیے جائیں۔

میں تو اپنے لیے باعثِ فخر و سعادت سمجھتا ہوں، کہ مجھے ایسے نیک بزرگ اور بلند پایہ شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر سلامت اللہ

بچّوں کی دنیا

بچّوں اور لڑکوں کے لیے محروم کا نیا مجموعۂ کلام

ہمارے دیس میں تعلیم کے میدان میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ تعلیم کی مختلف منزلوں کے لیے موزوں لٹریچر اور درسی کتابوں کی بڑی کمی ہے۔ یہ کمی ابتدائی تعلیم کی منزل پر شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ انگریزی زبان میں تقریباً سبھی مضامین پر اچھی کتابیں ہمارے ہاں مل جاتی ہیں۔ مگر وہ ہمارے طلبار کے کچھ زیادہ کام کی نہیں ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی منزل پر تو شاید ہمارے کالجوں کے طالب علم انگریزی کتابوں سے کچھ تھوڑا بہت فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے طلبار کے لیے انگریزی کتابیں بالکل بے کار ہیں۔ مادری زبان کے سوا دوسرے مضامین میں اس کمی کو کسی حد تک پورا کیا جا سکتا ہے اور اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انگریزی اور دوسری زبانوں کی اچھی کتابیں ترجمے اور تالیف کے ذریعے ہندوستان کی زبانوں میں منتقل ہو جائیں۔ مگر مادری زبان کی تعلیم کے لیے یہ طریقہ بوجوہ نہیں اپنایا جا سکتا۔ چنانچہ ملک کی ہر ایک زبان کی تعلیم کے لیے خود اپنا اپنا لٹریچر تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اردو میں بھی اس مسئلے پر کچھ عرصے سے قدرے توجہ دی جانے لگی ہے۔

یوں تو اردو کے تقریباً سبھی چوٹی کے ادیبوں کی کوئی نہ کوئی تخلیق ہمارے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے نصاب میں داخل ہے۔ مگر ایسی بہت کم چیزیں ہیں جن پر صحیح معنوں میں بچّوں کے لٹریچر کا اطلاق ہو سکے۔ نظیر اکبرآبادی حالی اور اقبال کا شمار اردو کے ممتاز ترین شعرار میں ہوتا ہے۔ ان کی چند نظمیں واقعی ایسی ہیں جو مدرسۂ ابتدائی اور مدرسۂ ثانوی کے طلبار کے ذہنی معیار اور دلچسپی کے مطابق ہیں یا نثر میں ڈاکٹر نذیر احمد اور سر سید احمد خاں کی بعض نگارشات یقیناً بچّوں اور نوجوانوں کے لٹریچر میں ایک اعلیٰ مقام کی مستحق ہیں۔ لیکن اس قسم کا لٹریچر بہت محدود اور ناکافی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بچّوں کے ادب کے معاملے میں ابھی اردو کا دامن بہت تنگ ہے۔

اس صورت حال کا جائزہ لیجیے، تو کئی ایک چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے ہاں بہت عرصے تک اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ بچوں اور نوجوانوں کے لیے کسی مخصوص قسم کے لٹریچر کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھا جاتا رہا کہ وہ ادب جو ماضی سے ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کے لیے بھی موزوں ہے اور اسے جستہ جستہ مناسب طریقوں سے ان کے ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔ گویا اس خیال کے بموجب تعلیم میں موضوع یا موادِ تعلیم کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ طریقۂ تعلیم کی، اور اگر مناسب طریقۂ تعلیم ڈھونڈ نکالا جائے، تو ہمارا تمام ادبی سرمایہ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے نصاب میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں سیکھنے اور علم حاصل کرنے کے ایک بنیادی اصول کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ جو چیز سکھائی جائے وہ سیکھنے والے کی ذہنی پختگی کے مطابق ہونی چاہیے۔ علمِ نفسیات کی رو سے دیکھیے تو ذہنی نشوونما ایک تدریجی عمل ہے۔ بچپن سے بلوغت تک ذہن برابر ترقی کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض وہ باتیں جو بچے کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں۔ انھیں بالغ آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ جو لوگ اس کلیے کو جانتے ہیں، ان میں بھی بعض اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر آسان زبان میں کوئی چیز بیان کر دی جائے تو اسے بچے ضرور سمجھ لیں گے۔ مگر یہ بات پورے طور پر صحیح نہیں ہے۔ کسی خاص عمر کے بچے کسی چیز کو ٹھیک طرح سمجھ سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کا انحصار صرف زبان کے آسان یا مشکل ہونے پر نہیں بلکہ اس بات پر بھی ہے، کہ وہ چیز معنوی لحاظ سے ان بچوں کے لیے قابلِ فہم ہے یا ان کی فہم سے بالاتر۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ہاں کوئی ایسی تحقیق نہیں ہوئی ہے جس کی روشنی میں یقینی طور پر کہا جا سکے کہ کس عمر کے بچوں کے لیے کون سے الفاظ قابلِ فہم ہوتے ہیں۔ بعض مغربی زبانوں میں تحقیق کی بنیاد پر ایسی فہرستیں مرتب کی گئی ہیں، جن سے بچوں کے لیے لکھنے والے استفادہ کر سکتے ہیں کہ کسی خاص عمر کے بچوں کے ادب میں کون سے الفاظ استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ اس طرح بچوں کی درسی کتابوں کا جو سلسلہ تیار کیا جاتا ہے وہ بچوں کے لیے موزوں اور مفید ثابت ہوتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ اردو کے نامور ادیبوں میں سے ایسے بہت کم ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کے اظہار کے لیے بچوں کے ادب کو قابل اعتنا سمجھا ہو۔ اکثر ادیب بچوں کے لیے لکھنا اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتے۔ بعض کا خیال ہے کہ بچوں کی شاعری محض تک بندی ہے۔ شاعری کے اعلیٰ محاسن سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ چناں چہ جسے تھوڑی بہت بھی ردیف و قافیہ کی شُد بُد ہو، وہ بزعمِ خود "بچوں کا شاعر" ہونے کا اعلان کر سکتا ہے، دراصل بچوں کی شاعری کے ساتھ یہ بڑی ناانصافی ہے۔ بچوں کی شاعری بھی بڑوں کی شاعری کی طرح شعری خوبیوں سے آراستہ ہونی چاہیے۔

اس میں بھی آمد کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے بھی تشبیہہ واستعارہ اور دوسری صنائع سخن کی چاشنی درکار ہے۔ وہ بھی شاعر کی قوت متخیّلہ کی محتاج ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ بچوں کی شاعری اُس پائے کی ہونی چاہیے کہ اس کا صحیح ادراک بچوں کو ہو سکے، اور اسے سراہنے کے لیے جس قسم کی صلاحیت کی ضرورت ہے وہ بچوں میں نشوونما پا چکی ہو۔

اگرچہ اردو میں بچوں کے لٹریچر کی تیاری سے متعلق اب تک کوئی منظم اور موثر قدم نہیں اٹھایا گیا ہے، پھر بھی ہمارے بعض ادیبوں نے اپنی سوجھ بوجھ اور تجربے کی بنا پر بالخصوص بچوں کے لیے نظم اور نثر دونوں میں کچھ اچھی چیزیں لکھی ہیں۔ اس میدان میں جو شعوری کوششیں ہوئی ہیں ان میں مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ترتیب دی ہوئی درسی کتابوں کا سلسلہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ایک بڑی مدت تک اردو کے نصاب تعلیم میں ہندوستان کے بعض علاقوں میں ان ہی کا بول بالا رہا ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کے علاوہ جن حضرات نے بچوں کے ادب میں شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں ہمارے بزرگ شاعر تلوک چند محروم بھی ہیں۔ ان کی نظمیں بچوں کی درسی اور امدادی کتابوں میں ایک مدت سے شامل کی جاتی رہی ہیں۔ ابھی حال (۱۹۶۰ء) میں محروم کی ایسی ہی کچھ نظموں کا مجموعہ "بہار طفلی" کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوا ہے۔ اب ان کی بچوں کی نظموں کا دوسرا مجموعہ چھاپا جا رہا ہے۔ جس کے دیباچے کے طور پر یہ سطور پیش کی جا رہی ہیں۔

محروم کا شمار اردو کے ان چند مشہور شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے معلمی کو بطور پیشہ اپنایا، اور اس کی آبرو کو اپنی پُرخلوص محنت اور تخلیقی صلاحیت سے بڑھایا۔ معلم کی حیثیت سے محروم کو بچوں کی نفسیات اور ضروریات کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ انھوں نے جو نظمیں بچوں کے لیے لکھی ہیں ان میں محروم کے اس تجربے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کی نظموں کو پڑھیے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے سامنے بچوں کی ایک جماعت ہے اور اس سے وہ مخاطب ہیں۔

محروم کی نظموں میں بچوں کی اخلاقی تربیت کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ یوں تو نئی تعلیم میں براہِ راست پند ونصائح کو کچھ زیادہ موثر نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو چیزیں بار بار دوہرائی جاتی ہیں ان کا دل ودماغ پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔ محروم کی نظموں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زبان ستھری اور سلیس ہے۔ انداز بیان سیدھا سادہ ہے۔ مصرعوں میں روانی ہے موضوع صاف ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ ان نظموں کو بچے ترنم کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی لَے اور دھن آسان ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ بھی دی ہوئی ہے جس میں تمام نظموں کے مشکل الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے۔ بچے اس کی مدد سے خود نظم سمجھ سکتے ہیں۔ انھیں کسی شخص کی مدد کی ضرورت نہیں۔

اس مجموعے میں چند نظمیں مظاہر فطرت سے متعلق ہیں، جن سے شاعر کے مشاہدے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے کیسی گہری نظر سے ان چیزوں کو دیکھا ہے، اور ان سے کیا اثر قبول کیا ہے۔ ان نظموں میں جو تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے گئے ہیں۔ ان سے بچوں کی قوتِ متخیلہ فروغ پائے گی۔

غرض محروم کی یہ نظمیں بچوں کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ امید ہے کہ اس لحاظ سے یہ نظموں کا مجموعہ اردو کی دنیا میں۔ بجا طور پر قدر و تحسین کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

رُباعیات

انساں ہے تمیزِ نیک و بد سے انساں　　حاصل کتنا کمال انساں نے کیا

ورنہ بد تر ہے دام و دد سے انساں　　افلاک کو پائمال انساں نے کیا

عقلِ محدود کا تقاضا ہے یہی　　یہ عقل مگر ابھی نہیں آئی کہ کیوں؟

گزرے ہرگز نہ اپنی حد سے انساں　　انساں کو تباہ حال انساں نے کیا

کالا انساں ہو یا کوئی زرد انساں　　فریاد ہے کس لیے درِ یزداں پر

رنگت میں یا ہو چاند کی گرد انساں　　الزام ترا شئے ہو کیوں شیطاں پر

خارج انسانیت سے اس کو سمجھو　　یزداں نے کیے کبھی، نہ شیطاں نے کیے

انساں کا اگر نہیں ہے ہمدرد انساں　　انساں نے کیے ہیں جو ستم انساں پر

محروم

جمنی سرشار

استادِ محترم جناب محروم

استادِ محترم امیرالشعراء پروفیسر تلوک چند صاحب محرومؔ کی ذات بابرکات سے راقم کی دلی عقیدت کا آغاز ۱۹۲۱ء میں ہوا جب کہ اس کی عمر صرف ۱۵ برس کی اور تعلیم نہایت معمولی تھی۔

۱۹۱۶ء کا آغاز تھا۔ شام کے وقت ایک دوست سے ملاقات ہوئی جو قصبہ خیر پور سادات ضلع مظفر گڑھ (میری جنم بھومی) کے پرائمری سکول میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ فٹ بال کھیلنے کے لیے قصبہ کے باہر میدان میں لے گیا۔ مجھے اس کھیل میں ایسا مزا آیا کہ اگلے روز کھیل ہی کی خاطر میں اسکول میں داخل ہو گیا۔ میرے والد ان پڑھ تھے۔ اور اردو زبان سے بے حد نفرت کرتے تھے۔ وہ مجھے اسکول میں داخل کرانے کو تیار نہ ہوئے۔ میں چوری چوری اسکول جاتا اور ہیڈ ماسٹر کی مہربانی سے بغیر نام درج ہوئے پڑھتا رہا۔ چودھویں روز پہلے درجہ کی پڑھائی ختم کر کے دوسرے درجے میں داخلہ لے لیا، اور ایک ہی مہینے کے بعد باقاعدہ امتحان دے کر تیسرے درجے میں آ گیا۔ لیکن پانچویں جماعت میں دو ہی مہینے رہا تھا کہ نئے ہیڈ ماسٹر سے ان بن ہو گئی اور اسکول چھوڑ دیا۔ میری باضابطہ تعلیم کا طول و عرض بس اتنا ہی ہے اس کے بعد جو کچھ حاصل کیا مطالعۂ کتب ہی سے حاصل کیا۔ کتابیں پڑھنے کا مجھے شوق ہی نہیں جنون ہے۔ جو آغازِ تعلیم سے پیدا ہو کر عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ آج بھی قریب قریب وہی حالت ہے گو اب سن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار میں قدرتی طور سے فرق آتا جا رہا ہے۔

۱۵ برس کی کچی عمر، ادھوری تعلیم اور جناب محروم جیسے آفتاب علم و کمال و ادب سے وابستگی اور والہانہ عقیدت اب جو اس پر غور کرتا ہوں تو نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس معاملہ میں قدرت کا غائبانہ ہاتھ کام کر رہا ہو یا ہندو فلسفے کے مطابق پچھلے جنم کے سنسکاروں کا اثر ہو۔

محروم صاحب کے کلام سے دل بستگی اور ان کی ذات سے عقیدت کا یہ جذبہ کامل پانچ سال تک میرے دل و دماغ میں پرورش پاتا رہا۔ آخر اس کی شدت یہاں تک بڑھی کہ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنے شاگردوں کے زمرے میں شامل کر لیں۔ جس وقت میں نے وہ لفافہ جس میں یہ درخواست ملفوف تھی ڈاک میں ڈالا

اس وقت میرے دل کی جو کیفیت تھی، امید و بیم کا جو طوفان برپا تھا اس کا اظہار الفاظ میں قطعی ناممکن ہے۔ اتنی مدت گزر جانے کے بعد آج بھی جب دماغ میں اس کا تصور آتا ہے تو ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ تقریباً دو ماہ کے اذیت دہ انتظار کے بعد ان کا ۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کا لکھا ہوا یہ مختصر سا جواب مجھے ملا۔

کلور کوٹ ضلع میانوالی

مکرم بندہ۔ تسلیم!

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ نظمیں میں نے پڑھی ہیں۔ میرے خیال میں تو آپ کو اصلاح کی چنداں ضرورت نہیں۔ بندش چست اور زبان درست ہے۔ آج کل بہت مصروف ہوں۔ فرصت میں ان پر تنقیدی نظر ڈالوں گا۔ اور اگر کوئی خامی نظر آئی تو اس سے آپ کو آگاہ کر دوں گا۔"

نیاز مند محروم

چند ہی روز کے بعد اصلاح شدہ نظموں کے ساتھ ان کا دوسرا خط آیا۔ انھوں نے لکھا تھا۔

مکرم بندہ۔ تسلیم!

کارڈ آپ کا مل چکا ہے، آپ کو اصلاح کی چنداں ضرورت تو نہیں۔ لیکن مشورہ دینے میں مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ اقبال۔ سرور و چکبست کے کلام کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔ زبان کے لیے داغ اور امیر کے دیوان کو بھی دیکھ لیں۔ مذاق آپ کا نہایت ستھرا ہے۔ معمولی سی خامی کہیں کہیں نظر آتی ہے سو مطالعہ اور مشقِ سخن سے وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ شاعری کے اصلی اجزا ہیں جذبات۔ یہ بے قرار ہیں تو مضامین پُر تاثیر پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

نیاز مند محروم

غرض اسی طرح قبلہ محروم صاحب سے میرے سلسلۂ نیاز مندی کی ابتدا ہوئی جو خدا کے فضل و کرم سے آج تک جاری ہے۔ مگر یہ سب کچھ خط و کتابت کے ذریعہ ہی ہو رہا تھا۔ انتہائی شوق، دلی تمنا اور کوشش کے باوجود مجھے ان کی زیارت اور قدم بوسی کا شرف اب تک حاصل نہ ہوا تھا۔ کئی دفعہ کلور کوٹ جانے کا پروگرام بنایا، مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ دو سال تک برابر ملتوی ہوتا رہا۔ میرے کاروباری اور گھریلو حالات ایسے تھے کہ نہایت آسانی سے ان کے در دولت پر حاضر ہو سکتا تھا۔ ان کی زیارت کی تمنا بھی دل میں کچھ کم نہ تھی۔ لیکن کہتے ہیں ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ محض خواہش اور کوشش سے انسان کی ہر تمنا پوری نہیں ہوتی۔ بعض اوقات سیدھے سادے معاملات میں بھی کچھ ایسے پیچ پڑ جاتے ہیں کہ آدمی کو لامحالہ قدرت اور تقدیر کی قوتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۲۸ء میں مجھے ایک بزرگ کی وساطت سے ملتان میں ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ ملتان کے مشہور کانگرسی لیڈر اور آتش بیان مقرر پنڈت شودت رنگا نے ملتان سے ایک ہفت روزہ اخبار "ویر کیسری" جاری کر رکھا تھا منشی ہری لعل وکیل، لالہ بودھ راج وکیل، لالہ کیول کرشن وکیل اور ڈاکٹر پرشوتم لال جیسے عالی قدر اور ذی وقار اصحاب اس کام میں ان کے ہمدرد و معاون تھے۔ مجھے اس کا جوائنٹ اڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اس وقت تک بطور شاعر میری اچھی خاصی شہرت ہو گئی تھی۔ پرکاش، پرتاپ، ملاپ، بندے ماترم، ہندوستان اور دوسرے موقر اخبارات اور ماہانہ ادبی رسائل میں اکثر میری نظمیں چھپتی رہتی تھیں۔ بہت سے باذوق اصحاب ملک کے ہر گوشے میں میرے نام سے آشنا ہو چکے تھے۔ ملتان کے کتنے ہی علم دوست احباب بیتابی سے میرے وہاں پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی مہربانی سے وہاں جا کر رہتے ہوئے مجھے ایک دن بھی بے گانگی کا احساس نہ ہوا۔ سب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور میں بہت جلد ان کی سوسائٹی میں خوب گھل مل گیا۔

محروم صاحب کو بھی میرے ملتان آنے سے بہت خوشی ہوئی۔ ان کا بجا طور سے یہ خیال تھا کہ اس سے مجھے اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے بہترین موقع حاصل ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے مجھے ۱۶ر نومبر ۱۹۲۸ء کو خط لکھا جو اس طرح تھا۔

عزیز سرشار

چند روز ہوئے ایک کارڈ آپ کے پرانے پتے پر بھیجا گیا تھا، غالباً وہ آپ کو نہیں ملا۔ آپ کے ملتان آجانے سے خصوصاً اڈیٹر ہو کر آنے سے بہت خوشی ہوئی۔ یہاں آپ کو اپنے ادبی جوہر دکھانے کا خوب موقع ملے گا۔

اگر موقع مل جائے تو یہاں ضرور تشریف لائیے۔ میں بھی ضرور کسی روز ملتان آؤں گا اور آپ کو اطلاع دوں گا

نیاز مند محروم

۲۱ر دسمبر کو ان کا ایک اور خط آیا۔

ڈیئر مسٹر سرشار۔ اخبار ہر ہفتے پہنچتا رہتا ہے۔ اس کے کئی پرچے آپ سے پہلے بھی میری نظر سے گزرے تھے یقیناً آپ نے اسے خوب ترقی دی ہے۔ ہنگامی نظم ہر ہفتے خوب ہوتی ہے۔ میں اسے خوب شوق سے پڑھتا ہوں۔ دو چار روز ہوئے صبح سیر میں مجھے ایک زمین سوجھی، لیکن مختلف مشاغل کے باعث نظم نہ ہو سکی۔ آپ اس پر شعر لگا کر اپنے نام سے شائع کر دیں۔ میرا نام دینے یا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ۔

اٹھالو اپنا یہ دربار سائمن گو بیک — گواہیوں سے ہے انکار سائمن گو بیک
کئی جہاز ہیں تیار سائمن گو بیک — ہیں منتظر ترے کلکتہ، بمبئی دونوں
بصد خروش و بہ تکرار سائمن گو بیک — جہاں جہاں یہ کمیشن گیا، کہا سب نے

ایک نہایت اچھا شعر تھا، لیکن وہ خیال سے اتر گیا ہے۔ آپ اس کمی کو پورا کردیں گے۔

نوحہ لالہ لاجپت رائے ارسال خدمت ہے۔ نہایت جلدی سے لاہور ہی میں لکھا تھا، اس کا انتخاب اخبار میں شائع کردیں تو ناموزوں نہ ہوگا۔

محروم

ملتان میں ایک بزرگ تھے لالہ بال کشن صاحب بترہ ایڈووکیٹ۔ مروت و اخلاص کی زندہ تصویر۔ مرنجان مرنج طبیعت کے، نہایت خوش خلق، سیر چشم، دریادل، شگفتہ مزاج، خوبرو اور نیک سیرت انسان، زندگی میں جس آدمی سے واسطہ پڑا ہمیشہ کے لیے اس کے دل میں اپنا گھر بنا لیا۔ ملتان میں آئے ابھی مجھے دو چار ہی روز ہوئے تھے کہ ایک دن شام کو دفتر میں آئے اور نہایت محبت سے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ بس اسی روز سے ان کا گھر ہی میرا گھر ہوگیا۔ ہزار جتن کرنے پر بھی انھوں نے مجھے کسی دوسری جگہ رہنے کی اجازت نہ دی۔ اور میں ان کے چھوٹے بھائی کی طرح ان کے گھر میں رہنے لگا۔ نہایت نیک خو اور پاکیزہ خصلت انسان تھے۔ ادب نواز، ادیب پرور، سخن سنج، نکتہ داں، اہل کمال کے دلدادہ و شیدا۔ ہر روز شام کو بیٹھک میں دوستوں کی محفل جمتی۔ احباب کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ رکھتے۔ طرح طرح کی مٹھائیاں، پھل، میوے، پرتکلف دعوتیں اور ان سب سے بڑھ کر صاحب خانہ کا خلوص و اخلاق۔ ہندوستان بھر میں شاید ہی کوئی ایسا نامور شاعر اور ادیب ہوگا جس نے بترہ صاحب کی میزبانی اور دعوتوں کا لطف نہ اٹھایا ہو۔ اہل کمال کی خدمت سے انھیں دلی مسرت اور روحانی حظ حاصل ہوتا تھا۔

ایک روز محفل جمی ہوئی تھی، بہت سے دوست و احباب جمع تھے۔ حضرت ناطق جالندھری اور فقیر اللہ بخش کشفی جو اپنی پرکشش شاعری اور دل فریب انداز ترنم کے باعث بلبل ملتان مشہور تھے تشریف لائے۔ تجویز ہوئی کہ آئندہ ماہ جنوری میں وسیع پیمانہ پر ایک مشاعرہ کا انتظام کیا جائے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری اور پنڈت ہری چند اختر کو لانے کی ذمہ داری ناطق صاحب نے لی۔ دیوان آنند شرر اور دو ایک دیگر شعرا کو شریک مشاعرہ ہونے کا بار ابترہ صاحب نے اٹھایا۔ محروم صاحب کو شرکت مشاعرہ پر آمادہ کرنے کا کام مجھے سونپا گیا۔ مشاعرہ کی تاریخ ۲۶ جنوری ۲۹ء طے ہوئی۔ ۲۶ جنوری جسے آگے جاکر آزاد ہندوستان کی تاریخ میں نہایت بلند اور مستقل مقام حاصل ہونا تھا، میری زندگی کا بھی ایک قابل یادگار دن بن گیا میں نے ڈرتے ڈرتے یہ سب کچھ محروم صاحب کی خدمت میں تحریر کردیا۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ اگر آپ کسی وجہ سے مشاعرہ میں

شریک نہ ہو سکے تو احباب میں میری بہت سبکی اور بدنامی ہوگی۔ اس وقت تک مجھے محروم صاحب کی ذرہ نوازی، بندہ پروری اور دریا دلی کا کچھ بھی ذاتی تجربہ نہ تھا۔ اس لیے ان کی آمد کے متعلق کوئی اندازہ لگانا آسان نہ تھا۔ میری خوشی اور حیرت کا ٹھکانا نہ رہا جب مجھے محروم صاحب کا ۱۷، جنوری کا لکھا ہوا مندرجہ ذیل نوازش نامہ موصول ہوا۔

کلور کوٹ ۱۷، جنوری ۱۹۲۹ء

ڈیئر مسٹر سرشار۔ مشاعرے کا دعوت نامہ ملا۔ مجھے اسی ماہ میں ضروری طور پر صاحب انسپکٹر مدارس راولپنڈی سے ملنا تھا۔ نیز ایک دوست شادی پر بنوں جانے کے لیے مجبور کر رہے تھے، یہ دونوں باتیں ملتوی سہی۔ ۲۵ تاریخ کو ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ جناب ناطق کی خدمت میں بھی عرض کر دیا ہے۔ اگر جناب حفیظ اور اختر نہ آئے تو مجھے بے حد مایوسی ہوگی۔ ویسے آپ کے پاس ملتان آنے کا ارادہ مارچ میں تھا ابر صاحب کی خدمت میں نیاز۔

بندہ۔ محروم

چار روز کے بعد دوسرا خط ملا۔

کلور کوٹ ۲۱، جنوری ۱۹۲۹ء

ڈیئر مسٹر سرشار۔ دیر کیسری کا گزشتہ پرچہ جس میں جوش ملیح آبادی کی نظم شائع ہوئی ہے، براہ کرم بھجوا دیجیے۔ میں ۲۵ کی شام کو ملتان پہونچوں گا۔ میرے ساتھ میرا لڑکا جگن بھی آئے گا۔ مشاعرہ سننے کا اسے بہت شوق ہے۔

محروم

میں نے ۲۵۔ جنوری کا تمام دن شام کے انتظار میں جس اضطراب و بے چینی سے گزارا اسے میرا دل ہی جانتا ہے شام کو ہم کئی آدمی لالہ بال کشن صاحب بترہ ابر کی زیر سرکردگی چار فٹنیں لے کر مہمانوں کی پیشوائی کے لیے ملتان چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ میرا دل جوش مسرت سے بلیّوں اچھل رہا تھا۔ آخر گاڑی آئی اور محروم صاحب اپنے کمپارٹمنٹ سے باہر نکلے تو میں فرطِ عقیدت سے ان کے قدموں میں جھکنے لگا۔ مگر انھوں نے فوراً میرا ہاتھ پکڑ کر بزرگانہ شفقت و نوازش سے گلے لگا لیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے جیتے جی بہشت میں پہنچ گیا ہوں۔ محروم صاحب کی رہائش کا انتظام بترہ صاحب نے اپنے گھر پر ہی کر رکھا تھا۔ میرا پلنگ بھی ان ہی کے ساتھ بچھایا گیا تھا۔ کھا پی کر فارغ ہوئے تو میں نے جگن سے پوچھا، سنیما دیکھو گے؟ اس وقت وہ غالباً چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ بولا وہ کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا تم نے سنیما نہیں دیکھا؟ تصویریں ہوتی ہیں بہت خوب صورت، چلتی پھرتی تصویریں۔ جگن معصومانہ انداز میں کہنے لگا۔ میں نے دیکھا ہے۔ ذرا تفصیل میں جانے پر معلوم ہوا کہ بھولا بھالا بچہ ان تصویروں

کو سینما سمجھ رہا ہے۔ تو بھیک مانگنے والے فقیر مرد عورتیں پیسہ یا روٹی کا پھلکا لے کر دیہات میں دکھایا کرتے ہیں۔ کلکتہ کا شہر دیکھو۔ دہلی کی شان دیکھو۔ ریل کی لائن دیکھو۔ میں نے اخبار کے کاتب سے کہا اسے سینما دکھا لاؤ۔ کہا سرشار کے استاد صاحب کا لڑکا ہے۔ چنانچہ دونوں کو فرسٹ کلاس کا پاس مل گیا۔ رات کو جب وہ سینما دیکھ کر لوٹا تو نہایت خوش تھا۔ اس طرح موجودہ دور کے ممتاز اور ہر دل عزیز شاعر جگن ناتھ آزاد کو پہلے پہل سینما سے روشناس کرانے کا فخر مجھے حاصل ہوا۔ جس کی یاد بھی شاید اب اس کے ذہن اور دماغ میں محفوظ نہ ہوگی۔

۲۶۔ جنوری کو مشاعرہ تھا۔ میں نے غزل کہی تھی۔ مگر پڑھنے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔ محروم صاحب نے پوچھا غزل کہی ہے؟ میں نے عرض کیا کہی تو ہے۔ مگر پڑھنا نہیں چاہتا۔ بولے کیوں؟ میں نے کہا حوصلہ نہیں ہوتا۔ دیہات میں رہا ہوں۔ آج تک کسی مشاعرہ میں شریک نہیں ہوا۔ نہ غزل پڑھی ہے۔ کہنے لگے اچھا غزل دکھاؤ۔ میں نے ڈرتے ڈرتے غزل پیش کی۔ انھوں نے بڑی توجہ سے پڑھی اور فرمایا سرشار تمہاری غزل بہت اچھی ہے بہت کم آدمی ایسے شعر پیش کر سکیں گے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ بہت کامیاب رہے گی۔ چنانچہ ان کے ارشاد پر میں نے غزل پڑھی اور وہ کافی پسند کی گئی۔ مشاعرہ طرحی تھا۔ دو طرحیں تھیں۔

۱۔ بزم میں موجود ساقی بھی ہے پیمانہ بھی ہے۔

۲۔ کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

پہلی زمین میں حضرت جوش ملیح آبادی کی غزل نما نظم یا نظم نما غزل چند روز پہلے "ویر کیسری" میں چھپ چکی تھی۔ یہی پرچہ جناب محروم نے طلب کیا تھا۔ وہ انھیں وقت پر مل گیا اور دوران سفر میں انھوں نے اس پر نہایت خوبصورت تضمین لکھ دی تھی۔ ایسے برجستہ اور زوردار مصرعے جیسے انھوں نے جوش کے منہ سے مصرعے چھین لیے ہوں۔ دوسری زمین میں انھوں نے دو غزلیں کہی تھیں۔ ایک میں ادب کا رنگ غالب تھا، دوسری میں سیاست یا حب الوطنی کا۔ ایک ایک شعر میں جادو کا اثر تھا۔ حفیظ صاحب ہر شعر پر حیرت سے محروم صاحب کی طرف دیکھتے اور سر دھنتے جاتے تھے۔ آپ بھی سنیے اور لطف اٹھایئے ۔

اشک بن کر دیدۂ گریاں سے بہہ آنا بھی ہے ضبطِ غم کے وقت پتھر تجھ کو بن جانا بھی ہے

داغ دینا بھی تری قسمت میں ہے کھانا بھی ہے تجھ کو اے دل خود تڑپنا بھی ہے تڑپانا بھی ہے

آگ بننا ہی نہیں ہے آگ برسانا بھی ہے

دیکھ اے غافل کہیں میں ہے فنا کی دست برد ہو نہ جائے راہ میں تیری امانت خورد برد

غفلتِ پارینہ کے دفتر کو کر دے گاؤ خورد آسماں نے کی ہیں دوہری خدمتیں تیرے سپرد
چونکنا بھی ہے تجھے دنیا کو چونکانا بھی ہے

ابر کا ٹکڑا نظر آتا ہے گر تجھ کو پری باعثِ صد آفریں ہے یہ تری صورت گری
گرچہ صوتِ سرمدی ہے ہر صدائے سرسری صرف سننا ہی نہیں تجھ کو پیامِ دلبری
بلکہ اس پیغام کو دنیا میں پھیلانا بھی ہے

خواہ شمعِ بزم بن تو خواہ بن ماہِ تمام جلوہ پاشی ہو تری تنویر کی دنیا میں عام
دیکھ ہے چھائی ہوئی تیرے وطن پر غم کی شام خود سراپا نور بن جانے سے کب چلتا ہے کام
تجھ کو اس ظلمت کدے میں نور برسانا بھی ہے

آ بھی میدانِ عمل میں کس لیے کرتا ہے ڈھیل مردِ میداں کے لیے زیبا نہیں یہ قال و قیل
کارنامے ہوں ترے تیری صداقت کی دلیل کب تلک دیکھے گا خود ہی جوہرِ تیغِ اصیل
اٹھ کہ اب اِس تیغ کے جوہر کو منوانا بھی ہے

نغمہ زن ہوا ے نوا ریزِ گلستانِ حیات ہے جبینِ موت پر اک تازہ عنوانِ حیات
خاک سمجھے موت کو سمجھے جو پایانِ حیات موت سے بڑھ کر نہیں کوئی نگہبانِ حیات
تجھ کو یہ نکتہ سمجھنا بھی ہے سمجھانا بھی ہے

درد میں شامل کسی کے ہو وہی ہے دردمند جو عمل پیرا ہو خود بھی وہ کرے اوروں کو پند
گو زمیں سے تا فلک تیری نہیں ہے راہ بند ہو چکا بس دور سے نظارۂ پست و بلند
اب تجھے اِن گھاٹیوں میں ٹھوکریں کھانا بھی ہے

آسماں پر ہے وہی مے خانۂ ابرِ بہار اوج نیت پر ہے یکسر تیری مستی کا مدار
وہ سنائی دے رہی ہے صاف رندوں کی پکار اے دلِ ناعاقبت اندیش! تا کے یہ خمار
بزم میں ساقی بھی ہے موجود پیمانہ بھی ہے

اب غزلیں دیکھیے۔

جب دل کا حال کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم لیتے ہیں کام نالہ و آہ و فغاں سے ہم
واقف ہیں اک فسردگیِ جاوداں سے ہم ناآشنا ہیں فرقِ بہار و خزاں سے ہم

خوش دل ہوئے نہ سیرِ گل و گلستاں سے ہم — پابندِ دام اُڑ کے ہوئے آشیاں سے ہم

اُلجھا کیے بہت دلِ ناشادماں سے ہم — عہدہ برا نہ ہو سکے جب دلستاں سے ہم

کترا کے اب گزرتے ہیں کوئے بتاں سے ہم — "کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم"

کس منہ سے شکوہ ان کے نہ آنے کا کیجیے — جب جا سکے نہ ان کے نہ آنے پہ جاں سے ہم

دل مجھ سے پوچھتا ہے کہ جائیں گے اب کہاں — میں دل سے پوچھتا ہوں کہ آئے کہاں سے ہم

خونِ جگر کے واسطے ہے شرم کا مقام — لیں نشۂ مستعار مئے ارغواں سے ہم

اے عشق تا کجا تری خونیں نوائیاں — اُکتا گئے ہیں اب ترے رنگِ بیاں سے ہم

اے حسن تا بکے یہ تری خودستائیاں — اب سیر ہو چکے ہیں تری داستاں سے ہم

افسوس ہے کہ اہلِ وطن وقفِ خواب ہوں — خواب آوری میں بڑھ کے ہوں افسانہ خواں سے ہم

کیوں دیکھتے نہیں کہ کہاں ہیں گرے ہوئے! — کیوں سوچتے نہیں کہ گرے ہیں کہاں سے ہم

بے کار شور و نالہ و فریاد ہے اگر — چونکا سکیں نہ ہند کو خوابِ گراں سے ہم

لازم ہے کاروانِ وطن کے لیے نہ ہوں — شور و فغاں میں کم جرسِ کارواں سے ہم

محروم ذوقِ جہدِ عمل دے خدا ہمیں
کر بھی دکھائیں جو کہیں اپنی زباں سے ہم

اہلِ جہاں بڑے تھے سارے جہاں سے ہم — ہندی ہیں پیار کرتے ہیں ہندوستاں سے ہم

حیرت کسی کو کیوں ہے جو ہیں نیم جاں سے ہم — سوچے ذرا کوئی کہ گرے ہیں کہاں سے ہم

نقشِ زوال آج ہیں پستی کی خاک پر — رتبے میں تھے بلند کبھی آسماں سے ہم

بھولی نہیں ہے باغِ وطن کی بہار ابھی — اے دورِ اولیں! تجھے لائیں کہاں سے ہم

رنگِ زمانہ دیکھتے ہیں چونک چونک کر — صدیوں کے بعد چونکے ہیں خوابِ گراں سے ہم

جس میں سکوتِ مرگ کے ساماں تمام ہوں — تا چند خوش رہیں گے اس امن و اماں سے ہم

باقی ہے ذوقِ اوج ہمارے غبار میں — گو پس چکے ہیں گردشِ دورِ زماں سے ہم

کیوں کر دبا سکے گا تو اے آسماں ہمیں — آخر گزر چکے نہیں کس امتحاں سے ہم

ہاں بے مبالغہ ہے یہ کہنا حفیظ کا — "مٹ مٹ گئے دبے نہ مگر آسماں سے ہم"
تو ناب دل کو بہنے دو آنکھوں کی راہ سے — پیدا نئی بہار کریں گے خزاں سے ہم

ہوتا ہے لفظ لفظ سے دردِ وطن نہاں
محروم خوش ہوئے ترے رنگِ بیاں سے ہم

اسی زمین میں حفیظ صاحب نے بھی شاید ۶ شعر کہے تھے۔ ان میں سے تین اس وقت یاد ہیں ؎

اس واسطے کہ خاک کا رتبہ بلند ہو — مٹ مٹ گئے دبے نہ مگر آسماں سے ہم
یہ اعترافِ عجز بھی معیوب ہے تو خیر — چپ ہو رہیں گے کچھ نہ کہیں گے زباں سے ہم
ہاں عیزر کی بھی آؤ بھگت خوب یاد ہے — اس روز خوش ہوئے تھے بہت پاسباں سے ہم

مشاعرہ اس قدر کامیاب رہا کہ اہلِ ذوق اصحاب نے تمام شعراء کو مزید ایک دن کے لیے روک لیا۔ چنانچہ اگلے روز کی نشست بھی نہایت دلچسپ رہی۔ عزیز جگن ناتھ نے بھی اپنے والدِ محترم کی کئی چیزیں مشاعرے میں پڑھ کر سنائیں۔ نو دس برس کا کمسن بھولا بھالا بچہ والدِ نامدار کی گراں مایہ چیزیں اس دلکش انداز اور روانی سے پڑھ رہا تھا کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ منجملہ دیگر نظموں کے اس نے وہ نظم بھی حاضرین کو سنائی تھی جو محروم صاحب کے تازہ مجموعۂ کلام "کاروانِ وطن" میں "پھر بھی لڑتے ہیں" کے عنوان سے شامل ہوئی ہے۔ سامعین پر اس دل کش نظم کا بہت زیادہ اثر ہوا۔

محروم صاحب کی طبیعت میں تغافل تو نہیں تساہل پسندی کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ خطوط کا جواب دینے میں غیر معمولی تاخیر سے کام لیتے رہیں۔ بار بار کے اظہارِ افسوس اور معذرت کے باوجود اپنی اس عادت کو ترک نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان سے تعلق رکھنے والے اصحاب اکثر اوقات بہت بددل اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کی نیک دلی، بلند خیالی، حسنِ اخلاق اور خلوص و مروت کا جذبہ اس کا کسی حد تک ازالہ کر دیتا ہے۔ ان مخلصانہ اظہارِ معذرت ان کے اس "ظلم" کی تلافی کے لیے عموماً کافی ثابت ہوتا ہے۔ کم از کم میں تو ان کے اس سلوک کا اس قدر عادی ہو چکا ہوں کہ طبیعت کو قطعی ناگوار نہیں معلوم ہوتا۔

محروم صاحب طبعاً تصنع اور تکلف سے قطعی بے نیاز، با مروت، فیاض طبع اور بے لوث انسان ہیں۔ اس لیے کوئی آدمی ان سے زیادہ عرصہ تک دل برداشتہ نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی معمولی سے معمولی تکلیف کو بھی اپنی بڑی سے بڑی تکلیف اور مصیبت کی طرح محسوس کرتے ہیں۔ ان کے خلق و مروت کی بدولت ان سے نہایت سرسری اور معمولی تعلق رکھنے والے اصحاب بھی اکثر اوقات ان کی ذات سے ایسے فوائد حاصل کر لیتے ہیں جن کے وہ کسی

بھی طرح مستحق نہیں ہوتے۔ بہت سے ہمعصر شعرا کی وفات پر انھوں نے جو نوحے لکھے ہیں اور ان میں جن اعلیٰ خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ان کی شفقت، محبت اور دریا دلی کا بیّن ثبوت ہیں۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں مجھے اپنی اہلیہ کی وفات کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ محروم صاحب نے بھی اس غم ناک حادثہ کو بُری طرح محسوس کیا۔ نہ صرف خطوط کے ذریعے مجھے تسلّی و تشفّی دینے کی کوشش کی، بلکہ ۹ فروری کو ملتان گیتا کانفرنس کے مشاعرے میں شرکت کے لیے کئی نہایت ضروری کام چھوڑ کر محض اس لیے تشریف لائے کہ مجھ سے ذاتی طور پر مل کر ماتم پرسی کر سکیں۔ اگرچہ باہمی ملاقات کے وقت ان کی آنکھوں میں آنسو لہرا رہے تھے، مگر کمالِ ضبط سے کام لے کر انھوں نے اپنے پند و نصائح سے میرے غم زدہ دل کو تسکین دینے کی انتہائی کوشش فرمائی۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ جس روز انھیں میرا خط ملا۔ ان سے رات کا کھانا نہیں کھایا گیا۔

۱۳ جون ۱۹۳۵ء کو ان کی چھوٹی لڑکی شکنتلا صرف دو سال کی عمر میں فوت ہو گئی۔ جس کی اطلاع انھوں نے مجھے اپنے ۲۵ جون کے خط میں دی۔ چند ہی روز کے بعد میں نے ان کی بڑی لڑکی ودّیا کی موت کی خبر اخبار میں پڑھی۔ مجھے خیال ہوا کہ نام غلطی سے چھپ گیا ہے۔ میں نے خط لکھ کر استفسار کیا تو ودّیا بہن کے دردناک انجام کی حقیقت معلوم ہوئی۔ مگر سینہ کوبی اور اشک افشانی کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ اس موقع پر مجھے چند روز کے لیے محروم صاحب کے ہاں چلا جانا چاہیے۔ وہ ان دنوں راولپنڈی میں تھے اور میں اپنے قصبہ خیر پور سادات میں کافی لمبا فاصلہ تھا خیر یہ تو طے ہو جاتا۔ لیکن بعض کاروباری مصروفیتیں ایسی تھیں کہ یہ ارادہ عمل کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ اس سے دل کی بے چینی اور زیادہ ہو گئی۔ مگر اس کا کوئی علاج نظر نہ آتا تھا۔ تھوڑے دنوں کے بعد آریہ سماجی حلقوں میں آریہ پرتی ندھی سبھا پنجاب کی اردو شتابدی منانے کی تحریک شروع ہوئی۔ یہ جلسہ بڑے اہتمام سے لاہور میں ہونا تھا۔ اس موقع پر مشاعرے کا پروگرام بھی رکھا گیا۔ صدارت کے لیے محروم صاحب کا نام تجویز ہوا۔ محروم صاحب نے اس غم و اندوہ اور پریشانی کے عالم میں بھی شرکت منظور کر لی۔ احساسِ فرض کی اس سے روشن تر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ جلسہ ماہ اپریل ۱۹۳۶ء میں بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوا۔ محروم صاحب نے کارکنان کو لکھ کر میری رہائش کا انتظام بھی اپنے ساتھ کرایا تھا۔ میں لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ عین وقت پر محروم صاحب بہت بیمار ہو جانے کی وجہ سے تشریف نہیں لا سکیں گے۔ دل کو بیحد مایوسی ہوئی۔ اگلے دن چودھری بھدر سین جو محروم صاحب کے ماتحت سی۔ بی سکول راولپنڈی میں ٹیچر تھے۔ محروم صاحب کا خط لے کر میرے پاس آئے اور کہا کہ ان کا حکم ہے راولپنڈی چلو۔ چنانچہ جلسے کے خاتمے پر میں ان کے ساتھ راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ چودھری بھدر سین اور محروم صاحب ایک ہی مکان کے دو الگ الگ حصّوں میں رہتے تھے۔ میں وہاں دس

دن تک رہا۔ اس عرصہ میں جس محبت اور گرم جوشی کا سلوک میرے ساتھ ہوا اس کی یاد تا زندگی میرے صفحۂ دل سے محو نہیں ہو سکتی۔

میرے قیام راولپنڈی کے دنوں میں اگرچہ مرحوم صاحب کی طبیعت پے در پے صدموں کے باعث رنج و غم سے نڈھال تھی مگر انھوں نے انتہائی ضبط سے کام لے کر مجھے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ میں پردیس میں یا گھر سے کسی دوسری جگہ پر ہوں۔ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ انھوں نے میرے لیے وقف کر دیا جو تمام تر علمی، ادبی مسائل پر گفتگو میں صرف ہوتا تھا۔ ایسا نظر آتا تھا جیسے انھوں نے اپنے غم و اندوہ کو چند روز کے لیے دل کے کسی خاص خانے میں بند کر کے مقفل کر دیا ہے۔ عبدالعزیز صاحب فطرت ان دنوں غالباً پشاور میں تھے۔ انھیں میرے آنے کی اطلاع ہو گئی تھی، انھوں نے تار دیا کہ میں آرہا ہوں۔ سرشار کو میرے آنے تک روکے وہ آئے تو سگے بھائیوں کی طرح ملے۔ خوب خوب باتیں ہوتی رہیں۔ جب وہ واپس چلے گئے تو میں نے اجازت چاہی ان کی خواہش مجھے کچھ دن اور رکھنے کی تھی۔ ادھر فصل کے ایام تھے، کام کا بہت حرج ہو رہا تھا۔ آخر دو روز اور رہ کر میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

کسی انسان کی حقیقی عظمت اور خصلت کا اندازہ کرنے میں عام طور پر اس کی زندگی کی روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی مدد ملتی ہے، کیوں کہ ان میں وہ کسی قسم کے تصنع اور بناوٹ سے کام نہیں لے سکتا۔ جن لوگوں کو زندگی میں مرحوم صاحب سے کبھی واسطہ پڑا ہے وہ ان کی بلندی اخلاق اور عظمت کردار کے بیحد مداح ہیں۔ میں راولپنڈی جاتے ہوئے خالص۔۔۔۔ گھی کے دو ٹین اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جن میں ۳۶، ۳۷ سیر گھی تھا۔ ہمارے ہاں دیہات سے تین چار من عمدہ گھی ہر مہینے آجاتا تھا جو کافی سستا پڑتا تھا۔ مرحوم صاحب نے مجھے اس کی قیمت لینے کے لیے مجبور کیا۔ میرے انکار پر تب تک اس گھی کو ہاتھ نہ لگایا جب تک اس کی قیمت میری جیب میں نہ ڈال دی۔ لاگت کے بھاؤ میں نے ان سے شاید ۱۳ ا سیر کے حساب سے دام لیے تھے۔ اتنی کم قیمت سن کر وہ بہت حیران ہوئے۔ میری رہائش کے دوران میں انھوں نے کئی بار پُر زور تقاضا کیا کہ میں صحیح اور پوری قیمت ان سے لے لوں۔ انھیں آخر تک یقین نہیں آیا کہ در حقیقت میں نے اپنا منافع چھوڑ کر باقی صحیح قیمت وصول کر لی ہے۔ ان دنوں ہمارے ہاں خالص دودھ آسانی سے ایک آنہ فی سیر مل جاتا تھا۔ راولپنڈی میں اس کا بھاؤ ۴، ۵ آنے سیر تھا۔ لہٰذا وہ مجھے غیر معمولی طور پر مہنگا لگتا تھا۔ میں نے کئی بار انھیں روکا مگر وہ بلا ناغہ روزانہ دو وقت مجھے برابر دودھ پلاتے رہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اگلے روز دودھ نہ لانے کا وعدہ کرتے۔ مگر یہ وعدہ کبھی پورا ہونے میں نہ آیا۔ ایک بار ملتان میں انھوں نے فوٹو گرافر سے اپنی تصویر کھچوائی۔ میں نے اگلے روز

وہ تصویر انھیں بھیج دی۔ اور قیمت اپنی گرہ سے ادا کردی۔ عرصہ تک وہ خطوط میں استفسار کرتے رہے کہ کتنی قیمت ادا کی گئی ہے تاکہ وہ مجھے منی آرڈر سے روانہ کی جاسکے۔ ہمارے علاقہ میں انار نہایت اعلیٰ قسم کے ہوتے تھے۔ بہت دور دور کلکتہ بمبئی تک جاتے تھے۔ میں ہر سال من بھر کے قریب پیک کر کے بذریعہ ریلوے پارسل انھیں بھیج دیا کرتا تھا۔ جب انار پہنچتے تو ان کی رسید کا خط ایسے لجاجت کے لہجے میں لکھتے جیسے میں نے ان پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے یا ان کے بھیجنے میں غیر معمولی تکلیف یا مصیبت برداشت کی ہے۔ تقسیمِ وطن کے بعد کا ذکر ہے، ان دنوں مرحوم صاحب کی رہائش ایل بنگش نیا محلہ میں تھی۔ شام کے وقت میں اپنی بیوی کے ساتھ ان کے گھر پہنچا۔ وہ سوٹ پہنے انجمن ترقی اردو کے جلسہ میں جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر فوراً جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے ہزار کہا کہ آپ ہو آیئے مگر وہ کسی طرح جانے کو تیار نہ ہوئے۔ بولے جلسے نوروز ہوتے رہتے ہیں۔ تم بیٹھو۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میری بیوی اور چھوٹی بچی بھی میرے ساتھ ہیں تو جھٹ لباس تبدیل کر کے بھاگے بھاگے بازار گئے۔ کچھ پھل اور مٹھائی لے آئے۔ یہ سب کام اس طرح آناً فاناً ہوا کہ میں ہکا بکا ہو کر دیکھتا رہ گیا۔ میری بیوی نے ان کے پاؤں چھوئے۔ اتفاق سے اس وقت ان کی جیب میں پیسے نہیں تھے۔ دوبارہ بازار جاکر ایک دوکان دار سے دو روپے لے آئے تاکہ میری بیوی اور اپنی بہو کے ہاتھ پر رکھ سکیں۔ جب میں ان سے ملنے کے لیے جاتا ہوں تو مجھے بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ خبردار ہو جائیں تو مجھے کبھی اپنے پاؤں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے اور بغیر ان کے پاؤں چھوئے میری طبیعت کو تسکین نہیں ہوتی۔ اس لیے میری ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی بے خبری میں میرے ہاتھ ان کے پاؤں تک پہنچ جائیں۔ میں حقہ اور سگریٹ نہیں پیتا۔ اس لیے مجھے اپنا حقہ بھرنے یا چلم پر آگ رکھنے کی کبھی اجازت نہیں دیتے۔ بار بار کے اصرار کے باوجود زندگی بھر میں ایک بار بھی ایسا موقع نہیں آنے دیا۔ اگر کسی وقت میں گھر میں موجود ہوں تو ناشتہ کے لیے مجھے آواز دینے کی بجائے گرم گرم پراٹھے اور چائے کا گلاس لے کر خود میرے پاس آجاتے ہیں۔ میرے احتجاج کی کچھ پرواہ نہ کرکے فرماتے ہیں تمھیں اپنے ہاتھ سے کھلا کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔

دوران گفتگو میں ایک بار استادی شاگردی کا ذکر آگیا۔ فرمانے لگے میں نے اپنی زندگی میں یہ دھندا کبھی اختیار نہیں کیا۔ کچھ لوگوں کو کبھی کبھار مشورہ ضرور دیا۔ مگر تمہارے سوا کسی کو اپنا شاگرد نہ کبھی سمجھا ہے نہ کہا ہے۔ وہ تعلقِ خاطر جو تمہارے ساتھ ہے کسی دوسرے شخص سے پیدا نہیں ہوا۔ ایک بار ایک بہت بڑے آدمی نے شاگرد ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی، میں نے معذرت کردی۔ سچ تو یہ ہے کہ جو اثر جوش اور زندگی تمہارے کلام میں دکھائی دیتی ہے ان کے اشعار میں اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

کچھ عرصہ ہوا دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ایک پروگرام نشر کیا تھا، جس میں ساٹھ برس سے زیادہ عمر کے بہت سے شعراء نے حصہ لیا۔ اس میں شعرا نے اپنے کلام اور استادی شاگردی کے بارے میں بھی واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ اس موقع پر جناب محروم صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ میرا صرف ایک شاگرد ہے اور وہ جیمنی سرشار ہے، جو سونی پت میں رہتا ہے۔ مجھے اس کو اپنا شاگرد کہتے ہوئے بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے۔

شروع شروع میں ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ کیا محفلِ ادب میں مجھے کوئی اچھا مقام حاصل ہو سکے گا؟ اس سے میری غرض یہ تھی کہ اگر مستقبل میں میری فکر و کاوش کا کوئی مفید نتیجہ برآمد ہونے کی امید ہو تو اس پر محنت کروں۔ ورنہ سرے سے اس شوق سے دست بردار ہو جاؤں۔ میری تعلیم و تدریس کا جو طول و عرض تھا اس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اس کے پیش نظر مجھے اپنی قابلیت پر کچھ زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ میرے متعلق ان کی رائے بہت اچھی ہے۔ انھوں نے مجھے مشقِ سخن جاری رکھنے کی تلقین کی اور مستقبل کے بارے میں نہایت امید افزا خیالات کا اظہار فرمایا۔

بعد میں میری کچھ اور نظمیں مثلاً کربلا، چتوڑ، دسہرے کی خوشی، سیرِ چمن، پھانسی کی رات، شاعری، تعارف، حبِّ وطن بھگت سنگھ، اور دت، تقدیر و تدبیر، اے جوانانِ وطن۔ ماتمِ پٹیل، خودی رام بوس، گناہِ عظیم، بچے، ماضی کی یاد اور مہارانا پرتاپ وغیرہ دیکھ کر میرے متعلق ان کی رائے اور بھی عمدہ ہو گئی۔

تمام اہل الرائے اس بات پر متفق ہیں کہ کلامِ محروم کی سب سے نمایاں صفت احساسِ غم ہے۔ جس کے اظہار پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ اپنے راولپنڈی کے چند روزہ قیام میں مجھے اس بات کا تجربہ ہوا کہ غم و اندوہ کے بھاری بوجھ کو محروم صاحب حتی الامکان تنہا برداشت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں کسی گہرے سے گہرے عزیز کا بھی سہارا نہیں لینا چاہتے۔ محروم صاحب اسکول چلے جاتے۔ جگن ناتھ کو کالج میں حاضری دینی ہوتی۔ میں چھ سات گھنٹے کے لیے اکیلا رہ جاتا۔ یہ تمام وقت میں مطالعۂ کتب اور محروم صاحب کی نظموں کی نقلیں لینے میں صرف کرتا۔ میز کی ایک دراز میں نہایت احتیاط سے کاغذات کے اندر چھپا کر رکھی ہوئی ان کی ایک چھوٹی سی پاکٹ بک مجھے ملی، میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں ایسی نظمیں اور اشعار درج تھے، جو شکنتلا اور ودیا کی وفات پر کہے گئے تھے میں نے وہ سب بھی نقل کر لئے اسی دوران میں محروم صاحب بھی اسکول سے واپس آ گئے۔ جب انھوں نے مجھے ان چیزوں کی نقلیں لیتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے" آہ! سرشار تم نے یہ کیا کر دیا۔ اچھا اب انھیں جگن ناتھ کو نہ دکھانا۔ اس کے دل کو بہت صدمہ ہو گا۔ یہ آگ اکیلے میرے ہی دل تک محدود رہنی چاہیے۔ تم لوگوں کو اس سے محفوظ رکھنا ہی بہتر ہے"

جو انسان اپنی دو برس کی کم سن بچی کی موت پر خون رو رہا ہو۔ اس کے حساس دل پر اپنی جواں سال بیٹی کی موت سے جس نے جسم پر مٹی کا تیل چھڑک کر اپنے آپ کو نذر آتش کر دیا ہو، کیا بیتی ہوگی، اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔ اس موقع پر ان کے کہے ہوئے اشعار، اشعار نہیں دہکتے ہوئے انگارے ہیں۔ جن کی حدت ہر سننے اور پڑھنے والے کے دامنِ صبر و شکیب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ پھر جس دل و دماغ نے انھیں اگلا ہو اس کی اپنی کیا حالت ہوگی اس کا تصور بھی حد درجہ اذیت ناک ہے۔ محروم صاحب نے جس جرأت اور پامردی سے ان رنجدہ اور افسوسناک حالات کا سامنا کیا اور حوصلہ مندی سے دل و دماغ کا توازن برقرار رکھا اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ میں نے محروم صاحب کے جن اشعار کو دہکتے ہوئے انگاروں کا نام دیا ہے وہ درحقیقت دہکتے ہوئے انگارے ہیں یا نہیں۔ اس کا فیصلہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔ ان میں کتنا سوز ہے کتنی آنچ ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

پہلے ہی عزا خانہ تھی وہ میری نظر میں — افسوس کہ اب اور بھی برہم ہوئی دنیا
اے لختِ جگر آہ کہ جل مرنے سے تیرے — میرے لیے آتش کدۂ غم ہوئی دنیا

بجھ نہیں سکتی جو دل میں آگ ہے بھڑکی ہوئی — عالمِ فانی میں اب راحت کہاں میرے لیے
سچ تو یہ ہے تیرے جل مرنے سے اے لختِ جگر — ہو گئے دوزخ زمین و آسماں میرے لیے

کر دیا ہوتا مجھے آگاہ اپنے حال سے! — تھی جو ایسی ہی کوئی تکلیف اے وِدّیا تجھے
دل ہی دل میں عزم جل مرنے کا تو نے کر لیا — ظالموں نے آہ! اتنا تو جلایا تھا تجھے

کب دہر میں بدنصیب مجھ سا ہو گا — معلوم نہیں مآل اب کیا ہو گا
شعلوں سے لپٹ کے مر گئی تو وِدّیا — یہ داغ مری چتا میں ٹھنڈا ہو گا

شمشان کا نظارہ دکھاتی ہے یہ دنیا — افسوس اسی شمشان میں کھائیں گے ہچکیں گے
تو مرنے پہ مجبور ہوئی مر گئی جل کر — ہم جینے پہ مجبور ہیں جل جل کے جئیں گے

تاب اک لو کے کی لا سکتی نہیں جانِ بشر　　ایک چنگاری سے ہوجاتا ہے انساں بیقرار
ہائے کن مجبوریوں سے تونے اے جانِ پدر　　کر دیا ملبوس تن کو اپنے تن پر شعلہ زار

دل بے تاب جلتا ہی رہے گا اس کی حدت سے　　زوالِ عمر میں جو داغِ پنہاں دے گئی و دیا
جگر پھنتا ہے میرا آگ لگتی ہے کلیجے میں　　تصور میں نظر آتی ہے جب جلتی ہوئی و دیا

جس طرح دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا یقینی ہے، اسی طرح شادی و غم، رنج و راحت اور سکھ دکھ بھی ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں ع "رہتا نہیں زمانہ کبھی ایک رنگ پر"۔ وقت کا مرہم آخر کار گہرے سے گہرے زخم بھی بھر دیتا ہے۔ جو نہیں بھر سکتے ان کی ٹیس بہرحال ضرور کم ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ محروم صاحب کی غم آشنا طبیعت اور درد آشنا دل کو بھی زمانے کی روش اور زندگی کی ضرورتوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑا۔ قدم قدم پر آہ و بکا کرنے والے دل اور بات بات پر چھلک پڑنے والی آنکھوں کو اب کچھ نہ کچھ موقع و محل دیکھنا اور کوئی نہ کوئی بہانہ بھی تلاش کرنا پڑتا ہے وقت ہر پھول کو اپنے دل کے داغ چھپا کر باغِ جہاں میں ہنسنے کے لیے مجبور کر ہی دیتا ہے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۴۰ء کو عزیز جگن ناتھ آزاد کی تاریخ شادی مقرر ہوئی۔ اس موقع پر مجھے بھی راولپنڈی حاضر ہونے اور سہرا لکھنے کا حکم دیا گیا۔ بعض مجبوریوں کے باعث ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں شادی میں تو شریک نہ ہو سکا، سہرا لکھ کر بھیج دیا، جسے محروم صاحب نے بہت پسند فرمایا۔ چار پانچ دیگر سہروں کے ساتھ بعد میں وہ "زمانہ" کانپور میں شائع ہوا۔ اس کے اڈیٹر منشی دیا نرائن صاحب نگم نے ایک مختصر تعریفی نوٹ بھی لکھا تھا۔ محروم صاحب نے اس موقع پر خود بھی ایک سہرا سپرد قلم کیا تھا۔ اپنے جواں بخت و جواں سال فرزند ارجمند کی تقریب سے انھیں جو تسکین ملی اس سے انھیں اپنی المناک و افسردہ زندگی کے بسر کرنے کا ایک بہت بڑا سہارا ہاتھ آگیا اور ان کے دن بظاہر سکون و اطمینان سے کٹنے لگے۔

۱۹۴۷ء کا سال آیا۔ وہ ہنگامہ خیز سال جو ہندوستان کی تاریخ میں رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ اپنی بے مثال خوبیوں کے لیے بھی اور لا انتہا خرابیوں کے لیے بھی۔ ہمارے وطن عزیز کو طویل جدوجہد اور عظیم قربانیوں کے طفیل غیر ملکی حکومت کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی، مگر اس کے ساتھ ہی اسے آگ اور خون کے خوفناک طوفانوں سے گزرنا اور ایسی ہولناک تباہیوں سے دوچار ہونا پڑا جن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں شاید کہیں بھی نہیں ملے گی۔ ملک تقسیم ہو کر ہند و پاکستان کے دو حصوں میں مستقل طور پر بٹ گیا۔ ہندوؤں مسلمانوں دونوں

نے ایک دوسرے کے خون سے بے دریغ ہولی کھیلی۔ راولپنڈی کا علاقہ بھی اس سے محفوظ نہ رہا۔ مرحوم صاحب کو ان خطرناک حالات سے بیحد تشویش ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے ۲۰ مئی ۱۹۴۷ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"عزیز سرشار! لفافہ مل چکا ہے۔ حالات یہاں بھی کچھ ایسے ہی مخدوش۔ طبیعت پریشان رہتی ہے۔ ساوتری، کرشنا اور جگن کی دونوں لڑکیوں کے متعلق بہت فکرمند ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ کہیں باہر پہنچا دیا جائے۔ لاہور تو یہاں سے بھی برا ثابت ہوا۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"واقعی آپ کے خط کا جواب نہ دے سکا۔ خواستگار معافی ہوں۔ راولپنڈی کے دیہات پر جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے قیامت گزر گئی۔ شہر نسبتاً محفوظ رہا۔ چھوٹے چھوٹے حملے بیرونی محلوں پر ہوتے رہے۔ کچھ جانی اور مالی نقصان بھی ہوا۔ لیکن دیہات سے بہت کم ہے عزیز جگن ناتھ لاہور میں بخیریت ہے۔ اب وہ اخبار جے ہند کے اسٹاف میں کام کر رہا ہے۔ عزیزان ساوتری کرشنا ایبٹ آباد میں تھیں۔ دونوں بعافیت یہاں پہنچ گئی ہیں۔"

اپنے بعض قدردان نیک دل مسلمان افسروں کی مہربانی اور توجہ سے وہ بالآخر لاہور، امرتسر اور جالندھر تک پہنچ گئے وہاں بہ ہزار دشواری و پریشانی دہلی آئے۔ جہاں بابو دیش بندھو گپتا نے انھیں اپنے اخبار تیج ویکلی کا اڈیٹر مقرر کر دیا۔ ایک روز میں دہلی کے ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ اتفاق سے چودھری بھدر سین مل گئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مرحوم صاحب دہلی آ گئے ہیں اور دفتر 'تیج' میں ملیں گے۔ میں فوراً وہاں پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ میں بخیر و عافیت بال بچوں سمیت ہندوستان پہنچ گیا ہوں۔ بہت خوش ہوئے۔ چند روز کے بعد میں نے اخبار "سوراجیہ" کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ جو چاوڑی بازار میں تھا۔ مگر مجھے یہ جگہ پسند نہ آئی اور تھوڑے ہی دن کے بعد نوکری چھوڑ دی۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو میں دفتر سوراجیہ میں بیٹھا تھا کہ مالک اخبار دیوان شمبھو ناتھ چوپڑا کا لڑکا جوش مسرت سے اچھلتا ہوا آیا اور خوشی سے چلانے لگا۔ بڈھا مر گیا۔ ہم سب حیران تھے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ آخر جب حقیقت کھلی تو میں ششدر و حیران رہ گیا۔ وہ راشٹر پتا مہاتما گاندھی کے اندوہ ناک قتل کا ذکر کر رہا تھا۔ مجھے اس کی اس ناواجب حرکت سے بے حد تکلیف ہوئی۔ اس رات میری آنکھوں نے اتنے آنسو بہائے کہ تمام زندگی بھر نہیں بہائے ہوں گے۔ دو روز تک دل و دماغ بہت پریشان رہے۔ تیسرے روز میں نے ایک نظم لکھی "نالۂ غم" وہ میں مرحوم صاحب

کے پاس لے گیا۔ وہ انھیں بہت پسند آئی۔ ان کا خیال اسے پرتاپ میں شائع کرنے کا تھا۔ میں اسے "زمانہ" کانپور بھیجنا چاہتا تھا۔ وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ اگلے دن وہ نظم پرتاپ کے پہلے صفحے پر چھپ گئی۔ دیوان سکھوناتھ مالک اخبار "سوراجیہ" نے دیکھی تو بہت برا منایا کہ میں ملازمت تو "سوراجیہ" میں کروں اور میری نظم پرتاپ میں شائع ہو۔ میں نے کہا آپ یہ نظم چھاپ کر کیا کرتے؟ آپ کو تو مہاتما جی کے مرنے پر خوشی ہی ہوئی ہے۔ بولے بھئی دنیا داری تو نباہنی ہی پڑتی ہے۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اور جب مہینہ ختم ہوا تو نوکری چھوڑ کر واپس شاہ آباد رفیوجی کیمپ میں آگیا۔

کچھ مدت کے بعد ہمیں سونی پت رفیوجی کیمپ میں روانہ کر دیا گیا۔ کیونکہ سرکاری طور پر تحصیل علی پور کے رفیوجیوں کو بسانے کے لیے یہی علاقہ تجویز کیا گیا تھا۔ چند مہینے کے بعد فیروز پور چھاونی کے بابو ستندر ناتھ ودیارتھی سونی پت آئے اور مجھے اپنے ہفتہ وار اخبار "نیا جیون" کا اڈیٹر بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے وہاں ساڑھے تین برس تک کام کیا۔ اس کام میں مجھے عزت بھی ملی شہرت بھی۔ اس ذریعہ سے ہندو پاکستان میں میں نے بہت سے نئے دوست بھی پیدا کر لیے۔ اس اثنا میں محروم صاحب اپنے جواہر پاروں کے ساتھ ساتھ قیمتی مشوروں سے بھی برابر نوازتے رہے۔ ان کی کئی نظمیں خصوصیت سے میری درخواست پر "نیا جیون" کے لیے لکھی گئیں۔ جس سے اخبار کی شان بڑھی، اس کے وقار میں اضافہ ہوا۔

محروم صاحب مذہب و ملت اور ذات برادری کے ناواجب امتیازات و تعصب سے قطعی بے نیاز ہیں — فرقہ وارانہ تنگ نظری کو انسانیت کے دامن پر بدنما داغ سمجھتے اور اس سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے ہر فرقہ و مذہب کے لوگ ان کی یکساں عزت کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے انسانیت۔ قومی یک جہتی، اصول پرستی اور وطنی مفاد سے غداری یا روگردانی ان کی نظر میں بدترین گناہ ہے۔ جس کی تلافی کسی طور ممکن نہیں۔ اخلاق و اخلاص کے اعتبار سے محروم صاحب کے ہم پلہ آدمی میں نے اپنی زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔

نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ملک، قوم، سوسائٹی اور حکومت کی طرف سے محروم صاحب کی ویسی قدر نہیں ہوئی جس کے وہ اپنے اوصاف و کمالات کے اعتبار سے مستحق تھے۔ کچھ ارباب اقتدار ایسے تھے جنھوں نے ان کی عظیم شخصیت کو اپنے ذہنی اخلاق کے پیمانہ سے ناپنے کی کوشش کی۔ بعض اشخاص نے انھیں تعصب اور تنگ خیالی کے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہا۔ کچھ لوگ اپنی فطرت کی پستی کے باعث ان کی حقیقی عظمت کا اندازہ کرنے سے قاصر رہے۔ وجہ خواہ کوئی بھی ہو۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ محروم صاحب کی ذات اور ان کے علم و کمال و فضل کے ساتھ متواتر و مسلسل بے انصافی ہوتی رہی ہے۔ پنجاب ہی کا ایک مشہور و موقر جریدہ جو پچیس برس سے بھی زیادہ عرصہ تک

بڑے اہتمام سے شائع ہوتا اور علم و ادب کی خدمت کا دم بھرتا رہا۔ اسے اپنی تمام زندگی میں ایک بار بھی محروم صاحب کا کلام شائع کرنے کی توفیق نہ ہوئی، اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اس کے قلمی معاونین میں سے بھی کسی نے اس کو ادھر توجہ نہ دلائی۔ حالانکہ ان میں سے بہت سے اصحاب محروم صاحب کے نیازمندوں میں اپنے آپ کو شمار کرتے تھے۔ اردو ادب کی تاریخ اور شعراء کے تذکروں میں بھی بیشتر مقامات پر محروم صاحب کی خدمات کو نہایت بے دردی سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ابتدا ہی سے محروم صاحب کو ایسے کام پر مامور کیا گیا جس کو ان کے شاگردوں کے بھی شاگرد احسن طریق سے سرانجام دے سکتے تھے اسے ارباب اقتدار کا اغماض کہیں یا قدرت کی ستم ظریفی۔ دنیائے ادب کو محروم صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ ایسے ناموافق حالات اور ناقدری کے ماحول میں بھی وہ مسلسل و متواتر اپنے جواہر پاروں سے علم و ادب کو مالا مال کرتے رہے۔ محروم صاحب نے متعدد بار یہ کوشش کی کہ انھیں کسی طرح لاہور میں کوئی جگہ مل جائے۔ تاکہ وہ اس تکلیف دہ ماحول سے نجات حاصل کر سکیں۔ برسوں تک سناتن دھرم اور ڈی۔ اے۔ وی اسکول کا طواف کیا۔ ان کے منتظموں سے گفت و شنید ہوتی رہی۔ مگر کسی بندۂ خدا کو یہ توفیق اور سعادت نصیب نہ ہو سکی کہ وہ ان کے لیے صرف مستقل نوکری کا بندوبست کر دیتا۔ ناقدردانی اور کم ظرفی کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

یوں پھر رہیں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

خود محروم صاحب نے بھی ایک مقام پر کہا ہے ۔

کج بیں ہے یہ زمانہ بہت بے وفا بہت
اوصاف کو کسی کے نہیں دیکھتا بہت

انگریزی حکومت نے تو اپنے دور آخر میں انھیں پہلے گارڈن کالج راولپنڈی میں اور ہندوستانی حکومت نے دہلی کیمپ کالج میں پروفیسر مقرر کر کے کسی نہ کسی حد تک اپنی کوتاہیوں کی تلافی کی بھی۔ مگر ملک و قوم اور سوسائٹی نے ان کی شاندار خدمات کا کیا صلہ ان کی خدمت میں پیش کیا ہے؟ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اندھیری رات میں جگنو کی چمک کی مانند ذاتی توقیر و قدردانیوں کے کچھ خوشگوار بھی ان کی زندگی میں ملتے ہیں آخر میں ان میں سے دو تین کا ذکر کر کے اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ملتان کے مشاعرے کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مشاعرے کے بعد رات کو جب سب دوست کھانا کھا رہے تھے تو ابوالاثر حفیظ جالندھری نے کہا، محروم صاحب آج تو آپ نے کمال کر دیا۔ افسوس ہے آپ ایسے نااہل دور میں پیدا ہوئے ہیں۔ ورنہ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ شہر شہر میں آپ کے مجسمے کھڑے ہونے چاہئیں۔ شاید آئندہ نسلیں آپ کی مناسب قدر کرنے کے قابل ہو سکیں گی۔
دوسرا واقعہ بھی ملتان ہی کا ہے۔ ۹ فروری ۱۹۳۵ء کی رات کو گیتا کانفرنس کے سلسلے میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لیے آنریبل سر گوکل چند نارنگ وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ پنجاب تشریف لائے تھے۔ ان دنوں آج کی طرح وزارتیں ٹکے سیر نہیں بکتی تھیں۔ ان کی شان رعب اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دبدبہ بدستور قائم تھا۔ شام کو وزیر موصوف ڈسٹرکٹ بورڈ کا سرکاری معائنہ کرنے کے لیے مظفر گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ اس لیے مشاعرہ ان کی غیر حاضری میں ہوا۔ اگلے روز بعد دوپہر ملتان میں ان کے اعزاز میں ایک ڈنر دیا جانا تھا۔ اس میں محروم صاحب کے ساتھ میں بھی مدعو تھا۔ محروم صاحب نے ایک گھنٹہ پیشتر اس موقع پر پڑھنے کے لیے نظم بھی کہی تھی۔ جب ہم پہنچے تو وزیر موصوف مظفر گڑھ سے لوٹ آئے تھے اور وہاں تشریف فرما تھے۔ محروم صاحب کو دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر کئی قدم آگے بڑھ آئے۔ ان سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا، اور معذرت کے لہجے میں بولے۔ محروم صاحب! افسوس ہے میں رات مشاعرہ میں شریک نہ ہو سکا۔ بعض دفعہ سرکاری مصروفیات سے مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ آپ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ میں وزیر بن کر آپ کو بھول گیا ہوں۔ میں بدستور آپ کا نیاز مند ہوں۔ تیسرا قصہ تقسیم وطن کے بعد کا ہے۔ محروم صاحب کسی مشاعرے کے سلسلے میں پاکستان تشریف لے گئے۔ واپسی پر دو پشاوری لنگیاں جن کے پہننے کا انھیں بہت شوق ہے اپنے ساتھ لے آئے۔ بارڈر پر آکر احتیاطاً انھوں نے ایک لنگی خود باندھ لی، دوسری نوکر کے سر پر بندھوا دی۔ بارڈر کے فوجی افسر نے دیکھا تو کہا "محروم صاحب! آپ نے ہمیں اندھا سمجھ لیا ہے"۔ محروم صاحب گھبرائے کہ اسے کیا جواب دیں۔ اتنے میں افسر مذکور نے آگے بڑھ کر ان سے پرجوش مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ آخر اس تکلف اور بیش بندی کی آپ کو کیا ضرورت تھی۔ ہم اتنے اندھے نہیں کہ آپ کو بھی نہ پہچانیں۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم آپ کے ذاتی استعمال کے لیے آپ کو دو لنگیاں بھی اپنے ساتھ ہندوستان نہیں لے جانے دیں گے۔ آپ اپنا تمام سامان بڑے شوق سے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ محروم صاحب کی جان میں جان آئی۔ اور وہ مسکرا دیے۔ افسر نے انھیں بسہولت تمام بڑے احترام سے ہندوستان کی سرحد پر پہنچا دیا۔

ابھی کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ میں چاہتا تھا کہ محروم صاحب کی قومی شاعری کے بارے میں کچھ تفصیل سے عرض کروں۔ کیوں کہ ان کی شاعری کے اس پہلو پر بعض وجوہ سے اب تک بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ مگر اس وقت اس کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا اسے کسی اور مناسب وقت پر اٹھا رکھتا ہوں۔

محمد شفیع الدین نیّر ایم، اے

بہارِ طفلی پر ایک نظر

یاد ش بخیر، اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے بچوں کی تعلیم مشرقی انداز کی ہوتی تھی۔ زبان کا جہاں تک تعلق ہے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو بھی تھی۔ لیکن فارسی زبان کی استعداد ہی اردو کے لیے کافی سمجھ لی جاتی تھی۔ اور دیکھا جائے تو زبان کے لحاظ سے اس زمانے کی تعلیم کچھ ایسی پختہ اور نتیجہ خیز ہوتی تھی کہ فارسی پڑھے لکھے لوگ اردو زبان میں بھی کافی لیاقت اور اس زبان و ادب کا مناسب ذوق پیدا کر لیا کرتے تھے۔

اردو زبان میں جتنے بڑے بڑے ادیب اور شاعر ہیں اور ایسے کہ جن کے نام نے شہرت کے دربار میں بقائے دوام کی کرسی پائی ہے، مثلاً سر سید احمد خاں، مولانا ذکاء اللہ، مولانا حالیؔ، مولانا شبلی، مولوی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، انیسؔ اور دبیرؔ وغیرہ ان میں سے شاید ہی کسی نے ابتدائی تعلیم میں اردو کی کوئی کتاب سبقاً سبقاً پڑھی ہو۔ لیکن ان بزرگوں کی تصانیف اور تالیفات اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اب کہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ برس کی عمر ان تصانیف کی ہو گئی ہے، چاہیے تھا کہ ضعف پیری کے آثار ان میں ہویدا ہو جاتے مگر نہیں، یہ تصانیف اب بھی جوان ہیں اور اس زمانے کے جوان ادیبوں اور شاعروں کو دعوت دے رہی ہیں کہ آؤ اور کچھ کرنا ہے تو ہمارے نقش قدم پر چلو۔

پھر فارسی کی تعلیم بھی ایسی کہ تشریح الحروف جیسی کوئی ابتدائی کتاب پڑھنے کے بعد ہی قادر نامہ، خالق باری، کریما اور مامقیماں وغیرہ کتابیں شروع کر دی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی تو گلستاں اور بوستاں جیسی کتابوں سے فارسی کی تعلیم کا آغاز ہوتا تھا۔ ان کتابوں کے علاوہ اخلاق محسنی، انوار سہیلی، یوسف زلیخا، سکندر نامہ، شاہنامہ، دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم جیسی معیار کی کتابیں درس و تدریس میں شامل تھیں، یہ نصاب تو گویا عام تھا۔ اس میں مسلمان کی تخصیص تھی نہ ہندو کی۔ ہاں مسلمانوں میں اکثر اور غیر مسلموں میں شاذ عربی زبان بھی پڑھتے تھے۔

غرض فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم ہوتی تھی۔ اور ساتھ ساتھ دیگر مروجہ علوم مثلاً ریاضی، منطق، فلسفہ، نجوم اور طب وغیرہ میں بھی لوگ حسب ضرورت درک حاصل کر کے ایسی استعداد پیدا کر لیا کرتے تھے جس سے زندگی کی معاشرتی اور تمدنی ضروریات ہی نہیں بلکہ حکومت کی انتظامی اور عدالتی ضروریات بھی پوری ہو جایا کرتی تھیں۔ اخلاقی تربیت اس تعلیم کی اساس تھی۔ جو لوگ اس طرح تعلیم یافتہ ہو کر درجۂ فضیلت حاصل کر لیتے تھے ان کے علم اور اخلاق پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔

اس زمانے میں انگریزوں کا پورا عمل دخل اس ملک پر ہو چکا تھا اور واجب یا ناواجب رد و کد کے بعد اس ملک کے باشندے نئی تعلیم کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ اس تعلیم میں انگریزی زبان اور خاص کر سائنس، جغرافیہ اور دیگر علوم جدید کے علاوہ باقی قدیم السنہ و علوم کی فی الجملہ تعلیم ہوتی تھی۔ مگر چونکہ تعلیم کی طرف رغبت بڑھ رہی تھی چھوٹے مکتبوں اور مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے مدرسے اور کالج عالم وجود میں آنے لگے تھے۔ اس لیے ان درسگاہوں اور تعلیمی اداروں میں سہولت کے لیے نصاب کو ابتدائی، ثانوی اور یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم میں تقسیم کیا گیا اور عمر کے لحاظ سے طالب علموں کی تقسیم مختلف درجوں میں ہوئی تو آسان اور مشکل کا سوال پیدا ہوا۔ اور اس بات کی کوشش کی جانے لگی کہ نہ صرف بچوں کی تعلیم میں ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے بلکہ تشکیل نصاب اور تنظیم اوقات میں بھی یہ امور پیش نظر رہیں۔ اس لیے اردو زبان کو بھی جو اس زمانے میں خواص اور عوام کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ نصاب تعلیم میں شامل ہونے کا موقع ملا۔ یہ ہوا تو اس بات کی تلاش ہوئی کہ نظم و نثر کا جو سرمایہ ہماری زبان میں ہے اسے ٹٹولا جائے۔ اور زبان کے لحاظ سے مشکل اور آسان تعلیم کے لحاظ سے مناسب اور غیر مناسب، معاشرتی اور تمدنی امور کے پیش نظر ضروری اور غیر ضروری اور معلومات زندگی کے اعتبار سے مفید اور غیر مفید اور حصول تعلیم میں سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دلچسپ اور غیر دلچسپ کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ جہاں تک اردو زبان اور خاص کر اردو شاعری کا تعلق ہے اس میں ہر معیار کی نظمیں ملتی ہیں، سلیس بھی اور دقیق بھی۔ چنانچہ اگر ہم اردو زبان کی بالکل ابتدائی ریڈروں اور درسی کتابوں پر نظر ڈالیں تو دیگر اصنافِ شاعری کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ غزل تک کے ایسے نمونے دستیاب ہوتے ہیں جو بجا طور پر ان کتابوں کی زینت بڑھانے کا موجب ہیں۔

ایک مدت تک اسی طرح کام چلتا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ اہل علم نے خود تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی عمر کے لحاظ سے بھی نثر و نظم کی کتابیں مرتب کیں تو یہ کوشش پرانی نظم و نثر کے مقابلے میں اپنے مقاصد کے لحاظ سے ممتاز نظر آئی۔

مولانا آزاد اور حالی جیسے بزرگوں نے بچوں اور بچیوں کے لیے تدریجی نثر کی نصابی کتابیں لکھیں تو انھیں نظمیں بھی اسی معیار کی تلاش کرنی پڑیں۔ چنانچہ کلام نظیر کے اقتباسات کے علاوہ جو غیر شعوری کوشش شاعر کی تھی، اب ہمارے اردو شعرا نے بھی اس وادی میں قدم رکھا اور شعوری کوشش شروع کر دی۔

گزشتہ پچاس ساٹھ برس میں جو کام اس سلسلے میں ہوا ہے اس کا جائزہ لینا بذات خود ایک اہم منصوبہ ہے لیکن نہ یہ موقع ہے نہ گنجائش۔ تاہم جن اصحاب نے بچوں کے لیے نظمیں لکھ کر اپنا مقام پیدا کیا ہے ان میں مولانا آزاد

اور مولانا حالی کے علاوہ مولوی محمد اسمٰعیل، منشی سورج نرائن مہر، ارشد تھانوی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، افسر میرٹھی، اندرجیت شرما، ناظم انصاری، حفیظ جالندھری، راجہ مہدی علی خاں، فیض لدھیانوی اور لطیف فاروقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی چھوٹے بڑے اور بھی بہت سے شاعر ہیں، جن کی کوشش قابل ستائش اور لائق التفات ہے اور جن نظموں کے موزوں انتخابات تعلیمی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

ان نظموں میں طبع زاد بھی ہیں اور انگریزی اور دوسری زبانوں کی نظموں کے ترجمے بھی۔ اور اب تو انگریزی کی دیکھا دیکھی تین تین چار چار برس تک کے بچوں کے لیے ہلکی پھلکی چھوٹی چھوٹی نظمیں ملنے لگی ہیں۔

میں نے بھی تیس پینتیس سال پہلے بحیثیت معلم بچوں کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر بچوں کے ادب اور شاعری میں کچھ کام شروع کیا اور اس سلسلے اس دوران میں اس نوع کے لٹریچر کے مطالعے کا مجھے موقع ملا ہے۔ جہاں تک میری رسائی ہے۔ بچوں کی نرسری نظموں کو چھوڑ کر ان نظموں کو جو بچوں کی تعلیمی اور اخلاقی ضرورتوں پر مبنی ہیں۔ اگر ہم تعلیمی نقطۂ نظر سے تقسیم کرنا چاہیں تو تین واضح معیار قائم ہو سکتے ہیں۔ ایک معیار ایسی نظموں کا جو پانچ چھ برس سے لے کر سات آٹھ برس تک کے بچوں کے لیے، دوسرا سات آٹھ برس سے دس گیارہ برس کے بچوں کے لیے اور تیسرا دس گیارہ برس سے چودہ برس تک کے بچوں کے لیے۔

اگر ہم تعلیمی درجوں کی موجودہ تقسیم کے لحاظ سے دیکھیں تو پہلی دوسری اور تیسری جماعت تک کم و بیش ایک معیار کی نظمیں کام آسکتی ہیں۔ چوتھی، پانچویں اور چھٹی تک ایک معیار کی۔ اور چھٹی، ساتویں سے لے کر آٹھویں جماعت تک ایک معیار کی۔ ان درجوں کے اچھے استاد کی نگرانی اور ہدایت میں ان معیاروں کی منظومات سے بچے معتد بہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں نویں اور دسویں جماعت کا معیار خواہ کتنا ہی پست کیوں نہ ہو، میں ان نظموں کو جو ان درجوں کے طلبا کے لیے ہوں، بچوں کی نظموں میں شمار نہیں کروں گا۔

بہرحال میں نے تعلیمی مقاصد اور بچوں کی عمر کے لحاظ سے ان ضروریات کے پیش نظر تھوڑا بہت کام کیا ہے اور اس سلسلے میں میری توجہ بچوں کے ادب اور شاعری کی طرف خاص طور سے مبذول رہی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی ایسا کام کیا ہے، جو غیر معمولی ہو۔ تاہم میں نے اپنی بساط بھر صدق دل سے کوشش ضرور کی ہے کہ بچوں کی کچھ نہ کچھ علمی اور ادبی خدمت مجھ سے بن آئے۔ اور اس کس مپرسی کے دور میں بھی مجھے اعتراف ہے کہ اہل علم نے میری حقیر خدمات کو سراہا ہے اور اب دو نسلوں سے بچے میری نظمیں اور نثر کی کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ غالباً یہی میری مساعی کی پذیرائی ہے کہ جگن ناتھ آزاد اپنے والد محترم یعنی حضرت تلوک چند محروم کے اس مجموعۂ کلام پر مجھ سے دیباچہ یا مقدمہ لکھنے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ یہ

مجموعہ وہ "بہار طفلی" کے نام سے مخصوص طور پر بچوں کے لیے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ "بہار طفلی" میں جو نظمیں شامل ہیں میرے عندیئے میں وہ تیسرے معیار کے طالب علموں کے لیے موزوں ہیں۔ یعنی دس گیارہ برس سے لے کر تیرہ چودہ برس تک کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اور اسی نقطہ نظر سے میں ان پر مختصر طور پر کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔

جرأت کا لفظ کسی شخصی انکسار کی وجہ سے ہے اور نہ اس میں شاعرانہ مبالغے کو دخل ہے۔ حضرت موصوف کے کلام پر کچھ لکھنے کی مجھے جرأت ہی ہو سکتی ہے۔ ورنہ میں نے جس قدر کلام ان کا پڑھا ہے، خاص کر "گنج معانی" میں اس کی بنا پر اور اس وجہ سے بھی کہ اپنے تعلیم اور تدریس کے زمانے میں نصاب کی کتابوں میں جن بزرگوں کی نظموں سے مجھے واسطہ پڑا ہے یا میں نے فائدہ اٹھایا ہے یا جن کے خیالات نے کوئی قابل ذکر اور دیرپا نقش میرے دل پر چھوڑا ہے، میں ان کو معنوی استاد سمجھتا ہوں۔ اس لیے جناب آزاد نے مجھے "بہار طفلی" کی نظموں پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو "ایاز قدر خود بشناس" کی مثل مجھے اپنی ذات پر صادق ہوتی نظر آئی۔ لیکن ایک تو جناب آزاد کی فرمائش کو ٹالنا میرے لیے دشوار تھا۔ دوسرے اس وجہ سے بھی کہ بچوں کی شاعری کے سلسلے میں اکثر احباب کا تقاضا رہا ہے کہ میں کچھ لکھوں۔ مگر اپنی عدیم الفرصتی کی بنا پر اب تک قاصر رہا ہوں۔ شاید اس بہانے سے یہ کام بھی فی الجملہ انجام پا جائے اور

بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم

والا مصرعہ مجھ پر بھی منطبق ہو، اور حضرت مرحوم کے کلام کی برکت سے میری معروضات بھی اہل علم کی پذیرائی سے محروم نہ رہیں، کچھ عرض کرتا ہوں۔

بچوں کی شاعری

اس زمانے میں بچوں کی شاعری کی عجیب عجیب تعبیریں سننے میں آتی ہیں۔ بعض لوگ ایسی نظموں کو بچوں کی نظمیں سمجھتے ہیں جو بچوں کی زبان میں لکھی گئی ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی نظموں کا دائرہ زبان کے لحاظ سے محدود ہوگا۔ بعض لوگ ایسی نظموں کو بچوں کی نظمیں سمجھتے ہیں جن میں تفریحی رجحان ہو۔ جیسے انگریزی میں نرسری رائمز NURSERY RHYMES ہوتی ہیں ان کا دائرہ بھی وسیع نہیں ہے۔ انگریزی اور اردو کی ایسی عام پسند اور مشہور نظموں سے میں کسی قدر واقف ہوں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ایسی نظمیں اگر جمع کی جائیں تو سو پچاس سے زیادہ نہ ہوگی۔ بعض لوگ ایسی نظموں کو بچوں کی نظمیں سمجھتے ہیں جو پند و نصیحت سے لبریز ہوں، اور وہ اخلاقی قدریں جو کسی قوم، فرقے یا طبقے میں رائج اور شائع ہیں۔ ان کو اس طرح بیان کیا جائے کہ بچے درس کی طرح انھیں پڑھیں، اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ایسی نظمیں اچھی بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن زمانۂ حال میں تعلیمی

رجحان یہ ہے کہ بچوں کے لیے براہ راست نصیحت کا پیرایہ اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ اسلوب کچھ اس نوعیت کا ہو کہ جو بھلائی ان میں پیدا کرنا یا جس برائی سے ہم انھیں بچانا چاہتے ہیں اس کی طرف کچھ ایسا اشارہ ہو کہ بچہ خود بخود اس اچھائی یا برائی کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو، اور اس کا دل از خود نیکی کی طرف مائل اور بدی سے متنفر ہو جائے بعض اس شاعری کو بچوں کی شاعری سمجھتے ہیں جس میں معلومات مہیا کی جائے۔ اس قسم کی نظمیں بالعموم سپاٹ ہوتی ہیں۔ اور ان میں اکثر یہ خامی رہتی ہے کہ کسی شے کی اصلیت کا جو نقش لوحِ ذہن پر منقش ہونا چاہیے وہ نہیں ہو پاتا۔ اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ ایسی معلومات اور مسائل کے لیے نثر ہی میں ایسے اسلوب اختیار کیے جائیں کہ بچے کے لیے ایسی نثریں نظموں سے بھی زیادہ جاذب نظر اور دلکش ہوں۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ بچوں کی شاعری کسی زبان کی عام شاعری سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ جو خوبیاں عام شاعری میں ہو سکتی ہیں، وہی کم و بیش زبان اور انداز کا خیال رکھ کر بچوں کی شاعری میں بھی پیدا کی جا سکتی ہیں اور کرنی چاہئیں تاکہ بچوں کی آئندہ زندگی میں یہ نظمیں ان میں شاعرانہ ذوق پیدا کرنے میں معاون ہوں۔

(۱) غرض یہ چند تعبیریں جو میں نے پیش کی ہیں اپنی اپنی جگہ سب ہی بچوں کی شاعری کا جزو ہو سکتی ہیں۔ تاہم میرا خیال یہ ہے کہ بچوں کی نظم کی پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ اس کی بنیاد علم اور اخلاق پر ہو، اور اس کے مقاصد اچھی تعلیم اور بہتر تربیت پر مبنی ہوں یعنی یہ کہ بچوں کی فطری صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے۔

(۲) ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے تعلیم ہی کے نقطۂ نظر سے مختلف عمروں کے لحاظ سے زبان تدریجی طور پر آسان یا مشکل ہونی چاہیے۔

(۳) بچوں میں قوت متخیلہ (IMAGINATION POWER) بڑی زبردست ہوتی ہے اور یہی خصوصیت دیکھا جائے تو ان کی طفلانہ خوشیوں کا موجب بنتی ہے۔ اس لیے اگر ایسی نظمیں ہوں کہ بچوں کو اس قوت کے اظہار کا خود بھی موقع ملے تو ایسی نظمیں کامیاب سمجھی جا سکتی ہیں۔

(۴) اچھے ذہن کے لیے اچھا جسم لازم ہے۔ اس لیے نظم کے اثر کا خیال رکھ کر ہم صحت و صفائی، تفریح اور ورزش اور محنت و مشقت کی طرف بھی متوجہ ہوں اور کھیلوں کا ذکر بھی کریں اور کھیلوں کی وجہ سے جو اخلاقی خوبیاں انسانی سیرت کو سنوارتی ہیں انھیں اجاگر کریں اور کھیل ہی میں جن قباحتوں کا احتمال ہے ان سے طبیعت کو نفرت دلائیں۔ اس شرط کے ساتھ کہ بچہ اس طرف از خود ملتفت ہو جائے تو یہ بات بھی بچوں کی نظموں کا جزو بن سکتی ہے۔

میں مذہبی عقیدے کو دنیوی فلاح کا چشمۂ شیریں تصور کرتا ہوں میری رائے میں قلبی اطمینان ہی نہیں بلکہ بڑے

سے بڑا اور مشکل سے مشکل کام تک کر گزرنے میں یہ جذبہ ممد ہوتا ہے۔ اس لیے عقیدے کے لحاظ سے خدا کے وجود اور اس کی قدرت و جلال اور دوسری صفات کا نقش بچپن ہی میں بچوں کے ذہن میں مناسب طور سے جاگزیں ہو جائے تو بہت سی بنیادی خوبیاں از خود بچوں میں پیدا ہو سکتی ہیں۔

(۶) تمدن اور معاشرت کی بہتری کے لیے ضروری ہے کہ آدمی باہمی الفت و محبت سے رہنا سیکھیں اور ایک دوسرے کے معاون اور ہمدرد ہوں۔ اس میں وطن اور ملک کی محبت بھی شامل ہو تاکہ خود غرضی کا سدّباب ہو اور بچہ شروع ہی سے اپنے قریبوں، عزیزوں، دوستوں اور شناساؤں، ہمسایوں اور ہم وطنوں سے وابستہ رہے۔ اور کوئی کام ایسا نہ کرے جس سے دوسرے لوگوں کی عافیت اور جائز آزادی خیال و عمل کو خطرہ لاحق ہو۔ چونکہ اس زمانے میں دنیا کے لوگ آپس میں قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لیے انسانی محبت کو وطن کی چار دیواری تک محدود رکھنا کافی نہیں۔ اگر ایسی دنیا تعمیر کرنی ہے اور اگر حضرت سعدی کے ان شعروں کا مصداق بننا ہے کہ

بنی آدم اعضائے یک دیگراند ۔۔۔ کہ در آفرینش زیک جوہراند

چو عضوے بدرد آورد روزگار ۔۔۔ دیگر عضو ہا را نماند قرار

تو باہمی نفرت اور عداوت، تعصب اور تنگ دلی کو دور کرنا ہوگا اور ایسے خیالات ان نظموں میں ظاہر کیے جائیں گے جو بچوں کے ذہن میں انسانی وحدت اور محبت کی فضا قائم کرنے میں مفید ثابت ہو۔

(۷) ہم بیماری میں کڑوی دوا تک شیرینی میں لپیٹ کر کھلا سکتے ہیں۔ جب بچوں کی بھلائی ہمارے پیش نظر ہے تو ہم کو طرز ادا اور اسلوب بیان بھی ایسا اختیار کرنا چاہیے کہ بچے خوشی خوشی ان نظموں کو پڑھیں۔ اَن مل بے جوڑ چیزیں بھی بچوں کی دلچسپی کا موجب بنتی ہیں۔ تاہم اگر دلچسپ طریقے سے پیش کی جائے تو سنجیدہ سے سنجیدہ بات بھی بچے شوق سے پڑھ لیتے ہیں۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے حسب موقع لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔

غرض یہ چند خاص باتیں ہیں جو بچوں کی نظموں میں ہونی چاہئیں اور اکثر شعراء جو بچوں کے لیے نظمیں لکھتے ہیں اور علم و اخلاق کی نعمت سے بھی بہرہ مند ہیں وہ اپنی ایسی نظموں میں کم و بیش اس قسم کی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان میں سے اکثر باتیں بنیادی ہیں۔ حضرت مرحوم کی نظموں کا یہ مختصر سا مجموعہ "بہارِ طفلی" میرے خیال میں کم و بیش مذکورہ تمام خصوصیات کا حامل ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے میں ان خوبیوں کو ابھارنا چاہتا ہوں۔

"بہارِ طفلی" حضرت مرحوم کے ایسے کلام کا جزوی انتخاب ہے جو بچوں کی تعلیمی اور اخلاقی ضرورتوں کے لیے خاص طور پر

موزوں ہے۔ ورنہ بقول جگن ناتھ آزاد صاحب "ابھی آپ کا اسی نوع کا معتد بہ کلام اور بھی موجود ہے، جو حسب موقع شائع کیا جائے گا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے ہاں ایسے شعراء کی کمی نہیں جو بچوں کے لیے لکھنے کے مدعی ہیں۔ لیکن ایسے اصحاب دو شقوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جن میں شاعری کا ذوق اور ملکہ خداداد ہے، اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے شاعری کو تعلیمی ضرورت یا تعلیمی اغراض کی تکمیل کے لیے اختیار کیا ہے۔ بچوں کی شاعری میں میرا خیال یہ ہے کہ شاعری اور تعلیم دونوں کی شمولیت زیادہ مفید اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ اس بحث کو طول دینے سے احتراز کرتے ہوئے میں اس امر پر زور دینا چاہتا ہوں کہ حضرت محروم میں یہ دونوں خوبیاں بوجوہ احسن موجود ہیں۔ آپ کو خدا کی طرف سے ذوق و ملکۂ شاعری اس معیار کا عطا ہوا ہے کہ آپ اردو زبان کے شعراء کی صف اول میں شامل ہونے کے مستحق ہیں پھر آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ چونکہ تعلیم اور مقاصد تعلیم کی تکمیل میں صرف ہوا ہے۔ اس لیے تعلیمی ضروریات اور بچوں کی نفسیاتی خصوصیات کا جیسا مطالعہ کرنے کا موقع آپ کو ملا ہے، بمشکل ہی کوئی دوسرا شاعر اور معلم اس کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ پھر آپ کی خلقی نیکی اور اخلاق و تمدن کے مشرقی آداب سے لگاؤ اور اردو زبان پر غیر معمولی دسترس ایسی باتیں ہیں جو آپ کو بچوں کی شاعری میں بھی امتیازی درجہ دینے کی تائید کرتی ہیں۔

پیش نظر مجموعہ یعنی "بہار طفلی" کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں طبع زاد نظمیں ہیں ان کی تعداد چوبیس ہے دوسرا حصہ انگریزی نظموں کے ترجموں پر مشتمل ہے اور تیسرا حصہ اخلاقی قطعات پر۔

ہر ایک قطعہ کسی اخلاقی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ اور ترجمے ایسی نظموں کے ہیں جو ہندوستان میں نصاب کی انگریزی کتابوں کے ذریعے مقبول ہو چکی ہیں۔ اور اپنی اخلاقی اور تعلیمی خوبیوں کے لحاظ سے ہندوستان کے ہزاروں ہی بچوں نے یاد کی ہوں گی۔ انھیں چھوڑ کر میں طبع زاد نظموں پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے اور جس کا اظہار اختصار کے ساتھ میں صفحات ماسبق میں کر بھی چکا ہوں۔ میں کسی پاکیزہ عقیدے کی پختگی کو تربیت کی بنیاد سمجھتا ہوں۔ اس میں خدا کا عقیدہ بھی شامل ہے۔ حضرت محروم نے خدا کی تعریف میں بہت بلند پایہ نظمیں لکھی ہیں۔ آپ خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہیں، اور اس کی ذات آپ کے نقطۂ نظر سے ایسی مرکزی حیثیت رکھتی ہے کہ فطری طور پر ہر شخص اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

خدا کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے بچے کی زبان سے یہ دعا کرائی ہے، جو حقیقت پر مبنی ہونے کی وجہ سے نہایت موثر انداز رکھتی ہے ؎

حاضر ہیں تیرے در پر پروردگار ہم بھی | ہیں رحم اور کرم کے امیدوار ہم بھی
علم و عمل کا رستہ یارب ہمیں دکھا دے | جس سے ملے سعادت اس راہ پر چلا دے
یارب تری رضا کے طالب رہیں ہمیشہ | نیکی کریں، بدی پر غالب رہیں ہمیشہ
عقبیٰ کی سرخروئی، دنیا کی کامگاری | حاصل ترے کرم سے ہم کو ہو ذات باری
وہ علم دے ہو جس سے دانش کا نور دل میں | پروردگار دیکھیں تیرا ظہور دل میں

یہ چند اشعار اگر بچے کو یاد ہو جائیں تو قدم قدم پر غور و فکر کا سامان اس کے لیے مہیا کر دیں گے۔ مجھے ڈاکٹر اقبالؔ کی دعا کے یہ شعر جو بچپن میں یاد ہو گئے تھے، زندگی میں ہزاروں ہی دفعہ یاد آئے ہیں ؎

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو | راہ جو نیک ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو
دکھ بھی آجائے تو ہو دل نہ پریشاں میرا | شکر ہر حال میں ہو میری زباں پر تیرا

اور ہمیشہ ان اشعار نے بڑا خوش گوار اثر مجھ پر چھوڑا ہے۔

اس دعا کے بعد دوسری نظم آپ کی "شکر" کے عنوان پر ہے۔ اس میں بھی خدا کی نعمتوں اور عنایتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان پاکیزہ نعمتوں میں سے بعض کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ یعنی اے خدا! تیرا شکر ہے کہ تو نے ؎

محبت سے دل کو کیا شاد میرے | دیا تو نے ماں باپ کا سر پہ سایا
دیے مجھ کو بھائی بہن پیارے پیارے | محبت کا ہر سمت دریا بہایا

سونے پر سہاگا اسی کا نام ہے۔ ایک طرف خدا کا شکر ادا ہو رہا ہے دوسری طرف ماں باپ، بہن بھائیوں کی محبت کی طرف ذہن منتقل ہو کر سماجی زندگی کو بہتر بنانے کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ یہ باتیں صرف شاعر سے بن نہیں پڑتیں جب تک معلمی سے بھی وابستگی نہ ہو۔

نیا سال آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ ہم لوگ بس رسمی مبارکباد دینے پر اپنی خوشیوں کو محدود کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ موقع گذشتہ زندگی کے احتساب اور آئندہ زندگی کی تمناؤں کی تکمیل کے لیے مناسب ارادوں کے لیے موزوں ہے حضرت مرحوم اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اس موقع پر بچوں کو مبارکباد دیتے ہوئے آپ کچھ ایسی کارآمد نصیحتیں فرماتے ہیں جو بچوں کے دل میں نئے مقاصد کی تعمیل و تکمیل کے سلسلے میں سعی و کوشش کے آغاز کے لیے ضروری ہیں ؎

طبیعت میں پیدا نئی تازگی ہو | نئے تم، نیا دل، نئی زندگی ہو
امیدیں نئی دل کو پھر گدگدائیں | امنگیں نئی پھر نیا رنگ لائیں

نئے سر سے میدان ہمت میں آؤ   نئے قابلیت کے جوہر دکھاؤ
پڑھو اور محنت سے تم نام کر لو   بڑھے جس سے عزت وہی کام کر لو

اگرچہ یہ پیرایہ براہِ راست نصیحت کا ہے، مگر میں اسے جائز سمجھتا ہوں کیوں کہ یہ امور سالہا سال کے بزرگانہ تجربوں پر مبنی ہیں اور گذشتہ تجربوں سے واقفیت حاصل کر کے ان سے فائدہ اٹھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یہی جذبہ آپ نے اس مجموعے کی دوسری نظموں میں بھی ابھارا ہے۔ ارادے کے بعد عمل کا نمبر آتا ہے۔ عمل پر ابھارنے کے لیے آپ نے "کام" اور "اچھے کام" پر نظمیں لکھی ہیں، مثلاً ؎

ہو کبھی انساں نہ بے دل کام سے   کیوں کہ ہوتا ہے یہ کامل کام سے
کام میں ہیں مہر و ماہ و ابر و باد   سج گئی دنیا کی محفل کام سے
اہلِ ہمت کا ہے خود حامی خدا   برکتیں ہوتی ہیں نازل کام سے
عزتیں محنت سے پاجاتے ہیں لوگ   مرتبے ہوتے ہیں حاصل کام سے

آخر میں فرماتے ہیں ؎

دین و دنیا سے گیا محروم وہ   ہو گیا جو شخص غافل کام سے

محرومؔ تخلص نے جو لطف اس شعر میں پیدا کیا ہے وہ حضرت مومنؔ کے تخلصوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ "اچھے کام" نظم کی تان اس آخری شعر پر ٹوٹی ہے ؎

پابندیوں تو سب ہیں زمانے میں کام کے
اچھے وہی ہیں کام جو ہیں فیضِ عام کے

غور فرمائیے اس شعر کے مفہوم پر۔ اگر بچہ غور کرے اور وہ کسی اچھے استاد کی رہنمائی سے فیضِ عام کے کاموں کی حقیقت اور اہمیت سے واقف ہو جائے تو کس قدر خوش گوار اثر اس کی زندگی پر پڑ سکتا ہے، اور ایسا شہری، شہری زندگی کا کس قدر مفید رکن بن سکتا ہے۔

کام میں تحصیلِ علم بھی شامل ہے۔ کتاب حصولِ علم کا وسیلہ ہے۔ آپ نے بھی ایک نظم "کتاب" کے عنوان پر لکھی ہے اور جو فوائد کتاب سے حاصل ہو سکتے ہیں خواہ وہ کسی درسگاہ کی تعلیم یا کسی اچھے معلم سے یا ذاتی مطالعہ سے آپ نے بڑی حد تک اس چھوٹی سی نظم میں یکجا کر دیے ہیں۔ چند منتخب اشعار پیش ہیں ؎

بہتر کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے   اچھا کوئی شفیق نہیں ہے کتاب سے

روئے زمیں کے سارے مظاہر اسی میں ہیں ‏ باغ جہاں کے سارے مناظر اسی میں ہیں

بیسیوں چیزوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں ؎

ہر اک کا حال اور ہر اک کی کہانیاں ‏ ہم کو سنا کے کرتی ہے کیا دلستانیاں

کھولو اسے کہ اس میں خزانہ ہے علم کا! ‏ اٹھو، پڑھو کہ زمانہ ہے علم کا

مولانا حالیؔ نے اپنی ایک مشہور نظم میں فرمایا تھا ؎

گیا دورہ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری ‏ جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عملداری

جنھیں دنیا میں رہنا ہے، رہے معلوم یہ ان کو ‏ کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری

حضرت محروم اپنی نظم میں آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

بے علم کی ذرا بھی ضرورت یہاں نہیں ‏ کچھ بھی نہیں جو علم کی دولت یہاں نہیں

لڑکو! لگاؤ دل کو تم اپنی کتاب میں ‏ مانگو دعا پہنچ کے خدا کی جناب میں

یہ کیوں؟ بقول حضرت جگر مراد آبادی ع

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

خدا کی مہربانی ہی سے یہ راہ طے ہو سکتی ہے۔ نہ تو دولت ہی سے طے ہو سکتی ہے اور نہ طاقت سے۔ اس دعا پر اس نظم کا خاتمہ ہے ؎

پروردگار دے مجھے الفت کتاب کی ‏ بھر دے تو میرے دل میں محبت کتاب کی

جب تک کہ دم میں دم ہے میں اس سے جدا نہ ہوں ‏ اور اپنے ایسے دوست سے غافل ذرا نہ ہوں

مولانا حالی کی نظم بھی اپنی مثال آپ ہے۔ مگر قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ بچوں کے لیے نہیں ہے۔ حضرت محروم کی نظم موزوں اور برمحل ہے۔

حصول علم کے لیے کتاب ہی نہیں بلکہ محنت بھی ضروری ہے۔ بلکہ محنت ایک ایسا سرمایہ ہے جو ہر موقع پر کام آتا ہے دنیا کی عام زندگی میں محنت سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے اس بند میں گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور یوں سمجھیے کہ ایک مشفق استاد کے دیرینہ تجربے کا نچوڑ ہے ؎

گر چاہتے ہو عزت محنت سے وہ ملے گی | درکار اگر ہے شہرت محنت سے وہ ملے گی
ہے جس کا نام دولت محنت سے وہ ملے گی | کہتے ہیں جس کو قسمت محنت سے وہ ملے گی

محنت کرو عزیزو محنت سے کام ہو گا

جو لوگ محنت نہیں کرتے اور کاہلی میں اپنا وقت گزارتے ہیں ان کا حشر بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جو حرف بحرف صحیح ہے ؎

کاہل جو ہیں جہاں میں ان کا مآل دیکھو | افلاس اور مرض سے ہیں خستہ حال دیکھو
رہتے ہیں ہر گھڑی وہ غم سے نڈھال دیکھو | جو لوگ محنتی ہیں، وہ ہیں نہال دیکھو

محنت کرو عزیزو، محنت سے کام ہو گا

مشتے نمونہ از خروارے، میں نے خاصی طویل نظموں کے مختصر اقتباس پیش کئے ہیں اور ان کی شرح میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے مطلق مبالغے سے کام نہیں لیا۔ "بہار طفلی" کی تمام نظموں کو اس طرح پیش کرنا غیر ضروری ہے کیوں کہ "مشک آں ست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" اس قسم کی اعلیٰ درجے کی نظموں میں "صفائی" "ہم ہرگز جھوٹ نہ بولیں گے"۔ "بدزبانی سے پرہیز کرو" اور "ادب" وغیرہ ہیں۔ جو علم و اخلاق کی طرف بچوں کو متوجہ کرنے میں یقین ہے کہ مؤثر ثابت ہوں گی۔

مناظر فطرت میں بلبل، پھول، برسات بطور نمونہ پیش ہیں "ہمارا دیس" جیسی نظم بھی ہے۔ ان نظموں سے بچوں کی تخیئل کو شہ ملے گی۔ اور وطن کی عظمت اور محبت کا بیج ان کے دلوں میں بویا جائے گا۔ جو شاید آئندہ چل کر اس ملک کی خدمت پر انھیں آمادہ کر دے۔

ہم میں سے اکثر نے اقبال کی شہرۂ آفاق "بلبل کی فریاد" نظم پڑھی ہے۔ وہ غلامی کی زندگی سے آزادی کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ حضرت محروم کی بلبل والی نظم بھی یقین ہے کہ افادی حیثیت سے اقبال کی نظم کی طرح اعلیٰ درجہ پائے گی مثلاً خود بلبل کی زبان سے سنیے ؎

لڑکو! اگر ہو دانا بتلاؤ بھید کیا ہے | ہے کیا سبب کہ دلکش اتنی مری صدا ہے
آؤ تمھیں بتادوں اس کا سبب عزیزو | تم غور کر کے سننا یہ بات سب عزیزو
وہ خالق دو عالم یعنی خدا ہمارا | ہر ایک پیاری شے سے ہے جس کا نام پیارا
ہم سب کا وہ خدا ہے، ہم سب پہ مہربان ہے | دیکھو تو اس کی قدرت ظاہر جہاں نہاں ہے

کرتا ہے پیار ہم کو وہ باپ ہے ہمارا اور ہر گھڑی نگہباں وہ آپ ہے ہمارا

ہوں گیت روز و شب میں اس کی ثنا کے گاتی

باعث یہی ہے لڑکو! ہوں سب کے دل لبھاتی

حضرت اقبالؔ نے بچوں کی دعا میں ؎

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

میری خوشبو سے معطر ہو زمانہ سارا بن کے بلبل ہو مرے حسن پہ دنیا شیدا

کیسے پیارے جذبے کا اظہار کیا ہے۔ ان اشعار کو پیش نظر رکھیے اور حضرت محرومؔ کا خطاب بھی پھول سے سنیے ؎

اے پھول کاش ہو مری قسمت تری طرح حاصل ہو رنگ و بوئے محبت تری طرح

جیسے عزیزِ خلق ہے تو کاش میں بھی ہوں دلشادِ باغِ دہر میں تیری طرح رہوں

میری شمیم خلق بھی پھیلے تری طرح آنکھوں پہ مجھ کو خلق بٹھائے تری طرح

زینت پذیر تجھ سے ہے جیسے ترا چمن مجھ سے بھی پائے رونق تازہ مرا وطن

تیرا نصیب باغِ جہاں میں جو پاؤں میں اے گل خدا کے شکر کے سو گیت گاؤں میں

میں نے بچوں کی شاعری کا جو تجزیہ پیش کیا ہے، آپ دیکھیے کہ حضرت محرومؔ کی یہ نظمیں قدم قدم پر کس حد تک میرا ساتھ دے رہی ہیں اور میرے خیالات کی تائید میں پیش پیش ہیں۔

رہا کھیل کود تو اس کا مآل تندرستی ہے اور یہی مقصد حضرت محرومؔ کے بھی پیش نظر ہے۔ "اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست" یہ دعا ایسی ہے کہ ہر شخص اس کی صداقت کا معترف ہے۔

بقول نظیر اکبرآبادی ؎

جتنے سخن ہیں سب سے سخن ہے یہی درست اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

آپ نے بھی اپنی نظم کا عنوان "تندرستی ہزار نعمت ہے" رکھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کوئی کہتا ہے کہ دنیا میں ہے دولت اچھی ہے کسی شخص کی دانست میں حکمت اچھی

کوئی کہتا ہے کہ اچھی ہے طبیعت اچھی کوئی کہتا ہے کہ اچھی ہے تو صورت اچھی

میں یہ کہتا ہوں کہ ہر شے سے ہے صحت اچھی

ایک ہی تیر سے دو شکار ؎

علم کا شوق ہے گر دل میں تمہارے لڑکو | بات سن لو یہ مری غور سے پیارے لڑکو
گر نہیں جیتتے داؤں کے سہارے لڑکو | کام محنت سے سنور جائیں گے سارے لڑکو

ضم حاصل نہ ہو جب تک نہ ہو صحت اچھی

غرض صحت اور تندرستی کا دارو مدار ہے کھیل اور ورزش پر۔ گویا بالواسطہ آپ نے اس نظم کے ذریعے صبح کی ہوا خوری، دوسری جسمانی ورزشوں اور میدانی کھیلوں کی تلقین فرمائی ہے۔

عام معلومات کے لحاظ سے ہر نظم ایک کارآمد ذخیرہ ہے۔ تاہم "نمائشی گاڑی" کے عنوان پر نظم لکھ کر آپ نے معلومات کا ایک خزانہ بچوں کی چشمِ تصور کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

غرض حضرت محروم نے جو ریاض شاعری میں کیا ہے اور اس سرزمین میں جو ایک چمن زار کھلایا ہے "بہارِ طفلی" اس چمن کے ایسے شگفتہ پھولوں سے بھرپور ہے کہ جن کی خوشبو سے نہ صرف لڑکوں اور لڑکیوں کے مشام ذہن معطر ہوں گے۔ بلکہ اس کی خوشبو ساری زندگی بھر اس کی راہِ عمل کو معطر کرتی رہے گی۔

زبان کے بارے میں کیا عرض کروں؟ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دو ایسے بزرگوں کی رائیں پیش کر دوں جو اس بحث میں قول فیصل کا حکم رکھتی ہوں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب حضرت محروم کے "گنجِ معانی" جیسے ضخیم مجموعہ کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

> "اس کلام کو پڑھ کر جو گلزارِ شاعری کے رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ منشی تلوک چند محروم ایک ایسے مقام کے رہنے والے ہیں جسے اہلِ پنجاب بھی ایک گوشۂ دور افتادہ سمجھتے ہیں۔ ان کو زبان پر ایسی قدرت ہے اور ان کے بیان میں ایسی صفائی ہے کہ مدعیانِ زبان میں سے بھی ہر ایک کو نصیب نہیں۔"

نظم میں حضرت اکبر الہ آبادی کی رائے بھی سن لیجیے ؎

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم | لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز | ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

اس رباعی کا اطلاق "معانی کے ہجوم" کے اعتبار سے شاید "بہارِ طفلی" پر نہ ہو۔ اور میری رائے میں بچوں کی ان نظموں میں ہونا بھی نہیں چاہیے۔ تاہم لاریب "بہارِ طفلی" کا "سخن" بچوں کے لیے "مفید اور دانش آموز" ضرور ہے۔

خاتمۂ سخن میں محروم کی عام شاعری کے بارے میں، جو خیال شیخ عبدالقادر جیسے سخن فہم اور سخن شناس نے ظاہر کیا ہے اور جس کا وافر حصہ "بہار طفلی" کے حصے میں بھی آیا ہے، میری رائے میں وہ بالکل درست ہے۔ شیخ صاحب فرماتے ہیں۔

"محروم اپنے تخلص کی مناسبت سے دنیا کی بعض نعمتوں سے محروم رہے ہوں تو اور بات ہے، مگر خداداد لطفِ سخن اور موزونیٔ طبع سے انھیں حصہ وافر ملا ہے۔ اور ان کا کلام خلعتِ قبولِ عام سے محروم نہیں رہا۔ بڑے بڑے سخنوروں نے ان کی شاعری کو سراہا ہے۔ اور ان کے حسن بیان کی تعریف کی ہے۔"

"بندش کی چستی، خیالات کی پاکیزگی، حضرت محروم کے اشعار کی خصوصیات ہیں۔ مگر ان کی شاعری کا جو وصف مجھے خاص طور پر پسند ہے وہ یہ ہے کہ اس میں صلح و محبت کی تلقین ہے۔"

محروم کی شاعری کی کم و بیش یہی خوبیاں ان بچوں کے لیے مخصوص منظومات میں بھی ہیں۔ مجھ ناچیز کو یہ پایہ کہاں نصیب جو مذکورہ بزرگوں کو زبان و ادب میں حاصل ہے۔ تاہم ایک طالب علم کی حیثیت سے میں حضرت محروم کی خدمت میں خراج تحسین پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں کہ "بہار طفلی" میری دانست میں طالب علموں ہی کے لیے ہے۔ اور اس لحاظ سے میں اپنے تئیں اس خیال کا حقدار سمجھتا ہوں۔

منوہر سہائے انور

پنجاب کا بہترین نظم نگار

اگرچہ عہدِ مغلوں متاخرین کے نصفِ اول کا حصۂ آخر ختم ہونے سے قبل ہی پنجاب کے فارسی نگار شعراء نے ریختے کی طرف کم و بیش ملتفت ہو کر وہاں اردو شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا، مگر جب انتخاب ہفت کشور" انگریزوں کے زیرِ اقتدار آگیا اور اردو فارسی کی جانشین اور ذریعۂ تعلیم قرار دے دی گئی تو اس خطے کے سخن سراؤں کو اپنی طویل لسانی روایت سے دست بردار ہو جانے میں کچھ بہت دیر نہ لگی۔ چوں کہ اردو پنجاب کی متوافق زبانوں سے بدرجۂ غایت صرفی و نحوی مماثلت رکھنے کے باعث فارسی کے مقابلے میں زیادہ سہل الحصول تھی اور اس کا فارسی رسم الخط بھی مدتہائے مدید سے چشم آشنا چلا آتا تھا، اس لیے وہ جلد مقبولِ عام ہو گئی اور اس میں کتبِ نظم و نثر اور رسائل و جرائد کی اشاعت کا بازار ایسا گرم ہوا کہ دہلی اور لکھنو حیران رہ گئے۔

انگریزوں نے اردو کا حلقۂ نفاذ وسیع کرنے کے علاوہ اس کی اہم علمی خدمات بھی انجام دیں۔ مثلاً اردو گرامریں اور ڈکشنریاں خود تیار کیں اور عمدہ عمدہ کتابیں نامور اہلِ زباں سے تصنیف، تالیف اور ترجمہ کرائیں۔ ہر چند شیکسپیئر، پلیٹ، فوربس اور فیلن جیسے متعدد علم دوست انگریزوں کا تمام تر کام اردو کے لسانی پہلو سے تعلق رکھتا تھا۔ اور ان کی توجہ جمود زدہ ادب کو حرارت بہم پہنچا کر متحرک کرنے کی جانب منعطف نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پنجاب میں جس اولوالعزم مجاہد نے اس مہم کا آغاز کیا وہ بھی انھیں کا ہم قوم تھا۔

جن دنوں پنجاب کا سررشتۂ تعلیم کرنل ہالرائیڈ کے زیرِ اہتمام تھا انھیں دنوں مولوی محمد حسین آزاد دہلوی اور خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی ملازمت کے تعلق سے لاہور میں مقیم تھے۔ کرنل ہالرائیڈ نے جو ایک مدت سے اردو شاعری میں تازگی اور توانائی پیدا کرنے کے وسائل تلاش کر رہے تھے آزاد اور حالی کی ادبی لیاقت اور استعداد قبول کا اندازہ کر کے انھیں مشورہ دیا کہ وہ شعر و سخن کو ایک نئی ڈگر پر ڈالنے کے لیے متنوع موضوعات پر مربوط نظمیں لکھا کریں۔

یہ تھا وہ زمانہ جس میں "نظم جدید" کی بنیاد پڑی اور لفظ "نظم" کا ایک نیا مفہوم سامنے آیا۔ حالی کی حبِ وطن، برکھا رت، امید، مناظرۂ رحم و انصاف وغیرہ، اور آزاد کی متعدد نظمیں اسی زمانے میں تصنیف ہوئیں۔ ان نظموں کی تازگی طرفگی اور بے ساختگی دیکھ کر روشن خیال شعراء آزاد اور حالی کی نرالی روش پر چلنے لگے۔ اسمٰعیل میرٹھی نے نوخیز طالبانِ علم

کی دل چسپی کے لیے عام حقائق پر خامہ فرسائی کی۔ شبلی نعمانی نے سیاسی مسائل پر اپنی منظوم نگارش کی بنا رکھی اور اکبرالہ آبادی نے طنز و تعریض کے میدان میں سخن طرازی کا علم بلند کیا۔

محرومؔ کی نظم نگاری کے زمانۂ آغاز میں آزاد، حالیؔ، اسمٰعیل اور اکبر اپنے انتہائی عروج پر تھے اور سورج نرائن مہر برج موہن کیفی، خوشی محمد ناظر، اقبال، غلام بھیک نیرنگ، ظفر علی خاں وغیرہ کی نظمیں مقبولِ خاص و عام تھیں۔

محرومؔ کی ولادت دسمبر ۱۸۸۷ء میں ہوئی۔ ان کا مسقط الراس تحصیل عیسیٰ خیل ضلع میانوالی کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو دریائے سندھ کی طغیانی میں بہہ گیا۔ انھوں نے جس ماحول میں اپنی عمر کا ابتدائی حصہ بسر کیا وہ مطلقاً دیہاتی تھا۔ ان کو اپنی زاد بوم اور اس کے گرد و نواح میں کسی اہل علم یا شاعر کی صحبت تو میسر نہیں آئی، لیکن صحیفۂ قدرت کے اوراق چپے چپے پر پھیلے ملے۔ وہ انھیں کا مطالعہ بچشم غائر کرتے رہے جو ان کے حق میں رسمی تعلیم سے بدرجہا مفید تر ثابت ہوا۔ جو اطفال مبدا فیاض سے ذہن اخاذ اور طبع وقاد لے کر آتے ہیں۔ ان کو بلوغت سے پہلے ہی کہنہ رسی اور دقیقہ فہمی کی استعداد حاصل ہو جاتی ہے اور ان کی رفتار، گفتار اور کردار سے ایسی متانت، ثقاہت اور نفاست کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسی عمر رسیدہ، جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ اشخاص کے اطوار، اقوال اور اعمال میں نظر آیا کرتی ہے۔ محرومؔ کا بھی یہی عالم تھا۔ وہ کم سنی میں پختہ مغز اور طفلی میں بالغ نظر ہو گئے تھے۔ ان کو باغ و راغ اور دشت و دریا کی سیر کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ وہ پڑھتے کم اور پھرتے زیادہ تھے۔ انھوں نے رسمی تعلیم سے فیض پایا اور خوب پایا۔ لیکن جن وسائل سے ان کی روح کو بالیدگی حاصل ہوئی اور نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا وہ قدرتی مناظر کے دل کش نظارے تھے۔ انھیں نگارخانہ عالم کے ہر نقش میں حسن نظر آیا جسے انھوں نے اپنی حسن پرست طبیعت میں ایسا جذب کیا کہ وہ اس کے قوام کا قومی عنصر بن گیا۔ وہ شعر و سخن سے فطری مناسبت رکھتے تھے اور اسی کی بدولت دس ہی برس کی عمر میں نظم نگاری کا آغاز کر کے بہت جلد کہنہ مشق اور پختہ کار ہو گئے۔ ان کی دلآویز نظمیں ۱۹۰۶ء سے یعنی انٹرنس پاس کرنے سے ایک سال پہلے ہی "زمانہ" کانپور اور "مخزن" لاہور کے صفحات کی زینت بن کر منظر عام پر جلوہ گر ہونے لگی تھیں۔ اس کے بعد ان کی شہرت یوماً فیوماً بڑھتی گئی اور ۱۹۱۹ء سے پیشتر انھیں بھی اپنے جواں سال ہمنوا برق دہلوی، چکبست لکھنوی وغیرہ کی طرح قبول عام کی سند مل گئی اور ان کا مقام اعلیٰ نظم نگاروں کی صف میں متعین ہو گیا۔ نظم جدید کے اساطین اولین میں سے آزاد ۱۹۱۳ء میں حالی اور شبلی ۱۹۱۴ء میں اور اسمٰعیل ۱۹۱۷ء میں رحلت کر گئے تھے اور محرومؔ کو ۱۹۱۹ء میں داد سخن دینے کے لیے صرف اکبر کا دم باقی رہ گیا تھا۔ اکبر نے کلام محرومؔ سے متاثر ہو کر اپنے تاثرات کا اظہار اس رباعی میں کیا۔

ہے داد کا مستحق کلامِ محرومؔ	لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز	ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

اس وقت یعنی جنوری ۱۹۶۲ء تک ان کی نظم نگاری کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی ہے۔ اس مدت میں انھوں نے معرفت، مظاہر قدرت، مناظر فطرت، آزادیٔ وطن، تحریکات سیاسی، روایات مذہبی، واقعات و آثار تاریخی، رہنمایان قوم، تشدد حکام، تعلیم، سودیشی، اخلاق، موعظت وغیرہ موضوعات پر بکثرت نظمیں لکھنے کے علاوہ رباعیات، غزلیات، مراثی اور اطفال خورد سال کے لیے ہلکی پھلکی منظومات قلم بند کر کے اپنی قادر الکلامی کی دھاک بٹھا دی ہے۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام میں سے گنج معانی، کاروان وطن، رباعیات محروم اور بہار طفلی، نیرنگ معانی، شعلۂ نوا شائع ہو چکے ہیں۔ اور دو آتشہ، مقاماتِ برتری کی اشاعت عنقریب ہونے والی ہے۔

اس مختصر مقالے میں محروم کی نگارشوں پر سیر حاصل بحث تو ممکن نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ان کی نمایاں خصوصیات کی طرف اشارہ کر دیا جائے تاکہ ناظرین اس وہبی سخنور کے تمام کلام کا مطالعہ خود کر کے آزادانہ رائے قائم کر سکیں۔

اگرچہ محروم نے ہمہ گیر طبیعت پائی، مگر اس کا میلان زیادہ تر حزنیت کی جانب رہتا ہے۔ ان کو ۱۹۱۵ء میں اپنی رفیقۂ حیات کی بے وقت وفات سے جو تاب شکن صدمہ پہنچا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے درد و کرب اور سوز و گداز کا پیکر بن گئے۔ وہ حسب حال کہتے ہیں ؎

آہیں وہی اور اشک باری ہے وہی ابر آلام دل پہ طاری ہے وہی
مردہ ہوں کہ لطف زیست سے ہوں محروم زندہ ہوں کہ دل کی بیقراری ہے وہی

انھوں نے مرحومہ کی دائمی مفارقت پر جو نظمیں "طوفانِ غم" کے زیر عنوان لکھیں وہ نہایت دل گداز اور رقت انگیز ہیں ارباب نظر ان کی تصانیف میں جمالیاتی احساس کی شدت، دل گداختگی اور جگر برشتگی، جذبات کا خلوص، وطن اور قوم سے والہانہ دل بستگی، تفصیل اور ایجاز کا توازن، محل اور مقام کے مطابق الفاظ وغیرہ دیکھ کر بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ جب محروم اپنی نظموں میں ارتقائے خیال کے ساتھ ساتھ لطف بیان کی فراوانی کرتے چلے جاتے ہیں۔ تو حسن گفتار بیش از بیش ہوتا جاتا ہے۔ وہ اقبالؔ، برقؔ دہلوی اور چکبستؔ سے کم اور سرور جہاں آبادی سے زیادہ اثر پذیر معلوم ہوتے ہیں زود گو بسیار گو تو ہوتے ہیں لیکن نغز گو نہیں ہوتے۔ گویا زود گوئی اور نغز گوئی میں یک گونہ منافات ہے لیکن محروم کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ بیک وقت زود گو، بسیار گو، اور نغز گو ہیں۔ ان کی صاف اور سلیس زبان کے متعلق بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا تھا۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ منشی تلوک چند محروم ایسے مقام کے رہنے والے ہیں جسے اہل پنجاب بھی

ایک گوشۂ دور افتادہ سمجھتے ہیں۔ ان کو زبان پر ایسی قدرت اور ان کے بیان میں ایسی صفائی ہے کہ مدعیانِ زبان میں سے بھی ہر کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی۔"

میں نے محروم کو پہلی بار ۱۹۲۰ء میں دیکھا تھا، جب وہ اور برق دہلوی پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لینے لاہور آئے تھے۔ انھوں نے کسی استاد سے اصلاح نہ لینے اور علمِ عروض، علمِ معانی اور علمِ بیان کا بقدر بایست مطالعہ نہ کرنے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ذوق و وجدان ہی کو اپنا خضرِ طریق بتایا تھا۔

ان کی شاعری اب بھی ویسی ہی جوان ہے جیسی ۱۹۲۰ء میں تھی، اور بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ عصرِ حاضر میں پنجاب کے بہترین نظم نگار ہیں۔

غزل

تجھ کو ہے ذوقِ سکوں اے دلِ بیتاب ابھی ۔۔۔ صبح ہے اور ہے تو منتظرِ خواب ابھی

ابھی اندیشۂ تاراجِ خزاں باقی ہے ۔۔۔ وقت ہنسنے کا نہیں اے گُلِ شاداب ابھی

فکرِ تعمیر بھی غافل نہیں، بے بس ہے مگر ۔۔۔ کہ جنوں خیز ہیں تخریب کے اسباب ابھی

جس سے دنیا کی جراحت کا مداوا ہو جائے ۔۔۔ نوشدارو وہ زمانے میں ہے نایاب ابھی

قیس و فرہاد کی تقلید پہ مرنے والے ۔۔۔ دشت و کہسار میں ہیں نقش وہ آداب ابھی

فیضِ قدرت میں کمی کوئی نہیں ہے لیکن
پھر بھی محتاج ہے یہ عالمِ اسباب ابھی

محروم

نصیرالدین ہاشمی

محروم کے کلام پر طائرانہ نظر

میرے عزیز دوست جگن ناتھ صاحب آزاد نے مجھ سے خواہش فرمائی کہ میں ان کے والد محترم محروم کے کلام پر کوئی مضمون رسالہ پگڈنڈی کے لیے تحریر کروں۔

محروم کے کلام پر اظہار خیال کرنا میرے لیے گویا چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہوگا۔ مگر آزاد صاحب کے حکم کی تعمیل میں یہ مختصر مضمون قلم بند کیا گیا ہے۔

حضرت تلوک چند محروم اردو کے نامور اور مشہور شعرا کی صفِ اول میں شامل ہیں، جن پر اردو زبان خود ناز کر سکتی ہے۔ پنجاب کے اردو دوست خطّے سے آپ کا تعلق رہا اور اب دہلی آپ کی بود و باش پر فخر کر سکتی ہے۔

حضرت محروم کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو گئے ہیں جن میں مختلف اصنافِ سخن شامل ہیں۔

گزشتہ ربع صدی کے اردو گو شعرا کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ کسی نے غزل گوئی میں نام آوری حاصل کی ہے تو کسی نے نظم نگاری میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ کسی نے رباعی کو اپنے خیالات کی جولانگاہ بنایا تو کسی نے مرثیہ اور سلام کو اپنے اظہارِ خیال کے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ ایسے بہت کم شعرا ہوں گے جنھوں نے شاعری کی ہر ایک صنف پر طبع آزمائی اور خیال آفرینی کے لافانی نقش ثبت کیے ہوں۔ انھی چند مخصوص شعرا میں حضرت محروم کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ آپ کی وطنی نظمیں ہوں یا غزلیں، رباعیات ہوں یا سلام، نوحے، بچوں کی نظمیں ہوں یا غیر زبان کا ترجمہ ہوا کلام، ہر ایک صنفِ سخن بلند پایہ ہے اور اس لحاظ سے آپ کو بہترین شعرا کی صف میں شامل کرنا حق بجانب ہے۔ آپ کی نظموں پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ آپ نے مختلف النوع موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً 'کاروانِ وطن' جو آپ کے سیاسی کلام کا مجموعہ ہے اس کے متعلق حضرت نیاز فتح پوری نے تحریر فرمایا ہے۔

"میں اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود ذہن و فکر کے لحاظ سے وہ مجھ سے بہت بڑے نکلیں گے اتنے بڑے کہ ان کی بالکل ابتدائی نظموں کے سمجھنے کے لیے مجھے ایک قرن پہلے یا ایک قرن بعد پیدا ہونا چاہیے تھا۔ پھر اگر ان کے منظومات صرف غزلوں یا منظری نظموں تک محدود ہوتے تو شاید میں اس قدر مرعوب نہ ہوتا، لیکن

جب میں نے دیکھا کہ وہ ۱۹۰۶ء میں یعنی جب کہ ان کی عمر ۱۹ سال کی تھی اور میری ۲۱ سال کی،
وہ اپنی ایک وطنی نظم میں اتنی بات سوچ سکتے تھے کہ

اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کر دے

تو میں اپنے اندر بڑا احساسِ کمتری پاتا ہوں۔"

یہ علامہ نیاز فتحپوری تحریر فرماتے ہیں جو آج کل دنیائے علم و ادب کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہیں۔

"کاروانِ وطن" میں یوں تو اصنافِ سخن میں سے نظم، غزل، رباعی موجود ہیں۔ لیکن نظموں کا حصہ زیادہ ہے۔ اس مجموعہ میں ۱۸۲ عنوانوں پر آپ کا کلام مشتمل ہے۔ رباعیات اور قطعات اس کے علاوہ ہیں۔

حضرت محروم کی قومی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں کس قدر جوش ہے، کس قدر وطن پرستی ہے، کس قدر بے خوفی ہے، کس قدر نڈر پن ہے۔ کس قدر حب وطنی ہے، اس کا ایک ایک شعر اپنی گہرائی اور بلندی کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ جوش اور جرأت کے لحاظ سے بھی قابلِ تحسین و مرحبا ہے۔

یہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ کلاسیکل اردو شاعری میں وطنیت کا حصہ بہت کم ملتا ہے لیکن حضرت محروم کا مجموعہ "کاروانِ وطن" دیکھنے کے بعد اردو کی کلاسیکل شاعری کی وطنیت پر جو مواد ملتا ہے وہ کسی دوسری زبان کی وطنیت کی شاعری سے کم نہیں ہے۔ اس کو پڑھ کر اردو شاعری کی تہی دامنی کا گلہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس پر حرف گیری ہو سکتی ہے۔

یہ ایک حقیقت نفس الامر ہے کہ جو شاعری آورد سے کی جاتی ہے اس میں خیالات کی بلندی ہوتی ہے اور نہ خیالات میں گہرائی، نہ اصلی جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے اور نہ اسلوب میں روانی۔ لیکن جو شاعری آمد ہوتی ہے وہ ہر لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہوتی ہے۔ اس میں خیالات بلند سے بلند تر۔ افکار عمیق سے عمیق تر۔ جذبات خفیف پرواز اور اسلوب میں قدرت اور جدت آفرینی کے جوہر ہوتے ہیں۔ حضرت محروم ان شعرا میں شامل ہیں جن کی شاعری میں آمد ہی آمد ہے۔ آورد کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

"کاروانِ وطن" کے ۱۸۲ عنوانات پر جو کلام چار سو سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس پر اظہارِ خیال کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک ضخیم مقالے کی ضرورت ہے۔

"کاروانِ وطن" دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک حصہ میں آپ کی وطنی شاعری کے آغاز یعنی ۱۹۰۶ء سے چالیس سال یعنی ۱۹۴۷ء تک کا کلام شامل ہے اور دوسرا حصہ ۱۹۴۷ء یعنی آزادی کے بعد سے اس وقت تک کے کلام پر مشتمل ہے۔

شاعری میں مبالغہ، جھوٹ، تصنع سب کچھ جائز سمجھا جاتا ہے مگر محروم کی شاعری تمام تر سچائی پر مبنی ہے، اس میں جھوٹ تو کیا مبالغہ بھی نہیں ہے۔ آپ کے کلام میں جذبات کا خلوص پایا جاتا ہے۔ اندازِ بیان میں متانت، سنجیدگی پائی جاتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے "کاروانِ وطن" میں پچاس سال سے زیادہ عرصہ کا کلام شامل ہے۔ اس میں سے چالیس سال کا وہ زمانہ ہے جب کہ ہندوستان غلام بنا ہوا تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ ہندوستان کا ہر متنفس غلامی کی فضا میں سانس لیتا تھا۔ اس زمانے میں ملک اور اہل ملک کے لیے جس قسم کی وطنی شاعری کی ضرورت تھی وہ پوشیدہ نہیں۔ قوم کو جوش دلانے، ہمت دلانے، غیرت دلانے، احساس کمتری دور کرنے، ہمدرد میدان بننے، محب وطن بننے کے لیے جن امور کی ضرورت تھی وہ آپ کی شاعری سے بخوبی واضح ہوتے ہیں۔

آزادی کے بعد جو واقعات رونما ہوئے ان پر انسانیت کو محجوب اور شرمسار ہونا پڑا۔ انسان نے اپنی انسانیت کو چھوڑ کر شیطان کے زمرہ میں شامل ہو کر قتل اور خون ریزی کے جو بہیمانہ نمونے پیش کیے وہ انسانیت کے لیے بدنما سیاہ داغ ہیں۔ محروم نے اس پر بھی آنسو بہائے ہیں۔ پاکستان کو الوداع، عتاب وطن، صوفی اللہ داد خاں، پاکستان، وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو آزادی ملنے کے بعد لکھی گئی ہیں۔

"گنج معانی" درحقیقت گنج معانی ہے۔ یہ نظموں اور غزلیات وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ اس کلام کو کئی شعبوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ مثلاً حمد و معرفت، جذباتِ فطرت، مناظرِ قدرت، راماین کے سین، پند و نصائح، سیرِ گلستاں، نکاتِ شیکسپیر، یادِ رفتگاں، طوفانِ غم، تقریبات، تضمینات، قطعات وغیرہ اور پھر ہر شعبہ میں کئی کئی عنوان ہیں۔ ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہوتی ہے۔

"گنج معانی" کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس میں شاعری کے بہتر سے بہتر نمونے شامل ہیں۔ عام طور سے عمدہ کلام کی جانچ کے لیے تین معیار قرار دیے جاتے ہیں۔ یعنی سادگی، نازک خیالی اور اثر۔ سادگی سے یہ مقصود ہے کہ کلام سادہ اور صاف ہو۔ عام فہم ہو۔ ساتھ ساتھ قوانین فطرت سے متجاوز نہ ہو۔ نازک خیالی سے یہ مراد ہے کہ شاعر اپنے کلام کو نئی نئی تشبیہوں، جدت آفریں تمثیلوں اور خیالات کی ندرت سے مرصع کر کے دلچسپ، دل آویز بنا دے۔

نازک خیالی اور سادگی کا جمع ہونا بہت دشوار ہوتا ہے۔ مگر جو استادِ فن ہوتے ہیں وہ نہایت خوبی سے ان کو جمع کر دیتے ہیں۔ اثر آفرینی کے معنی یہ ہیں کہ شاعر مختلف نہج سے اپنے کلام کو پر تاثیر بناتا ہے۔ کوئی درد و غم سے اثر پیدا کرتا ہے۔ کوئی ہنسی مذاق سے تفریحِ طبع کا سامان پیدا کرتا ہے، کوئی حسن کی تصویر کھینچتا ہے۔ کوئی پند و نصائح اور اخلاق

کا سبق دیتا ہے۔ کوئی مناظرِ قدرت کی نقاشی کر کے اثر پیدا کرتا ہے۔

محروم کا کلام پڑھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اچھے کلام کی تینوں باتیں آپ کے یہاں ملتی ہیں اور ان لحاظ سے آپ کے کلام کی ستائش نہ کرنا ناقابلِ معافی جرم ہوگا۔

اس موقع پر اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ آپ کے کلام کے نمونے تائید میں پیش کیے جائیں۔ لیکن آپ کے کلام میں بیسیوں نقش ایسے ہیں جن میں سے کسی کو انتخاب کرنا اور کسی کو متروک کرنا نہایت دشوار ہے۔ صرف ایک عنوان کا اظہار کیا جاتا ہے۔

"گنجِ معانی" میں ایک عنوان "یادِ رفتگان" ہے۔ اس میں حضرت محروم نے جن مشاہیر کے متعلق اظہار خیال کیا ہے وہ یہ ہیں۔

خوابِ جہانگیر۔ نور جہاں کا مزار۔ مرزا غالب، غمِ نادر، ماتمِ طالب، نوحہ چکبست، ماتمِ گرامی۔ اسی کے ساتھ طوفانِ غم کے عنوان کے تحت کئی نظمیں اپنی اہلیہ کی وفات پر لکھی ہیں۔

ان تمام نظموں میں محروم نے جس طرح رنج والم کا اظہار کیا ہے اور آنسو بہائے ہیں اور اپنے دوستوں کی یاد میں صفِ ماتم بچھائی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ محروم کو مرثیہ نگاری میں کتنا ملکہ حاصل ہے۔

"نور جہاں" کے مزار کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے کہتے ہیں یہ آرام گہِ نور جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے اٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے ان کی شبِ دیجور کا عالم

اے حسنِ جہاں سوز کہاں ہیں وہ شرارے کس باغ کے گل ہو گئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے

تجھ سی ملکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بے چارگی اے ماتجوری ہے دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

حسرت ہے ٹپکتی درو دیوار سے کیا کیا | ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دل افگار سے کیا کیا | اٹھتے ہیں شرر آہِ شرر بار سے کیا کیا

یہ عالم تنہائی یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لیے ہُو کا نظارا

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر | آرام کیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپر | اڑ اڑ کے لگاتے ہیں درو بام کے چکر

معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی

طویل نظم ہے، جس کا ہر ہر شعر سوز و گداز کی بولتی تصویر ہے محروم کے تمام نوحے درحقیقت غمناک مرثیے ہیں۔
غزلیات کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

تو ہے نہاں مگر ترے جلوے کہاں نہیں | ہر لختِ سنگ آئینہ تیرے جمال کا

حسن کلام صدقۂ ورقِ جمال ہے | محروم شاعری کا ہمیں کب شعور تھا

ہمارے واسطے ہے ایک جینا اور مر جانا | کہ ہم نے زندگی کو جادۂ راہِ سفر جانا

وہیں تک ضبطِ وحشت میں دلِ بےتاب کوشاں تھا | ترے کوچے سے ہم نکلے تو پھر کوسوں بیاباں تھا

جتنی صفا تھی سب رخِ جاناں میں آگئی | جو داغ رہ گیا مہ کامل میں رہ گیا

کیا ہے قتل لیکن دیکھیے جاں کب نکلتی ہے | کسے کو رقصِ بے تابانۂ بسمل پسند آیا

عزیز ذلت کو کردیا ہے ذلیل عزت کو کردیا ہے		عدو کو سر پر چڑھا چڑھا کر نظر سے ہم کو گرا گرا کر

ہے خاتمہ قریب جوانی کی رات کا		محروم پھر فسانۂ زلفِ بتاں نہ چھیڑ

خلوت نشیں حرم کے ہیں یا دیر کے مکیں		سب سجدہ کرنے والے اسی آستاں کے ہیں

کیوں پیش و پس ہے آپ کو لینے میں دل مرا		دیتا ہوں اک نگاہ پر اتنا گراں نہیں

سرِ راہِ فنا اٹھ اٹھ کے اکثر بیٹھ جاتا ہوں		جو ہو بیگانۂ منزل وہ گردِ کارواں ہوں میں
ملی بحرِ فنا میں کیا مجھے گرداب کی قسمت		کہ جب تک ہوں اسیرِ اضطرابِ جاوداں ہوں میں

شاملِ تعمیرِ دنیا تھی یہی بے رونقی		عشق کے دم سے مگر کچھ گرم بازاری رہی

مری فغاں ہی سے رونق ہے میری ہستی کی		صدا جرس کی ضروری ہے کارواں کے لیے

دل میں کہتے ہیں کہ اے کاش نہ آئے ہوتے		ان کے آنے سے جو بیمار کا حال اچھا ہے

محروم کی غزلیات کے بعد آپ کی رباعیات پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے اگرچہ صنف رباعی اصناف کلام میں اہم نازک اور مشکل ترین صنف ہے، لیکن محروم کے قلم کی جولانی اس مشکل ترین صنفِ سخن کو بھی نہایت کامیابی سے اجاگر کرتی ہے۔ ان کا معیار بلند ہے۔ فارسی کے رباعی گو اصحاب ابو سعید ابوالخیر، عمر خیام، سحابی، نجفی، سرمد وغیرہ کی طرح فلسفہ اخلاق اور تصوف و روحانیت کے جواہر ان میں نظر آتے ہیں۔ اردو رباعی گو شعرا میں میر انیس کے بعد حضرت امجد کو اقلیم رباعی میں شہرت اور نام آوری حاصل تھی۔ محروم بھی اس صف میں شامل کیے جانے کے قابل ہیں۔ چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

دم اکثر پارسائی کا بھرتا ہے		حیراں ہوں کہ دل مرا یہ کیا کرتا ہے

خوف اس کو گناہ سے نہیں ہے لیکن
الزامِ گناہ سے بہت ڈرتا ہے

ظاہر میں قضا بہت ستم ڈھاتی ہے
جان سُن کے اجل کا نام ڈر جاتی ہے
لیکن ہر موت، کا نتیجہ ہے حیات
ہر شام پیامِ صبح لو لاتی ہے

حیراں ہوں کیا کیا خدا یا میں نے
بے فائدہ عمر کو گنوایا میں نے
پیری بھی قریب خاتمہ آ پہنچی
منزل کا نشاں ابھی نہ پایا میں نے

مختار تھا کر گیا جو دل کو بھایا
ہو کر مجبور پھل بھی اس کا پایا
یوں جبر سے اختیار مغلوب ہوا
یوں عالمِ اختیار میں جبر آیا

تغییر پسند ہے زمانے کا مزاج
تبدیل ہوئے جاتے ہیں سب رسم و رواج
پہلے تھا جنونِ عشق عریاں کوش
برہم زنِ ہوش حسن عریاں ہے آج

رباعیات محروم کے متعلق بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی رباعیات استادانہ ہی نہیں بلکہ حکیمانہ بھی ہیں اور آپ کے خزانہ میں گراں بہا جواہر پارے ہیں۔

"بہارِ طفلی" ایسی نظموں کا مجموعہ ہے جو بچوں اور لڑکوں کے لیے کہی گئی ہیں۔ بچوں کی ذہنیت اور ان کی نفسیات بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ ان کی ذہنی تربیت کے لیے ایسی نظمیں درکار ہیں جو صحیح معنوں میں بچوں کی طبیعت کے موافق ہوں اور ان کی سلیقہ سے تربیت کر سکیں۔ حضرت محروم نے جو نظمیں کہی ہیں وہ بچوں کے ذہن اور نفسیات کے عین مطابق اور موافق ہیں۔ ان کو بچے نہ صرف شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں بلکہ یہ ان کی تربیت کا ایک بہترین سبق ثابت ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر زور صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے۔

"اس چمنستانِ سخن کا ہر ورق ایک دبستاں بنا ہوا ہے۔ ہر نظم ایک سدا بہار گلستاں کا تصور پیش کرتی ہے۔ شاعر ہر نظم کے موضوع کے ساتھ خود کو اس سلیقے سے وابستہ کرتا ہے کہ وہ بھی بچوں کی برادری کا ایک فرد معلوم ہوتا ہے۔"

بہرحال حضرت محروم کا کلام اردو شاعری کو اس کی معراجِ کمال پر پہونچاتا ہے۔ اس میں ایسے ایسے جواہر پارے ہیں جو رہتی دنیا تک باقی رہیں گے، اور ان پر اردو شاعری فخر کرے گی۔
غرض محروم کو نوع شاعری پر ایسی دستگاہ حاصل ہے جس سے بہتر، جس سے اعلیٰ، جس سے بلند مرتبہ کوئی اور کلام غالباً نہیں ہو سکتا۔

غزل

ارزاں سمجھ، اگر غمِ الفت گراں ملے — نقصاں نہیں، اگر عوضِ نقدِ جاں ملے

اے راہرو، قدم نہ رکھ اس پر غرور سے — یہ خاک وہ ہے جس میں کئی کارواں ملے

مل جائیں کاش مجھ کو کہیں، اور میں کہوں — ڈھونڈا کہاں کہاں تمھیں اور تم کہاں ملے

ہوں دشت و کوہ یا چمن، اے مادرِ وطن — جنت ہے تیرا سایۂ دامن جہاں ملے

اس چند روزہ زیست سے جاں ہے عذاب میں — کیوں کر کٹے، جو زندگیِ جاوداں ملے

ہم کیوں کریں ذلیل جبینِ نیاز کو — شایانِ سجدہ جب نہ کوئی آستاں ملے

جب تک خیال حسن سے آباد ہو نہ دل — ممکن نہیں زبان کو حسنِ بیاں ملے

ملتے رہے ہیں ہم شعرائے کرام سے — کم اہلِ دل تھے، بیشتر اہلِ زباں ملے

محروم ہو گیا سفرِ زندگی تمام!
اب دیکھیے قرار کی منزل کہاں ملے

محروم

ڈاکٹر سیدہ جعفر

محروم کی نظم نگاری

بیسویں صدی طلوع ہونے کے کچھ عرصہ بعد نئے رجحانات، نئے اسالیب اور روحِ عصر کے نئے تقاضوں کا احساس لیے۔ شاعروں کا جو گروہ ابھرا ان میں تلوک چند محروم اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ محروم نے نظم میں ہیئت کے کچھ نئے تجربے بھی کیے۔ خیالات کے نئے پیکروں کی تخلیق کی، اور اپنے دل کا گداز اور احساس کی آنچ نظم میں سمو کر یہ ثابت کر دیا کہ اسلوب کا نکھار، اندازِ بیان کا بانکپن اور جذبات کی اثر انگیز ترجمانی، صرف غزل کا حصہ نہیں نظم نگار کا اعجاز بھی ہے۔

جس فضا میں محروم کے ادبی ذوق کی تعمیر و تشکیل ہوئی تھی وہ حالی کے پرخلوص نغموں سے گونج رہی تھی۔ اسمٰعیل میرٹھی چکبست اور سرور جہان آبادی کی آوازوں میں اسی کا ارتعاش محسوس ہوتا تھا۔ نیچرل شاعری اپنے ساتھ نئے موضوعات اور پیش کش کا نیا انداز لائی تھی۔ مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کی مرقع کشی، مقامی رنگ کے شعور اور انسانی سیرت کی بوقلمونی کے ادراک نے نظم نگاری کو نئی توانائی، نئی واقعیت اور نئی وسعتیں بخشی تھیں۔ محروم کی نظموں کی قابلِ لحاظ تعداد ایسی ہے جس میں فطرت کے دلفریب جلووں اور اس کے حسین و رنگین مناظر کی عکاسی ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دریا کی مترنم موجوں، پرندوں کے چہچہوں، کھیتوں کی خنک ہواؤں اور پھولوں کی نکہتِ پریشاں سے محروم کو الہام (INSPIRATION) ملتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ محروم کا بچپن گاؤں کی کھلی فضا میں گزرا تھا۔ جہاں دور تک دریائے سندھ کے کنارے پھیلے ہوئے تھے۔ اس پر نیلا امبر تھا اور نیچے چمکتی ہوئی ریت کے میدان تھے۔ یہ فضا ان کے مزاجِ شعری اور وجدان کا ایک جزو بن کر ان کی نظموں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ جہاں محروم نے منظر کشی کے دلکش نمونے پیش کیے ہیں وہاں اس کا شدید احساس ہوتا ہے کہ یہ نظمیں خیال آرائی کا نگار خانہ نہیں، وہ مرقعے ہیں جو مشاہدے کی منزل سے گزر کر شعور کی وسعتوں میں کھوئے گئے ہیں۔ محروم کی منظر نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی نظموں میں نہ صرف مخصوص مناظر کی متحرک اور گویا تصویریں نظر آتی ہیں بلکہ اس خاص فضا کے تاثرات بھی قاری کے احساس پر محیط ہو جاتے ہیں اور اسے منظر نگاری کا کمال کہنا مبالغہ نہیں۔ صبح کے وقت نسیمِ بہار کی آمد کا یہ منظر ملاحظہ ہو، جسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم صحنِ چمن میں نسیم کے قدموں کی چاپ سن رہے ہیں۔

ستاروں کی چھاؤں میں تو جو آئی ہے باغ میں
ٹھنڈک سی ڈال دیتی ہے لالے کے داغ میں

محروم نے بندرا بن کی صبح کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کی نظیر اردو نظم کے سرمایے میں ذرا مشکل ہی سے ملے گی۔ چھوٹی بحر اور سادہ و پرکار اسلوب میں یہ نظم حسن کاری کی ایک اچھی مثال پیش کرتی ہے ۔

صبحِ خنداں عروسِ تازہ — آئی مل کر شفق کا غازہ
آئی اور کس ادا سے آئی — شانوں پر کاکلیں طلائی
چہرہ اس کا وہ یعنی خورشید — بے پردہ عدوِ حسرتِ دید
ہر چیز کو پرتوِ سحر سے — قدرت نے رنگا ہے آبِ زر سے
جمنا ابھی خواب سے اٹھی ہے
پیدا بشرے سے تازگی ہے

محروم کی وہ نظمیں زیادہ پُراثر معلوم ہوتی ہیں جن میں انھوں نے فطرت کے جلالی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محروم کا زورِ بیان، ان کی شاعری کی صلاحیتیں اور محاکاتی طرز کا رنگ انھیں نظموں میں زیادہ چوکھا ہے جن میں فطرت کے ہیبت و جبروت کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ "آفتاب عالم تاب" اور "آندھی" میں محروم کی منظری شاعری کے جوہر حقیقی معنی میں بروئے کار آئے ہیں۔ منظر نگاری اسی وقت مکمل اور بھرپور ہو سکتی ہے جب پڑھنے والا اپنے آپ کو اسی ماحول میں سانس لیتا ہوا محسوس کرے، جس کی تصویر کھینچی جا رہی ہے۔ محروم کی نظم "آندھی" کا یہ بند ملاحظہ ہو ؎

وہ گرد کا پہاڑ اٹھا پھر شمال سے — بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ یہ باہر مثال سے — آتی ہے فوجِ دیو نظر چال ڈھال سے
روپوش اس کے خوف سے کوہ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رُخِ آسماں ہوا

آندھی کی بے پناہ قوت اور دم بدم بڑھتی ہوئی رفتار، چھتوں کا گرنا، چھپروں کا اڑ جانا، درختوں کا جڑ سے اکھڑنا اور لوگوں کا پناہ لینے کے لیے حیران و پریشان پھرنا، جس محاکاتی انداز سے اس نظم میں پیش کیا گیا ہے وہ ایک مثالی چیز معلوم ہوتی ہے۔

فطرت کے ان رنگارنگ جلوؤں کا نظارہ محروم کے یہاں بے مقصد نہیں۔ وہ ان مناظر میں قدرت کے جلال وجمال کا

عکس ڈھونڈھتے ہیں ؎

ہر ستارے کی چمک ہے حق نما میرے لیے
ہو گیا رہبر فریب ما سوا میرے لیے

رنگ و بو کی اس دنیا میں محروم کھو نہیں جاتے، حقیقت کو پا لیتے ہیں، شبنم کے حسن، چاندنی کی ٹھنڈک، شاخ گل کی نزاکت اور دریا کی ہیبت، ناک تموج اور سلسلۂ کوہ کے جلال سے وہ محض ایک مصور کی طرح متاثر نہیں ہوتے بلکہ ان کا انداز فکر صوفی کے نقطۂ نگاہ سے قریب ہو جاتا ہے ؎

چمن میں دشت میں وادی میں کوہ و صحرا میں | کہیں اوس میں شبنم میں ابر و دریا میں
شرر میں شعلے میں آتش میں برق سینا میں | شمیم گل میں نسیم مسرت افزا میں

یہ سارے جلوے ہیں کس کے، خدا کے جلوے ہیں

اپنی نظم "خطا کس کی ہے؟" میں محروم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ خدا نے اپنے جلوؤں کی کثرت میں انسان کی دل بستگی کے سامان بھی فراہم کر دیے ہیں، لیکن انسان ان مناظر سے بے پروا ہو کر فطرت کی نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے محروم کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن میں مناظر قدرت کی عکاسی کرتے ہوئے قدرت کی عظمت و ہیبت کے مقابلے میں انسان کی بیچارگی اور بے مائگی کا شدید احساس ملتا ہے اور ایسی نظموں کی تان حزن و اندوہ کے ایک رچے ہوئے جذبے پر ٹوٹتی ہے۔ ان کی نظمیں "شام غم"، "کنار راوی" اور "انجام گل" ملاحظہ ہوں۔ بہار و خزاں، گرمی اور برسات، بجلی کی چمک، ہوا کے جھونکے، کہر کی نمی اور شعلۂ گل کی گرمی اور تاروں بھری رات ایسے مظاہر قدرت ہیں جنھیں عام آدمی اکثر دیکھتا اور سرسری نظر ڈالتا ہوا گزر جاتا ہے، لیکن یہی مناظر محروم کے وجود کو غم کے بیکراں سمندر میں غرق کر دیتے ہیں، اور ان کے دل میں یادوں کے دیپ جل اٹھتے ہیں ؎

جب کالی گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں | ساون کا گیت کوئلیں گاتی ہیں
تب یاد میں گزری ہوئی برساتوں کی | آنکھیں مری سیل اشک برساتی ہیں

محروم نے جس لب و لہجہ میں انسان کی بے بسی اور قدرت کے مقابلے میں اس کی مجبوری کا ذکر کیا ہے، اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حالات کی ناہمواری اور واقعات کے المناک انجام نے انھیں فلسفۂ جبر کا قائل سا بنا دیا تھا۔ حوادثات کی یورش اور ہجوم غم سے گھبرا جانا فطرتِ انسانی کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں۔ محروم کے یہاں غم کے جذبے میں جو شدت اور رقت پسندی ملتی ہے وہ ان کے نجی حالات کا ردعمل ہو سکتا ہے اس اندوہ پرستی اور حزن دوستی کے پیچھے نفسیاتی

عوامل کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ جگر برشتگی اور دل گداختگی اکثر تجربے ہی کے ذریعے شعر میں داخل ہوتی ہے۔ محروم کی المیہ شاعری کے بعض مقامات نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت گراں مایہ ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خلوص کی تڑپ اور احساس کے زہر آگیں نشتروں کے کرب نے شعر کا روپ بھر لیا ہے۔

"مچھلی کی بیتابی" "چڑیا کی زاری" "بلبل کی فریاد" اور "کولھو کا بیل" میں محروم کا یہ خیال کام کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ تمام جاندار اس دنیا میں مشیت کے مضبوط بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تمام مخلوقات حالات و حوادث کے ہاتھ میں کھلونا بنے ہوئے ہیں اور انہی کے اثر کے تحت کبھی انسان ہنستا اور کبھی روتا ہے۔ انسان کے تبسم میں بھی موت کا خوف اور فنا کا غم چھپا ہوا ہے۔ موت محروم کے یہاں ایک بھیانک خواب ہے وہ اس کی تباہ کاریوں اور اس کی تاراج کرنے والی صلاحیتوں سے بیزار اور خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ موت کا ذکر کرتے ہوئے محروم کا لہجہ احساس نیاں میں ڈوب جاتا ہے۔ ان کی نظمیں "خیالِ مرگ" اور "موت" ملاحظہ ہوں۔ ایک جگہ موت کی چیرہ دستیوں کی اس طرح شکایت کی ہے ؎

مارا کسی غریب کو تو نے وطن سے دور	ماں باپ سے بہت پرے بھائی بہن سے دور
لاشہ کوئی پڑا ہے مزار و کفن سے دور	دستِ صدائے شیون و شورِ محن سے دور
پھولوں کی آہ نازبھری انجمن سے دور	گھونٹا گلا ہزار کا صحنِ چمن سے دور

محروم کا اندازِ بیان بڑا پُرسوز اور اثرانگیز ہے۔ دردمندی اور خستگی ان کے کلام میں ہر جگہ جلوہ فرما رہی ہے خواہ وہ رباعی کی صنف ہو یا غزل اور نظم ہو۔ سرور جہان آبادی، چکبست، نادر کاکوروی، سحر ہنگامی، ٹیگور اور دیا نرائن نگم کی یاد میں کہی ہوئی نظموں میں کہیں کہیں مرثیت کی لے بہت گہرائی اور اندوہ ناک ہوگئی ہے۔ محروم کے مخصوص اندازِ بیان اور عقیدت مندی کے جوش نے رامائن کے المیہ مناظر کو اور بھی پُردرد بنا دیا ہے۔ ان نظموں کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ محروم نے ان میں انسانی نفسیات کی تہوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور واقعات کی پیشکش میں فن کارانہ بصیرت سے کام لے کر ان نظموں کے بعض حصوں کو ایک سدابہار عظمت عطا کردی ہے۔ بن باس کے دوران میں جب تلاش بسیار کے بعد بھی رام، سیتا کو نہیں پاتے تو وہ مضطرب اور سراسیمہ ہو جاتے ہیں۔ محروم نے یہاں رام چندر جی کے جذبات کی بڑی اچھی مصوری کی ہے رام کی بے قراری اور بے تابیٔ دل کی کیسی پُردرد تصویر کھینچی ہے ؎

اشجار مجھے اس کا پتہ کیوں نہیں دیتے	پتوں کی زباں ہے تو صدا کیوں نہیں دیتے
مرغانِ ہوا تم ہی بتا کیوں نہیں دیتے	سیتا پہ جو گزری ہے سنا کیوں نہیں دیتے

بھرتا نہیں دم کوئی بھی فریاد رسی کا
پر سچ ہے کہ نہیں کوئی مصیبت میں کسی کا

اس نظم میں محروم کا پیرایۂ بیان بڑا دل گداز ہے، اور اسلوب کی سوزناکی کی شدت کا یہ حال ہے کہ محروم نے جہاں راون جیسے سرکش دشمن کی موت کا نقشہ کھینچا ہے وہاں بھی ان کا لہجہ اسی غمناکی میں ڈوب گیا ہے۔ راون کی رانیوں کا ماتم ملاحظہ ہو ـــ

کہتی تھی بازوؤں کو کوئی تھام تھام کے — ہم نربلوں کا آہ سہارا تمہیں تو تھے
ان بازوؤں کی آہ وہ قوت کدھر گئی — جن سے اٹھے پہاڑ وہ طاقت کدھر گئی
کہتی کوئی یہ شبد ہے بھاتے نہیں ہمیں — لو اٹھ کے بیٹھو موت کا آیا یقیں ہمیں
طاقت سے اپنی زیر جو اندر کو کر چکا
وہ فانیوں کے تیر ہوائی سے مر چکا

راون کی موت اور اس کے انجام کو محروم نے بہت مؤثر اور عبرت انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ راون کی خاص رانی مندوری کا بین عبرت کا بہترین نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ محروم کی شاعری کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس میں انسان کی بے مائگی، دنیا کی بے ثباتی، عیش و عشرت کی ناپائداری اور گرمیٔ بزم کے "رقص شرر" ہونے کا بیان ملتا ہے۔ نورجہاں جس نے اپنی زندگی مغلوں کے عالی شان محلوں میں گزاری تھی اور جو اپنے عہد میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی سمجھی جاتی تھی، آج دیدۂ عبرت نگاہ اور گوش حقیقت کو انسان کی بیچارگی اور بے بسی کا درس دے رہی ہے اور ایک ٹوٹی پھوٹی کٹیا میں زیر خاک سو رہی ہے۔ اس خیال کو محروم نے اپنی نظم میں کیسے مؤثر اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے ـــ

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے — کہتے ہیں یہ آرام گہہ نورجہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہ خاک نہاں ہے — اٹھتا مگر اب تک سر مرقد سے دھواں ہے
جلوؤں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے ان کی شب دیجور کا عالم
تجھ سی ملکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے — غالیچہ سر فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالم بے چارگی اے تاج وری ہے — دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

محروم کے اشعار میں دنیا کی محوکن رعنائیوں میں کھو نہ جانے کی تاکید بھی ہے۔ عصرِ حاضر کی پُرفریب روشوں سے بچنے کی تنبیہہ بھی ہے اور آرزوؤں کے سراب سے دور رہنے کی تعلیم بھی ہے۔ محروم کی عمر کا قابلِ لحاظ حصہ تعلیمی اداروں سے وابستگی میں گزرا۔ اس لیے فطری طور پر ان کی شاعری میں اکثر جگہ

روک لو گر غلط چلے کوئی

والے پُرخلوص مسلک کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔ کش مکشِ حیات کے گوناگوں تجربات نے بھی ان کی شاعری کو اخلاقی عناصر سے مالا مال کر دیا ہے۔ محروم کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تخیل کی رنگ آمیزی اور معنویت کے سحر سے اپنی اخلاقی نظموں کو بھی حسین اور جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔ پھیکی سے پھیکی بات بھی محروم بڑے شگفتہ اور شاداب انداز میں بیان کرتے ہیں۔ محروم کے مجموعۂ کلام میں ہمیں سعدی کی نظموں کا جو ترجمہ نظر آتا ہے وہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اصلاحی اور اخلاقی نکات کی ان کے ہاں بڑی اہمیت ہے۔ محروم کی مذہبی نظموں کا مقصد بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلاف کے کارناموں سے روحانی اور ابدی قدروں کی عظمت واضح کی جائے۔ محروم اپنی نظموں میں واعظِ سمع خراش اور زاہدِ خشک نظر نہیں آتے، اور نہ انھوں نے دو اور دو چار والے انداز میں اخلاقیات کا درس دینے کی کوشش کی ہے۔ اگر پند رنگین کا بہترین نمونہ اور مثالی روپ دیکھنا ہو تو محروم کا کلام پڑھیے۔ شراب کی مذمت کا طرز ملاحظہ ہو۔ پرکیف اور شاداب اسلوب نے خمریاتی شاعری کا سا لطف پیدا کر دیا ہے۔

فریب دہر نے تدبیرِ جاں ستانی کی	کہ شکل آگ نے کی اختیار پانی کی
نہ غور سے نہ یہ کوئی پری ہے شیشے میں	رہے خیال کہ آتش بھری ہے شیشے میں

محروم کی شاعری میں حد سے بڑھا ہوا چنچل بن اور ڈھول ڈھپا والی شوخی کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے نشیب و فراز اور اس کے حسین دھوکوں سے واقف ایک جہاں دیدہ، ہمدرد اور مخلص رہنما اپنے تجربات کی مشعلیں روشن کر کے نوجوان نسل کی راہوں میں اجالا کر رہا ہے۔

محروم کسی خاص سیاسی مکتب سے تنظیمی طور پر وابستہ نہیں تھے۔ ان کے تصورات پر کسی مخصوص گروہ بندانہ نظریے کی چھاپ لگی ہوئی نہ تھی۔ انھیں اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ وہ کسی خاص سیاسی ادارے کے کل وقتی کارکن بنتے، سیاست سے ان کی وابستگی ایک باشعور اور حساس وطن پرست اور انسان دوست شاعر کی وابستگی تھی۔ وہ سیاست کو بطور پیشہ

اختیار کرنے کے قائل نہ تھے۔ محروم کو اس کا یقین تھا کہ محض نعرہ بازی اور اشتعال انگیزی سے ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا۔ سیاست میں آبرو "بقدر سوختن" ہوتی ہے۔ محروم کے پیش نظر وہ تمام مطالبات تھے جو ہندوستانی عوام کے ہونٹوں پر مچل رہے تھے، وہ طبقاتی کش مکش بھی تھی جس کی حدیں اشتعال سے شروع ہو کر خونی ہولی پر ختم ہوتی تھیں ـــــ ایک حساس، باشعور اور ذکی الحس شاعر ہوتے ہوئے وہ اپنے وقت کے مسائل سے چشم پوشی کیسے کر سکتے تھے۔ اپنی طالب علمی ہی کے زمانے میں انھوں نے سامراجی لوٹ کھسوٹ سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک نظم "بھارت ماتا کیوں روتی ہے" لکھی تھی۔ لیکن بعد میں جب وہ گورنمنٹ کے ملازم ہوئے تو انھیں اپنی سیاسی نظموں کا لہجہ نرم بنانا پڑا، اور اپنے چہرے پر مصنوعی نقاب ڈالنے پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ محروم نے ولولہ انگیز سیاسی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ محروم کی بعض سیاسی نظموں میں امنا جوش اور ابال ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر ان نظموں کے مجموعے کا نام "کاروان وطن" کے بجائے "شعلۂ نوا" ہوتا تو زیادہ موزوں معلوم ہوتا۔ تحریک آزادی کی ابتدا سے لے کر حصولِ آزادی کی منزل تک ہندوستانی سیاست جن راہوں سے ہو کر گزری ہے اس کا مطالعہ کرنا ہو تو اقبال، سرور اور چکبست کے ساتھ ساتھ محروم کی نظمیں بھی پڑھنی ہوں گی، سودیشی تحریک، ہوم رول، مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ، تحریکِ خلافت، سائمن کمیشن، اور جلیاں والے باغ کی خونچکاں داستانوں کے تاثرات ہیں محروم کی سیاسی نظموں میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ محروم کی نظموں میں ہندو مسلم اتحاد کی آرزو ہے، آزادی کی لگن ہے اور غلامی سے بیزاری اور انسان دوستی کا جذبہ ہے۔

جس طرح حسن نظامی اردو نثر میں اپنے عنوانات کی ندرت اور انفرادیت کے لیے مشہور ہیں اسی طرح محروم نظم میں اپنے اچھوتے عنوانات کے لحاظ سے منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ انھیں اپنی نظموں کو نئی نئی سرخیوں سے سجانے میں لطف آتا ہے۔ بچے کی مسکراہٹ، ویران کٹیا، گھر سے نکل کے دیکھو، بگڑے ہوئے پنجاب سے، بہہ گئی کشتی، جگانے کی گھڑی، سندھ کو پیغام، اور اترا ہوا دریا اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

رباعی

دل کی خواہش یہ ہے کہ بن جاؤں نیک
نیکی کروں اور اس کا صلہ پاؤں نیک
تحریک مگر نفس کی ہر لحظہ ہے یوں
نیکی سے کروں گریز، کہلاؤں نیک

محروم

روش صدیقی

محروم

(وادیِ غزل میں)

جناب تلوک چند محروم ہماری زبان کے برگزیدہ شعرا میں گنے جاتے ہیں۔ ان کے علمی و ادبی خدمات نے تقریباً نصف صدی کے دائرے کو اپنی شعری تخلیقات سے مکمل کیا ہے۔ وہ پنجاب کے ایک دور افتادہ علاقے میں پیدا ہوئے۔ جہاں نہ کوئی ادبی ماحول تھا، نہ شعروسخن کی محفل آرائیاں۔ لیکن ان کے ذوقِ خداداد اور طبعِ سلیم نے ایک جادو سا کر دکھایا۔ اپنی شاعری اور زبان دانی کی داد ان کو شیخ عبدالقادر اور مولوی عبدالحق جیسے بزرگوں سے ملی۔ زبان و محاورہ کی صحت و صفائی اور اندازِ بیان کی شستگی و شائستگی میں ان کا جو درجہ ہے، اس کا اعتراف اہلِ زبان بھی احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔

محروم صاحب نے ہر صنفِ سخن میں بہت کچھ کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے۔ نظم ہو یا غزل، رباعی ہو یا مثنوی غرض تمام اصناف میں ان کی حسن پسند اور حسن آفریں طبیعت نے نگار خانے سجا دیے ہیں۔ ان کی زندگی شرافتِ کردار اور فضائلِ اخلاق کی راہوں سے گزری ہے۔ جذبات کی فراوانی میں بھی ایک لطیف سنجیدگی اور پاکیزہ متانت کا دامن ان سے جدا نہیں ہوتا۔ غزل کے رشتے میں انھوں نے اخلاقی قدروں کے آبدار موتی، بڑے حسن اور سلیقے سے پروئے ہیں۔ جذبے کی صداقت اور ادائے بیان کی سادگی نے ان کے تغزل کو کہیں کہیں غزلِ سعدی کی حدوں سے قریب کر دیا ہے۔

ابتدائی دور یا یوں کہیے کہ عہدِ شباب کی غزلوں میں رنگینی و سرمستی کا پرتو کچھ زیادہ جھلکتا ہے۔ لیکن وسطی اور آخری دور کے کلام میں ایک سبک خرام متانت، ایک خوشگوار تامل اور ایک دلآویز اخلاقی رکھ رکھاؤ کا عالم نمایاں نظر آتا ہے۔

محروم صاحب نے اپنی روداد محبت کو بڑی ریاضت اور محنت سے چھپانا چاہا ہے۔ لیکن عشق اور مشک کو کون چھپا سکا ہے۔ اخلاق و فضائل کی بستی میں کبھی کبھی ان کے لب پر نعرۂ محبت آ ہی جاتا ہے۔

نوجوانی میں ترے رُخ پہ یہ زردی محروم ہو نہ ہو، عشق کا آزار نظر آتا ہے

گیا دورِ عشق و جوانی ہمارا مگر داغِ حسرت ابھی دلنشیں ہے

جوانی کہ "عہدِ گل" کی سرشور و سرشار رنگینیوں سے عبارت ہے ان کے لیے بہت جلد حدیقۂ اخلاق بن گئی۔ پھر بھی

وہ حادثہ جسے آغاز محبت کہتے ہیں۔ انھیں والہانہ طور پر یاد آتا رہا ہے، ایک مسلسل غزل کے چند اشعار سنیے۔

نگاہِ اولیں کی دلستانی یاد آتی ہے ۔۔۔ کسی نامہرباں کی مہربانی یاد آتی ہے

قریبِ شاخِ گل ہوتی ہے جب دستاں سرا بلبل ۔۔۔ ہمیں بھولی بسری اک کہانی یاد آتی ہے

جوانی اور بوئے گل میں یارب کیا تعلق تھا ۔۔۔ کہ بوئے گل سے پیری میں جوانی یاد آتی ہے

ان اشعار میں نظیری کے نظریۂ عشق کا سا انداز ہے، وہی رنگینی اور وہی خود فراموشی۔

محروم کا مسلک حیات محبت ہے، اور ان کی طریقت خلقِ خدا کی خدمت، ان کی حق پرستی کسی حلقۂ خیال میں محدود نہیں، وہ اپنے کو کعبہ سمجھ کر بھی خوش ہوتے ہیں اور بت خانہ بنا کر بھی۔ انھیں ناقوس و اذان میں عجیب یک رنگی محسوس ہوتی ہے۔

مجھے کیا ہے، جو میں شیخ و برہمن کی طرح بھٹکوں ۔۔۔ بنا لیتا ہوں دل کو گاہ کعبہ، گاہ بت خانہ

کفر و دیں میں اتحادِ جاوداں پیدا کریں ۔۔۔ نالۂ ناقوس سے بانگِ اذاں پیدا کریں

وہ لباس مجاز میں بھی، حسنِ حقیقت کی جھلک دیکھ لیتے ہیں، اس حق شناسی کے اشارے اُن کے اشعار میں جابجا ملتے ہیں۔

ساقی ترا عکسِ رخ ہے، ورنہ ۔۔۔ صہبا رنگین، نہ جام رنگین

حسن یہ سارا اسی کا ہے کہ جس کے عشق میں ۔۔۔ چاک، روزِ ابتدا سے ہے گریبانِ سحر

کس ستارے میں تجلیِ سرِ طور نہیں ۔۔۔ جلوۂ حسنِ ازل آج بھی مستور نہیں

سادے سے سادہ خیال میں بھی محروم اپنی ندرتِ فکر اور حسنِ بیان سے ایک نیا رنگ بھر دیتے ہیں۔

مایۂ نازشِ دوراں، یہ پریشانی ہے ۔۔۔ روز ہوتے ہیں کہاں ہم سے پریشاں پیدا

آخری منزل میں اک سنگین حقیقت بن گئی ۔۔۔ زندگی جس کو سمجھتے آئے تھے افسانہ ہم

یوں زندگی سے مل کے جوانی، جُدا ہوئی　　جیسے کوئی کسی سے سرِ رہ گذر ملے

(آل انڈیا ریڈیو کے شکریہ کے ساتھ)

پروفیسر محمد اجمل خاں

حضرت تلوک چند محروم

قدیم تہذیب میں گہرائی تھی، نرمی تھی، لوچ تھا اور ان سب کے ساتھ انسانیت تھی، مادی یعنی مشینی ترقی نے جسمانی رفتار کو تیز کر دیا۔ پرانا سانچا جس میں دل کی دھڑکنیں عقل کے بندھنوں میں بندھی ہوئی تھیں، ٹوٹ رہا ہے، نیا سانچہ نہ تو بنا ہے نہ بن سکتا ہے۔ لوگ لاکھ کوشش کریں کہ دل کی دنیا اجڑ جائے لیکن وہ مجروح ہو جائے گی، اجڑے گی نہیں۔ دماغ کو دل سے الگ کرنا ایسا ہی ہے جیسے گوشت کو ناخن سے جدا کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ دماغ اور دل دو الگ الگ عنصر نہیں دونوں نام کو الگ الگ ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود محال ہے۔ جب ایک کو پامال کرنے کی کوشش کی جائے گی تو دوسرا بھی نیم جان ہو جائے گا۔

حضرت محروم ۱۸۸۷ء میں پنجاب میں دریائے سندھ کے کنارے پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم و تعلم مشغلہ تھا لیکن ۱۹۲۵ء میں ان کی ایک صاحبزادی (ودیا) کی نا وقت موت نے ان کے دل کو ہمیشہ کے لیے پیمانۂ غم بنا دیا۔ ودیا کی خودکشی کا تیر نیم کش ہی رہا، اور اس کی چبھن ان کے کلام و بیان کے ہر گوشے کو درد افزا بنائے ہوئے ہیں۔ اس درد و الم کی دنیا میں بچپن کی مسرتوں اور شباب کی لذتوں کو جب کبھی تصور کے آئینے میں دیکھے گا تو ان کی یاد بھی غم کے سانچے میں ڈھل جائے گی۔ ہائے کیا زمانہ تھا! کیا معصوم زندگی تھی!! کتنا پرکیف شباب تھا!!! یہ سب عیش رفتہ کی تصویریں سوہانِ روح بن جاتی ہیں۔ پھر کیوں آپ محروم کے زخم خوردہ دل سے یہ توقع رکھیں کہ وہ فطرتِ صحیحہ سے منحرف ہو کر فلسفۂ نفسیات کو بدل دے۔ البتہ اس میں کلام نہیں کہ ان کا ہر یاس انگیز نشتر زخم دل کو ہرا نہیں کرتا بلکہ صبر و رضا کے اخلاقی پہلو کو اجاگر کر دیتا ہے اور جوش کو ہوش میں بدل دیتا ہے۔

"بہارِ طفلی" کے مختلف عنوانات کو دیکھ جائیے۔ ہر جگہ بلند اخلاقی تعلیم کو سلیس و سادہ زبان میں بیان کر دیا ہے۔ انگریزی سے جن نظموں کے ترجمے کیے گئے ہیں ان کی سلاست کا وہی اندازہ کر سکتے ہیں، جو اصل انگریزی کو دیکھ چکے ہیں، "اندھا لڑکا" جس سوز و گداز سے روشنی کی تلاش میں ہے وہ انسان کے دکھے ہوئے دل کی پکار ہے، لیکن اس کا آخری بند حضرت محروم کی زندگی کا ماحصل ہے۔ اس میں درد بھی ہے، کیف بھی ہے، اور پھر تسلیم و رضا بھی۔ (اس سلسلے کے شائع کنندگان سے التماس ہے کہ وہ انگریزی نظموں کا پہلا مصرعہ اور شاعر کا نام آئندہ اڈیشن میں ضرور شائع فرمادیں)

غالباً ابتدائے زندگی ہی سے حضرت محروم نے ایک درد آشنا دل پایا تھا، اور اسی لیے لفظ "محروم" تخلص کے لیے منتخب کیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں "گنجِ معانی" کا مجموعہ نظم شائع ہوا، اور اس کے مختلف عنوانات وہی ہیں، جو ایک درد آشنا پسند کرسکتا ہے۔ موت کا موسم، انجامِ گل، ایک خاندان کی قبریں، شمعِ سحر، فریادِ یتیم، مدرسے کی یاد، وغیرہ وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو "یادِ رفتگان" اور "طوفانِ غم" کی متعدد نظموں کے ہم پلّہ ہیں۔ میں اقتباسات نہیں دیتا۔ ہر نظم ایسی ہے کہ پوری کی پوری پڑھی جائے اور بار بار پڑھی جائے۔ اس کے بعد آپ اندازہ کرسکیں گے کہ کاروانِ وطن" کا ۱۳۴ صفحوں کا مجموعہ کس پروانۂ حریت کی آتش نفسی کا نتیجہ ہے۔

رباعیات ہوں یا نظمیں، انگریزی سے ترجمہ ہوں یا فارسی سے، سب کے متعلق اردو کے سخن ور اور نقاد ہم زبان ہیں کہ "یہ گلزار شاعری کے رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ ہے" ہاں ان پھولوں میں کہیں کہیں خار بھی نظر آجاتے ہیں، اور ان کا اضافہ خوشنویسوں کی جدت آفرینی ہے۔ مثلاً کاروانِ وطن کے صفحہ ۵۱ پر ہولی کو تھولی لکھ دیا گیا ہے۔ اس میں یہ مناسبت ضرور ہے کہ یوپی میں "ٹھرّا" پینے والے کے خانے کو تھولی کہتے ہیں۔ حالانکہ ہولی کا تعلق بہار و شراب دونوں سے ہے۔ اسی طرح "گنجِ معانی" کے صفحہ ۱۵۳ پر "مزاحیہ" کو "مذاحیہ" بحرف ذال، لکھا گیا ہے۔ اس طرح کی متعدد تحریفیں ہیں جو ناگزیر ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ اڈیشنوں میں ان کی تصحیح کردی جائے گی۔

غزل

اِس کا گلہ نہیں کہ دعا بے اثر گئی — اک آہ کی تھی، وہ بھی کہیں جا کے مر گئی
اے ہم نفس نہ پوچھ جوانی کا ماجرا — موجِ نسیم تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی
انجامِ فصلِ گل پہ نظر تھی، وگرنہ کیوں — گلشن سے آہ بھر کے نسیمِ سحر گئی
بس اتنا ہوش تھا مجھے روزِ وداعِ دوست — ویرانہ تھا نظر میں جہاں تک نظر گئی

ہر موجِ آب سندھ ہوئی وقفِ پیچ و تاب
محروم جب وطن میں ہماری خبر گئی

محروم

امیر حسن نورانی

بچوں کے محرومؔ

اردو شاعری نے اپنی مختصر مدتِ حیات میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو زبان کا آغاز شاعروں کا رہینِ منت ہے۔ اَن گنت ستارے اردو شاعری کے آسمان پر نمایاں ہوئے۔ قانونِ قدرت کے مطابق سب ہی کم و بیش چمک دمک عطا ہوئی مگر کچھ ایسے چاند تارے بھی نمایاں ہوئے جن کی ضیا پاشیوں نے عالم انسانیت کے کسی گوشے کو منور کر دیا۔ قدرت نے ان کی فطرت میں ملکۂ شاعری ودیعت کیا اور وہ دنیا میں ایک انفرادی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ایسے بلند پایہ اردو شعرار کی تعداد محدود ہے۔ جنھوں نے اپنے انفرادی کمالات شاعری سے دنیائے انسانیت کی قدروں کو بلند کرنے کی جدوجہد کی، اور اپنے ملک و قوم کی صحیح معنوں میں خدمت کی۔ حضرت تلوک چند محروم کا شمار بھی ایسے ہی باکمال شعرار میں کیا جاتا ہے۔

حضرت محروم کی طبع رسا نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نقاد ان کے کلام پر جس گوشے سے نظر ڈالتا ہے ایک مکمل تصویر نظر آتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ محروم کو قبول عام حاصل ہوا۔

محروم کے شاعرانہ کمالات کا ایک گوشہ ایسا بھی ہے جس پر اہلِ نظر نے کم توجہ کی ہے، حالانکہ وہ ان کی شاعرانہ عظمت کا روشن ترین گوشہ ہے۔ جہاں وہ بچوں کے ایک کامیاب ترین شاعر کی حیثیت سے نظر آگئے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی حسین و دل کش نظموں کے ساتھ ساتھ محروم کی نظمیں بھی پڑھی ہیں۔ ان میں وہی لطف حاصل ہوتا تھا۔ جو حالیؔ اور اسمٰعیل کی نظموں میں تھا۔ اسمٰعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے نظم و نثر دونوں لکھی ہیں۔ ان کی نظمیں بے حد مقبول ہیں اور وہ بچوں کے لیے محبوب شاعر سمجھے جاتے ہیں۔

ہم اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے کہ محروم نے اس تحریک کو پروان چڑھایا۔ جو آزاد اور حالیؔ نے شروع کی تھی اور اسمٰعیل نے جس کو آگے بڑھا کر اور حسین و دل کش بنایا تھا۔

محروم کی دیگر شاعرانہ حیثیتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر انھیں صرف (بچوں کا شاعر) کہا جائے تب بھی ان کی شاعرانہ عظمت میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ بچوں کی تعلیم قومیت کی تعمیر ہے تو ماننا پڑے گا کہ محرومؔ نے عام شعرار کی طرح صرف (ادب اور شاعری) کی خدمت نہیں کی بلکہ ملک اور قوم کی بنیادی خدمت کی

ہے۔ اس طرح ان کی شاعری کی عظمت، قیمت دوچند ہو جاتی ہے۔

حضرت محروم نے اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ درس وتدریس میں گزارا۔ بچوں کی تعلیم وتربیت کے عملی تجربے کئے ان کی ذہنی کیفیات اور نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا۔ ظاہر ہے انھوں نے بچوں کی تعلیم واخلاق کی تربیت کے لیے جو نظمیں تجربات کی روشنی میں لکھی ہیں وہ کتنی مفید اور دل کش ہو سکتی ہیں۔ بچوں کے لیے محروم نے ہر قسم کی نظمیں لکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

صبح کے پر کیف اور روح پرور سماں کی تصویر کشی بہت سے شاعروں نے کی ہے۔ لیکن محروم نے جس انداز سے صبح کی اہمیت اور سحر خیزی کی افادیت کو بچوں کے ذہن نشین کرایا ہے۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا جو سراپا اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اسمٰعیل میرٹھی نے بھی صبح کے وقت پر نظمیں لکھی ہیں اور بہت خوب لکھی ہیں۔ مگر محروم کی اس نظم کا ایک ایک شعر جس تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اس کے علاوہ شاعرانہ محاسن سے بھی آراستہ ہے۔ یہ نظم ملاحظہ ہو۔ اس کا ہر ہر شعر سراپا اثر ہے۔ طبیعت میں ایک عجب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

وقت سحر ہے سونے والو　　دھیان کدھر ہے سونے والو!
جاگو نیند کے اے متوالو　　لطف سحر کے کھونے والو
جاگ اٹھا ہے پتا پتا　　غفلت کیسی سونا کیسا
بادِ سحر کے جھونکے آئے　　نکہت تر کے جھونکے آئے
جاگو پہلو بدل کر دیکھو　　اٹھو آنکھیں مَل کر دیکھو
صلِّ علیٰ یہ نور کا عالَم　　ہر ذرے پہ طور کا عالَم
تازہ نوا مُرغانِ چمن ہیں　　نغمے جن کے جانِ چمن ہیں
میٹھی بولی بول رہے ہیں　　اڑنے کو پَر تول رہے ہیں

وجد میں ہیں سب آتے جاتے
حمدِ خدا کے گیت ہیں گاتے

نخل کھڑے ہیں سر کو جھکائے　　دستِ دعا شاخوں نے اٹھائے
شاخ پہ بُلبُل زمزمہ خواں ہے　　خاک پہ سُنبل سجدہ کناں ہے

جاگو یادِ خدا کی گھڑی ہے
وقتِ نماز و دعا کی گھڑی ہے

شور اٹھا ناقوس و اذاں کا　　وقت نہیں یہ خواب گراں کا
عابد و شیخ و برہمن جاگے　　جاگے مسجد و مندر جاگے
عارف و زاہد اور پجاری　　نیند نہیں ہے جن کو پیاری
نیند سے پیاری یادِ خدا ہے　　یادِ خدا میں جن کو مزا ہے

محفلِ راز میں جا کر بیٹھے
دل کو جہاں سے اٹھا کر بیٹھے

حضرت محروم نے بچوں کے لیے جو لاجواب نظمیں لکھی ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو بھی بچوں کی انجمن کا ایک رکن سمجھنے لگتے ہیں۔

"ہمارا دیش" کے عنوان سے انھوں نے ایک چھوٹی سی خوب صورت نظم لکھی ہے، جو سلاست، روانی اور سادگی کا اچھا نمونہ ہے، اور حب الوطنی کے جذبات کو بڑے سلیقے سے نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سب سے اچھا دیش ہمارا　　دنیا بھر سے نیارا ہے
پیارا دیش ہمارا بھارت　　ہم کو دل سے پیارا ہے

اپنے دل کا سہارا ہے
بھارت دیش ہمارا ہے

اونچے اونچے پربت اس کے　　لہراتے ہیں جن پر جنگل
مور پپیہے اور کوئل سے　　جنگل میں ہوتا ہے منگل

کیا ہی خوب نظارا ہے
بھارت دیش ہمارا ہے

ہر چیز سے عیاں ہے یارب ظہور تیرا　　خورشید میں قمر میں تاروں میں نور تیرا
قدرت سے تیری ساکن قدرت سے تیری جاری　　قائم ترے سہارے ہے کائنات ساری

روشن کرے فلک پہ یہ ہم جو چل رہے ہیں
دن رات بن رہے ہیں موسم بدل رہے ہیں

حاضر ہیں تیرے در پہ پروردگار ہم بھی ۔۔۔ ہیں رحم اور کرم کے امیدوار ہم بھی
علم و عمل کا رستہ یارب ہمیں دکھا دے ۔۔۔ جس سے ملے سعادت اس راہ پر چلا دے

وہ علم دے ہو جس سے دانش کا نور دل میں
پروردگار دیکھیں تیرا ظہور دل میں

بچوں کو پڑھنے لکھنے کا شوق دلانے کے لیے مرحوم نے بہت سی پُراثر نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم "کتاب" ہے جس میں بڑے دل کش انداز اور شیریں الفاظ میں کتاب کی اہمیت کو دل نشین کرایا ہے۔

بہتر کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے ۔۔۔ اچھا کوئی شفیق نہیں ہے کتاب سے
روئے زمیں کے سارے مظاہر اسی میں ہیں ۔۔۔ باغِ جہاں کے سارے مناظر اسی میں ہیں
دیکھا ہے سب کتاب میں جو کچھ جہاں میں ہے ۔۔۔ موجود ہے زمین میں یا آسماں میں ہے
سب کچھ کتاب ہم کو دکھاتی ہے ہو بہو ۔۔۔ ان سب کا حال ہم کو سناتی ہے ہو بہو

کھولو اسے کہ اس میں خزانہ ہے علم کا
اٹھو پڑھو بڑھو کہ زمانہ ہے علم کا

مرحوم نے بچوں کے لیے ہر قسم کے مفید عنوانات پر نظمیں لکھی ہیں۔ صفائی، تندرستی، صبح خیزی، حب وطن، ادب و احترام، سچ اور جھوٹ، محنت و مشقت کے فوائد وغیرہ پر مرحوم کی پُراثر نظمیں موجود ہیں۔ ملک اور قوم پر یہ ان کا احسان ہے کہ محنت و جاں فشانی سے بچوں کی ذہنی تربیت اور تہذیب، اخلاق کا سامان فراہم کیا۔ انھوں نے خدا کی حمد اور دعا وغیرہ کے عنوان سے متعدد نظمیں لکھی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ان میں بڑی دل کشی اور تاثیر ہے۔ یہ اشعار ہمارے دعویٰ کی صداقت کے آئینہ دار ہیں۔

ہر چیز سے عیاں ہے یارب ظہور تیرا ۔۔۔ خورشید میں، قمر میں، تاروں میں نور تیرا
قدرت ہے تیری ساکن، قدرت سے تیری جاری ۔۔۔ قائم ترے سہارے ہے کائنات ساری
باقاعدہ ہے تجھ سے سارا نظامِ عالم ۔۔۔ قدرت کے ہیں کرشمے یہ صبح و شام تیرے
علم و عمل کا رستہ یارب ہمیں دکھا دے ۔۔۔ جس سے ملے سعادت اس راہ پر چلا دے

عقبیٰ کی سرخروئی دنیا کی کامگاری
حاصل ترے کرم سے ہم کو ہو ذاتِ باری

"دعا" والی نظم آپ پڑھ چکے، اب دیکھیے خدا کا شکر ادا کرنے کی تلقین بچوں کو کس دلنشین طرز پر کی ہے۔ زبان کی سلاست اور روانی بھی خوب ہے۔

زباں پر نہ کیوں کر ترا شکر آئے ۔۔۔ کہ احسان ہیں تیرے ہزاروں خدایا
مجھے تو نے دی زندگانی سی نعمت ۔۔۔ عطا عقل کی اور انسان بنایا
یہ قدرت ہے تیری یہ صنعت ہے تیری ۔۔۔ کہ مٹی کو دانا و بینا بنایا
محبت سے دل کو کیا شاد میرے ۔۔۔ دیا سر پہ ماں باپ کا تُو نے سایا
سمندر، جزیرے، پہاڑ اور دریا ۔۔۔ جو منظر دکھایا سو دلکش دکھایا
چمک چاند سورج کو تو نے عطا کی ۔۔۔ ستاروں نے تجھ سے ہی یہ نُور پایا

تری یاد سے دل نہ غافل ہو میرا
دعا تجھ سے محروم کی ہے خدایا

بچوں کو اگر کسی بُری بات سے روکا جائے یا کسی اچھی بات کی تلقین کی جائے تو اس کے اثر کا انحصار سمجھانے کے طرز و انداز پر ہوتا ہے۔ نثر کے مقابلے میں نظم زیادہ پُر اثر ہوتی ہے۔ لیکن ایسے شاعر بہت کم ہیں جو اپنی فطری صلاحیتوں اور غیر معمولی خداداد ذہانت سے بچوں کی نفسیات کا خیال رکھ کر نظم لکھیں۔ حالیؔ، اسمٰعیل اور اقبال کی نظموں میں جو دلکشی ہے اس کو اردو ادب میں ایک مسلّم حقیقت سمجھا جاتا ہے اور موجودہ دور میں حضرت محرومؔ کو مذکورہ اربابِ ثلاثہ میں شامل کر کے بچوں کی دنیائے شعر و ادب کے اربعہ عناصر کہا جا سکتا ہے۔

مزارِ غالب پر

آہ! اے نیّرِ تابانِ جہانِ معنی ۔۔۔ اوجِ افلاک پہ یا دفن اسی خاک میں ہے
تیری تُربت پہ چڑھانے کے لیے لایا ہوں ۔۔۔ گوہرِ اشک مرے دیدۂ نمناک میں ہے

محرومؔ

رشید حسن خاں

تلوک چند محروم

محروم صاحب کا وطن، سندھ کا وہ ریگستانی علاقہ ہے، جہاں زندگی سخت کوشی کا دوسرا نام ہے۔ وہ ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایک طویل مدت تک اسی ریگ زار کے دور افتادہ علاقوں میں، بہ حیثیت استاد، زندگی کے دن گزارے۔ اگر ہم اس پس منظر کو پیشِ نظر رکھیں تو بہ آسانی اس بات کا سراغ لگا سکتے ہیں کہ ان کے کلام کے خاصے حصّے پر سادگیِ فکر و سادگیِ بیان کا جو رنگ چھایا ہوا ہے، اس کی بڑی وجہ کیا ہے۔ انھوں نے شعور کی آنکھیں اُس زمانے میں کھولیں جب ہندوستان میں تعصب اور نفرت کا جال ہر روش پر نہیں بچھایا جا سکا تھا۔ پرانی تہذیبی روایتوں کی روشنی ختم نہیں ہوئی تھی، زندگی ابھی منافقت سے پوری طرح آنکھیں چار نہیں کر سکی تھی، سادگی کے جلوے روپوش نہیں ہو پائے تھے۔ اور علم کے ہنگاموں نے معصوم جہالتوں کو بالکل ختم نہیں کیا تھا۔ اس دورِ معصوم اور ان سادہ فضاؤں کے فیض سے محروم صاحب کی ذہنی نشوونما میں پاکیزگیِ خیال و فکر کے عناصر کارفرما رہے اور انھیں عناصر کے فیض سے ان کی شاعری میں اخلاقی و روحانی اقدار سے وابستگی اور رواداری کے وسیع تصور کے انعکاسات جا بجا نظر آتے ہیں۔ انھیں کے اثر سے مایوسی، نفرت اور بے زاری کے تاریک سایے ان کی شخصیت اور شاعری پر سایہ فگن نہیں ہو پائے۔

بیسویں صدی کا آغاز ان کی شاعری کا آغاز ہے۔ اس وقت سے اب تک ۶۰، ۶۲ سال کی لمبی مدت میں، زندگی کے ہر شعبے میں نہ معلوم کتنے انقلاب آئے۔ ملک میں بہت سی تحریکیں صورت بدل بدل کر اٹھیں اور ڈوب گئیں۔ سیاسی تحریکوں نے ایک منزل پر پہنچ کر، ہنگامہ ہائے نفرت کا سہارا لیا اور نفرت نے چند قدم آگے بڑھ کر مسرت کے ترانوں کو مناجاتِ بیوہ میں بدل دیا۔ لیکن محروم صاحب کی شاعری میں پہلے دن جو پاکیزہ خیالی تھی وہی آج بھی ہے۔ وہ شروع ہی سے وطن دوستی اور محبتِ ابنائے وطن کے جذبے سے سرشار رہے ہیں لیکن دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح، ان کی وطن دوستی نے تعصب یا منافرت کا سہارا لینا ضروری نہیں سمجھا اور حالات سے گھبرا کر پرانے تصورات کی گرد کو دامن سے جھٹک دینا خلافِ وضع داری سمجھا۔ یہ معمولی بات نہیں۔

محروم صاحب نے غزلیں بھی کہی ہیں، رباعیاں بھی اور نظمیں بھی۔ ایک مشاق شاعر قدرتِ کلام کے فیض سے ہر صنف میں کچھ نہ کچھ کہہ سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت ان کی بیانیہ اور تاثراتی نظمیں اور رباعیاں ان کے کمال کی حقیقی جولاں گاہ ہیں۔ غزلوں

میں مشاقی، قدرت کلام، لفظوں کا رکھ رکھاؤ اور ردیف و قافیے کا دست و گریباں ہونا، غرض سارے خارجی محاسن موجود ہیں لیکن وہ گھلاوٹ نہیں ہے جو اچھی غزل کا سرمایہ ہے اور جس کے بغیر تاثیر و دل کشی کی موج تہ نشین پیدا نہیں ہوتی۔

"کاروانِ وطن" ان کی سیاسی و وطنی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان نظموں میں وطن دوستی، آزادی سے تعلقِ خاطر اور وطن کے ذرّے ذرّے سے محبت کرنے کا پرخلوص جذبہ موجزن ہے۔ ان نظموں میں جذبۂ صادق اور خلوص و وفا کی نمود ہے لیکن جوش و ولولہ اور تاثیر نسبتاً کم ہے۔ اس کی وجہ ان کی سلامتِ طبع بھی ہے اور پرگوئی بھی۔ کہیں کہیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ محروم صاحب نے ہر اس عنوان یا واقعے پر فوری طور سے قلم برداشتہ نظم لکھ دی ہے، جو کسی بھی وقت ان کے ذہن میں آیا، یا جس کے متعلق کچھ سنا، کسی خیال کو ذہن و فکر کے پرپیچ راستوں میں کچھ دیر تک بھٹکنے کے لیے چھوڑ دینا اور اس وقت تک انتظار کرنا کہ وہ جذبے کی دھیمی دھیمی آنچ میں تپ کر نکھر جائے، ضروری ہے۔ اس جذبے کو جب لفظوں میں منتقل کر دیا جائے گا اس وقت تاثیر کا رنگ خود بخود چمک اٹھے گا۔ اس کے بغیر بیان کی دلکشی خواہ کسی حد تک پیدا ہو جائے لیکن شدتِ تاثیر کی جھلک بھی نظر نہیں آئے گی۔ "کاروانِ وطن" کی بیش تر نظموں کو پڑھ کر اس بات کا واضح طور پر احساس ہوتا ہے۔

"کاروانِ وطن" کی نظموں کے مقابلے میں "نیرنگِ معانی" کی نظمیں زیادہ قابل توجہ ہیں۔ "نیرنگِ معانی" میں جو منظومات "جذباتِ فطرت" کے عنوان کے تحت درج ہیں، ان میں سے بیش تر میں حسنِ بیان، زورِ بیان اور تاثیر و دل کشی کا رنگ نمایاں ہے۔ اس مجموعے کا پہلا حصہ خدا کی تعریف، بزرگانِ مذہب کی تعریف اور بعض تہواروں کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں ان کی وسیع المشربی اور مذہب دوستی کا رنگ تو نمایاں ہے لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر سے ان نظموں میں وہ خوبی نہیں ہے جو "جذباتِ فطرت" والی نظموں میں ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محروم صاحب کے حقیقی مرتبۂ شاعری کی نمایندہ ان کی بیانیہ اور تاثراتی نظمیں ہیں۔

"جذباتِ فطرت" کے ذیلی عنوان کے تحت ۴۲ نظمیں ہیں اور ان میں بیش تر نظمیں حسنِ بیان جذبات نگاری اور تاثیر سے دست و گریباں ہیں۔ ان میں چستیِ بندش کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ پاکیزہ و لطیف تشبیہوں اور شاعرانہ تعبیرات سے حسنِ بیان میں لطف مزید کا اضافہ کر دیا ہے۔ مثلاً اس حصۂ منظومات کے شروع ہی میں ایک نظم "آفتاب" کے عنوان سے ہے۔ اس کا پہلا بند ہے۔

اے شمعِ دل فروزِ شبستانِ کائنات — تیری کرن کرن ہے رگِ جانِ کائنات
سرچشمہ زندگی کا ہے دریا ہے نور کا — مقصد بہت وسیع ہے تیرے ظہور کا
ہنگامہ زندگی کا ترے دم سے گرم ہے — یہ بزم تیری تابشِ پیہم سے گرم ہے

سورج کی کرن کو رگِ جانِ کائنات کہنا کیسا اچھا اندازِ بیان ہے۔ اس کا آخری بند ہے۔

گزری ہے شب جہاں کو ترا انتظار ہے ہر ذرہ جستجو میں تری بے قرار ہے
مرغانِ صبح خیز کی مشرق پہ ہے نظر ہیں راہ دیکھتے تری واماندۂ سفر
چڑیوں کے دل میں پھر ہے چہکنے کی آرزو کلیاں لیے ہوئے ہیں چٹکنے کی آرزو
چپ چاپ برہمن لبِ دریا ہے منتظر پہلی کرن کی چشمِ تماشا ہے منتظر

"محروم کا وطن" کے عنوان سے اپنے وطن پر جو نظم کہی ہے۔ اس میں کسی مبالغے کے بغیر ان ساری مقامی خصوصیات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے جو دراصل مصیبت کا دوسرا نام ہیں۔ شروع کا بند دیکھیے کس انداز سے بات اٹھائی ہے۔

اپنے وطن کی شان میں کہتا ہوں چند شعر ہر چند شعریت سے ہے عاری یہ سرزمیں
دوزخ عزیز اہلِ عقوبت کو ہو اگر اہلِ جہاں ہمیں بھی ہے پیاری یہ سرزمیں

اور آگے چل کر تیسرے بند کے ایک شعر میں ساری مصیبتوں کو اس طرح بیان کر دیا ہے کہ ایک شعر ساری خصوصیات کا آئینہ دار بن گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

راحت نہ مل سکے گی مسافر یہاں تجھے قریوں میں لوگ راہ میں کانٹے اُلجھتے ہیں

ہر دم پیش آنے والی مشکلوں اور وہاں کے رہنے والوں کے عادات و خصائل کی کیسی وسیع الذیل تصویر ہے۔

اس مجموعے کی دو نظمیں "وادیِ نشاط" اور "وادیِ غم" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ زندگی کے دو مختلف تصورات کی عکاسی ایسے شاعرانہ انداز سے کی ہے کہ طبیعتوں کے اختلاف اور اس کی کارفرمائی سے احساس کا فلسفہ آنکھوں کے سامنے مجسم ہو کر آجاتا ہے۔ یہ دنیا درحقیقت نہ گہوارۂ آلام ہے نہ شبستانِ راحت، یہ ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں دیکھنے والے کے تصورات کی جلوہ گری ہی نظر آتی ہے۔ جن کو وہ دنیا کی حقیقت سے تعبیر کرنے لگتا ہے۔ مسرت و غم کا وجود درحقیقت خارج میں اتنا نہیں ہے جس قدر ہمارے ذہن و احساس میں محفوظ ہے۔ اسی کے فیض سے یہ دنیا کسی کو کبھی جنتِ شداد معلوم ہوتی ہے کسی کو بت خانۂ چین اور کسی کو محض غمکدہ۔ غم دوست فطرت اور الم چشیدہ دل کو اس دنیا کا ہر گوشہ غموں سے معمور نظر آتا ہے کسی وادی میں مسرتوں کے قافلے خیمہ زن نظر آبھی جاتے ہیں تو وہ ان کو نصیبِ دیگراں سمجھ کر منہ پھیر لیتا ہے۔ وہ اگر دور سے اس بزمِ عشرت کی جھلک دیکھ بھی لیتا ہے تو معاً اس کی نگاہیں آسمان کو بھی دیکھتی ہیں۔ اور وہ اس بزمِ عشرت کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔ وادیِ نشاط کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

دامنِ کہسار میں ہے اک مقامِ دل نشیں شوخیوں رنگینیوں رعنائیوں کی سرزمیں

نظم میں نہایت چابکدستی کے ساتھ اس وادی نشاط کی تصویر کھینچی ہے اور دامن کہسار کی رعایت کو ہر جگہ اس حد تک ملحوظ رکھا ہے کہ نظم میں وحدت مکان کی جس حد تک لازمی رعایت ہونا چاہیے، اس کا حق ادا ہو گیا ہے مثلاً

ناچتی پھرتی ہیں کرنیں اس میں پریوں کی طرح
ندی نالے گیت گاتے ہیں گڈریوں کی طرح

حسن تدبیر تکلف سے یہاں آزاد ہے
عشق زنجیر تاسف سے یہاں آزاد ہے

عشرت امروز کو اندیشۂ فردا نہیں
یاد ماضی کی حکایت بھی کوئی سنتا نہیں

ساری تصویر کشی کے بعد شاعر مرکز اصلی پر پلٹ آتا ہے۔

گاہے گاہے دور سے اس کی جھلک پاتا ہوں میں
آسماں کو دیکھتا ہوں اور پلٹ آتا ہوں میں

اس کے بعد وادی غم کا بیان شروع کر دیتا ہے۔ یہ اس کی پسندیدہ جنت ہے۔ اس ویرانے کا ہر ذرہ اور ہر کانٹا اس کے احساسات کا امین اور اس کے جذبات کا سرمایہ دار ہے۔ اسی لحاظ سے اس حصۂ نظم میں تاثیر کی فراوانی ہے معلوم ہوتا ہے سچائی نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا ہے۔

خامشی چھائی ہوئی ہے دامن کہسار میں
دم بخود بیٹھی ہے حیرت سایۂ اشجار میں

طائروں کو اس جگہ گانے کی عادت ہی نہیں
ندیوں کو شور کرنے کی اجازت ہی نہیں

پرتو خورشید کے منہ پر نقاب سایہ ہے
صبح کا ملبوس جو ہے شام کا پیرایہ ہے

رنگ و بوئے گل میں اصلا شوخی و تیزی نہیں
فصل گل میں دل کشی ہے پر جنوں خیزی نہیں

چاندنی راتوں میں میلی ہے ردائے ماہتاب
چپکے چپکے جا رہا ہے سر جھکائے ماہتاب

سبزۂ دامن کشاں چاروں طرف خوابیدہ سا
ہر شجر حیرت زدہ دل گیر سا غم دیدہ سا

جلوہ گر تمکین خاموشی ہے اپنی شان میں
جس طرح بیٹھا ہوا ہو کوئی گہرے دھیان میں

سیر اس وادی کی اکثر آ کے کر جاتا ہوں میں
میری نظروں میں یہ رہتی ہے جدھر جاتا ہوں میں

کیسی پر تاثیر نظم ہے اور کس قدر متناسب و دل کش انداز بیان سے معمور۔

وارداتی نظموں کے ذیل میں، ان کی نظم "کمسن بچی کے مدفن پر" معرکہ کی نظم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبات لفظوں کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ اس کے ایک ایک مصرعے پر تاثیر کی مہر لگی ہوئی ہے۔ شکنتلا مرحوم صاحب کی بچی تھی، جو کمسنی ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ یہی اثر ان نظموں میں ہے، جو انھوں نے اپنی دوسری لڑکی ودیا کی خودکشی کے سلسلے میں کہی ہیں ــــــ کے مختلف رہنماؤں اور معروف اصحاب کے مرثیے بھی محروم صاحب نے لکھے ہیں جن سے ان کی وسیع المشربی اور

صلح کل طبیعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے لیکن ان مراثی میں تاثیر کا حصہ کم ہے۔

رباعی فارسی الاصل صنف ہے اور وہاں وہ بلندی کی آخری منزل پر ہے۔ رباعی میں فکر بلند کے ساتھ ساتھ مشاقی اور قدرتِ کلام کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض اور اصناف سے زیادہ، یہی وجہ ہے کہ اس خارزار میں کم لوگ قدم رکھتے ہیں، اور جو قدم رکھتے ہیں، ان میں سے بھی صرف معدودے چند کو منزلِ مقصود پر پہنچنا نصیب ہوتا ہے۔ محروم صاحب کے مجموعہ رباعیات میں ایسی متعدد رباعیاں موجود ہیں، جن کو رباعی کے کسی بھی اچھے منتخب مجموعے میں شامل کیا جا سکتا ہے مثلاً

دروازہ نجات کا بیاباں میں نہیں	دل کا آرام قصر وایواں میں نہیں
تسکین جنت میں بھی نہیں مل سکتی	جب تک موجود قلب انساں میں نہیں

دنیا نے عجب رنگ جما رکھا ہے	ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے	اس عالم آب و گل میں کیا رکھا ہے

میں خصوصیت کے ساتھ اس طرف متوجہ کرنا، اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہ نقطۂ نظر کہ شاعر کا سارا کلام ضرور چھپنا چاہیے، ہر لحاظ سے غلط ہے۔ اسی غلط اندازِ نظر کی وجہ سے محروم صاحب کی اچھی نظمیں بھی بہت سی معمولی نظموں میں دب کر رہ گئی ہیں۔ یہی حال رباعیوں کا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ محروم صاحب کے سارے کلام کا ایک مختصر اور نمایندہ انتخاب مرتب کیا جائے جو بہ آسانی ایک مختصر مجموعے میں سما سکتا ہے تاکہ ان کی شاعری کی صحیح تصویر سامنے آئے۔ ورنہ دوسرے بہت سے لوگوں کے مجموعوں کی طرح کچھ دنوں کے بعد ان مجموعوں کو بھی کم سے کم لوگ پڑھیں گے۔ میں یہ بات بھی واضح کردوں کہ کسی شاعر کی اچھائی یا بلندی کے اثبات کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی دوسرے شاعر سے اس کا تقابل کیا جائے یا یہ دیکھا جائے کہ اس نے وطنی یا سیاسی موضوعات پر کیا لکھا ہے۔ یہ محض مفروضات ہیں۔ شاعر کے مرتبے کا تعین اس کی دس نظمیں بھی کر سکتی ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو سو نظمیں پیش کی جائیں جن میں سارے سماجی موضوعات بکھرے ہوئے ہوں اور وہ شاعر کے مرتبے کو اور پست کر دیں۔ شاعری میں مرتبے کے تعین کو کلام کی کثرت یا موضوعات کی تقسیم سے لازمی تعلق نہیں ہے۔ وہ شاعر بھی ہمارے سامنے ہیں جن کے سو، پچاس شعر ان کو زندۂ جاوید بنانے کے لیے کافی ثابت ہوئے ہیں اور وہ شاعر بھی ہمارے سامنے ہیں جن کے دس ہزار شعر بھی ان کے نام کو مرحوم ہونے سے نہیں بچا سکے۔ نیز یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر شاعر کا کوئی مخصوص رنگ بھی ہو۔ انفرادیت ایسی دولت ہے

جو سیکڑوں نہیں، ہزاروں میں سے چند خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ شاعر کو اچھا اس وقت مانا جائے، جب اس کے یہاں کوئی انفرادی رنگ بھی ہو۔ شعر کا بجائے خود اچھا ہونا ایک چیز ہے۔ اور وہی درحقیقت شاعر کا آخری سہارا ہے۔ باقی سہارے جلد یا بدیر ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

نریش کمار شاد

ایک انٹرویو

اس دن میں صبح ہی محروم صاحب کے ہاں پہنچ گیا۔ محروم صاحب بھی غالباً صبح کی سیر کے بعد ابھی واپس پہنچے تھے۔ مجھے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر فرمانے لگے "اچھا تو آپ حسب وعدہ آگئے" پھر میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے "بھئی میں تو ایک سیدھا سادا سا آدمی ہوں۔ میری سیدھی سادی زندگی میں کوئی خاص بات ہی کیا ہے کہ میرا انٹرویو لیا جائے" اور پھر ایک لمحہ کے تامل کے بعد سنجیدگی سے کہا "بہرکیف آپ جس مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں اسے پورا کیجیے۔ اور پوچھیے مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں نے انٹرویو کی ابتدا اس استفسار سے کی کہ آپ کی شاعری کی ابتدا کن حالات سے ہوئی؟

محروم صاحب کی شفیق آنکھیں خلا میں گھورنے لگیں، وہ اپنی زندگی کی گھڑی کی سوئیوں کو بہت پیچھے گھماتے ہوئے بتانے لگے "ایک گاؤں ـــــ دور افتادہ گاؤں میں دریا کے کنارے سکونت تھی۔ لڑکپن ـــــ بلکہ بچپن ہی سے دل قدرتی مناظر سے متاثر ہوتا رہا تھا۔ ابھی شاید تیسری یا چوتھی جماعت کا طالب علم ہی تھا جب ایک منظوم کتاب "مجموعۂ قصص" ہاتھ لگ گئی۔ یہ نظم آسان تھی اور تھی بھی بحر خفیف میں، اسے پڑھتا رہا اور نامعلوم طور پر موزوں مصرعے زبان پر آنے لگے۔

میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "تو شروع میں آپ نے کن موضوعات پر شعر کہے اور سب سے پہلی نظم یا غزل کب کہی؟"

"جو کچھ ابتدا میں کہا وہ محض داخلی جذبے کا اظہار تھا۔ مثلاً پانچویں جماعت میں ایک نظم "بارش" پر کہی۔ جس کا ایک شعر تھا ؎

الٰہی تری مہر بانی ہوئی　　　کہ ساری زمین پانی پانی ہوئی

"اور آپ نے اپنے اشعار پر اصلاح کس سے لی؟"

میرے اس سوال کے جواب میں محروم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ بچپن اور لڑکپن میں جہاں رہتا تھا اس علاقے میں سیکڑوں میل تک کسی شاعر یا ادبی شخصیت کا نام ونشان نہیں تھا۔"

"اپنا تخلص محروم کیا آپ نے خود تجویز کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

جی ہاں ۔"

"اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے" میں نے اپنے سوال کو واضح کرتے ہوئے کہا ۔ "کہ آپ کی طبیعت شروع ہی سے غم پسند تھی، اور اسی وجہ سے آپ نے محروم تخلص اختیار کیا۔"

محروم صاحب کے چہرے پر اُداسی کا غبار سا چھا گیا اور میں نے محسوس کیا کہ واقعی وہ غمگین سے ہو کر کہہ رہے ہیں ۔

"بلا شبہ میری طبیعت شروع ہی سے غم پسند واقع ہوئی ہے ۔ بقول خود ؂

غم ہائے روزگار کی منزل کہیں جسے — اس دل کو شاد رکھنے کی خدمت ملی مجھے

اسکول کی کتابوں میں بھی رقت آمیز مضامین پڑھ کر اکثر جماعت ہی میں آنسو نکل آتے تھے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بیس پچیس لڑکوں کی کلاس میں جب میں نے پہلی بار "فسانۂ آزاد" کا ایک مضمون "محمود کا پھانسی پانا اور اس کے چھوٹے بچے کا بلبلانا" پڑھا تو میں اکیلا ہی ایک ایسا طالب علم تھا جس کی آنکھیں نم ناک ہو گئی تھیں ۔" اور وہ پھر بچپن کی یادوں کے جھرمٹ سے نکلتے ہوئے متوازن ہو کر کہنے لگے ۔ بعد میں مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ؏

مزن فالِ بد کا ورد حالِ بد

چنانچہ جب ہائی کلاس میں پہنچا اور "زمانہ" کانپور کے اڈیٹر منشی دیا نرائن نگم سے خط و کتابت ہوئی تو میں نے ان کو تخلص بدلنے کے متعلق اپنے ارادے سے مطلع کیا اور محروم کی بجائے "پرواز" تخلص تجویز کیا اور چند رباعیات بھی اسی تخلص کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیجدیں لیکن انھوں نے اس تجویز کو رد کر دیا اور مجھے محروم تخلص کے قائم رکھنے پر ہی مجبور کیا ۔

بولتے بولتے جب محروم صاحب چپ ہو گئے تو میں اپنی محویت سے چونکا اور چند منٹ کی خاموشی کے بعد یہ سوال میری زبان پر آیا "اپنی ابتدائی شاعری میں آپ کس شاعر سے بہت زیادہ متاثر تھے"؟

محروم صاحب نے حافظہ پر زور دیتے ہوئے کہنا شروع کیا ۔ "جب شاعری کی ابتدا کی تھی اس وقت ایک ایسے اسکول میں پڑھتا تھا جس میں نہ کوئی لائبریری تھی اور نہ جس کے اساتذہ میں کوئی باذوق حضرت تھے ۔ ان دنوں اتفاق سے "دیوانِ ذوق" میرے ہاتھ لگ گیا ، اسی کو پڑھتا رہتا تھا اور اپنی شاعری میں سب سے پہلے اسی سے متاثر ہوا ۔ ہائی اسکول میں پہنچ کر "آبِ حیات" کے مطالعہ کا موقع ملا اور اب شاعری کا شوق بھی قدرے پختہ ہو چکا تھا چنانچہ ۱۹۰۶ء میں اقبال اور دوسرے شعرائے وقت کے کلام سے واقفیت ہوئی ۔ ویسے جہاں تک شعوری طور پر متاثر ہونے کا

سوال ہے میں سرور کے کلام سے اثر پذیر ہوا۔ اقبال کے ساتھ ساتھ سرور کا بھی غیر معمولی معتقد اور مداح ہوں، سرور سے میری عقیدت میرے بعض اشعار سے بھی مترشح ہے۔ سرور سے ایک طرحیہ نظم میں میرا یہ شعر بہت مشہور ہے کہ ؎

جی میں آتا ہے کہ آکر چوم لوں تیرے قدم　　　آہ لیکن جاں گزا ہے دوریٔ منزل کا غم

"شروع کی شاعری میں آپ زیادہ تر نظم کہتے تھے یا غزل"؟

شروع ہی سے میری طبیعت نظم کی طرف مائل تھی، پہلی قابل ذکر نظم کوئن وکٹوریہ کا مرثیہ تھا، جس کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے ؎

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں گل گریباں چاک ہیں　　　نو نہالانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

۱۹۰۶ء سے "زمانہ" کانپور اور "مخزن" لاہور میں میری نظمیں باقاعدگی سے شائع ہونے لگیں۔"

"جب آپ نے شاعری کا آغاز کیا تھا محروم صاحب! ——" میں نے دریافت کیا "اس وقت شعر گوئی کا کیا مقصد آپ کے پیش نظر تھا؟"

محروم صاحب نے انتہائی بے تکلفی سے اعتراف کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں کہا "کوئی واضح مقصد نہیں تھا بس یوں سمجھ لیجیے کہ اندرونی ولولہ کی وجہ سے شعر کہتا تھا۔ شعر کہنے کی وجہ سے چونکہ اپنے ساتھیوں اور ہم درسوں میں مجھے ممتاز سمجھا جاتا تھا اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ جذبۂ شہرت کو تسکین دینے کی غرض سے شعر کہتا تھا تو نامناسب نہ ہوگا۔ ویسے آگے چل کر بیرونی تحریکوں سے متاثر ہو کر بھی میں نے شعر کہے ہیں۔ جن میں متعدد شعراء کے مرثیے اور رہنمایانِ وطن سے متعلق میری بیشتر نظمیں شامل ہیں۔"

"اپنے ہم عصر شاعروں میں کون کون سے شاعر آپ کو بہت پسند ہیں۔"

"بہت سے شاعر پسند ہیں۔ جیسے اقبال، درگا سہائے سرور، جوش ملیح آبادی، تلوک چند محروم ناظر، غلام بھیک نیرنگ، نوبت رائے نظر، برق دہلوی اور منور لکھنوی —— "اور ممکن ہے اس وقت اس ضمن میں دو چار مزید نام میں بھول بھی گیا ہوں ——"

میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ نے فرمایا ہے کہ اقبال بھی آپ کے پسندیدہ شاعروں میں ہیں لیکن یہ بتائیے کہ کیا اقبال کے سیاسی نظریات سے بھی آپ متفق ہیں؟"

"بلاشبہ اقبال کو میں اپنے دور کا عظیم ترین شاعر سمجھتا ہوں" محروم صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ان کی فکر اور ان کا اسلوب ان کی شاعرانہ عظمت کا بین ثبوت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے سیاسی نظریات سے مجھے اختلاف رہا

ہے۔ چنانچہ ان کی زندگی ہی میں اپنے اختلاف کا اظہار اپنے متعدد اشعار میں کر چکا ہوں۔ مثلاً وہ قومیت کا انحصار وطن پر نہیں رکھتے۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ

ہر ایک قوم ہے اپنے وطن سے وابستہ ہیں جس طرح گل و بلبل چمن سے وابستہ

یا

ہر قوم کا وجود ہے اپنے وطن کے ساتھ وابستہ جیسے جان گرامی ہے تن کے ساتھ

اسی طرح ان کی شاہینی قسم کی تعلیم سے بھی مجھ کو اختلاف ہے۔ صرف مجھ کو ہی نہیں تمام امن پسند طبائع شاہین کو کبوتر پر جھپٹتے ہوئے دیکھ کر خوش نہیں ہوتیں۔ میرا مسلک تو مولانا گرامی کا یہ شعر ہے۔ خواہ اس کو بزدلی تصور کیا جائے یا کچھ اور ؎

جانور را کہ جاں ز تن بردی جان من آہ جان من بردی

خواجہ حافظ شیرازی کیا خوب فرماتے ہیں ؎

مباش در پئے آزار ہرچہ خواہی کن کہ در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

"کیا آپ نے عروض کا فن باقاعدہ طور پر سیکھا ہے۔"

"باقاعدہ ——" انھوں نے ہنستے ہوئے اس لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا" باقاعدہ تو کیا بے قاعدہ بھی نہیں نہ کسی نے مجھے عروض سکھایا اور نہ میں نے خود اس کا مطالعہ کیا۔ لیکن جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے ابتدائی شاعری میں بھی کم از کم وزن کی غلطی تو سرزد نہیں ہوئی۔"

" رباعی آپ کی محبوب صنف سخن ہے قبلہ! اور رباعی کہنے پر آپ کو کافی قدرت بھی حاصل ہے —— میں نے انھیں کے جواب سے سوال پیدا کرتے ہوئے پوچھا ——" تو عروض کو جانے بغیر آپ رباعی کے پیچیدہ اوزان پر کیوں کر قادر ہو گئے ——؟

دوسرے شعراء کی رباعیاں پڑھ کر رباعی کے ایک وزن کا نقش طبیعت پر بیٹھ گیا۔ اسی کی رہنمائی میں رباعیاں موزوں ہوتی گئیں۔ ویسے فن عروض سے اپنی ناواقفیت کے متعلق میں ایک قطعہ زمانہ طالب علمی میں بھی کہہ چکا ہوں"

محروم ہم کو عشق نے شاعر بنا دیا بے ساختہ زباں سے نکلتی ہے دل کی بات
کرتے رہیں گے مولوی صاحب تمام عمر! مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات

میں نے ایک ملاقات میں ڈاکٹر اقبال سے بھی عروض کے متعلق دریافت کیا تھا کہ شاعر کے لیے عروض کا مطالعہ کہاں تک

ضروری ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا تھا کہ میں نے تو عروض سبقاً سبقاً پڑھا ہے۔ اگر کوئی . . . . . . پڑھے تو بھی کام چل سکتا ہے، اس سے میری تو صلہ افزائی ہوئی۔"

"اردو کے پُرانے شاعروں میں سے کن کن کے دواوین آپ نے پورے طور پر پڑھے ہیں"؟

"غالب اور ذوق کے سوا کسی کا سالم دیوان نہیں پڑھا۔ ویسے مختلف تذکروں میں تمام اہم شعرائے اردو کی منظومات نظر سے گزرتی رہی ہیں اور ان سے واقفیت ہوتی رہی ہے۔"

فارسی کے کن کن شعرا کے دیوان زیرِ مطالعہ رہے ہیں؟

"صرف حافظ اور سعدی کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا ہے ورنہ "شعر العجم" اور "سخندانِ پارس" میں دوسرے شاعروں کے حالات پڑھے ہیں، اور ان کا کلام دیکھا ہے۔"

"انگریزی کے کن کن شاعروں سے آپ متاثر رہے ہیں؟"

"ٹینی سن، ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس میں سے ہر ایک کی چند نظمیں اور شیکسپیئر کے تین چار ڈرامے پڑھے ہیں۔ اور ان کے بعض حصّوں کو اردو میں بھی منتقل کیا ہے۔"

"سنسکرت اور ہندی کے ادبِ عالیہ کا مطالعہ آپ نے کس حد تک کیا ہے۔"

سنسکرت سے ناواقف ہوں، اور ہندی میں بھی اگرچہ مجھے کم دسترس ہے، تاہم ہندی کی مدد ہی سے بھرتری ہری کے بعض اشلوک اور گیتا کے گیارہ ادھیائے اردو نظم میں ترجمہ کر چکا ہوں۔ نیز کئی دعائیہ ویدمنتروں کے ترجمے بھی۔"

"محروم صاحب! آپ خود تو کسی کے شاگرد نہیں ہیں، لیکن یہ فرمایئے آپ کے کون کون سے قابلِ ذکر شاگرد ہیں۔؟"

اور محروم صاحب نے اس سوال کے جواب میں استادانہ متانت سے کہا "بات یہ ہے شاد! میں نے شاعری میں سرے سے استادی شاگردی کا قائل نہیں ہوں۔ اس نصف صدی میں متعدد مبتدی شعرا نے اصلاح لینے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن میں نے ان کی ایک آدھ نظم دیکھ کر یہی مشورہ دیا کہ وہ مستند شعرا کا مطالعہ کریں اور مشقِ سخن سے کام لیں۔

البتہ مہاشہ چمنی سرشار کافی مدت تک اصلاح کے لیے نظمیں بھیجتے رہے اور میرے انکار کے باوجود اپنی ضد پر قائم رہے اور ہاں آپ نے بھی کسی زمانے میں اصلاح کے لیے اشعار بھیجے تھے۔"

"آپ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں، لیکن آپ نے غزلیں بھی تو کہی ہیں۔"؟ میری یہ بات سن کر جب محروم صاحب سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے تو میں نے بے اختیار یہ سوال کر دیا۔ "کامیاب اور معیاری غزل کی آپ کے نزدیک کیا خصوصیات ہیں۔"

"ہیئتی حسن ——" محروم صاحب سوچ سوچ کر رُک رُک کر بولنے لگے، "الفاظ کی درو بست۔ زبان کی درستی —— اور تاثر —— اور جذبات عالیہ —— اور اشاریت۔ سیاسی اور رومانی جذبات واحساسات کی تفسیر —— اور ——"

"خیر چھوڑیے اور بتایئے کہ اس دور کا سب سے بڑا غزل گو شاعر آپ کی نظروں میں کون ہے؟"

"سب سے بڑا تو جگر تھا وہ مر گیا —— ہاں زندہ غزل گو شاعروں میں جدید انداز میں فراق گورکھپوری اور قدیم طرز میں جوش ملسیانی۔"

"اچھا یہ فرمایئے کہ اس دور میں واقعی غزل کا ارتقا ہوا ہے۔"

"جی ہاں واقعی ہوا ہے ——" محروم صاحب نے کامل اعتماد کے ساتھ کہا —— "بلکہ اس حد تک ہوا ہے کہ میں اس کے ارتقا کی رفتار سے قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتا۔"

محروم صاحب کی زبان سے جوش ملسیانی کی اتنی تعریف سن کر مجھے یہ پوچھنے کا حوصلہ ہوا۔ "آپ کی نسل کے بیشتر شعراء زبان و بیان کی فنی قدروں کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ ان قدروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے"؟

"شعر کو مؤثر اور خوب صورت بنانے میں فن اگر مدد دے تو اس کی پابندی لازمی ہے، لیکن محض فن کی خاطر شعر کہنا حقیقی شاعری نہیں ہے، لوازماتِ فن زیور کا درجہ رکھتے ہیں اور یہ زیور شاید شعر کے حسن میں اضافہ ضرور کرتے ہیں، لیکن اگر زیورات سے اسے لاد دیا جائے تو فطری خوب صورتی پر پردہ پڑ جاتا ہے۔"

"آپ طبعاً غم پسند ہیں، اس لیے آپ کی اکثر نظموں کے علاوہ آپ کے بیشتر غزلیہ اشعار میں بھی غمناک فضا ملتی ہے۔ لیکن آپ نے بعض عاشقانہ اشعار بھی کہے ہیں جیسے ؎

خلوت ناز میں او چھپ کے سنورنے والے
مر گئے حسرتِ دیدار میں مرنے والے

رہے گی حاجتِ شرحِ وفا نہ محشر میں
اسی ادا سے جو تم سامنے خدا کے چلے

اور کئی شعر رندانہ مضامین کے بھی حامل ہیں جیسے ؎

نام کوثر رکھ دیا ہم سے چھپانے کے لیے
بزمِ واعظ میں بھی ذکرِ عشرتِ مے خانہ تھا

یا

اس شراب خانے سے دور ہے بہت مسجد
شیخ جی یہاں پہنچے آپ کس بہانے سے؟

اتنا کہنے کے بعد میں ذرا رُکا، اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ نے زندگی میں کبھی عشق کیا ہے اور شراب پی ہے۔"

محروم صاحب یہ سن کر کھلکھلا کر ہنسنے لگے اور بولے "میری غزلیہ شاعری تمام تر رسمی ہے اور محض شعرائے متقدمین کی تقلید میں عاشقانہ اور رندانہ اشعار موزوں کیے ہیں، اور میری عاشقی اور رندی قطعی فرضی اور خیالی ہے۔"

"اردو کے جدید شاعروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ کے خیال میں کیا انھوں نے اردو شاعری میں کوئی اضافہ کیا ہے؟"

"کیا ہے" محروم صاحب نے فی الفور جواب دیا "لیکن سب نے نہیں بعض شاعروں نے۔ اور ان کا کلام مجھے بے حد پسند ہے۔ لیکن ان میں سے بعض نے عریانی اور فحش گوئی سے کام لیا ہے۔ یہ مجھے قطعاً پسند نہیں۔ بلکہ اس کی وجہ سے جدید شاعری سے نفرت سی ہو گئی ہے۔"

"کون کون سے نئے شاعر آپ کو خاص طور پر پسند ہیں؟"

"ایسے کئی شاعر جنھوں نے قدیم روایاتِ شعر گوئی سے بھی اپنا رشتہ قائم کر رکھا ہے مثلاً سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی اسرار الحق مجاز، ساحر لدھیانوی، مجروح، شکیل، اختر الایمان، سکندر علی وجد، شاہد صدیقی ہیں۔ اگر اسے خویش نوازی نہ سمجھیں تو نریش کمار شاد، اور جگن ناتھ آزاد کو بھی ان میں شامل کر لیں۔ لیکن ان میں سے اکثر کے سیاسی عقاید کا نہ مجھے پورا علم ہے اور نہ میں اس پر کوئی رائے دے سکتا ہوں۔"

"آپ ادب میں افادیت کے کہاں تک قائل ہیں؟"

"میرے خیال میں افادیت ادب کا لازمی مقصد ہونا چاہیے۔ لیکن ادب کا ادبی پیرائے میں ہونا ضروری ہے۔ جیسے شیخ سعدی کی گلستاں بوستاں۔ میرے خیال میں جس ادب کو "فن برائے فن" کہتے ہیں اس میں بھی ایک حد تک افادیت موجود ہے۔ عاشقانہ شاعری اگر تیز و تند جذبات کو بھڑکانے والی نہ ہو تو "احساسِ جمال" کو ابھارنے میں ممد ثابت ہوگی۔ یہ بھی افادیت ہی ہے۔ مختصر یہ کہ جو ادب جذباتِ صالحہ کو ابھارتا ہے اس میں افادیت ہے خواہ وہ ادب قدیم ہو یا جدید۔ رندانہ شاعری صرف تفنّنِ طبع کا سامان پیدا کرتی ہے۔ ممکن ہے نوجوانوں کو اس سے ترغیبِ مے نوشی ہوتی ہو۔ یہ بات بہت مُضر ہے۔"

"آپ کی کون کون سی نظمیں آپ کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں؟"

"زیادہ تر مرثیے، عزیز و اقارب کے مرثیے، گرامی، چکبست، سرور اور نادر کاکوروی جیسے شاعروں کے مرثیے اور کچھ سیاسی رہنماؤں کے مرثیے، جو ان کی وفات کے بعد میں نے لکھے ——"

محروم صاحب نے اپنے جواب کی وضاحت کے لیے خود ہی فرمایا —— "چونکہ یہ رسمی یا فرمائشی طور پر نہیں لکھے

گئے، بلکہ واقعی میرے احساس کی شدت ان کی تخلیق کا محرک ہوئی ہے۔"

اچانک اردو نظم کے سلسلہ میں مجھے فراق صاحب کی ایک بات یاد آگئی، چنانچہ اسے دوہراتے ہوئے میں نے محروم صاحب سے پوچھا۔" ابھی حال ہی میں فراق صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی تو انھوں نے اپنی بات چیت کے بارے میں کچھ اس قسم کی رائے کا اظہار فرمایا تھا کہ گزشتہ بیس برس میں اردو کی کسی نظم نے ان کے دل و دماغ پر ایسا گہرا اور پائدار نقش نہیں چھوڑا جیسا غزلوں کے بعض شعروں کا ہے ——— آپ کے خیال میں فراق صاحب کی یہ رائے کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے؟"

محروم صاحب کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہنے لگے" فراق صاحب کی رائے کافی حد تک درست ہے۔ نظمیں بہت کم لکھی جارہی ہیں اور جو لکھی جارہی ہیں اور جو لکھی جاچکی ہیں، وہ بھی اس معیار کی نہیں، جو معیار بیسویں صدی کی ابتدا میں لکھی گئی نظموں کا تھا" اور پھر کچھ دیر رک کر خود ہی کہنے لگے۔" شاید بیسویں صدی کی ابتدا میں لکھی گئی نظمیں اس لیے بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ وہ نظم کا ابتدائی دور تھا۔"

شعر و شاعری کو چھوڑ کر ادب کی دوسری اصناف کا ذکر چھیڑتے ہوئے میں نے دریافت کیا" اردو کے کون کون سے نقاد آپ کو پسند ہیں؟"

"شعر و سخن کی تنقید کا حق صرف انھیں کو حاصل ہے جو خود بھی اچھے شاعر ہوں" یہ کہہ کر محروم صاحب نے کہا" اس لیے میں نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، احتشام حسین وغیرہ کو بہت اچھا نقاد خیال کرتا ہوں۔ اس دور سے پہلے حالی اور چکبست کے تنقیدی مضامین کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔"

"اردو افسانہ نگاری سے آپ کو کس حد تک دل چسپی ہے۔" اور میرے اس سوال کا جواب محروم صاحب نے میرے سوال سے بھی مختصر لفظوں میں دیا "پڑھنے کی حد تک۔"

"کون سے افسانہ نگار آپ کو پسند ہیں۔"

"کرشن چندر، عباس، کنہیا لال کپور، شوکت تھانوی بہت پسند ہیں۔ رسالوں میں جہاں ان کے افسانے نظر آتے ہیں پڑھ لیتا ہوں، بلکہ ان میں سے بعض کے تو مکمل مجموعے بھی پڑھے ہیں۔ ابتدا میں پریم چند کی کہانیاں جو "زمانہ" کے پرچوں میں پڑھیں، بے حد دلکش اور مرغوب تھیں، کیوں کہ ان میں حب الوطنی کا جذبہ بھی تھا، اور اصلاحی مواد بھی۔ ہاں، موجودہ افسانہ نگاروں میں رام لال کی چند کہانیاں بھی شوق سے پڑھی ہیں کیونکہ ان کے کردار میرے ضلع میانوالی کی جیتی جاگتی شخصیتیں معلوم ہوتی ہیں۔"

"اچھا اب یہ فرمائیے ——— میں نے موضوعِ گفتگو کا دھارا موڑتے ہوئے کہا" جس زبان کے جلیل القدر شاعر سے میں انٹرویو لے رہا ہوں اور جس کے شعر و ادب کے متعلق اتنے سوالات کر چکا ہوں اس زبان کا ہندوستان میں مستقبل کیا ہے"؟

"مستقبل ——— آپ کا مطلب ہے اردو کا مستقبل ———" محروم صاحب کے چہرے کی متانت نسبتاً زیادہ گہری ہوگئی اور انھوں نے کہا "اسکولوں اور کالجوں سے اردو زبان کا خارج ہوجانا صریحاً اردو زبان کے مستقبل کا ایک افسوسناک پہلو ہے۔ کیونکہ جب اردو پڑھنے والی نسل ہی نہ رہے گی تو اردو اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی اشاعت لازماً محدود ہوکر رہ جائے گی، اور ہندوستان میں اور دوسری غیر زبانوں کی طرح ایک ثانوی حیثیت اختیار کرے گی۔ اگر گورنمنٹ کی طرف سے اردو کو کچھ مراعات مل گئیں تو یہ زبان زندہ رہے گی اور ترقی کرے گی۔ میں اس نظریہ سے متفق نہیں ہوں کہ کوئی زبان حکومت کی مدد کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے یا ترقی کر سکتی ہے۔ انگریزی عملداری میں اردو کو جو فروغ حاصل ہوا وہ سرکاری امداد ہی سے ہوا۔"

اردو کے سلسلہ میں دوسرا سوال میں نے یہ کیا "اور کچھ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اردو کو زندہ رکھنے کی محض یہی صورت ہے کہ دیوناگری رسم الخط کو اپنا لیا جائے۔ اس سے آپ کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟"

اس کے جواب میں محروم صاحب نے کہا "رسم الخط کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ اس کے بدلنے سے اردو کو بہت نقصان پہنچے گا اور اردو کے پرانے ادب کا ذخیرہ نایاب اور ناکارہ ہوکر رہ جائے گا۔ پڑھنے والوں کو بھی بے شمار دقتیں پیش آئیں گی۔ اردو کا موجودہ رسم الخط ایسا مشکل نہیں کہ اسے تبدیل کیا جائے۔ قومی یک جہتی کی خاطر اتحاد کے خواہاں دونوں زبانوں میں مہارت کیوں نہ حاصل کریں۔"

"ویسے محروم صاحب! آپ کے سیاسی نظریات کیا ہیں؟ اور میرے اس غیر متوقع سوال پر محروم صاحب چونکتے ہوئے فرمانے لگے" مجھے سیاست سے صرف اتنا تعلق ہے کہ جو بات ملک اور قوم کے لیے مفید سمجھتا ہوں اس کی تائید کرتا ہوں موجودہ دور میں کانگرس ہی ملکی ترقی کی علمبردار نظر آتی ہے۔ فرقہ داری اور فرقہ آرائی کو مذموم سمجھتا ہوں۔"

"چلیے اب لگے ہاتھوں اپنے مذہبی نظریات پر بھی روشنی ڈال دیجیے۔"

"میں آریہ سماج کو ریشنل مذہب سمجھتا ہوں اور دل سے اس کے عقائد کا قائل ہوا لیکن مذہبی احکام پر عمل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس سے معذور ہوں۔ نیز غیر ضروری مذہبی بحث مباحثہ کو بھی بے کار سمجھتا ہوں۔ آریہ سماج اور سوامی دیانند کی تعریف میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ چنانچہ ایک کتاب موسوم بہ "مہرشی درشن" شائع بھی ہوچکی ہے۔"

"محروم صاحب! آپ اکتا تو گئے ہوں گے لیکن معاف کیجیے ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں ــــ"

"ہاں ہاں ضرور"

"اخلاقیات ہمیشہ سے آپ کا محبوب موضوع رہا ہے نا ــــ؟"

"جی"

"اور اپنی زندگی میں بھی آپ نے ایک اچھا انسان بننے کی کوشش کی ہے ــــ"

میری اس بات کے جواب میں محروم صاحب ٹکٹکی لگا کر مجھے دیکھنے لگے تو میں نے بات کو مکمل کرتے ہوئے کہنا شروع کیا "کیا آپ اس کلیے کو تسلیم کرتے ہیں کہ اچھا انسان ہی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ اپنے تجربے کی بنا پر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہر اچھا شاعر واقعی اچھا انسان ہوتا ہے۔"

محروم صاحب کی کشادہ پیشانی کی لکیریں ایک لمحے کے لیے سکڑیں اور پھیلیں، اور انھوں نے نہایت گمبھیرتا سے کہنا شروع کیا "میرے خیال میں اچھا شاعر ہونے کے لیے اچھا انسان ہونا ضروری نہیں ہے۔ بعض صورتوں میں جذبات اور خیالات اچھے ہوتے ہیں۔ اور عمل ناقص ہوتا ہے اور شاعری انھیں جذبات و خیالات کا سہارا لے کر رونما ہوتی ہے چونکہ تمام تر میرا تعلق طلبا کے ساتھ رہا ہے اور بطور استاد میرا فرض تھا کہ ان کے اخلاق کی نگرانی کرتا۔ اگر میرا اپنا طرزِ عمل مذموم ہوتا تو ظاہر ہے کہ میں اپنے شاگردوں پر اچھا اثر نہیں ڈال سکتا تھا۔ اخلاقی نظمیں جو میں نے لکھی ہیں وہ بھی اسی افتادِ طبع کا نتیجہ ہیں۔"

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم والی بات ہوگئی۔ شکریہ آپ کا کہ آپ نے اتنی زحمت فرمائی ــــــ" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے اتنے دل چسپ سوال کیے۔"

"اچھا آداب عرض۔" محروم صاحب نے مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا، اور میں نے دیکھا کہ سورج کی شعاعیں کھڑکی سے چھن چھن کر محروم صاحب کے پیروں تک پہنچ رہی ہیں اور ایک لمحہ کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نورانی شعاعیں اس عظیم انسان دوست شاعر کی قدم بوسی کر رہی ہیں۔

خلیل احمد کلیم

حرّیت پسند شاعر

انسانی آفرینش اپنے ماحول کی پابند ہے۔ ماحول دراصل ان حالات و معاملات سے عبارت ہے جس میں فطرت کے خارجی اور داخلی دونوں عوامل بہ یک وقت کارفرما ہوتے ہیں۔ جغرافیائی حالات، سماجی رسم و رواج، اخلاقی پابندیاں، آئین و قوانین سب مل کر ماحول اور اس کے عظیم تر رشتوں کو استوار کرتے ہیں۔ ماحول میں انسانی کرب کی آہیں اور اس کی ریخت کے افسانے باہم دگر شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی "ذی شعور تخلیق" ماحول سے ماورا، ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔

دریائے سندھ کے مغربی دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں عیسیٰ خیل واقع ہے۔ یہاں ۱۸۸۷ء میں تلوک چند محروم ایک اوسط درجے کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پر آشوب واقعات ذہنوں سے محو نہیں ہوئے تھے۔ نیز سامراجیوں نے اپنی حکومت کی ساکھ کو مضبوط کرنے کے لیے جو جبر و تشدد اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا تھا اس نے سونے پر سہاگے کا اثر دکھایا۔ محروم نے اسی معاشرہ میں پرورش پائی، یہیں سے اس کے ذہن پر وہ اثرات مرتب ہوئے جو آگے چل کر اس کی گرمیٔ گفتار کا موضوعِ خاص بنے۔ ایک طرف حالات کی ستم ظریفیاں اور دوسری طرف محروم کی شاعری کا فطری میلان دونوں نے مل کر ماحول کی چیرہ دستیوں میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ ان کے قومی اور وطنی جذبات کا والہانہ جوش ان کی مشہور نظم 'بھارت ماتا کیوں روتی ہے؟' میں ملتا ہے۔

کب سے پامالِ جفا ہوتی چلی آتی ہے
ہدفِ تیرِ بلا ہوتی چلی آتی ہے
کشتۂ تیغِ قضا ہوتی چلی آتی ہے
یوں ہی مظلوم سدا ہوتی چلی آتی ہے
تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

جس کی دولت سے ہوا ایک جہاں مالا مال
جس کے دریائے کرم سے کبھی دنیا تھی نہال
آج کل گردشِ افلاک سے ہو کر پامال

سامنے غیر کے پھیلاتی ہے دامانِ سوال

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

یہ ایک ایسے وقت کی آواز ہے جب قومی شعور بیدار ہو رہا تھا۔ وطن کی محبت کے گیت گائے جا رہے تھے۔ لیکن اس آواز میں کسی تھکے ہوئے مسافر کا کرب تھا۔ جو ابھی قنوطیت سے بچا ہوا تھا۔ اس میں ایک توجہ اور اجتہاد کی اسپرٹ موجود تھی۔ شاعر افلاک کی گردش سے پس کر پامال ضرور ہو رہا تھا لیکن وہ مایوس نہیں تھا۔ اسے اپنے جذب صادق میں بیم و رجا کی روشنی کا مینار نظر آ رہا تھا۔ وہ وطن اور وطنیت کی محبت کے جذبے سے سرشار تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ مصیبت اور سماجی ناانصافی (SOCIAL INJUSTICE) وقتی ہے۔ اس قسم کے ہزارہا امتحانات ہمارے استقلال اور استحکام سے ٹکرا کر فنا ہو چکے تھے۔

تلوک چند محروم کی شاعری کے تمام تر رجحانات سیاسی اور سماجی شعور کی بیداری پر منتج ہیں۔ سیاسی تنظیم کے لیے اس وقت ملک میں بہت سی تحریکیں چل رہی تھیں۔ اس وقت کی ایک تحریک "سودیشی" تحریک تھی۔ محروم اس تحریک سے بہت متاثر ہوئے۔

وطن کی الفت میں ہر زباں پر سودیشی وستو، سودیشی وستو
سنا دو ہندوستاں میں گھر گھر سودیشی وستو، سودیشی وستو
یہیں کی روئی یہیں کی ململ، یہیں کا ریشم، یہیں کی مخمل
نہ لنکا شائر نہ مانچسٹر، سودیشی وستو، سودیشی وستو

تحریکِ ترکِ موالات سے ہندو مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات دب گئے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ زوروں پر تھا۔ انگریزوں نے جب ترکوں کے خلاف علمِ جنگ بلند کیا تو مسلمان ان سے متنفر ہو گئے۔ اس سے ہندو مسلم اتحاد کے جذبہ کو مزید تقویت پہنچی لیکن انگریز اس اتحاد کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے پرانے حربہ کا استعمال کر کے ہندو مسلم اتحاد میں نفاق کا بیج بو دیا اور یہ کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ ان حالات کو دیکھ کر محروم کے ذہن پر جو تاثرات مرتسم ہوئے ان کو شعر کی شکل میں اس طرح پیش کیا ہے۔

آہ پھر بزمِ وطن میں شورشِ بیہودہ ہے
ہر مسرت، وقفِ غم ہر عیش خوں آلودہ ہے
اتحاد ان کو گراں ہے اور نفاق ان کو عزیز
ایک مقصد ہے مگر ہے افتراق ان کو عزیز
جب کہیں تدبیر لڑ پڑتی ہے لڑ پڑتے ہیں یہ
جب ذرا تقدیر بنتی ہے بگڑ پڑتے ہیں یہ

کاش انھیں کو دے کوئی سرمست جام صلح کل
لائے نانک کی طرح کوئی پیام صلحِ کل

تلوک چند محروم ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے حامی رہے، اور انھوں نے ہندو مسلم دونوں قوموں کو مشورہ دیا کہ اپنے

وقت جب کہ تحریک آزادی زوروں پر ہے وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے اس مقدس کام میں رکاوٹ پیدا ہو۔ لہٰذا سائمن کمیشن ۱۹۲۵ء کی آمد پر انھوں نے دونوں قوموں کے نفاق کا مرثیہ اس طرح پڑھا ہے ۔

ہے مشہور ہندوستاں کا نفاق ۔۔۔ مرض ہو گیا ہے پرانا نفاق
عجب لوگ ہیں اہلِ ہندوستاں ۔۔۔ نہیں جانتے اپنا سود و زیاں
نہیں متفق یہ کسی بات پر ۔۔۔ تلے رہتے ہیں اختلافات پر
نہ لیڈر یہاں کے بہم متفق ۔۔۔ نہ پبلک نہ اہلِ قلم متفق
کمیشن کے آنے پہ برپا ہے شور ۔۔۔ دکھاتی ہے ہر پارٹی اپنا زور

کوئی کہہ رہا ہے کہ آ سائمن
کوئی چیختا ہے کہ جا سائمن

اس کے باوجود انگریز کی بدنیتی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی یہ وہ زمانہ تھا جب کہ طاعون اور قحط کی وبا سے ملک میں ہزاروں جانیں تلف ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف لارڈ کرزن کی تحریک تقسیم بنگال نے تو "سفید فتنہ" کو بے نقاب کر دیا۔ جب یہ بات حکومت کی کرسیوں سے پھسل کر عوام تک پہنچی تو عوام اس سے بہت دہشت زدہ ہوئے اور ان کی تحریک آزادی کے جذبہ کو ابھرنے کا اور موقع ملا۔ حکومت اس تحریک کو جتنا دبانا چاہتی تھی یہ تحریک اسی شدت سے اور بڑھتی تھی اور دہشت پسندوں میں اشتعال پیدا کرتی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں ہوم رول لیگ کی ابتدا، ۱۹۱۸ء میں انٹیگو چیمسفورڈ کی اصلاحات کی تحریک اور رولٹ بل نے عوام کے جذبات کو اور بھڑکایا۔ عوام کے ہر طبقہ نے ان کے نفاذ کے خلاف آواز بلند کی۔ جلوس نکالے ہڑتالیں کیں۔ اس رجحان کا ردعمل اہلِ پنجاب پر شدید ہوا، اور اس کا زور قصور، امرتسر اور گجرانوالہ میں زیادہ رہا اس غم و غصہ کی معراج امرتسر کے ۱۳ر اپریل ۱۹۲۱ء کو جلیانوالا باغ کے پُرامن جلسہ پر جنرل ڈائر کی گولیوں کی بوچھاڑ تھی۔ جنرل ڈائر کے حکم سے سینکڑوں انسان وہیں گولیوں کا نشانہ بنا دیے گئے۔ ہزاروں زخمی ہوئے اور بہت سوں کو پھانسی دی گئی۔ کئی ماہ تک مارشل لا نافذ رہا۔ لیکن اس کا ایک ردعمل یہ ہوا کہ عوام متحد ہو کر تحریکِ آزادی میں شریک ہوئے۔ اور اس تحریک میں ایک نئی جان پڑ گئی۔

جلیانوالہ باغ کے سفاکانہ قتل کو تلوک چند محروم نے نادر شاہ کے قتل سے بھی زیادہ شرمناک بیان کیا ہے ۔

نادر کا قتلِ عام ہے مشہور آج تک ۔۔۔ سفاک اسی کا نام ہے مشہور آج تک
ڈائر کے قتلِ عام نے خونِ وفا کیا ۔۔۔ لو ہو سے لال دامنِ برطانیا کیا

ان حالات سے حد درجہ متاثر ہو کر محروم بہادر شاہ ظفر کے ہم نوا ہو جاتے ہیں۔ ظفر کے مصرعے "اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں" پر کتنی برمحل تضمین کرتے ہیں ؎

پر و بال اپنے اسیرو سنبھالو | اٹھو اور پھڑک کر قفس توڑ ڈالو
بگڑ جاؤ پاؤں سے رستے لگالو | بہم ہو کے بگڑی ہوئی کو بنالو

اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

یہ صیاد ظالم ہے نا مہرباں ہے | محبت جو چاہو تو اس میں کہاں ہے
دل آزاریوں میں یہ اک آسماں ہے | اذیت نئی، نت نیا امتحاں ہے

اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

۔۔۔ آزادی کے بعد وطن کی محبت کا اظہار قابلِ غور ہے ؎

باغ ہیں اجڑے ہوئے گلیاں ہیں شہروں کی اداس | قتل گاہیں بے بسوں کی ہیں ابھی خونیں لباس

لیکن آزادی کا اس طرح سواگت کرتے ہیں۔ ؎

بلندی پہ ہے آج اپنا ستارا | وہ پستی جو تھی ننگِ ہستی کہاں ہے
کہ لطفِ خدائے جہاں آفریں سے | زمینِ وطن رشکِ آسماں ہے
گیا وہ زمانہ کہ محکوم تھے ہم | ستم دیدہ بدحال مظلوم تھے ہم
اب آزاد ہیں اور دلشاد ہیں ہم | کہ آزاد آباد ہندوستاں ہے

جنگِ آزادی کے بعد وہ اردو کی روایتی شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ؎

بشر کے ساتھ غم ہی غم نہیں ہے | خوشی بھی ہے یہاں اور کم نہیں ہے
جو غم تھا اس میں رونا ہے اسی کا | دلِ محروم کا ماتم نہیں ہے
چمن میں رات بھر رویا ہے کوئی | اسی کے اشک ہیں شبنم نہیں ہے
نہیں مشکل شکستِ دامِ ہستی | شکنجِ گیسوئے پُرخم نہیں ہے
وہی ہے فصلِ گل جب کھل گیا دل | بہار آنے کا اک موسم نہیں ہے
ہمیں باعث ہیں اس کی برہمی کے | مزاجِ زندگی برہم نہیں ہے

سنائیں حالِ دلِ محروم کس کو
کوئی مونس، کوئی ہمدم نہیں ہے

اسی رنگ اور اسی زمین میں ایک قطعہ کہا ہے ؎

بڑی شے ہے ترا یہ جام ساقی | مسلّم بات، ہے مبہم نہیں ہے
ہے نام اس کا طفیلِ جام ساقی | ہوئیں صدیاں جہاں میں جم نہیں ہے

انھیں وطن کے چرند پرند سب ہی سے محبت اور لگاؤ ہے، وہ یہاں کی ہر چیز کو عزیز گردانتے ہیں۔ ان کا فلسفۂ حیات عدم تشدد (اہنسا) کی تعلیمات پر منحصر ہے۔ وہ کسی بھی جاندار کو ایذا پہنچانا بُرا خیال کرتے ہیں۔ ان کی ایک نظم "درمنع شکار" ہے ؎

شغل اچھا نہیں، شکار نہ کر | بے زبانوں کو دل فگار نہ کر
کھیل اس کو سمجھ نہ اے ناداں | کھیلنا جان پر نہیں آساں
جن کو ہے خوف خالق برتر | رحم کرتے ہیں بے زبانوں پر
ہے جو انسان خوف سے عاری | نہیں در خور رحمت باری
جان شیریں عزیز ہے سب کو | حق نے بخشی یہ چیز ہے سب کو
تو اگر جان دے نہیں سکتا | حق نہیں تجھ کو جان لینے کا
جس طرح تو ہے سرد و گرم شناس | جانور کو بھی ہے یونہی احساس
تو ہو بے تاب نوک نشتر سے | اس کو تڑپائے تیر و خنجر سے
اک پٹاخے سے تیری تڑپے جاں | اس کو گولی سے تو کرے بے جاں

بربریت نہیں تو کیا ہے یہ
سر بسر جور ناروا ہے یہ

یہاں سے مرحوم کی زندگی کا ایک نیا موڑ آتا ہے اور وہ گوشۂ تنہائی میں عافیت گزیں ہو جانے کو پسند کرتے ہیں ؎

دنیا میں بہت دوڑے | راحت کے تمنائی
تسکین کی مگر صورت | تجھ میں ہی نظر آئی

اے گوشۂ تنہائی

یہ نظم دراصل کش مکش حیات کی کلفتوں سے نبرد آزما ہونے کی خواہشات کا ردعمل ہے۔

ہر ایک تنگ و دو کی ہے آخر کار آخر
گر تجھ سے یہاں بھاگے ہے کُنجِ مزار آخر

اے گوشۂ تنہائی

خواہاں ہے دل و جاں سے محروم حزیں تیرا
کاش اس کو دلِ ناداں ہونے دے مکیں تیرا

اے گوشۂ تنہائی

محروم کی زندگی کا محور قومی اور وطنی بیداری رہا ہے۔ ان کا پیغام اکبر الٰہ آبادی، درگا سہائے سرور جہان آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، برج نرائن چکبست اور اقبال سے مختلف نہیں رہا۔ اس کا شمار اس ہراول دستے کے سرفروشوں میں ہوتا ہے جنھوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نیز محروم ان نعمتوں سے بھی محروم نہیں ہوئے جن کی بشارت وہ اپنے کلام میں کر چکے تھے۔ وہ ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑے مصلحِ قوم اور ترجمانِ حقیقت بھی رہے ہیں۔

غزل

وہ دل کہاں ہے اہلِ نظر دل کہیں جسے
یعنی نیازِ عشق کے قابل کہیں جسے

زنجیرِ غم ہے خود مری خواہش کا سلسلہ
یا زلفِ خم بہ خم کہ سلاسل کہیں جسے

کشتی شکستگانِ یمِ اضطراب کو
تیرا ہی ایک نام ہے ساحل کہیں جسے

باقی نہیں فروغ بجز سوز و سازِ عشق
شمعِ حیات درخورِ محفل کہیں جسے

اس دل کو شاد رکھنے کی خدمت ملی مجھے
غمہائے روزگار کی منزل کہیں جسے

اس دورِ قدردانِ سخن میں بہ اتفاق!
شاعر وہی ہے رونقِ محفل کہیں جسے

محروم چاکِ سینۂ ہر گُل میں ہے وہ چیز
تاثیرِ نالہ ہائے عنادل کہیں جسے

ماہر القادری

قِرانُ السّعدین

جناب تلوک چند محروم سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، ان کی زیارت سے میں محروم ہی رہا۔ مگر ان کے کلام کے ذریعے ان سے بارہا ملا ہوں۔ اپنے کلام میں وہ ایک مرنجان مرنج، صلحِ کل اور شریف انسان نظر آتے ہیں۔ ان کی عاشقانہ شاعری میں (ROMANCE) جھلکتا ہے۔ مگر عیاشی اور آوارگی نہیں پائی جاتی۔ یہ جو کسی شوخ مزاج شاعر نے کہا ہے بلکہ دعا مانگی ہے سے

کہ ایں آوارۂ کوے بتاں آوارہ تر بادا

تو محروم

"کوئے بتاں" کی آوارگی کو پسند نہیں کرتے، کوے بتاں میں کسی کا گزر ہو جائے، تو اسے خودداری اور عزتِ نفس سے کام لینا چاہیے۔ محروم نے اپنی شاعری کے ذریعے محبت کی چنگاریوں کو ہوا تو ضرور دی ہے کہ محبت کی گرمی کے بغیر زندگی اداس اور بے کیف رہتی ہے۔

مگر

ان کی شاعری پڑھنے والے کو "عورتوں کا تعاقب کرنے کے لیے نہیں ابھارتی" اور نہ "کوٹھوں" کی سیر کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ محروم تغزل کے تقاضوں اور اس کے مزاج کو پہچانتے ہیں۔ لیکن وہ تغزل کو اس درجہ شوخ اور رنگین بنا دینا نہیں چاہتے جو پرائی بہو بیٹیوں کو تصور ہی تصور میں "اغوا" کرنے کے لیے لوگوں کو ابھارے، اور "آنکھیں سینکنا" نوجوانوں کا محبوب مشغلہ بن کر رہ جائے۔ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ تلوک چند محروم محبت کی لطافت اور پاکیزگی کو "ہوس" سے دور رکھنا چاہتے ہیں، ہوس کثیف ہے، محبت لطیف ہے ——— اور شاعر "کثافت" کا نہیں "لطافت" کا امین اور نقیب ہوتا ہے۔

محروم کا کلام قدیم اور جدید شاعری کا برزخ ہے۔ وہ امیر و داغ اور اکبر و اقبال کے درمیان ایک سفیر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ تلوک چند محروم خیر سگالی کے وفد (GOOD WILLMISSION) کے نمائندے کا فرض انجام دیتے ہیں کہ قدامت اور جدت کے مابین کسی قسم کی غلط فہمی اور انقباض و تکدر باقی نہ رہے۔ شعر و ادب کی فضا کو سیاست بازوں کی رسہ کشی سے بلند ہونا چاہیے۔

محروم کی شاعری میں "موضوعات" کی رنگا رنگی اور بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ گھریلو زندگی سے لے کر مناظر فطرت اور قومی و وطنی جذبات و احساسات تک قریب قریب ہر موضوع ان کے کلام میں ملتا ہے۔ اپنی نظموں میں وہ نادر کاکوروی، برج نرائن چکبست اور خوشی محمد ناظر کے ہم صفیر ہیں۔ "لے" سب کی ایک ہی جیسی ہے۔ مگر لہجہ کا فرق ہے۔ اور لہجے کے فرق نے "لے" کے زیر و بم میں بھی شخصیتوں کا امتیاز پیدا کر دیا ہے۔

اردو اور فارسی شاعری میں سب سے زیادہ مشکل صنف رباعی ہے۔ اس کے لیے بڑی پختہ مشقی اور قدرت کلام کی ضرورت ہے۔ رباعی کے صرف چار مصرعوں میں شاعر کو اپنا مفہوم ادا کرنا ہوتا ہے "رباعی" محروم کی پسندیدہ اور محبوب صنف ہے انھوں نے سینکڑوں رباعیاں لکھی ہیں۔ یہ دلیل ہے ان کی دقت پسندی، معنی آفرینی اور قدرت کلام کی۔ رباعیات میں ان کا زیادہ تر انداز ناصحانہ ہے۔ خیام کی طرح وہ نادنوشی کی تلقین نہیں کرتے۔ محروم کی رباعیوں میں حضرت ابوسعید ابوالخیر کی رباعیات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی بعض رباعیاں کیا عجب ہے کہ "ضرب المثل" بن جائیں۔

جناب تلوک چند محروم نے اپنی شاعری میں زبان کی صحت کا بہت کچھ خیال رکھا ہے، بے عیب تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ہر بڑے سے بڑے انسان کے کام میں کچھ نہ کچھ کور کسر رہ ہی جاتی ہے۔ محروم کے یہاں بھی زبان و محاورہ کے بعض تسامحات ہماری نگاہ سے گزرے ہیں ـــــ مگر مجموعی طور پر ان کی شاعری صحت زبان کی آئینہ دار ہے۔

تلوک چند محروم کو اردو زبان سے لگاؤ نہیں والہانہ محبت ہے۔ ان کی آرزو ہے، دعا ہے بلکہ ان کا مشن ہے کہ "اردو" ہی کو ہندوستان اور پاکستان کی قومی زبان ہونا چاہیے، کہ یہ زبان "آفاق گیر" ہے۔ اپنی وسعت، جامعیت، دلکشی اور جاذبیت میں دنیا کی کسی زبان سے ہیٹی نہیں ہے جس زبان کی روس تک دھوم مچی ہے اسے اپنے وطن میں اس کا جائز حق تو ملنا چاہیے۔

اردو زبان کے ساتھ جہاں کہیں بھی "سمپورنا نندی" سلوک کیا جاتا ہے، محروم کو اس سے بڑا دکھ ہوتا ہے، اس بڑھاپے میں اس دکھ کو وہ سہ رہے ہیں۔ مگر مایوس نہیں ہیں۔ ان کے اندر رجائیت کی بڑی ہما ہمی پائی جاتی ہے۔ سدا ایک سے دن نہیں رہتے۔ تعصب کا غبار کبھی نہ کبھی تو ضرور چھٹے گا۔ اس وقت اردو آفتاب جہاں تاب بن کر نمودار ہو گی۔ اور تلوک چند محروم خوشی کے مارے پکار اٹھیں گے ؎

دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

تلوک چند محروم کے شعر و ادب کی سب سے بڑی کمائی اور کامیابی ان کے لائق فرزند جگن ناتھ آزاد کی ادبی شہرت اور شاعرانہ عظمت ہے۔ یہ "قران السعدین" اردو زبان کے لیے نیک فال ہے۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت

محرومؔ اور ان کا شعورِ غم

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ حضرت محروم اردو کے موجودہ شاعروں میں سب سے زیادہ محترم اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ جتنا کلام آپ کا اب تک سرانجام ہوا اور شائع ہو چکا ہے اتنا بامعنی اور موثر کلام شاید ہی کسی اور شاعر کا منظرِ عام پر آیا ہو اردو شاعری کی خدمت حضرت محروم پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصے سے کر رہے ہیں اور ان کے کلام کے جتنے مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں، ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ان کی زندگی بن گئی ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ شعر کہنے سے ہٹ کر جو وقت ان کا گزرا وہ شعر کے فن کے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں گزرا ہے۔ اب جہاں تک اردو شاعری اور اس کے فن کا تعلق ہے، حضرت محروم کی شخصیت ایک فرد کی نہیں رہی بلکہ وہ شعر و سخن کا ایک ادارہ بن گئے ہیں۔ کم سے کم میرے ذہن میں حضرت محروم کا جب کبھی تصور آتا ہے اسی طرح آتا ہے۔

حضرت محروم کے کلام سے میری عقیدت آج کی نہیں کوئی سولہ سترہ سال پرانی ہے۔ بچپن میں جب ہم اپنی درسی کتابوں میں حضرت محروم کی نظمیں "نور جہاں" "کنارِ راوی" "محنت کرو عزیزو" "بادِ بہاری چلی" وغیرہ پڑھتے اور کورس کے طور پر گاتے تو ایک خاص سرخوشی کی کیفیت ہم سب پر طاری ہو جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ نظم کی رو ہمارے خیالات کو بھی اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہی ہے۔ دُور اپنے ماحول سے دور ——— جہاں ہم اپنے کو فطرت کی رعنائیوں میں گم پاتے۔ نسیمِ بہار کے جھونکے ہمارے دلوں کی ننھی کلیوں کو کھلاتے دکھائی دیتے۔ "محنت کرو" کو ہم خاص طور پر مل کر پڑھتے اور ایک ولولہ اور کام کرنے کا ایک جوش ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتا۔

اس وقت حضرت محروم کی نظموں کے مخصوص تاثر کو ہم کوئی نام نہیں دے سکتے تھے اور نہ ہی اس کا تجزیہ کر سکتے تھے۔ اب ان کی نظموں کو ایک وسیع کینوس پر دیکھنے اور انھیں پڑھنے کے بعد یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ ان نظموں کا تاثر شاعر کے خاص وجدان اور اس کی نفسی اور ذوقی کیفیتوں کا نتیجہ ہے۔

جن موضوعات نے حضرت محروم کو اپنی طرف مائل کیا ہے، وہ محض ذہنی نہیں ہیں بلکہ ان کو شاعر کے مزاج کی افتاد اور طبیعت کے میلان سے ایک گہرا ربط رہا ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں عام طور پر جذبے کی فراوانی، خلوص اور صداقت کی تاثیر نمایاں ہے۔ ان کی شعری اور طبعی صداقتوں نے ان کی شاعری کو ایک معیار بخشا، اور ان کے کلام کے تانے بانے میں کچھ ایسے

نقوش ابھارے اور رنگ نکھارے ہیں، جن کی وجہ سے ان کی شاعری کا ایک مخصوص آہنگ بن گیا ہے۔

حضرت محروم کی شاعری کی پائیدار خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت نیک نفسی کا وہ جذبہ ہے جو اس میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب ہم ان کے کلام کے توسط سے ان کے نہاں خانۂ دل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمارا پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ اس کا کہنے والا ایک نیک نفس شخصیت کا حامل ہے۔ اسی نیک نفسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری خوبی کے ایک خاص معیار تک پہنچ جاتی ہے اور وہاں سے وہ کبھی نیچے کھسکتی نہیں دکھائی دیتی۔

حضرت محروم کے کلام کے کوئی چھ سات مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں اور یہ سارا کلام نہایت وسیع اور متنوع موضوعات اور تجربات پر حاوی ہے۔ "گنجِ معانی" وہ پہلا مجموعہ تھا جو شاعر کا سکہ ادبی دنیا پر بٹھانے کا باعث ہوا۔ آج اس مجموعے کی کئی نظمیں کلاسیکی نظموں کا رتبہ حاصل کر چکی ہیں۔ وطنی، قومی اور ملی جذبات کا پاکیزہ مجموعہ "کاروانِ وطن" ہے۔ انھوں نے کچھ نظمیں بچوں کی دلچسپی اور ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لیے بھی لکھی تھیں، جو "بہارِ طفلی" کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ اس مجموعے میں "دعا" "ہمارا دیش"، "اچھے کام" "محنت" غرض کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں بیان کی سادگی اور سلاست کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان نظموں کے مجموعی تاثر سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے نونہالانِ وطن کے لیے ایک ایسی کائنات کی تخلیق کی ہے جو عملی بھی ہے اور نصب العینی بھی اور جس کی بنیاد اخلاقی اقدار پر قائم ہے۔

"نیرنگِ معانی" ایک اعتبار سے حضرت محروم کی تخلیقی صلاحیتوں کا نکھار ہے۔ "گنجِ معانی" سے لے کر "نیرنگِ معانی" کی اشاعت کے دوران میں بقول پروفیسر عبدالقادر سروری "شاعر کے ادراک اور اس کے اظہار نے فطرتاً رفعت اور بلندی کے بہت سے مدارج طے کیے ہیں اور اس کے سارے خد و خال 'نیرنگِ معانی' میں نمایاں ہیں۔"

حضرت محروم کی رباعیاں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی بہت سی کہی ہیں۔ یہ تفصیل شاعر کی طبیعت کی ہمہ گیری کا ایک پرتو ہے۔ اصل چیز جو اس رنگارنگی میں دیکھنے کی ہے وہ ایک تو شاعر کی وسعتِ قلب و نظر اور اخلاقی معیار ہیں اور دوسرے اس کا روحانی اور تاثراتی پہلو۔ جسے ہم حضرت محروم کے "شعورِ غم" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن اس شعور کو ہم نہ تو فانی کی یاسیت سے جوڑ سکتے ہیں اور نہ ہم میر کے نشاطِ غم اور ان کے شعورِ غم کو ایک کہہ سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ غالب کے اہتزازِ غم سے بھی الگ ہے۔ محروم کا غم ان کا اپنا غم ہے اور ان کا اپنا سرمایہ ہے۔

عظیم شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ناکامی، نامرادی، یاس اور غم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ شاعری پر ہی کیا موقوف ہے۔ ہر عظیم الشان فنی نمونے کی تہ میں یہی عنصر کار فرما ہوتا ہے۔ غم و الم کا یہ عنصر فن کار کے غیر شعوری یا تحت شعوری جذبۂ ناکامی کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔

قطع نظر اس کے کہ حضرت محروم کی شاعری کی نشوونما بیرونی تسلّط کے گھٹے گھٹے سے ماحول میں ہوئی تھی. جس کا پرَ تو "کاروانِ وطن" کی کئی ایسی نظموں میں مل جاتا ہے. جو آزادی سے پہلے لکھی گئی تھیں، اور جن میں وہ وطن اور اہلِ وطن کی بے بسی پر کڑھتے دکھائی دیتے ہیں. چنانچہ نظم "تازیانہ" میں انھوں نے ایک ایسے شخص پر تنقید کی ہے، جسے شعورِ آزادی نہیں ہے اور جو وطن اور اہلِ وطن کی بدحالی کی فکر سے بے نیاز ہے. کہتے ہیں.

قفس میں بلبلانِ نغمہ خواں ہیں تجھ کو کیا پروا　　ترے سرو و سمن وقفِ خزاں ہیں تجھ کو کیا پروا

مصیبت میں ہزاروں خانداں ہیں اور تو بے غم　　ترے اہلِ وطن محوِ فغاں ہیں اور تو بے غم
وطن کے حال پر سب نوحہ خواں ہیں اور تو بے غم　　تزلزل میں زمین و آسماں ہیں اور تو بے غم

تجھے طوقِ غلامی سے جو عار آئے تو کیوں آئے　　جو دل میں حسرتِ قومی وقار آئے تو کیوں آئے

تجھے معلوم کیا قومی حمیت کس کو کہتے ہیں
یہ غیرت مند کیا ہیں اور غیرت کس کو کہتے ہیں

حضرت محروم کی اس نظم کا انداز انگریزی کی ایک مشہور نظم سے بہت ملتا جلتا ہے، جس میں شاعر نے ایسے شخص کی ہجو کی ہے جس کا دل حبِ وطن کے جذبات سے عاری ہے. وہ ایسے شخص سے جل کر کہتا ہے کہ کیا کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کے دل میں وطن کی محبت کا جذبہ نہ ہو. اگر ایسا کوئی شخص موجود ہے تو اس کو اچھی طرح دیکھ بھال لینا چاہیے. جب وہ مرے گا تو اس پر نہ کوئی نوحہ خواں ہوگا اور نہ کوئی اس کی موت پر کفِ افسوس ملے گا. خود حضرت محروم کی ذات میں بھی غم کے ایک سے زیادہ اسباب جمع ہو گئے تھے. ان کی رفیقۂ حیات نے انھیں نوجوانی میں داغِ مفارقت دیا اور اس پر مستزاد ان کی سنِ شعور کو پہنچی ہوئی چہیتی بیٹی نے آگ میں جل کر خودکشی کر لی. وہ شعلے جنھوں نے ان کی بیٹی کو جلا کر بھسم کر دیا تھا ان کے خرمنِ ہستی کو عمر بھر سلگاتے رہے. یہ اور اسی طرح کے دوسرے واقعات نے ان کی زندگی میں درد و غم کی وہ حس پیدا کر دی ہے جس نے ان کے خیالوں کی دنیا میں ایک ہلچل مچا رکھی ہے. وہ اپنے پہلو میں ایک درد آشنا دل رکھتے ہیں، جو مبتلائے آلام انسانیت پر کڑھتا ہے. ان کی حسِ غم نشوونما پا کر ان کی زیست کا اسلوب بلکہ خود زیست بن گئی. اب یہ شعورِ غم نہ انھیں زندگی سے دامن بچانے پر مائل کرتا ہے اور نہ ان سے زیست کی صلاحیتوں کو چھین لیتا ہے. اسی لیے وہ اپنے غم کی ضرب کاری کے باوجود نہ قنوطی بن سکے نہ راہب. اس کی وجہ تھی. اور یہ وجہ بھی کچھ انوکھی سی جان پڑتی ہے. انھوں نے دنیا کی

ہر خوشی اور غم کا تجربہ کیا ہے اور اس کا انھیں اچھی طرح احساس ہو چکا ہے کہ خوشی ایک مفروضہ سے زیادہ نہیں۔ بقول غالب۔

دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا — حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی

نتائجِ حسرت دیرپا نہیں ہوتے۔ اس کے مقابلے میں غم ایک ٹھوس حقیقت ہے بعض طبیعتوں کی پرورش غم کے طوفانوں میں ہوتی ہے، غالب نے کہا ہے۔

چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے — غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو

بلکہ ان کی طبیعت کے جوہر ایسے ہی ماحول میں نکھرتے ہیں، جو بظاہر ناخوشگوار اور نامساعد دکھائی دیتا ہے۔ گویا

ہیں یہ وہ سبزہ کہ زہر آب اگاتا ہے انھیں[1] — جوہرِ تیغ بہ سرِ چشمۂ دیگر معلوم

غم کے نقوش انسان کے دل و دماغ پر انمٹ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے غم کے مماثل واقعات خود اپنے ذاتی غموں کی یاد تازہ کر دیتے ہیں اور یہ یادیں بھی جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہیں، بلکہ جانِ زندگی بن جاتی ہیں۔ کیونکہ ان میں ماضی کی ہر داستان ایک نیا جنم لیتی دکھائی دیتی ہے۔ محروم کہتے ہیں۔

مراخیاں تری یاد سے گلستاں ہے — بہارِ رفتہ تری یاد مونسِ جاں ہے

زندگی کی بساط میں جب کچھ بھی نہیں ہوتا تو یادیں ہی سرمایۂ حیات بن جاتی ہیں۔ یہی غم کو ابدیت بخشتی ہیں، اور غم زندگی کے حق میں سمِ قاتل ثابت ہونے کی بجائے امرت کے گھونٹ بن جاتا ہے۔

حضرت محروم کے بارے میں ایک احساس یہ بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی میں بس دو ہی کام کیے ہیں، محبت اور شاعری۔ محبت کسی ایک فرد سے نہیں بلکہ تمام بنی نوعِ انسان سے۔ ساری انسانیت سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ازل سے ایک جذبۂ محبت سے معمور دل اور احساس سے مملو دماغ لے کر آئے ہیں۔ انھیں اپنے اجداد سے عقیدت ہے۔ اپنے خاندان سے پیار ہے، وطن سے محبت اور اہلِ وطن سے لگاؤ ہے۔ اس لیے ان کے عمل کا کوئی پہلو سرد اور بے مہر نہیں۔ انھوں نے روحِ محبت کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا ہے کہ وہ ایک جذبۂ بسیط بن گیا ہے۔ ایسے جذبۂ محبت میں عصبیت اور تنگ نظری کا پرتو بھی نہیں دکھائی دیتا۔ ان کے لیے غم خواری اور دردمندی ایک فطری سی بات ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری ان کی جگر چاکی اور المناکی کا مظہر بن گئی ہے۔ اور چونکہ انسانیت سے محبت ایک جذبۂ حاوی ہے۔ اس لیے بھی یہ غم کی غم خواری بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ چنانچہ موت پر انھوں نے جو نظم لکھی ہے اس میں نقوشِ ابنِ آدم کی پائمالی پر نوحہ خوانی کا

---

[1] غالب سے معذرت کے ساتھ

یہی محرک ہے۔ کہتے ہیں۔

بربادسازِ رونقِ بزمِ جہاں ہے تو　　　اے موت غایتِ ستمِ آسماں ہے تو
تجھ کو ذرا غمِ غمِ اہلِ جہاں نہیں　　　کچھ دل میں تیرے رحم وکرم کا نشاں نہیں

حضرت محروم نے اپنی ایک نظم میں اپنے "دل سے دو دو باتیں" کی ہیں۔ یہ باتیں نہیں ہیں اصل میں وہ باآواز بلند سوچ رہے ہیں۔ نظم کے مجموعی تاثر سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اضطربِ دل کی کوئی وجہ شاعر کی سمجھ میں نہیں آئی ہے اور غم کی کنہ تک وہ ابھی نہیں پہنچ پایا ہے۔ وہ دل سے پوچھتا ہے۔

دلِ غم نصیب و محزون　　　تو نحیف وزار کیوں ہے
تجھے اضطرار کیوں ہے
ترے غم کو میں بھی جانوں　　　کہ وہ کس ماں کا ہے
نہ شگفتہ فصلِ گل میں　　　نہ کسی چمن میں خنداں
تجھے کیا ہوا ہے ناداں
تجھے بزمِ عیش میں بھی　　　تو بٹھا بٹھا کے دیکھا
تجھے جام دستِ ساقی سے　　　پلا پلا کے دیکھا
نہ ملا قرار تجھ کو
کوئی اور جستجو ہے
تجھے لے چلوں وہاں میں　　　ہیں جہاں چمکتے تارے
کہ تجھے بلا رہے ہیں　　　وہ فلک کے ماہ پارے

نہ تجھے ہے ان کی چاہت　　　نہ ہے تیرہ خاکداں کی
نہ زمیں سے تجھ کو الفت　　　نہ محبت آسماں کی
تو ہے آرزو کہاں کی

"انجام گل" فطرت کی حسین پیداواروں سے وابستگی اور ان کے فنا ہونے کے غم والم کی مظہر ہے۔ ایک پژمردہ پھول پر جب ان کی نظر پڑتی ہے تو ان کے جذبات میں ایک تلاطم برپا ہوجاتا ہے اور اس طرح سے پیرایۂ اظہار اختیار کرتا ہے۔

کس حال میں آہ آج تو ہے　　　وہ خوبیٔ رنگ ہے نہ بو ہے
بکھری ہوئی چند پتیاں ہیں　　　نکہت آوارہ سو بہ سو ہے

کل تک تو چمن میں ہنس رہا تھا　　　وہ خندہ عجیب جاں فزا تھا

انجام گل کو دیکھ کر انجام ہستی کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

آغاز انجام دیکھ گل کا　　　نقشہ یہی جان جزو و کل کا

شاعر کے ذہن کو دنیائے ناپائدار کے حوادث کے تسلسل کا اتنا تجربہ ہوگیا ہے کہ وہ آغاز سے ہی انجام کو سمجھ جاتا ہے۔

آغاز طلوعِ صبحِ انور　　　انجام سوادِ آمدِ شام
آغاز نگاہِ لطفِ ساقی　　　انجام شکستِ شیشہ و جام

حضرت محروم نے ایک نظم "ایک آرزو" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ایک طرح پر اپنے دل میں دنیا اور اس کے حادثات کے بارے میں جو خیالات وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے، انھیں ظاہر کیا ہے۔ پیہم ناکامیوں نے حیات کے بارے میں ان کا ایک نقطۂ نظر پیدا کر دیا ہے اور اسی نقطۂ نظر کا اظہار انھوں نے اس نظم میں کیا ہے۔ نظم کے جستہ جستہ شعر حسب ذیل ہیں۔

آہ یہ دنیا کے جھگڑے اور یہ فکرِ بیش و کم　　　بے قراری ہائے امیدِ مسرت خوفِ غم
ہر قدم پر آہ نیرنگِ جہاں کا سامنا　　　شعبدہ آرائی ہائے آسماں کا سامنا
ہے کہیں جور و جفا مہر و وفا کے روپ میں　　　اور کہیں مکر و دغا صدق و صفا کے روپ میں

دنیا کی یہ حالت دیکھ کر شاعر کے دل کے ایک گوشے میں یہ آرزو ابھرتی ہے۔

روحِ مضطر کو کسی ایسی جگہ لے جاؤں میں　　　کش مکش سے چھوٹ جاؤں اور تسکین پاؤں میں

لیکن کسی طرح یہ آرزو فرار کا پرتو نہیں بلکہ شاعر کے حسنِ فطرت اور حسنِ مطلق کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانے کی خواہش کا نتیجہ ہے۔ یہی آرزو شعر کی صورت میں اس طرح ظاہر ہوئی ہے۔

جو یہاں در پردہ ہے وہ آشکارا ہو جہاں　　　حسنِ مطلق بے تکلف جلوہ آرا ہو جہاں
پاک ہو جائے جہاں آلائشِ دنیا سے دل　　　جوڑ لے اپنا تعلق عالمِ بالا سے دل

شاعروں کے ذہن، فکر کے ایک ہی رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔ ہر قابل ذکر شاعر کی زندگی میں ایسے بھی لمحے آئے ہیں جب انھیں روحانی سکون کی تلاش ہوئی ہے، اور انھوں نے ایک نصب العینی دنیا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس

دنیا کے خدوخال ممکن ہے کہ ان کے ذہنی ارتباط کی وجہ سے ملتے جلتے نظر آئیں۔ ہمارے شعراء میں غالب نے اپنی ایک دنیا کی تخلیق کی کوشش کی، اور اقبال نے ایک جہانِ آرزو تعمیر کیا ہے۔

حضرت محروم جیسے دلگیر اور دردمند آدمی کے لیے ہر ماحول یکساں ہوتا ہے۔ شبِ غم کے بعد کی سحر بھی گزشتہ دکھوں کا مداوا نہیں بن سکتی، شبِ غم سوز و گداز کا آتش کدہ ہے تو طلوعِ سحر اس آتش کدہ کا بجھ جانا ہے۔ اس لیے سحر کے ساتھ افسردگی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اور "قیدِ حیات و بندِ غم" جب ایک ہو جائیں تو شعورِ غم کو بھی ایک رفعت حاصل ہو جاتی ہے۔ محروم کہتے ہیں۔

چمکے جگر کے داغ طلوعِ سحر کے ساتھ   پایا نہ ہم نے چین شبِ غم گزار کے

زیست کے تلخ حقائق نے حضرت محروم کے دل سے تمناؤں کی ایک ایک آہٹ بھی چھین لی ہے۔ تشنگی اور ناتمامی کا احساس ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں بھی رچ گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کبھی ابرِ کرم کی نہ بوندگری ہوئی آہ نہ شاخِ امید ہری   ترے دل کی کلی نہ کھلی نہ کھلی ترے باغ میں بادِ صبا نہ چلی

محروم کا ایک اور پر معنی شعر ہے۔

جو گری فلک سے شبنم رہی تا سحر وہ گریاں   جو صبا کہیں سے آئی تو لیے غبار آئی

اس شعر کی کیفیت اس سطحِ آب کی سی ہے جو اوپر سے پرسکون نظر آتی ہے لیکن اس کی تہ میں ہزار طوفانوں کی شورشیں چھپی ہوئی ہیں۔ یہی دراصل حضرت محروم کے بطون کی بھی حالت ہے۔

حضرت محروم کے شعور کی آنکھ نے غم کے اتنے رخ دیکھے ہیں کہ آخرکار غمِ مسلسل غم گوارا بن گیا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر شاعر کا احساسِ ذات خوابیدہ ہو جاتا ہے اور وہ مظاہر کی نیرنگیوں میں یک رنگی کو پا جاتا ہے۔ کہتے ہیں۔

یہ جو نالے ہیں زینتِ قرطاس   ہے فقط اپنی شاعری کا پاس

ورنہ ہم کو خزاں بہار ہے ایک   برگِ گل اور نوکِ خار ایک ہے

ذہنی رفعتوں کے ایک اور مقام پر پہنچ کر وہ یہ بھی محسوس کرنے لگتے ہیں کہ راحت کو دوام نہیں تو غم کو بھی کب قیام ہے۔ یہ ساری اختلاف نہیں دراصل ہمارے احساس کی اضافیت کا نتیجہ ہے۔ فرماتے ہیں:

خیالِ رنج و راحت میں عبث اے دل پریشاں ہے
نہ یہ قائم نہ وہ دائم یہ پرّاں وہ شتاباں ہے

خلیق انجم

محروم کا سیاسی شعور

۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب نے ہندوستانی زندگی کے ہر گوشہ میں انقلاب پیدا کر دیا، اور خاص طور پر ہماری سماجی تہذیبی اور ادبی اقدار کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اردو شاعری جو اب تک حسن و عشق اور گل و بلبل میں گم تھی اچانک بیدار ہو گئی۔ شاعر کا ذہن اور اس کی نظر غم جاناں کی حدود سے نکل کر غم روزگار پر پڑنے لگی۔ وطن اور قوم کی اہمیت اور محبت کا احساس پیدا ہوا اور شاعر نے پہلی بار مڑ کر اپنے اس عظیم ماضی کو دیکھا جو اب ایک قصۂ پارینہ سے زیادہ نہ تھا۔ حال کے خونیں مناظر نے ان میں سوئے ہوئے انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، آزاد اور حالی نے حب الوطنی کے نغمے چھیڑے۔ عظمت ماضی کے مرثیے لکھے اور مستقبل کی منزل کی طرف اشارہ کیا۔ حالی کا تعلق سرسید گروہ سے تھا جو انگریزی حکومت کو نعمتِ عظمیٰ سمجھتا تھا۔ ہندوستان کو مغل حکومت اور ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں سے نجات مل گئی تھی جنھوں نے ڈیڑھ سو سال سے عوام کی زندگی کو اجیرن کر رکھا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان پر ہر ممکن ظلم و ستم کیا تھا۔ لیکن وہ اپنے ساتھ دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ تہذیب اور علوم لائے تھے۔ جنھوں نے صدیوں سے خواب گراں میں رہنے والے ہندوستانیوں کو نہ صرف بیدار کیا بلکہ متحیر کر دیا تھا، اس لیے آزاد، حالی۔ سرسید اور اس گروہ کے دوسرے ادیب اور شعراء انگریزی حکومت کے خیر خواہ تھے ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام محض اس لیے عمل میں آیا تھا کہ محکوم اور حاکم کے خراب تعلقات کو خوشگوار بنایا جا سکے۔ ابتدا میں کانگریس کا مطمح نظر کوئی انقلاب لانا یا غیر ملکیوں سے ہندوستان کو نجات دلانا نہیں تھا بلکہ وہ بالواسطہ ہندوستان میں غیر ملکی حکومت کو اور زیادہ استحکام دینا چاہتی تھی۔ کانگریس کے مقاصد میں تبدیلی بہت آہستہ آئی۔ ابتدائی چند سالوں تک کانگریس نے صرف اس قسم کے مطالبے کیے کہ ہندوستانیوں کو بھی سرکاری عہدے دیے جائیں یا ہندوستان میں بڑھتا ہوا افلاس روکا جائے یا ملک کی صنعتی حالت بہتر بنائی جائے۔ کچھ برسوں بعد سوراج اور پھر مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء کا زمانہ وہ ہے جب کانگریس چاہتی تھی کہ ملکی انتظامات میں خود ہندوستانیوں کا بھی ہاتھ ہو۔ سرسید نے ۱۸۸۸ء ہی سے کانگریس کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ حالی بھی اس تحریک سے کنارہ کش رہے۔ یہ حضرات انگریزوں کی محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے مغل حکومت کے زوال کی اور پھر ہندوستانی مسلمانوں پر انگریزوں کے ظلم و ستم کی پوری تصویر تھی۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتے تھے جو مسلمانوں کی وفاداری کو مشتبہ کرتی۔ حالی مسلمانوں کو ان کے عظیم ماضی کی یاد دلاتے رہے۔ ایک دردمند حساس انسان کی طرح ہندوستانیوں کی تباہ حالی پر آنسو بہاتے رہے۔ لیکن ان کے

سامنے کوئی روشن منزل نہیں تھی۔ ان کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے۔ آزاد اور حالی کے بعد اکبر الہ آبادی، چکبست، اقبال، اسمٰعیل میرٹھی۔ سرور جہاں آبادی اور تلوک چند محروم کا دور تھا۔ یہ تمام شاعر قومی اور سیاسی شعور رکھتے تھے۔ مغربی علوم نے ان کے غور و فکر کی شمعیں فروزاں کی تھیں۔ ان سب کو اپنے وطن سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ اکبر پرانی تہذیب، معاشرت، تمدن، علم اور جاگیرداری نظام کا ماتم کر رہے تھے۔ اسمٰعیل میرٹھی، چکبست اور سرور جہاں آبادی نے وطن پر بہت سی نظمیں کہیں۔ جن کا ایک ایک لفظ محبت اور ایثار کے جذبات میں ڈوبا ہوا تھا۔ چکبست کا مطالبہ ہوم رول سے آگے نہ بڑھا۔ بلکہ وہ برطانیہ حکومت کی وفاداری کا بھی دم بھرتے رہے۔ جس وقت ہندوستان کے نوجوان انگریزوں کی طرف سے جرمنی سے لڑ رہے تھے تو چکبست یہ کہہ کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے ؎

جاں نثار آج تمہارے سا ملتے ہیں نہیں　　ہاں دکھا دو کہ ہو تاجِ سرِ لندن کے نگیں

دوست کیا چیز ہیں دشمن ہوں فدائے تحسین　　آسماں وجد کرے بول اٹھے رن کی زمیں

یوں تو لڑنے کو بہت شہ کے نمک خوار لڑے

اور ہی شان سے لیکن یہ وفادار لڑے

یہ وہ دور تھا جب علامہ اقبال جیسے باشعور شاعر کو کوئی واضح راہ نہیں دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے بھی ۱۹۱۷ء تک ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس وقت یعنی ۱۹۰۸ء میں جب تلوک چند محروم کی عمر مشکل سے ۲۱ سال ہوگی اور انھیں میٹرک کا امتحان پاس کیے ایک سال ہی گزرا تھا انھوں نے اس جبر و استبداد کے نظام کے خلاف بغاوت کے شعلے بلند کیے یعنی انگریزوں کے ظلم و ستم کے خلاف نعرے لگائے اور نوجوانوں کو ترغیب دی کہ وہ ہندوستان کو غیر ملکی لٹیروں سے آزاد کرائیں۔ محروم صاحب نے بہادر شاہ ظفر کے ایک مصرع کو تضمین کیا ہے۔ بحیثیت سیاسی نظم کے یہ کوئی غیر معمولی نہیں ہے بلکہ اردو میں اس موضوع پر اچھی خاصی تعداد میں ایسی بلکہ بعض اس سے بہتر نظمیں مل جائیں گی۔ اس نظم کی اصل اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب ہم اس دور کا تصور کرتے ہیں جس میں یہ کہی گئی ہیں۔ اس لیے محروم صاحب کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے صرف یہی نظم کافی ہے۔ اس نظم کے کچھ بند ملاحظہ ہوں ؎

یہ مجبوری و بے نوائی کی باتیں　　یہ ناطاقتی نارسائی کی باتیں

زمانے کی بے اعتنائی کی باتیں　　یہ ہیں سر بسر جگ ہنسائی کی باتیں

اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

پر و بال اپنے اسیرو، سنبھالو | اٹھو اور پھڑک کر قفس توڑ ڈالو
بگڑ جاؤ پھندے سے گردن نکالو | بہم ہو کے بگڑی ہوئی کو بنالو

اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

یہ صیاد ظالم ہے نامہرباں ہے | محبت جو چاہو تو اس میں کہاں ہے
دل آزاریوں میں یہ اک آسماں ہے | اذیت نئی، نت نیا امتحاں ہے

اسیرو! کرو کچھ رہائی کی باتیں

اس نظم میں کوئی گہرا سیاسی شعور نہیں ہے۔ اور نہ ہی الفاظ کی وہ گھن گرج ہے جو بعض انقلابی شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن وطن کی محبت، حاکم کے ظلم و ستم اور اہلِ وطن کی بربادیوں کے شدید احساس اور خلوص و دردمندی کی وہ دھیمی دھیمی آنچ ہے جو پتھروں کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ مرحوم صاحب کو اپنے وطن سے والہانہ عشق ہے۔ وہ خدا سے اپنی مادی ترقیوں کے لیے دعا نہیں مانگتے بلکہ ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کے ملتجی ہیں۔ خیال رہے کہ یہ ان کی عمر کا وہ زمانہ ہے جب انسان ہر شے پر بہار دیکھتا ہے۔ ہر چیز حسین نظر آتی ہے اور شراب جوانی کی مستی انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور دیکھنے کی قوت کو سلب کر لیتی ہے۔ "کاروانِ وطن" کی سب سے پہلی نظم "دعا" میں مرحوم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اخترِ ہند ہم اوجِ ثریا ہو جائے۔ جس ہندوستان نے کبھی روم و یونان کی تاریکیوں کو دور کیا تھا وہ ایک بار پھر اپنے علم و فن کی روشنی سے دنیا والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دے۔ چند شعر سنیے۔

اے خداوندمرا دہر دعا ہے تجھ سے | اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کر دے
روم و یونان میں گئی روشنی جس مشعل کی | پھر اسے نوردہِ دیدۂ دنیا کر دے
قعرِ پستی سے نکلنے کو ہیں بے تاب بہت | غیب سے خود کوئی سامان مہیا کر دے

ہندوستان کی زبوں حالی پر مرحوم صاحب خون کے آنسو روتے ہیں۔ ان کا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کم عمر ہونے کی وجہ سے وہ اس دور کے سیاسی نظام، سامراجیوں کی لوٹ کھسوٹ اور خود ہندوستان میں پیدا ہونے والے سرمایہ دار طبقہ اور اس کے اثرات کو اچھی طرح نہ سمجھ سکے ہوں۔ لیکن ہندوستان کا افلاس، لاچاری و بے بسی محکومیت کی ذلت و خواری ایسی چیزیں نہیں تھیں جو نوجوان مرحوم کے فہم و ادراک سے باہر ہوں۔ ایک نظم "بھارت ماتا کیوں روتی ہے" میں انھوں نے اپنا جاں دل نکال کر رکھ دیا ہے ؎

دل ملا سختیِ ایام کے سہنے کے لیے | جگر خوں شدہ ہے آنکھ سے بہنے کے لیے

دست ہوا کس نے دیے تھے اسے پہنے کے لیے　　کہ بنے زیورِ زنجیر میں رہنے کے لیے
تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

نظم ۱۹۰۶ء میں لکھی گئی تھی ۔ جب ہندوستان میں سیاسی شعور پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس نظم کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ محروم صاحب کے مزاج، شخصیت اور اسٹائل کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے ۔ اس میں مجاہدوں کا جوش و خروش نہیں ، سرفروشی کی وہ تمنا نہیں جو دار و رسن کو بھی بازیچۂ اطفال بنا دیتی ہے ۔ اس نظم میں وہ نعرے بھی نہیں جو مظلوم کی آنکھوں میں بغاوت کے شعلے پیدا کر دیتی ہیں ۔ اور رگوں میں دوڑتے خون کو آتش سیال بنا دیتے ہیں ۔ اور جو دشمن اور ظالم کو لرزہ بر اندام کر دیتے ہیں ۔ اس نظم میں صرف انسانی ہمدردی ، خلوص ، محبت ، خاموش ایثار اور صداقتِ جذبات کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا ۔ نیاز فتحپوری نے بالکل صحیح کہا ہے کہ حالی کا اثر سب سے زیادہ محروم ہی نے قبول کیا ۔ ان کے ہاں وہی سادگیٔ بیان اور پر خلوص لہجہ ہے جو حالی کو اپنے ہم عصر شعراء اکبرؔ ، اسمٰعیل میرٹھی اور اقبال سے ممیز کرتا ہے ۔ محروم کے خلوصِ جذبات کے متعلق نیاز صاحب نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ " محروم کے جذبات کا خلوص ، انداز بیان کی متانت ، گویا ایک ٹھہرا ہوا سمندر ہے جو طوفان سے زیادہ گہرائی اپنے اندر رکھتا ہے ۔ اور ان کی شاعری محض ماتم ملک و ملت نہیں بلکہ مکمل داستان ہے ۔ ان کے دردمندانہ احساسات کی اور خود ان کے نفسیات وطلون کی جس کی عظمت سے انکار ممکن نہیں ۔" محروم صاحب کو انگریزوں سے شدید نفرت ہے ۔ وہ ہندوستان کو خون چوسنے والے سامراجیوں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں ۔ انھیں کانگریس کی پالیسی سے اتفاق ہے ۔ وہ گاندھی ، تلک ، گوکھلے ، لالہ لاجپت رائے ، موتی لال ، سبھاش چندر بوس وغیرہ کے گیت اس لیے گاتے ہیں کہ یہی لوگ جدوجہد آزادی کی راہ پر گامزن ہیں ۔ انھیں ہر اس شخص سے عقیدت اور ارادت ہے جو جنگ آزادی کا سپاہی ہے ان لوگوں کا نام آتے ہی محروم صاحب کا سر ادب اور احترام سے جھک جاتا ہے ۔ وہ گاندھی جی کی سودیشی تحریک کے نہ صرف حامی ہیں بلکہ اس کا پرچار کرتے ہیں ۔ سودیشی تحریک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

وطن کے دردِ نہاں کی دوا سدیشی ہے　　غریب قوم کی حاجت روا سدیشی ہے
ثبوت ہے یہی اپنے وطن کی الفت کا　　عزیز خاطرِ اہلِ وفا سدیشی ہے
وطن سے جن کو محبت نہیں ، وہ کیا جانیں　　کہ چیز کون بدیشی ہے کیا سدیشی ہے

آزادی کی اس جدوجہد میں محروم صاحب خود حصہ نہیں لے سکے ۔ لیکن ان کی سب سے بڑی تمنا یہی رہی کہ وہ اپنے ملک کو آزاد دیکھیں وہ کاروانِ آزادی کے ہر سپاہی کی پوجا کرتے ہیں ۔ مجاہدین میں جوش پیدا کرتے ہیں ، تاکہ منزلِ آزادی جلد سے جلد آجائے ۔ ایک نظم "بڑھے چلو" کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

بگڑی ہوئی وطن کی بنا لو، بڑھے چلو — گرتے ہوئے نشاں کو اٹھا لو، بڑھے چلو
مردانہ خارزارِ غلامی کو طے کرو — کانٹا بھی پاؤں سے نہ نکالو بڑھے چلو
منزل بہت قریب ہے وہ دن نہیں ہے دور — جب گو ہر مراد کو پا لو، بڑھے چلو

اس نظم میں زبان اور بیان کی ایسی سادگی ہے جس پر سینکڑوں بناؤ سنگار کیے جا سکتے ہیں۔ اور یہی دونوں نظمیں نیاز صاحب کے اس بیان کی تصدیق کے لیے کافی ہیں کہ حالی کا سب سے زیادہ اثر محروم نے لیا ہے۔ محروم صاحب کے سیاسی کلام کا مجموعہ "کاروانِ وطن" ہماری آزادی کی مکمل تاریخ تو نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن اکثر اہم واقعات پر ایسی نظمیں موجود ہیں۔ جن سے تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ سودیشی تحریک، جنوبی افریقہ کے مظلوم ہندوستانی، چار آنسو، ڈائر اور نادر پنجاب اور دہلی کے واقعات پر۔ سائمن کمیشن۔ زندانیوں کی عید۔ غدارِ وطن۔ مہاتما گاندھی کے ایک برت پر۔ مقامِ غیرت۔ کمیونل اوارڈ، قحط بنگال، آزاد ہند فوج، انگریز کے ارادے، گول میز کانفرنس وغیرہ ایسی نظمیں ہیں۔ جن میں راہ آزادی کے اہم واقعات اور حادثات۔ ہندوستانیوں کی فتح و شکست۔ حاکم اور محکوم کے تعلقات پر شاعرانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعات پڑھ کر انسان اتنا متاثر نہیں ہو سکتا جتنا کہ محروم صاحب کی نظموں سے ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان نظموں میں محروم صاحب کا خلوص، درد و کرب اور خونِ دل بھی شامل ہے۔

محروم صاحب انسان ہیں اور ہندوستانی ہیں۔ انھیں ہر اس شخص سے محبت ہے۔ جو ہندوستان میں پیدا ہوا ہے۔ اس لیے مذہب و ملت ان کے لیے اہمیت نہیں رکھتے۔

اس کے سیاسی اور سماجی وجوہ کچھ بھی ہوں لیکن یہ زندہ حقیقت ہے کہ سرسید، حالی اور اقبال کی کوشش نے مسلمان کو کانگریس سے دور کر دیا۔ اور خود کانگرس کے ایک گروپ نے بالواسطہ سرسید گروپ کی مدد کی۔ انگریز کی برسوں یہ جدوجہد رہی تھی کہ ہندو مسلمان خود کو الگ الگ قومیں سمجھیں۔ اچھے اچھے باشعور اور ذی فہم لوگ دو قوموں کے اس تصور کا شکار ہو گئے۔ مگر محروم صاحب کے پائے استقلال میں ذرا جنبش نہ ہوئی۔ انھیں یقین کامل تھا کہ ہندوستان کی قسمت کسی ایک مذہب کے افراد کے نہیں تمام ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے مذہبی تعصبات سے بالاتر ہو کر آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینا چاہیے۔ ورنہ غیر ملکی حکومت اس تفرقہ اور آپس کی نفرت سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتی رہے گی۔ ہندو مسلمان، انجام اتحاد، کمیونل اوارڈ۔ اور اہل وطن کی خدمت میں، ایسے ہی خیالات کی آئینہ دار ہیں۔

ہندوستان کے آزاد ہونے پر جو ایک سچے سپاہی کو اپنی کامیابی پر خوشی ہونی چاہیے وہ محروم صاحب کو ہوئی۔ اگرچہ انھوں نے تلوار سے دشمن کی گردنیں نہیں اڑائی تھیں۔ لیکن وہ اپنے قلم سے تلوار کا کام لیتے رہے تھے۔ آزادی۔ کانگرس

سے نے کیا ہے کلام بڑا۔ اہنسا کے سپاہی۔ ہمارے سپاہی۔ صبر ہمارا جیت گیا۔ اور جشن آزادی۔ ایسے ساغر ہیں جن سے مسرت وانبساط کی شراب جھلک رہی ہے۔ آزادی ملنے پر پاکستان اور ہندوستان میں جو انسانیت کا ننگا ناچ ہوا تھا، اور جو وحشیانہ قتل وغارتگری ہوئی اس نے محروم صاحب کے دل کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس موضوع پر بھی ان کی بہت سی نظمیں کاروانِ وطن میں شامل ہیں۔

اردو ادب نے ہماری آزادی کی جدوجہد میں جو رول ادا کیا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے "کاروان وطن" اعلیٰ ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ ادب کا مورخ محروم صاحب کے کارناموں کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ کلام ہمارے ادب کا گراں بہا سرمایہ ہی نہیں تاریخ ہندوستان کا ایک اہم جزو بھی ہے۔

اگرچہ یہ بات رسمی سی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس حقیقت کا اظہار کرنا ضروری بھی ہے، کہ اس مقالے میں "کاروان وطن" کا جائزہ لینا ناممکن ہے۔ میں صرف چند خصوصیات کی طرف اشارہ کر سکا ہوں۔

غزل

ہر نظارے میں ہیں سو پرتوِ جاناں — کیوں نہ ہو دیکھنے والے میں نئی جاں پیدا

جن کی تقدیس کی کھاتے ہیں فرشتے بھی قسم — ہم گنہگاروں میں ہوتے ہیں وہ انساں پیدا

کر ہی ڈالے گی ہوائے چمنِ دہر ملول — صورتِ گُل بھی اگر کوئی ہو خنداں پیدا

ظلمتِ یاس میں امید کی پنہاں تھی جھلک — پردۂ شب سے ہوا نیرِ تاباں پیدا

حق نے شاعر کے تخیل کو وہ قدرت بخشی
ذرّۂ خاک سے کردے چمنستاں پیدا

محروم

ضیا محمد ضیا
(سیالکوٹ، مغربی پاکستان)

محروم کی اخلاقی شاعری

اس بدیہی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ہی صحبت میں کسی شاعر کی شاعری کے تمام پہلوؤں پر گفتگو کرنا اور اس کے متنوع موضوعات کو زیرِ بحث لانا نہ ممکن ہوتا ہے نہ مفید، بالخصوص ایک مختصر سے مضمون میں تو اس قسم کی کوشش ہمیشہ ناکام و ناتمام رہتی ہے۔ اس وقت کلامِ محروم کے دو مجموعے "گنجِ معانی" اور "رباعیاتِ محروم" میرے پیشِ نظر ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری چشمِ تماشا کے سامنے اس شاعرِ جلیل کے حسین و جمیل افکار و خیالات اور بوقلمونی جذبات و احساسات کا ایک رنگین و پُر بہار چمن کھلا ہوا ہے۔ گلگشت کا شوق اور گلچینی کی ہوس چند لمحوں کے لیے مجھے اس خلدِ معانی اور فردوسِ تخیل میں لے آئی ہے۔ جہاں کا ہر پھول مجھے دعوتِ نظارہ دیتا اور میرے دامنِ شوق کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ حیران ہوں کہ اس گلشنِ بے خار سے کس کس گلِ رعنا کا انتخاب کروں اور کس کس کو اگلی فرصت کے لیے اٹھا رکھوں

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار   گل چینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

جہاں تک جناب محروم کی شاعری اور اس کے مختلف عناصر کا تعلق ہے، میرے خیال میں اس کا سمجھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ بادی النظر میں یہ چیز صاف طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ان کی شاعری تین بڑے عناصر سے مرکب ہے۔ اخلاقیات، جذباتِ غم اور مناظرِ فطرت۔ یہی ان کے سب سے زیادہ اہم موضوع ہیں، اور انہی تین رنگوں کے اختلاط و امتزاج سے ان کی شاعری کی خوب صورت اور دل کش تصویر تیار ہوتی ہے۔ وہ بیک وقت بہت بڑے معلمِ اخلاق بھی ہیں اور ترجمانِ جذبات بھی، مصورِ غم بھی ہیں اور مظاہرِ قدرت کے بہترین عکاس بھی، جذبات نگاری، منظر کشی اور ناصحانہ سخن سرائی پر انھیں یکساں طور پر قدرت اور کمال حاصل ہے۔ قدرتی مناظر پر انھوں نے بڑی لاجواب نظمیں لکھی ہیں۔ آخر شاعر ہیں، زندگی کی دوسری مادی مسرتوں سے محروم ہوں تو ہوں، ذوقِ حسن و زیبائی سے محروم نہیں، وہ جمالِ فطرت سے خود بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی جھلک دکھانے کا سودا رکھتے ہیں۔ اپنے تخیل کی رنگینی اور ذوق کی لطافت سے کام لے کر ایسے ایسے دلکش مرقعے انھوں نے صفحۂ قرطاس پر کھینچے ہیں کہ خود نقاشِ فطرت بھی دیکھے تو دنگ رہ جائے۔ انسانی جذبات کی مصوری اور ترجمانی میں انھیں وہ کمال حاصل ہے کہ بایدو شاید۔ حزن و ملال، درد و غم اور یاس و حرماں کی کیفیات کا بیان و اظہار تو ان کی

طبعِ غم سرشت کے لیے گویا مخصوص ہے۔ ان کی نیچرل اور حزنیہ نظمیں اردو ادب کا ایک قابلِ فخر اور غیر فانی سرمایہ ہیں، مگر ذاتی طور پر ان کی شاعری کی جس خصوصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ اس کا اخلاقی اور روحانی پہلو ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے ان کے کلام کو عظمت بخشی اور معاصرین میں ان کو ایک بلند و رفیع مقام عطا کیا ہے۔ ان کی شاعری کا یہ رنگ اتنا شوخ اور نمایاں ہے کہ اہلِ نظر کو دور ہی سے دکھائی دینے لگتا ہے۔ میں آج کی صحبت میں ان کے اسی دل فریب رنگ اور مہتم بالشان خصوصیت کا اجمالی تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

بد قسمتی سے ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں وہ نفسانیت اور مادہ پرستی کا دور ہے۔ سیم و زر کی ہوس، مادی مفادات کی پرستش، نفسانی جذبوں کی تسکین اور حیوانی خواہشات کا احترام اور اس کے نتیجے میں اخلاقی روایات کی بے حرمتی اور اقدار و تصورات کی پامالی ہمارے معاشرے کے روزمرہ معمولات میں داخل ہے۔ مذہب کی گرفت ہمہ جہت ڈھیلی پڑ چکی ہے اور سماجی زندگی کا پورا نظامِ اخلاق پابندیوں سے آزاد ہو کر رہ گیا ہے۔ ظالم مشینی دور نے تمام اعلیٰ و ارفع مقاصد، پاکیزہ و مقدس خیالات اور شریفانہ جذبات و احساسات کو کچل ڈالا ہے۔ انسان رفتہ رفتہ ایک بے حس کل بنتا جا رہا ہے۔ شاعری بھی آخر ماحول کی پیداوار اور ملکی و سماجی حالات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جب زندگی کے اجتماعی نظام میں مذہب و اخلاق کا عمل دخل ختم ہو کر رہ جائے تو اس نظام کے فکری اور علمی شعبے کیوں کر محفوظ رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا اور شعبۂ ادب بھی جو اقوام کا سرچشمۂ حیات ہے، اس انقلاب کی زد میں آ گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ہماری ادبی محفلوں میں اخلاق کا موضوع خارج از بحث ہو چکا ہے، اور شعر و سخن کی دنیا میں دین اور دھرم کا ذکر اب شاذ و نادر ہی سننے میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جدید فنِ تنقید نے بھی ادب اور اخلاق کے درمیان کچھ ایسا خطِ امتیاز کھینچا کہ یہ دونوں شعبے ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہو کر رہ گئے۔ اب مذہبی معتقدات اور اخلاقی مسائل کی ترجمانی ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا کام نہیں بلکہ مذہبی واعظوں اور مبلغوں کی ذمہ داری ہے۔ آج اگر کوئی شاعر مذہب کی تعلیمات کا نام لیتا ہے، دھرم کے اصولوں کا ذکر زبانِ قلم پر لاتا ہے یا پند و موعظت کا اسلوب اختیار کرتا ہے تو وہ پنڈت اور ملّا تو ہو سکتا ہے، شاعر اور فن کار نہیں۔ حالیؔ کو اپنی ناصحانہ اور مصلحانہ شاعری کی جو سزا تکنیک اور فن کے پجاریوں کی طرف سے ملی تھی وہ آج بھی صلاح کار شاعروں کو مل سکتی ہے اور مل رہی ہے۔

الغرض اردو شاعری جس کا مذہب و اخلاق سے چولی دامن کا ساتھ تھا، جو اوّل روز سے اخلاقی نکتے سمجھاتی اور عالمِ روحانیت کی باتیں کرتی تھی، جو پاک باطن صوفیوں، خدامست درویشوں اور اہلِ حال عارفوں کے جذبات و افکار کی ترجمان تھی، آج محض ہوس انگیز تغزل کے لیے اور یا پھر پست و رکیک خیالات کے اظہار اور بے خدا عصری نظریات کے پرچار کے لیے

وقف ہوکر رہ گئی ہے۔ ان حالات میں جب ہم جناب محروم کی نوائے شاعرانہ اور صدائے عارفانہ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ ہمیں ایک آسمانی پیغام اور الہامی آواز سے کم معلوم نہیں ہوتی، ایک ایسی آواز جو نغمۂ نے کی طرح گوش دل کی راہ سے روح کی گہرائیوں میں اترتی اور نشۂ مے کی طرح رگ و پے میں جاری و ساری ہو جاتی ہے، اور کیوں نہ ہو جس شاعری کی بنیاد خدا، مذہب اور احترام آدمیت کے عقیدے پر قائم ہو، جو ابنائے آدم کو نیکی، حسن عمل اور انسانیت عظمیٰ کا درس دیتی ہو جو دلوں میں اعلیٰ انسانی جذبات کو ابھارتی اور ان کی نشوونما کرتی ہو، جو انسان کی قلبی و روحانی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہو اُسے نوائے سروش اور ندائے ہاتف کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔

جن لوگوں نے کلام محروم کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ میری اس رائے سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ محروم کی نظموں میں ایک خاص نوع کی روحانی فضا اور ایک بھرپور قسم کی وجدانی کیفیت ملتی ہے، ان کے یہاں صوفیانہ مستی اور فن کارانہ ہشیاری ایک عجیب والہانہ انداز میں دوش بدوش چلتی نظر آتی ہیں۔ درد و گداز، جذب و اثر اور سوز و سرور ان کی شاعری کے غیر منفک اجزا ہیں۔ پاکیزگی خیال ان کے کلام کا خاص جوہر اور طہارتِ فکر ان کی شاعری کا اصل زیور ہے۔ ان کا سارا کلام اول سے آخر تک پڑھ جائیے، ابتذال اور عامیانہ پن کی پرچھائیں بھی آپ کو کہیں نظر نہ آئے گی اور ایک لفظ بھی ثقاہت اور متانت کے پایے سے گرا ہوا آپ کو نہ ملے گا۔ حد یہ ہے کہ اگر انھوں نے کھلم کھلا کسی قسم کی ہجو اور مذمت سے اپنی زبان قلم کو آلودہ کیا بھی ہے تو وہ صرف ہجوِ بے اور مذمتِ جہالت ہے۔ لذت پرستی کے اس دور میں ایسی پاکیزہ سنجیدہ اور مہذب شاعری کی مثال یقیناً بآسانی نہیں مل سکتی۔

جیسا کہ میں شروع میں اشارہ کر چکا ہوں محروم کا بنیادی موضوع اخلاق ہے اور نفسِ انسانی کی اصلاح و تہذیب ان کا مطمحِ نظر، ان کا کلام مقصدیت کی روح سے لبریز ہے۔ وہ سخن آرائی کو شغلِ بے جا نہیں سمجھتے، بلکہ اسے ایک انسانیت کی خدمت کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی منظومات میں بالعموم شاعرانہ بلند آہنگی کی بہ نسبت حکیمانہ آہستگی اور مصلحانہ دردمندی و دل سوزی زیادہ پائی جاتی ہے اور جذبات کی شورش و طغیانی کے بجائے افکار کی گہرائی اور لب و لہجہ کی سنجیدگی کار فرما نظر آتی ہے۔ ان کی کوئی نظم بھی اصلاحی جذبے اور فکر سے خالی نہیں۔ مناظر قدرت کا بیان ہو، مسائل زندگی کا ذکر ہو، ذاتی واردات کا اظہار ہو یا کوئی اور موضوع، کسی نہ کسی اخلاقی نکتے کا استنباط ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ روزمرہ کے معمولی واقعات و مشاہدات سے ان کی چشمِ بصیرت اور حقیقت آشنا نظر عبرت و موعظت کے پہلو تلاش کر لیتی ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں بھی۔

جویائے کہنہ راز نہاں کے لیے یہاں   عالم کا ذرہ ذرہ ہے اسرار کا جہاں

"گنج معانی" کی متعدد نظمیں مثلاً سبزۂ نو، عجیب وغریب، بلبلہ، پرانا کرتہ، خیال اور ملکۂ نور جہاں کا مزار اس کا بہترین ثبوت ہیں۔ ان نظموں میں صرف ایک جاندار اسلوب اور بھرپور شعریت ہی نہیں بلکہ شاعر کے مخصوص طرزِ فکر کا پرتو بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ شعر و حکمت اور جذبہ و فکر کا یہ لطیف و حسین امتزاج مرحوم کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ سبزۂ نو میں جہاں حیات دنیا کی ناپائداری کا تاثر ملتا ہے، وہاں ملکہ نور جہاں' والی نظم میں مآلِ ہستی کا اور اس کے ساتھ حسن و شباب اور دولت و حکومت کے عبرت انگیز انجام کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، عجیب وغریب، اپنی نئی وضع اور انوکھے انداز کے اعتبار سے واقعی ایک عجیب وغریب نظم ہے۔ شاعر سے کسی ایسے موضوع پر نظم لکھنے کی فرمائش کی گئی، جو بیحد نادر اور عجیب وغریب ہو۔ بیچارہ حیران ہے کہ ایسا موضوع کہاں سے لائے۔ کیونکہ تمام مضمون فرسودہ اور پامال ہو چکے ہیں۔ بالآخر اسے ایک نہایت حیرت انگیز مضمون سوجھ جاتا ہے اور وہ اسے پیش کرتے ہوئے سراپا استعجاب بن کر کہتا ہے ؎

ہاں ایک بات ہے جو نہایت عجیب ہے	حیراں اسی پہ یہ دلِ حیرت نصیب ہے
ہیں سب مآلِ ہستی فانی کو جانتے	اور اپنی زندگی کو ہیں دو روزہ مانتے
پھر بھی یہ زورِ حرص و ہوا ہے کہ الاماں	ہنگامہ زادہ جہد بقا ہے کہ الاماں
غالب طلوعِ فکر پہ غفلت کی رات ہے	اس سے عجیب تر بھی کوئی اور بات ہے

پھٹا پرانا لباس کون تبدیل نہیں کرتا۔ جب نئے کپڑے موجود ہوں تو پرانے اتار ہی دئے جاتے ہیں۔ یہ روزمرہ زندگی کا ایک ایسا معمول ہے جسے کسی شخص نے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی، مگر شاعر اس تبدیلی کو ایک ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس نے جب "پرانا کرتا" اپنے جسم سے اتار کر پھینکا تو اس کے دل نے اندر سے یہ آواز دی۔

یہ ترا جسم بھی کرتے کی طرح ہے غافل	اور اس کرتے میں ہم رہتے ہیں پنہاں ہوکر
یہ بھی اک روز اسی طرح پرانا ہو گا	پھینک دیں گے اسے اور نکلیں گے عریاں ہوکر
فانی چولے سے محبت کو گھٹا جا تو	تاکہ جب چھوڑیں تو چھوڑیں اسے شاداں ہوکر

"خیال" مرحوم کی ایک بلند پایہ فلسفیانہ نظم ہے۔ جس میں تخیل کی بلندی بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی ایک بہت بڑے حکیمانہ نکتے کو انھوں نے ایک نہایت خوب صورت اور مؤثر شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان کا خیال ہی اس کے تمام عملی مظاہر کا ذمہ دار ہے۔ آدمی جو کچھ اور جیسا کچھ سوچتا ہے، اسی قسم کے اعمال اس سے صادر ہوتے ہیں۔ اس سلسلۂ خیال کی آخری کڑی ذیل کے فصیح و بلیغ شعر کی صورت میں دیکھئے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

خیال بیج ہے اعمال کے درختوں کا	خیال نیک وطیرہ ہے نیک بختوں کا

پانی کی سطح پر ایک بلبلہ تیرتا ہوا جا رہا ہے۔ ہم یہ منظر ہر روز دیکھتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت و ماہیت اور بود و نبود پر غور کرنے کی طرف ہمارا ذہن شاید ہی کبھی منتقل ہوا ہو۔ شاعر اس انتہائی معمولی مشاہدے کو بھی باقاعدہ موضوعِ سخن بناتا ہے، اور اپنے حاصلِ فکر کو ایک عمدہ اور رواں نظم "بلبلہ" میں ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

پانی کی بوند بوند بشر اور حباب ہیں	اور دونوں اس جہاں میں نقشِ بر آب ہیں
دونوں مئے غرور سے مست و خراب ہیں	اور اس لیے غریقِ یمِ پیچ و تاب ہیں

دل میں اگر خودی نہ ہو سر میں ہوا نہ ہو

ہوں اپنی اپنی ذات میں صورت جدا نہ ہو

ان منظومات کے علاوہ "گنجِ معانی" میں مرحوم کی اکثر نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں انھوں نے اپنے مخصوص اصلاحی انداز میں کسی مسئلے پر اظہارِ خیال فرمایا ہے اور براہ راست نصیحت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ یہ نظمیں پڑھنے والوں کو درسِ عبرت بھی دیتی ہیں اور دعوتِ عمل بھی۔ الدنیا دار الغرور، شراب، نوجوانو! شراب سے بچنا، حسن اور زیور، حیاتِ جاوید، پرہیزگاری، جگانے کی گھڑی، گوشۂ تنہائی، مار آستیں اور رباعیات کے مجموعے میں انسان، دنیا اور فکر و نظر کے عنوانات کے تحت کہی ہوئی متعدد رباعیاں، ان کی معلمانہ سپرٹ کی آئینہ دار اور ان کے اصلاحی مقاصد کی پوری نمائندہ اور ترجمان ہیں۔ جستہ جستہ اقتباسات پیشِ خدمت کیے جاتے ہیں۔

موجودہ دور میں کہ شراب نوشی کا مرض ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ عوام و خواص کی اکثریت اس کا شکار ہے اور بالخصوص شعراء تو دخترِ رز کی اداؤں پر سو جان سے فریفتہ اور نثار ہیں۔ مرحوم کا دل عیاشی اور اوباشی کی اس صورتِ حال پر کڑھتا ہے، اور وہ بڑے درد بھرے لہجے میں نوجوانوں کو اس کافرے سے بچنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

نوجوانو! شراب سے بچنا	اثرِ زہرِ ناب سے بچنا
اس سے کب دل کی پیاس بجھتی ہے	ہاں! فریبِ سراب سے بچنا
مے کدہ یہ نہیں جہنم ہے	دور رہنا عذاب سے بچنا
مے کشی ہے خدا کو نامنظور	آسمانی عتاب سے بچنا

ایک دوسری نظم میں اس ام الخبائث کے متعلق یوں اظہارِ خیال کیا ہے ۔

بن آئی مرتے ہیں اکثر جو اس پہ مرتے ہیں	جہاں سے عین جوانی میں وہ گزرتے ہیں
یہی بناتی ہے دیوانہ ہوشیاروں کو	گلی گلی میں گراتی ہے وضعداروں کو

ہم اس کو مایۂ فسق و فجور کہتے ہیں! جو بات کہنے کی ہے، وہ ضرور کہتے ہیں

محروم کے نزدیک اصل چیز سیرت ہے نہ کہ صورت۔ وہ ظاہری زیب و زینت کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے، بلکہ حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل کو انسان کا بہترین زیور قرار دیتے ہیں۔

زیور سے ہو نہ طالبِ آرائشِ جمال کچھ اور ہے ذریعۂ افزائشِ جمال
حسنِ عمل سے روح کو اپنی نکھار تو پھر دیکھ حسن روکشِ گل کی بہار تو

'الدنیا دارالغرور' کا یہ بند انسانِ غافل کو بیداری کا پیغام دے رہا ہے ؎

محرومِ خاکسار! جہاں کا یہ حال ہے ہو اس جہاں سے دور جو فکر مآل ہے
نام و نمود نے جو بچھایا یہ جال ہے بچنا مرے خیال میں اس سے محال ہے
گر کھل سکی نہ آنکھ تو پھنسنا ضرور ہے دنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے

حقیقتِ انسان کا اس سے زیادہ بلیغ اور موثر بیان اور کیا ہوگا۔

پرّاں ہو خواہ آسماں پر انساں ہو خواہ سمندر کا شناور انساں
انسانیت اس میں نہیں جب تک اے دوست مرغ و ماہی سے ہے فروتر انساں

اپنے بنیادی موضوع سے محروم کی دل چسپی یہیں تک محدود نہیں بلکہ جہاں کہیں سے انھیں حکمت و اخلاق کے جواہرات ملتے ہیں، انھیں نظم اردو کی لڑی میں پرو کر قدر دانانِ فن اور مشتاقانِ سخن کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ 'گنجِ معانی' میں 'سیر گلستاں اور نکاتِ شیکسپیر' کے دو باب اور رباعیات میں ترجمہ وید منتر، مہاراج بھرتری کے دو اشلوک، ترجمہ رباعی بیدلؔ اور عمر خیام کی چند رباعیوں کا ترجمہ اس امر کی روشن مثالیں ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کے ان پاکیزہ جذبات و افکار کا سرچشمہ کہاں ہے اور یہ مہذب اور شائستہ مضامین کہاں سے اس کے خیال میں آجاتے ہیں، جواب پہلے دیا جا چکا ہے کہ وہ مقدس سرچشمہ مذہب ہے، جس کے پاک اور پوتر پانی سے شاعر کے نخلِ تخیل کی آبیاری ہوئی۔ اور جس کے برگ و بار ہمیں ان شعری تخلیقات کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر کے فکر و خیال کا مرجع و مآب اور اس کی محبت و عقیدت کا مرکز و محور خدا کی ذات ہے، ذاتِ باری سے محروم کی والہانہ محبت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کے دونوں مجموعوں کا آغاز ہی حمد و معرفت کے ترانوں سے کیا ہے۔ یہ منظومات شاہدِ حقیقی سے ان کے صادقانہ عشق و شیفتگی کا پتہ دیتی ہیں۔ شاعر ہر ذرۂ ہستی میں خدا کے نور کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اور کائنات کی ہر چیز میں اسے حسنِ ازل کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ خود بھی اسی حسنِ مطلق کا جویا اور متلاشی ہے، اور شب و روز اسی جمالِ جہاں آرا کی تعریف و توصیف میں

رطب اللسان رہا کرتا ہے، زمزمۂ توحید، ترانۂ وحدت، یہ کس کے جلوے ہیں، سارے خدا کے جلوے ہیں، خدا کی امانت اور متعدد دوسری رباعیات، شاعر کے خدا پرستانہ اور فنافی اللّٰہانہ جذبات کا آئینہ دکھاتی ہیں۔

شاعر کے طائر فکر کا آشیاں عالمِ قدس میں ہے اور وہ ہمیشہ اسی فضائے لاہوت کی طرف محوِ پرواز رہتا ہے۔ شاعر آسماں پر ماہِ تاباں کو جلوہ گر دیکھتا ہے تو اسے فوراً اپنے دل کی تیرگی یاد آتی ہے۔ اور پھر ظلمت آباد جہاں کی طرف اس کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے، اس عالم میں اس کے منہ سے بے ساختہ یہ التجا نکلتی ہے ؎

تو کدھر ہے آہ اے حسنِ ازل کے ماہتاب ۔۔۔ تا کجے اوڑھے رہے گا منہ پہ دامانِ سحاب

خانۂ دل ہو نہ جائے اس اندھیرے میں خراب ۔۔۔ ڈال دے کوئی شعاعِ شفقت آلودہ شتاب

تیرے جلوے کاش ہو جائیں قریبِ چشمِ دل ۔۔۔ خوابِ غفلت ہو نہ پھر ہرگز نصیبِ چشمِ دل

اس مادی دنیا میں جہاں لوگ نفسانی خواہشات پر مرے جاتے ہیں اور فکرِ عقبیٰ سے بے نیاز دنیوی ساز و سامان جمع کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں، شاعر ایک روحانی فضا کا متلاشی ہے۔ اسے ایک ایسا ماحول درکار ہے ؎

جو یہاں در پردہ ہے وہ آشکارا ہو جہاں ۔۔۔ حسنِ مطلق بے تکلف جلوہ آرا ہو جہاں

آسماں سے روز و شب روحانیت برسا کرے ۔۔۔ اور دل محبوس اپنی کھڑکیوں کو وا کرے

پاک ہو جائے جہاں آلائشِ دنیا سے دل ۔۔۔ جوڑ دے اپنا تعلق عالمِ بالا سے دل

حمد کے اشعار گاتے ہوں طیورِ خوش نوا ۔۔۔ نغمہ ہائے سرمدی کا اک تلاطم ہو بپا

فکر کوئی بھی نہ ہو دل میں بجز فکرِ معاد ۔۔۔ ذکرِ خالق ہر گھڑی ہو، ہر گھڑی خالق کی یاد

محروم اپنے دل کو خدا کی امانت سمجھتے ہیں۔ اس لیے اگر یہ دل نفسانی خواہشات و جذبات کی پرورش گاہ بن جائے تو یہ ایک طرح کی خیانت ہو گی۔ نفسِ امارہ کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

صیادِ نفس طائرِ دل سے ذرا پرے ۔۔۔ کم بخت اپنے جال کو جا کر بچھا پرے

دانا ہے کب فریب میں آتا ہے جا پرے ۔۔۔ مکار جا کے مکر کے دانے گرا پرے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

رباعیات میں عرفان اور خدا پرستی کا یہ رنگ بہت زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ یہاں محروم کی متصوفانہ شاعری اور ان کا فکر و فن اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتے ہیں۔ محروم اپنے اس مجموعۂ کلام میں صرف ایک معلم اور مصلح ہی کے روپ میں جلوہ گر نہیں بلکہ ایک پرشکوہ عارفانہ شان کے ساتھ نمودار ہوئے ہیں۔ رباعیات کا مطالعہ کیجیے تو یہ ایک ایسے عارفِ باخدا اور

صوفیِ باصفا کا کلام معلوم ہوتا ہے جو سرتاسر عشقِ الٰہی میں ڈوبا ہوا ہو۔ خدائے برتر و برحق کی حمد و ثنا، اس کی بے پایاں عنایات کا تشکر اس کے حضور میں اپنی بندگی اور عبودیت کا اظہار، اپنے گناہوں کا اعتراف اور آمرزشِ عصیاں کی طلب، دیدارِ خداوندی کی آرزو، اور رضائے حق کی تمنا، حسنِ ازل اور عشقِ حقیقی کی سرمدی کیفیات کا بیان، دنیا کی بے ثباتی اور حیاتِ انسانی کی ناپائداری کا ذکر، ترکِ دنیا اور فکرِ عقبیٰ کی ترغیب، نفسِ انسانی کی مکاریوں اور حیلہ سازیوں پر تنبیہہ، مکر و ریا اور کبر و غرور سے بچنے کی تلقین، حسنِ عمل کی دعوت، غیبت اور عیب جوئی کی مذمت، انسان کی وحشت اور درندگی پر اظہارِ افسوس غرض جس موضوع پر بھی محروم کا گوہر بار قلم اٹھا ہے، علم و حکمت کے موتی بکھیرتا چلا گیا ہے۔ چند رباعیات ملاحظہ ہوں ؎

حمدِ الٰہی کے موضوع پر اپنے لفظی اور معنوی حسن کے اعتبار سے یہ رباعی کتنی لاجواب ہے ؎

ہر صبح جب بلند علم کرتا ہے　　سر تیرے حضور کے خم کرتا ہے
لوحِ افلاک پر شعاعی خط میں　　خورشید تیری ثنا رقم کرتا ہے

خدا کے حضور میں اپنی خطاکاری اور گنہگاری کا اعتراف کرتے ہوئے کس عاجزی سے اس کی رحمت اور بخشش کی التجا کرتے ہیں ؎

مجرم ہوں سیاہ کار ہوں رحمت کر　　عاجز ہوں گنہگار ہوں رحمت کر
حاضر ترے در پر اے خداوند کریم　　با دیدۂ اشکبار ہوں رحمت کر

اور

اے روشنیِ شعور دینے والے　　ذرّوں کو ضیائے طور دینے والے
دیدار طلب ہے چشمِ حیراں میری　　اے شمس و قمر کو نور دینے والے

دنیا اور اس کی طلسمی کشش کا نقشہ کتنے عمدہ الفاظ میں کھینچا ہے ؎

دنیا نے عجب نقش جما رکھا ہے　　ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے　　اس عالمِ آب و گل میں کیا رکھا ہے

انقلابِ روزگار اور نیرنگیِ زمانہ کا ذکر کیسے دردانگیز لہجے میں کرتے ہیں ؎

دنیا تھی یہی صدق و صفا کی دنیا　　رحم و کرم و مہر و وفا کی دنیا
انسان نے بنا دیا بالآخر اس کو　　جور و ستم و کذب و ریا کی دنیا

دنیا محروم کے نزدیک دارالعمل ہے۔ جو کچھ انساں یہاں بوتا ہے دوسری زندگی میں کاٹ لیتا ہے۔ اس

مضمون کو انھوں نے بڑے سادہ اور موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔

جو کچھ کہ ہے مستعار دیتی ہے — ہے وقت سفر سنبھال لیتی دنیا
دانا ہے تو تخمِ خیر بوئے جا تو — آخر ہے آخرت کی کھیتی دنیا

یہ دنیا انسان کا ایک عارضی مستقر ہے۔ بالآخر ہم سب کو یہاں سے چل دینا ہے اور سب کچھ یہیں چھوڑ جانا ہے اعمال کے سوا انسان اپنے ساتھ اور کچھ بھی نہیں لے جائے گا۔

لائے تھے ساتھ کچھ نہ لے جائیں گے — ہمراہ عمل برے بھلے جائیں گے
جس کو اپنا سمجھ رہے ہیں، سب کچھ — رہ جائے گا اور ہم چلے جائیں گے

اس لیے بہتر ہے کہ انسان جب سفرِ آخرت پر روانہ ہو تو نیک اعمال کا زادِ راہ اپنے ساتھ لیتا جائے اور اس کے لیے پہلے سے تیاری کرتا رہے۔ وہ بار بار یاد دلاتے ہیں۔

پیری ہے فکرِ عاقبت کر ناداں — کیا فکرِ سخن نجات دلوائے گی

اور

بہبودِ معاد کی کوئی بات کریں — تا وقتِ وداعِ جاں نہ ہیہات کریں

نفس انسانی کی فریب کاریوں کا تجزیہ ایک ماہر نفسیات کی طرح کیا ہے۔

انکارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں — تکرارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں
حاصل ہو ثوابِ مفت اس لالچ میں — اقرار گناہ بھی کیے جاتا ہوں

دوسروں کی عیب جوئی سے احتراز کرنے کی تلقین یوں فرمائی ہے۔

کیا تجھ کو جو کوئی ہے بداعمال اے دوست — کر اس کے حساب کی نہ پڑتال اے دوست
مائل ہو کسی کی عیب جوئی پہ ہو دل — منہ اپنے گریباں میں وہیں ڈال اے دوست

غیبت کی حقیقت ان کی زبان سے سنیے۔

دنیا میں ہے اک بلائے بد غیبت بھی — پیدا جھگڑے بھی کرتی ہے نفرت بھی
غیبت کو بنا لیا ہے جس نے ہمدم — بزدل انساں بھی ہے اور بد نیت بھی

ان قدیم اخلاقی مضامین کے علاوہ انھوں نے جدید مسائل پر بھی اظہار خیال فرمایا ہے، اور نئی تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ مفاسد پر بڑی زوردار تنقید کی ہے۔ وہ بداخلاقی کے مختلف مظاہر اور اس کے گوناگوں محرکات وعوامل پر

سخت ترین الفاظ میں نفریں کرتے ہیں۔ بالخصوص آرٹ کے نام پر فحاشی اور بے حیائی کا جو کھیل کھیلا جاتا ہے، عورتوں اور دوشیزاؤں کو رقص کی جو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے وہ ان کے نزدیک نہایت قابلِ مذمت ہے۔ وہ حسنِ نسوانی کی بے حجابی اور اس کی آزادانہ نمائش کو ایمان و اخلاق کے لیے بے حد خطرناک سمجھتے ہیں اور بار بار حسنِ عریاں کے فتنوں سے خبردار کرتے ہیں۔ مغرب کی یہ ثقافت ان کی نظروں میں شرم و حیا کی دشمن اور متاعِ عفت و عصمت کی رہزن ہے۔ موجودہ آرٹ کے بارے میں ان کی بے لاگ رائے ہے کہ ؂

یہ آرٹ وہ ہے کہ جس پر شرم اور حیا غیرت سے زمیں میں گڑے جاتے ہیں

اور اس آرٹ کے حامیوں اور سرپرستوں کے متعلق وہ کہتے ہیں ؂

ہے کون رذیل ان کو گر کہیے شریف محفل میں جو لڑکیوں کو نچواتے ہیں

آج کل کے فیشن ایبل لباس کے بارے میں ان کا یہ کہنا کتنا صحیح ہے ؂

ملبوس وہی پسندِ خاطر ہے آج ہر عضو کو جو اور نمایاں کر دے

ایک زمانہ تھا کہ شرم و حیا عورت کا زیور اور عفت و پاکدامنی اس کا پیرایۂ حیات تھی مگر انقلاب زمانہ نے اب قدر و قیمت کے پیمانے اور خوب و ناخوب کے معیار بدل دئے ہیں۔ ماڈرن سوسائٹی میں ان لڑکیوں کو قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو شوخ و شنگ ہوں اور رقص و سرود میں بھی دستگاہ رکھتی ہوں۔ بقول محروم ؂

کہلاتی تھی پہلے وہی اچھی لڑکی! شرم اور حیا کی ہو جو پتلی لڑکی
افسوس کہ انقلاب دوراں سے آج ممتاز ہے رقص کرنے والی لڑکی

اور

دوشیزہ سرِ بزم اگر ناچے گی گرد اس کے ہوس کار نظر ناچے گی
کھا جائے لغزش نگہ پاک وہیں جس وقت وہ لچکا کے کمر ناچے گی

ان مضامین و مطالب کو سامنے رکھتے ہوئے ہم رباعیات محروم کو حقائق و معارف اور اخلاق و آداب کا ایک ایسا بیش بہا گنجینہ قرار دے سکتے ہیں جس کی نظیر اردو کے شعری ادب میں نہیں ملتی۔ حالیؔ اور اکبرؔ کی رباعیات بھی راقم الحروف کی نظر سے گزری ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خیال کی جو تازگی اور ندرت اور اسلوبِ بیان کی جو دلکشی اور جدت رباعیات محروم میں ہے، وہ ان دونوں کے ہاں نظر نہیں آتی۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، مذہب اور خدا کی طرف محروم کا رجحان نہ صرف طبعی اور فطری ہے، بلکہ وہ فکری

اور نظری طور پر بھی ان دونوں صداقتوں کے زبردست قائل بلکہ مبلغ ہیں۔ انھوں نے فرد کی بہبود اور معاشرۂ انسانی کی اصلاح کے لیے مذہب کی ضرورت پر بڑا زور دیا ہے۔ مذہب ان کے الفاظ میں منزلِ دو جہاں کا رہبر ہے اور انسان کو دنیا میں مقامِ برتر بخشتا ہے۔ اس کے برعکس الحاد کو وہ تباہی اور ہلاکت کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جہاں مذہب کا عمل دخل موجود ہو وہ سرزمین شر و فساد سے محفوظ رہتی ہے اور اپنے باشندوں کے لیے امن و سکون کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ فرماتے ہیں ؂

مذہب کا عمل جہاں کہیں ہوتا ہے　　　فتنہ داخل وہاں نہیں ہوتا ہے
اغراض سے بے نیاز آلام سے پاک　　　جنت وہ خطۂ زمین ہوتا ہے

حقیقت بھی یہی ہے کہ خدا کے تصور کے بغیر کوئی اخلاقی نظام وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ مذہب ہی اخلاق و روحانیت کا منبع ہے اور تمام اخلاقی اصول اور ضابطے اسی سے جنم لیتے ہیں۔ خدا کی ہستی پر یقین ہی وہ زبردست داخلی عامل ہے جو انسان کو ہر قسم کی ذہنی اور فکری آوارگیوں سے بچاتا ہے۔ جو لوگ اپنے تخلیقی عمل کو کسی اخلاقی ضابطے کا پابند نہیں بناتے ان کا سفینۂ حیات ہمیشہ بے لنگر رہتا ہے اور آخر کار دہریت و الحاد کے طوفانِ بے ساحل کی نذر ہو جاتا ہے۔

محروم کو یہ دیکھ کر بڑا قلق ہوتا ہے کہ لوگ دھرم اور مذہب پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے۔ وہ نام تو خدا کا لیتے ہیں مگر بات شیطان کی مانتے ہیں ؂

قائل ہم ذاتِ پاکِ یزداں کے ہیں　　　عامل فرمودہ ہائے شیطاں کے ہیں
کہنے کو تو ہندو بھی مسلماں بھی ہیں ہم　　　پابند نہ دھرم نہ ایماں کے ہیں

مذہب ان کے نزدیک حسنِ عمل، راست گوئی اور صلح جوئی کا پیغامبر ہے۔ جو لوگ مذہب کے نام پر ہنگامۂ جدال برپا کرتے ہیں وہ مذہب کے مقام سے ناآشنا، اس کی روح سے بے خبر اور اپنے نفس کے غلام ہیں، کیوں کہ

لڑتے نہیں واقفِ مقام آپس میں　　　برہم ہوتے ہیں کج خرام آپس میں
مذہب کے نام پر بحکمِ ابلیس　　　لڑتے ہیں نفس کے غلام آپس میں

غرض مذہب و اخلاق اور ایمان و عرفان کا یہ دل پذیر موضوع کلامِ محروم میں اول سے آخر تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم ان کے نقوشِ قلم میں جا بجا روحانیت کا نظر افروز رنگ چھایا ہوا دیکھتے ہیں، اور قدم قدم پر ان کی متصوفانہ شاعری کا

حسن ہمارے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کہاں تک اس حسن جاں نواز کی جھلکیاں ناظرین کو دکھائی جائیں اور اپنی ناچیز نگارش کو اس بلند پایہ شاعری کے گراں مایہ اقتباسات سے کہاں تک مزین کیا جائے۔ خوفِ طوالت بار بار قلم کو روک رہا ہے۔ ورنہ جہاں تک دیدہ و دل کی تشنگی کا تعلق ہے، اتنی طویل داستان سرائی کے بعد بھی فرو نہیں ہوئی۔

حضورِ یار حکایت دراز تر گردید چنانکہ یہ ہمہ ناگفتہ در دل است ہنوز

خدا سے دعا ہے کہ وہ اس مجسمۂ اخلاق اور پیکرِ مروت کو ادب اور انسانیت کی خدمت کے لیے تا دیر سلامت رکھے۔ میں اس حکایتِ لذیذ کو انہی کے دعائیہ اشعار پر ختم کرتا ہوں ؎

دہر میں جب تک بوئے گلہائے تر باقی رہے نظمِ اردو کا پھلا پھولا چمن باقی رہے
مایہ دارِ رونقِ بزمِ سخن باقی رہے یادگارِ مشربِ دورِ کہن باقی رہے

جی میں آتا ہے کہ آ کر چوم لوں تیرے قدم
آہ لیکن جاں گزا ہے دوریِ منزل کا غم

غزل

زوالِ حسن کو حسنِ نگار کیا جانے خزاں قدم بہ قدم ہے، بہار کیا جانے
لکھا ہے اس کے مقدر میں اضطرابِ دوام قرار کیا ہے دلِ بے قرار کیا جانے
سمجھ رہے ہیں جسے سب گناہگار یہاں اسی پہ ہو کرمِ کردگار کیا جانے
کئے پہ اپنے ہو خود منفعل بشر آخر یہی ہو جبر، یہی اختیار کیا جانے
کہاں یہ شامِ غریباں، کہاں وہ صبحِ وطن یہ فرقِ گردشِ لیل و نہار کیا جانے

جو پاؤں توڑ کے بیٹھے سرِ رہِ منزل
وہ کب اٹھیں گے، کوئی شہسوار کیا جانے

محروم

حکم چند نیّر

بچوں کا ادب اور محروم

ہمارے ملک میں ثانوی اور فوقانی تعلیم کے مسائل پر جس قدر غور و خوض کیا جاتا ہے، تحتانی یا ابتدائی تعلیم کے مسائل سے اسی قدر بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ بے اعتنائی برتی جاتی ہے حالانکہ ہونا کچھ اس کے برعکس چاہیے تھا، کیونکہ ثانوی اور فوقانی تعلیم کا انتظام تربیت یافتہ اور منتہی اساتذہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اور ابتدائی تعلیم کا بار اکثر و بیشتر ایسے اشخاص کے کندھوں پر ڈالا جاتا ہے جو اس اہم ذمہ داری کو سنبھالنے کے شاید ہی اہل ہوں، اور جنھیں استاد جیسے لفظ سے موسوم کرتے ہوئے بھی کچھ جھجک محسوس ہوتی ہے۔ ستم بالائے ستم، لکیر کا فقیر بنے رہنا ہمارا قومی کردار بن گیا ہے۔ اس کردار کی حفاظت ہم اپنی دیگر تہذیبی قدروں کی طرح کرتے ہیں۔ غیر ملکی حکمرانوں نے ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے جو اصول اور قاعدے وضع کیے تھے، ہم آج بھی انھیں پر سختی سے کاربند ہیں۔ ایک آزاد قوم کے لیے سوچتے وقت بھی ہم اسی دائرہ سے باہر قدم نہیں رکھتے، جو انگریزوں نے ہمیں محکوم رکھنے کے لیے کھینچا تھا۔ یا پھر سالہا سال کی غلامی نے ہماری قوم کے غور و فکر کے قویٰ کو مفلوج کر دیا ہے۔ آج جن معدودے چند اصحاب کو کشتیٔ ملک و قوم کی ناخدائی سونپی گئی ہے وہ بھی "گورے لوگوں" کی طرح چھوٹی موٹی باتوں پر غور کرنا اپنی شان کے شایاں نہیں سمجھتے، شاید اس لیے بچوں کی تعلیم و تربیت جیسے اہم مسئلہ کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کیا گیا۔ حالانکہ قوم کی ترقی کے لیے اس مسئلہ پر سب سے زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔

ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ دنیا کے بڑے مدبرین و مفکرین نے ہمیشہ بچوں کی تعلیم و تربیت سے انتہائی دل چسپی کا اظہار کیا ہے۔ بہت سے رہنماؤں نے تو دیگر بڑے بڑے قومی کاموں پر اس کام کو ترجیح دی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ملک و قوم کا مستقبل انھیں نونہالوں سے وابستہ ہے جو آج اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔ مصلحین پر یہ واضح تھا کہ قوم کی اصلاح صرف اس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب کہ بچوں کی صحیح تربیت کی جائے جو اس سلسلہ کی سب سے اہم کڑی ہیں۔ بچے ہی قوم کا گراں بہا سرمایہ ہوتے ہیں۔ یہی ہماری آرزوؤں کے محل اور تمناؤں کے حصار ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت میں کی گئی کوتاہی سے نہ صرف بچوں کو یا ان کے

خاندان وشہر کے لوگوں کو نقصان ہوگا بلکہ تمام قوم، سماج اور زندگی کے ہر شعبے کو ایک نقصانِ عظیم پہنچے گا۔ جس کی تلافی صدیوں میں بھی ممکن نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ لیوٹالسٹائی، مہاتما گاندھی، گورو دیو رابندر ناتھ ٹیگور وغیرہ قومی مفکرین قوم کی تہذیب و ترقی کے لیے بچوں کی تعلیم کے مسئلہ کو اہم سمجھتے تھے۔ ان کا یہ اعتقاد سیاسی رہنماؤں کی طرح صرف زبانی جمع خرچ پر نہیں تھا بلکہ انھوں نے اس میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دئے اور آنے والی نسلوں کے ایسے غیر فانی نقوش چھوڑے جو ہمیشہ چراغ راہ کا کام دیتے رہیں گے۔ لیوٹالسٹائی نے ۱۸۶۵ء میں یاسنا پولیانہ میں بچوں کے لیے اسکول قائم کیا۔ تھرشی ٹیگور نے ۱۹۰۱ء میں شانتی نکیتن میں سب سے پہلے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا فنکیس فارم۔ ٹرانسوال کا ٹالسٹائی فارم، سابرمتی آشرم اور سب سے بڑھ کر وارھا تعلیمی اسکیم مہاتما گاندھی کی دل چسپی کے مظہر ہیں۔

اردو کے شعراء نے عشق و محبت کے فرسودہ عنوان سے لے کر تصوف و فلسفہ جیسے ادق موضوع تک ہر ایک شعبۂ حیات پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ اگر اس سرمائے میں کوئی چیز معدوم ہے تو وہ بچوں کا ادب ہے۔ معلوم نہیں اردو کے شعراء نے اس اہم موضوع سے کیوں بے اعتنائی برتی۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد ہمیں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، مولانا محمد حسین آزاد مولانا الطاف حسین حالی اور منشی سورج نرائن مہر دہلوی کی کچھ نظمیں مل جاتی ہیں۔ جو انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ ان نظموں میں، بچوں کی نفسیات کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ پھر بھی یہ کوششیں مستحسن اور قابلِ داد ہیں۔ اس دور میں کہی گئی نظمیں پند و نصائح پر مشتمل ہیں یا ان سے کوئی اخلاقی نتیجہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شعراء مذکور صرف بچوں کی تعلیمی اغراض کو پورا کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں، مگر زبان اور اسلوبِ بیان محض روکھے پھیکے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ جو کچھ ہے بہر حال غنیمت ہے۔ ورنہ ان کے بعد تو اردو ادب کے بھرے گھر میں بچوں کی دل چسپی کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔

حضرت محروم کی زندگی کا معتد بہ اور قابلِ قدر حصہ محکمۂ تعلیم میں بسر ہوا ہے۔ انھیں تمام عمر بچوں کی درس و تدریس کا کام کرنا پڑا۔ اس طرح بچوں کے جذبات، احساسات اور نفسیاتی کیفیات کا مطالعہ کرنے کے مواقع سب سے زیادہ میسّر آئے۔ وہ تعلیمی اغراض سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اس پر ان کی کہنہ مشقی اور پیرانہ سالی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ شاید پیرانہ سالی کے لفظ سے کچھ اصحاب چونک اٹھیں۔ لیکن علمِ نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ بچے اور بوڑھے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہاں محروم صاحب کے کلام کی ایک خصوصیت کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ شاعر کے کلام پر اس کی شخصیت بلکہ نجی زندگی کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ اردو شاعری کے بیشتر حصّے کے غیر موثر ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اکثر شعراء گفتار کے غازی تو ہوتے ہیں مگر کردار کے غازی نہیں ہوتے۔ لیکن حضرت محروم اس

لحاظ سے منفرد ہیں کہ ان کے کردار و گفتار میں کوئی فرق نہیں ۔ میرے اس دعوے کے ثبوت میں ان کی تمام شاعری پیش کی جاسکتی ہے۔ میرا خیال ہے اگر مرحوم "بہار طفلی" تصنیف نہ کرتے تو شاعری اور اپنی ذات دونوں پر ظلم کرتے۔

"بہار طفلی" چوبیس طبعزاد نظموں۔ پانچ انگریزی نظموں کے تراجم اور چھ قطعات پر مشتمل ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے، جس میں مشکل الفاظ کے معنی لکھے گئے ہیں۔ اس طرح سے بہار طفلی کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ بہار طفلی صحیح معنوں میں اسم بامسمّٰی ہے۔ اس گلزار میں آپ کو ایسے گل بوٹے ملیں گے جو اپنی بہار کی عظمت کا گہرا نقش دل پر ثبت کرتے ہیں رنگارنگ پھول اتحاد و اتفاق اور اخوت و بھائی چارے کا درس دیتے ہیں۔ پتی پتی اپنی عطر بیزی سے دیش بھگتی اور حب الوطنی کے جذبات سے دلوں کو سرشار کرتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سب سے اچھا دیش ہمارا   دنیا بھر سے نیارا ہے
پیارا بھارت دیش ہمارا   ہم کو دل سے پیارا ہے

اپنے دل کا سہارا ہے
بھارت دیش ہمارا ہے

اس کی خاک سے ہو کر پیدا   ہم نے سدھ بدھ پائی ہے
کیوں نہ کریں گے اسکی سیوا   اپنی اس میں بھلائی ہے

بھارت دیش ہمارا ہے

ہماری سماجی زندگی میں وطن ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ بچوں کے دل میں حب وطن کی چنگاری بچپن میں روشن کرنا ضروری ہے تاکہ وہ ہمیشہ ایک سچے شہری کی طرح مادرِ وطن کی خدمت کرتے رہیں۔

آدمی کو صحیح معنوں میں انسان بننے کے لیے تعلیم ضروری ہے اور تعلیم و تعلّم کا واحد ذریعہ کتابیں ہیں "کتاب" کے عنوان سے ایک نظم ہے جس سے قاری کے دل میں کتابوں کی افادیت اور عظمت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ نظم کے آخری حصے میں بچہ درگاہِ ایزدی میں کیسی خوب صورت دعا مانگتا ہے۔

پروردگار دے مجھے الفت کتاب کی   بھر دے تو میرے دل میں محبت کتاب کی
جب تک کہ دم میں دم رہے اس سے جدا نہ ہوں   اور اپنے ایسے دوست سے غافل ذرا نہ ہوں

تعلیم و تربیت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ پاکیزہ عقائد کے نقوش بچوں کے ذہنوں پر مرتسم ہو جائیں۔ انھیں پاکیزہ عقیدوں میں سے کچھ عقائد یہ ہیں۔ خداوند عزوجل کی ہستی۔ مذہب کی اہمیت اور علم و عمل کی

برتری کا احساس وغیرہ ہیں۔ دیکھیے محروم صاحب یہ نقوش کس طرح ابھارتے ہیں۔

وہ خالقِ دو عالم یعنی خدا ہمارا
ہر ایک پیاری شے سے ہے جس کا نام پیارا

جس نے زمیں بنائی جس نے جہاں بنایا
جس نے بنائے تارے اور آسماں بنایا

پودے اگائے جس نے میوے لگائے جس نے
گلشن کے پھول کانٹے سارے بنائے جس نے

کرتا ہے پیار ہم سے وہ باپ ہے ہمارا
اور ہر گھڑی نگہباں وہ آپ ہے ہمارا

حاضر ہیں تیرے در پر پروردگار ہم بھی
ہیں رحم اور کرم کے امیدوار ہم بھی

علم و عمل کا رستہ یارب ہمیں دکھا دے
جس سے ملے سعادت اس راہ پر لگا دے

یارب تری رضا کے طالب رہیں ہمیشہ
نیکی کریں بدی پر غالب رہیں ہمیشہ

وہ علم دے ہو جس سے دانش کا نور دل میں
پروردگار دیکھیں تیرا ظہور دل میں

جس دیش کے بچوں کے دل میں ایسی خواہشات ہوں اس دیش کی خوش بختی میں کس کو شک ہو سکتا ہے ؎

اے پھول کاش ہو مری قسمت تری طرح
حاصل ہو رنگ و بوے محبت تری طرح

جیسے عزیزِ خلق ہے تو کاش میں بھی ہوں
دل شاد باغِ دہر میں تیری طرح رہوں

میری شمیمِ خلق بھی پھیلے تری طرح
آنکھوں پہ مجھ کو خلق بٹھائے تری طرح

زینت پذیر تجھ سے ہے جیسے ترا چمن
مجھ سے بھی پائے رونقِ تازہ مرا وطن

بچوں کے دل کومل ہوتے ہیں۔ اس نظم کا ایک بند محنت کی عظمت و برتری کا احساس پیدا کرنے کے لیے پند و نصائح کے طومار سے کہیں بہتر ہے ؎

تم کو خیالِ محنت گر صبح و شام ہوگا
کہتے ہیں بخت جس کو آکر غلام ہوگا

جو دل کا مدعا ہے حاصل تمام ہوگا
محنت سے کام ہوگا محنت سے نام ہوگا

محنت کرو عزیزو محنت سے نام ہوگا

نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے حضرت محروم رسم و رواج سے ہٹ کر کہتے ہیں ؎

نئے ولولے ہوں نیا شوق پیدا
نیا دل میں ہو علم کا ذوق پیدا

نئے سر سے میدانِ ہمت میں آؤ
نئے قابلیت کے جوہر دکھاؤ

پڑھو اور محنت سے تم نام کر لو　　بڑھے جس سے عزت وہی کام کر لو

اس طرح سے اس مجموعہ میں بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق تمام عنوانات مثلاً سویرے اٹھنا، اچھے کام صفائی، جھوٹ بڑا پاپ ہے۔ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ اچھا آدمی، جیسی کرنی ویسی بھرنی وغیرہ پر نصیحت آموز نظمیں موجود ہیں۔ غرض کہ اس دلبستان کا ہر ورق اپنی رنگینی و دلکشی کے لحاظ سے اثر رنگ مانی اور نگارخانۂ چین بنا ہوا ہے۔

اس مجموعے میں آپ کو تدریجی ارتقا کے نقوش بھی ملیں گے جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے محروم صاحب کے ہاں کوئی خاص تجربات نہیں ہیں۔ ان کی شاعری نہ صرف پابند ہے بلکہ اس ضمن میں انھوں نے خود کو پابند شاعری کی روایات سے ایک قدم باہر جانے کی اجازت نہیں دی۔ ہو سکتا ہے کہ ہیئت کے تجربات کی طرف انھوں نے خود کو مائل نہ کیا ہو۔ میری رائے میں اگر معرّیٰ اور آزاد نظموں کے ذریعے کچھ نئے تجربات کیے جائیں تو یقیناً کچھ اور وسعت و گہرائی پیدا ہو جائے گی۔

محروم کی شاعری پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ کہے جانے کی توقع ہے۔ اس مضمون میں ان کی شاعری کے صرف ایک پہلو یعنی اس کلام پر مجمل بحث کی گئی ہے جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھا ہے۔ ورنہ ان کی شخصیت ہمہ پہلو ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں اور قومی وطنی ترانے بھی گائے ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی نے خوب کہا ہے ؎

ہے داد کا مستحق کلام محروم　　لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید اور دانش آموز　　ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

سرمایہ دار اور مزدور

ایثار و لطف و رحم کے دعووں کے باوجود　　حساس مثل سنگ بھی انساں نہیں ابھی
"دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم"[1]　　سرمایہ دار قائل احساں نہیں ابھی

محروم

---

[1] مرزا غالب

سید مبارز الدین رفعت

حضرت محروم کی فارسی شاعری

ہمارے اس دور میں جب کہ ہندوستان سے فارسی کا مذاق ناپید ہوتا جارہا ہے اس بات کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ آج سے پچاس سال پہلے تک بھی ہندوستان کی علمی اور ادبی دنیا میں فارسی زبان کو کتنا اونچا مقام حاصل تھا۔ بارھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک کوئی سات سو سال فارسی اس ملک کی سرکاری اور درباری زبان رہی۔ اس لمبے عرصے میں چاہے مسلمان ہوں کہ ہندو یا کچھ اور، چاہے ان کی مادری زبان کچھ ہی رہی ہو سب ہی کے لیے اس ملک میں فارسی دانی تعلیم یافتہ، مہذب اور شائستہ ہونے کی ایک دلیل بنی رہی۔ راجہ رام موہن رائے سے لے کر ہمارے دور کے بزرگ قائدوں میں لالہ لاجپت رائے پنڈت موتی لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو سب ہی نے ابتدا میں فارسی زبان کی تحصیل کی۔ فارسی زبان کا قابلِ فخر سرمایہ اس کا ادب ہے اور اس کے ادب میں رشک آور دل آویزی اس کی شاعری کی رہینِ منت ہے۔ نازک خیالیوں کے جیسے اور جتنے شاندار کارنامے اس زبان نے پیش کیے ہیں، دنیا کی شاید ہی کوئی اور زبان پیش کر سکے گی۔

ہندوستانیوں نے فارسی زبان سیکھی تو لازمی طور پر فارسی کی سب سے نمایاں خصوصیت شاعری نے ان کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور وہ بھی بے تکلف فارسی میں شعر کہنے لگے۔ بارھویں صدی عیسوی تک ہمارے ملک نے جتنے بھی فارسی گو شاعر پیدا کیے ہیں، ان سب کے نام گنے جائیں تو بلا مبالغہ یہ گنتی سینکڑوں تک نہیں ہزاروں تک پہنچے گی۔ اردو کے بیشتر شاعر فارسی میں بھی لکھتے رہے۔ لیکن برہمن، تفتہ اور گرامی جیسے شاعر بھی بہت مل جائیں گے۔ جنھوں نے اپنی مادری زبان میں تو سرے سے شعر ہی نہیں کہا۔ لیکن فارسی میں ایک سے زیادہ دیوان اپنی یادگار چھوڑ گئے۔

ہندوستان نے فارسی ادب کی جو مہتم بالشان خدمت انجام دی ہے، افسوس ہے ایران والوں نے اس کی قرار واقعی قدر اب تک نہیں پہچانی۔ اپنے آپ کو اہلِ زبان مان کر انھوں نے ہندوستانی لکھنے والوں کو حقارت ہی کی نظر سے دیکھا ہے اور بڑے تمسخر سے انھیں "بلوچ گویان ہند" کہا ہے[1]۔ حضرت امیر خسرو سے لے کر فیضی، عرفی، ظہوری، بیدل

---

[1] یاد کیجیے اردو کے رفیع المرتبت شاعر مرزا رفیع سودا کا ایک شعر سن کر ایران سے وارد شیخ علی حزیں نے کہا تھا "در پوچ گویان ہند غنیمت است"۔

غالب، گرامی اور اقبال جیسے بلند پایہ شاعر ہندوستان ہی نے فارسی زبان کو دیے ہیں۔ امیر خسرو، بیدل، گرامی، غالب اور علامہ اقبال تو ایران کے بڑے سے بڑے فارسی گو شاعر سے درجے میں کم نہیں۔ لیکن ان میں سے حضرت امیر خسرو کے سوا کتنوں کو ایرانیوں کی لکھی ہوئی فارسی ادب کی تاریخوں میں جگہ ملی ہے؟ رضا زادہ شفق جیسے فارسی ادب کے منصف مزاج عالم نے بھی غالب اور اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف گوارا نہیں کیا ہے۔ یہ حضرات ہندوستان کے فارسی لکھنے والوں کی فارسی کو "سبک ہندی" کے نام سے یاد فرماتے ہیں اور کچھ اس انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ گویا ایران میں لکھی جانے والی فارسی کے مقابلے میں یہ فارسی بڑی گھٹیا اور ادنیٰ درجے کی چیز ہے۔

لیکن یہاں انتقاماً نہ سہی اتفاقاً یہ بھی یاد کر لیجیے کہ عربوں نے ایرانیوں کو کب خاطر میں لایا تھا اور اپنی فصاحت اور بلاغت کے مقابلے میں کس درجہ حقارت کے ساتھ عجم یعنی گونگے کا خطاب دے ڈالا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ خاقانی کے ایک استثنا کے سوا جامی پر فارسی ادب کے کلاسیکی دور کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جامی کے بعد سے جو پوچ گوئی عہد حاضر تک ایران میں ہو رہی ہے اس کا فارسی کے کلاسیکی ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس پوچ گوئی کے مقابلے میں عہد حاضر تک بھی ہندوستان کے بہت سے فارسی گو شعرا کا کلام کہیں زیادہ با معنی، کہیں زیادہ باوقار اور کہیں زیادہ وقیع ہے۔

ہندوستان نے فارسی کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس کی قدر ایرانیوں نے نہیں کی تو جانے دیجیے غیروں سے اس کا گلہ کیا۔ لیکن کیا ستم ہے کہ ہم نے بھی آج تک اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا۔ آج تک بھی ہندوستان میں فارسی ادب کی کوئی جامع تاریخ مدون نہیں ہو پائی ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ اس ملک میں اردو زبان پر ہی پیمبری وقت آن پڑا ہے، فارسی کے ذوق کو زندہ رکھنے کی بات کرنا بظاہر بے تکی سی معلوم ہوگی۔ لیکن اس حقیقت سے کس طرح صرفِ نظر کیا جائے کہ اردو ادب پر فارسی کی بہت گہری اور اَن مٹ چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اور جب تک تھوڑی بہت فارسی نہ آئے اردو لکھنا اور خاص طور پر شاعری کرنا بے جا جسارت ہی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ترقی پسند شعرا فارسی کی اہمیت کو نظر انداز تو کر دیتے ہیں۔ لیکن غالب اور علامہ اقبال کے ہمہ گیر اثر کے تحت اپنے کلام میں وزن پیدا کرنے کے لیے نئی نئی فارسی ترکیبوں ہی کا سہارا لیتے ہیں۔ ان میں اکثر حضرات فارسی سے ناواقف ہیں اور نئی فارسی ترکیبیں گھڑتے وقت ایسی ایسی ٹھوکریں کھاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ بہتر اور خوب تر اردو لکھنے کے نقطۂ نظر سے ہی نہیں نزاکتِ خیال کے ایک عظیم الشان ذخیرے تک رسائی کے لحاظ سے بھی فارسی کی تحصیل ہمارے لیے ضروری ہے۔ حضرت مجنوں گورکھپوری کو خدا تا دیر سلامت رکھے۔ ایک جگہ کیا پتہ کی بات کہہ گئے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ ہم جب تک ایرانی تمدن اور فارسی شاعری سے پوری واقفیت اور موانست نہ پیدا کریں گے ہمارے اندر وہ تمدنی نفاستیں اور ذہنی پاکیزگیاں نہیں آئیں گی جن کے بغیر زندگی بے کیف اور بے رنگ رہتی ہے۔ ہمارے ملک سے فارسی کا ذوق مٹ رہا ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ فارسی سے بے بہرہ رہ کر ہم کچھ نیم وحشی رہیں گے۔"

حضرت تلوک چند محروم ہمارے ایسے بزرگ شعرا میں شامل ہیں جن کی ابتدائی تعلیم فارسی میں ہوئی۔ اسی فارسی دانی کا نتیجہ ہے کہ فارسی سے ناواقف اردو شاعروں کے یہاں فارسی ترکیبوں اور الفاظ کے تعلق سے جو مضحکہ خیز غلطیاں ہوتی ہیں ان سے حضرت محروم کا کلام بالکل پاک ہے۔ فارسی سے ناواقف شعرا جس طرح فارسی ترکیبوں اور بھاری بھرکم الفاظ کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، فارسی دانی نے انھیں اس احساس کمتری سے بچایا ہے حضرت محروم کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ اردو کے بہت سے شاعروں کی طرح وہ اردو کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ ان کی اردو شاعری پر تفصیل کے ساتھ بہتوں نے لکھا ہے اور لکھتے ہی رہیں گے۔ یہاں ان کے مختصر سے فارسی کلام کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کی جا رہی ہے۔

حضرت محروم کے فارسی کلام کا کوئی الگ مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ ان کا فارسی کلام ان کے اردو کلام کے مجموعوں کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ حضرت محروم بہت اچھے رباعی گو شاعر ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ اردو رباعی گوئی میں حضرت امجد اور حضرت جوش ملیح آبادی کے بعد حضرت محروم کے سوا اس پایہ کا رباعی گو شاعر دکھائی ہی نہیں دیتا" رباعیات محروم" کے آخر میں چند فارسی رباعیاں بھی درج ہیں اور یہ چند رباعیاں بھی لطف سے خالی نہیں۔

حضرت محروم کا اردو کلام ہو کہ فارسی، اس کا امتیازی وصف دردمندی اور افتادگی ہے۔ شرافتِ نفس کے بغیر یہ دردمندی پیدا ہی کہاں ہوتی ہے۔ شرافتِ نفس، دردمندی اور انسانیت دوستی یہ سب حضرت محروم کی شاعری کے نمایاں وصف ہیں۔

اپنے پروردگار کے مقابلے میں کون یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ محض اپنی طاعت پر ہی بخشے جانے کا مستحق ہے۔ وہ مواخذہ پر آئے تو گنہ گار تو رہے ایک طرف، انبیا، صلحا، اور عرفا تک نہ بچ سکیں گے۔ سب ہی اس کے فضل کے اس کے کرم کے اور اس کے رحم کے امیدوار ہیں۔ گناہ گاروں کا سب سے بڑا سہارا تو یہی اس کا بے پایاں اور بے اندازہ رحم و کرم ہے۔ وہ جبار و قہار ہی نہیں رحیم و رحمٰن، ستار و غفار بھی ہے۔ ایک رباعی میں فرماتے ہیں۔

ہستم بہ جہاں اگرچہ غرقِ عصیاں ۔۔۔ دارم امید رحمتش در دل و جاں

دانندۂ ہرچہ در ضمیرم گزرد | بینندۂ ہرچہ کردہ باشم پنہاں

مشیتِ الٰہی کے آگے کسی کو بھی جائے دم زدن نہیں۔ اپنی مصلحتیں وہ آپ ہی بہتر جاننے والا ہے۔ اس کے اسرار و رموز ناقص فہم انسانی میں عمر بھر کے تفکر کے باوجود کہاں آ سکتے ہیں ؎

در کنہِ رموز راہ نتوانم کرد | بر کار فلک جز آہ نتوانم کرد
یکسر سرِ من سفید گردید، و لے | یک موے ازاں سیاہ نتوانم کرد

اور یہی رباعی حضرت مرحوم نے اپنی ایک ایسی تصویر پر اپنے ہاتھ سے لکھ کر چھاپی ہے۔ جس میں ان کے سفید سفید بال نمایاں طور پر نظر آرہے ہیں۔

"گنجِ معانی" کے آخر میں بھی "قندِ پارسی" کے عنوان کے تحت حضرت مرحوم کا فارسی کلام شامل ہے۔ اس کی ابتدا ہی میں تین رباعی نما قطعات اپنے آفریدگار کے حضور میں پیش کیے ہیں۔ ان میں اس ناز کے ساتھ شکوے کیے ہیں کہ سو سو نیازمندیاں اس پر تصدق ہوئی جاتی ہیں ؎

مہ و مہر و ثریا آفریدی | چہ صورت ہائے زیبا آفریدی
گر ایں ہا آفریدی از پئے ما | چرا بے ذوق مارا آفریدی

بتانِ ماہ سیما آفریدی | نگارانِ خود آرا آفریدی
دل و دیں گرچہ شد تاراجِ ایشاں | چساں گویم کہ بے جا آفریدی

عیاں بودی چو دنیا آفریدی | زمین و آسماں ہا آفریدی
گناہِ ماچہ بودا ے دادرِ پاک | نہاں گشتی چو مارا آفریدی

اسی طرح حضرت نظامی گنجوی کے اشعار پر بطور مثلث تضمین کرتے ہوئے مناجات لکھی ہے، اور ایک بلند حوصلہ صاحبِ بصیرت انسان اپنے قاضی الحاجات سے جو کچھ بھی مانگ سکتا ہے مانگ لیا ہے۔

بہ حالِ من کہ محرومم بہ بخشائے | خداوندا درِ توفیق بکشائے
بہ سوے خود رہِ توفیق بنمائے

ببخش آں علم کو سوئیت گراید | دلے دہ کو یقینت را بشاید

زیانے کافرینت را سراید

درخشاں کن دلم در صورت ماہ　　مدہ ناخوب را در خاطرم راہ

بدار از ناپسندم دست کوتاہ

دل افسردہ را کن شعلہ اندوز　　درونم را بہ نور خود بیفروز

زبانم را ثنائے خود در آموز

ربینِ لطفِ بے اندازہ گرداں　　بہ داؤدی دلم را تازہ گرداں

زبورم را بلند آوازِ گرداں

ایک دعائیہ قطعہ میں کس تڑپ کے ساتھ حق نمائی کی دعا کی ہے ؂

گم کردہ نشانِ منزلم من!　　بے راہ نماوبے دلم من!

خوابیدہ بہ راہ دشت پُر ہول　　رحمے، یارب چہ غافلم من!

ظلم کو فروغ بس چند ہی روز رہتا ہے، حق کو دبایا جائے تو وہ عارضی طور پر دب تو جائے گا، لیکن اس سے اندر ہی اندر ایسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں کہ ظالم کی بیخ و بنیاد ہی اکھیڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ بیدادگر ناحق خون نہیں بہاتا۔ اپنے خدا سے لڑتا ہے اور اس سے بے خبر رہتا ہے کہ جو بھی بے گناہ خون وہ کر رہا ہے۔ اس کی جگہ حریت اور آزادی کے بلند و بالا پیڑ کا بیج بو رہا ہے ایک رباعی میں اسی مفہوم کو کس خوبی سے ادا کیا ہے ؂

بیدادگرے کہ خون ناحق ریزد　　با خالق داد گر ہمی ستیزد

ہر قطرۂ خونِ بے گناہانِ غریب　　تخمے است کہ نخل حریت زر خیزد

انسان ہوا و ہوس کا بندہ ہے اور اس کی پانچ صورتیں ہیں، کام (شہوت)، غضب (کرودھ)، حرص (لوبھ)، دلبستگی (موہ)، خودی (اہنکار)، ان کے ہاتھوں اسے کیسے دن دیکھنے پڑتے ہیں اور انھیں اپنے قابو میں رکھتے ہیں ؂

ہم خانۂ من کہ پنج اعدائے من اند　　موجود بہ بیداری درویائے من اند

از دست فریب شاں رہانم یارب　　ہمدم شدہ مستعد بہ ایذائے من اند

عبرت کا یہ مضمون کہ "دارا رہا، نہ جم، نہ سکندر سا بادشاہ" فارسی اور اردو میں سو سو طرح بندھ چکا ہے۔ حضرت محروم نے بھی ایک رباعی میں اس مضمون کو بڑے اثر آفریں انداز میں باندھا ہے۔ فرماتے ہیں ؂

تہیدست از جہاں رفتند شاہاں　　بہ عالم بے نشاں عالم پناہاں
بہ دہر اندر نیفرازی سرِ کبر　　اگر بینی مآلِ کج کلاہاں

غزل فارسی ادب کی جان ہے۔ اس کے ساحرانہ اثر سے کون فارسی گو شاعر بچ سکا ہے۔ حضرت محروم نے بھی فارسی میں چند غزلیں کہی ہیں اور حق یہ ہے کہ پاکیزہ اور ستھری غزلیں لکھی ہیں۔ اِن غزلوں سے چند پر لطف شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہزاراں دلستاناں دل بہ غارت می برند ایں جا　　نکو کردی، اگر داری بہ رغبت دلستانے را
حبیب نکتہ یابے نیست در دنیائے غم خواری　　دگر نہ قطرۂ اشکیست کافی داستانے را
ہر یک کارواں لبیک گوید منزلِ دنیا　　ولیکن بر نمی تابد قیام میہمانے را

کمال صنعت بت ساز کرد حیرانم　　مآل عشق بتاں غیر ازیں نمی دانم
تلافیٔ ہمہ دشواریٔ حیات شود　　چہ خوش بود کہ بخشند مرگِ آسانم
دمے بہ حرمت ایمائے گل نخندیدم　　دگر نہ واقف آئین ایں گلستانم
فسردہ ناز زپیری شود دلِ محروم　　حدیثِ شوق بہ یادِ شباب می رانم
رفت سودائے سیرِ گل زسرم　　در چمن زارِ عالم دگرم
منتِ شیخ و برہمن نہ برم　　بے نیازم زطوفِ دیر و حرم

حضرت محروم کے فارسی کلام میں سب سے زیادہ دلچسپ چیز ان کے قطعات ہیں۔ ایک قطعہ "سخت نادان" کے عنوان کے تحت لکھا ہے اور اسے ابن یمین فریومدی کے ایک شعر پر ختم کیا ہے۔ مسلمان شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے تمام اعمال و افعال کو بجا قرار دیتے ہوئے ان کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لکھنے پر مصر ہیں۔ بدیسی راج کے تحت اقبال کی زبان میں اس "ترکش مارا خدنگ آخریں" پر لگائے ہوئے بہتانوں کی بنا پر بعض ہندو انھیں ہندو کش اور ظالم و جابر قرار دینے پر اڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ان گڑے مردوں کو اکھیڑ کر آپس کی محبت اور اخلاص کی جڑ کاٹنے سے آخر حاصل ؟ حضرت کا صلح کل اور الفت زا مشرب گرفتارانِ ابوبکرؓ و علیؓ کے اس طرزِ عمل کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اور اسے سراسر حماقت سے تعبیر کرتا ہے۔ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

ذکرِ اورنگ زیب عالمگیر　　شورش افزائے بزم ویران است

عقدہ بر کردہ باشی ہندو را — مسلم اورا بدل ثنا خوان است
سخن برہمن سناں تمثال — نفس شیخ شعلہ سامان است
اندریں حال قولِ ابنِ یمین — در حقِ ہندو و مسلمان است

"ہر کہ با زندہ از پئے مردہ
می کند جنگ سخت نادان است"

یہ کچھ ضروری نہیں کہ شاعر اپنی شاعری میں جیسی بلند بانگ باتیں کرتا ہے واقعی اس پر اس کا عمل بھی ہو۔ شاعروں کا سب سے بڑا فن باتیں بنانا ہے۔ باتیں بنانے والے عمل نہیں کرتے۔ عمل کرنے والے باتیں نہیں بناتے۔ یہ گفتار کے غازی ہیں، کردار کے غازی نہیں ؎

تو گفتی فلاں شاعرِ خوش نوا است — ولے صاحبِ حسنِ کردار نیست
مدار از سخن در امیدِ عمل — کہ اورا ہنر جز بہ گفتار نیست

ہم زبانی جمع خرچ کے طور پر چاہے اپنے معلموں اور مدرسوں کو "معمارِ قوم" جیسے کتنے ہی بھاری بھرکم لقب دے لیں، لیکن ہمارے معاشرے میں معلم اور مدرس کی جو بے توقیری ہے وہ ہماری قومی زندگی کا ایک الم ناک باب ہے۔ یہی بے کس معلم اور یہی بے بس مدرس اپنی پوری عمریں گدھوں کو انسان بنانے میں صرف کر دیتے ہیں۔ اس پر بھی گدھوں کو انسان بنانے والے ان بے نصیبوں کو ہمارے معاشرے میں کوئی ممتاز مقام حاصل نہیں ہوتا، اور کس مپرسی اور بے توقیری کی حالت میں یہ "معمارانِ قوم" اپنی زندگی تیر کر جاتے ہیں۔ حضرت مرحوم عمر بھر معلم اور مدرس رہے۔ اس خدمت سے سرکاری طور پر سبک دوش ہوتے وقت انھوں نے کیا دلدوز قطعہ کہا ہے۔ اور حق ہے کہ ہمارے بے حس معاشرے کے گال پر طمانچہ لگایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سی و پنج سالِ عمرم بہ ملازمت بسر شد — سحرِ شباب خود را ہمہ تیرہ شام کردم
شرمم بہ عہدِ پیری چہ بود کہ در جوانی — بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

حضرت مرحوم کے قطعات میں سب سے دلکش قطعہ ملا کمال موہوم اور علامہ اقبال مرحوم کا خیالی مناظرہ ہے۔ ملا موہوم کٹر ملا، علامہ مرحوم برہمن زادہ۔ ملا صاحب بگڑ بگڑ کر برہمن کی بت پرستی کی تحقیر کرتے ہیں اور اسے اپنے خیال کے مطابق مسلمان بنانا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبال مسلمان ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ برہمن نژاد ہیں۔ اس تحقیر و تذلیل کو وہ برداشت نہیں کرتے۔ ملا صاحب جتنا گہرا طنز فرماتے ہیں، علامہ اقبال اتنی ہی نرمی، اتنی ہی دلداری اور اتنی ہی

مروت وانسانیت کے ساتھ زہر میں بجھے ہوئے ان تیروں کا سارا زہر دھو دیتے ہیں۔ یہ نظم سرتاپا علامہ اقبال کے رنگ میں لکھی گئی ہے اور بڑی کامیابی کے ساتھ ان کے رنگ کو نبھا یا ہے۔ علامہ اقبال کی برہمن زادگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک تنگ نظر ملاّ کے اعتراضات کے جواب خود ان کے کلام سے خوب اور بہت خوب دیے ہیں۔

ملاّ موہوم کا سارا زور بت پرستی کے خلاف ہے، وہ علامہ اقبال سے فرماتے ہیں کہ سجدہ بس مسجد میں اللہ ہی کو زیب دیتا ہے تم خدا کے بندے ہو تو ہندوستان سے بت کدوں کے نام ونشان میٹ دو۔ جواب میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ قبلہ! برہمن کی بت پر برہم نہ ہوئیے۔ خود خدا نے فرشتوں سے آدمِ خاکی کے پتلے کو سجدہ کرایا ہے۔

ملاکمال

بہ مسجد سجدۂ پیشِ خدائے　　　　بہ دیر اندر رسوم بت پرستی

بنائے دیر ہندی ما بر انداز　　　　خدائے پاک را گر بندہ ہستی

علامہ اقبال

مرنج از برہمن اے واعظِ شہر　　　　گر از ما سجدۂ پیشِ بُتاں خواست

خدائے ما کہ خود صورت گری کرد　　　　بتے را سجدہ از قدسیاں خواست

آگے ملاکمال موہوم کہتے ہیں کہ برہمن بتوں کو پوجتے ہیں، اسی لیے برہمن سے ہماری لڑائی ہے۔ جواب میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ برہمن نے روزِ حشر خدا سے کیا خوب کہا کہ بت آدمیوں سے بھی زیادہ پائندہ تھے۔ اس لیے میں نے بتوں کی پرستش اختیار کی تو کیا گناہ کیا۔

ملاکمال

پرستش را نشاید نقشِ فانی　　　　ہمہ اصلِ صنم از خاک و سنگ است

صنم ہا را برہمن می پرستد　　　　ازاں ما را بہ وی پیکار و جنگ است

علامہ اقبال

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت　　　　فروغ زندگی تابِ شرر بود

ولیکن گر نہ رنجی با تو گویم　　　　صنم از آدمی پائندہ تر بود

ملاکمال بگڑ کر کہتے ہیں کہ آخر برہمن کی اتنی تعریف کیوں ہو رہی ہے، نہیں دیکھتے کہ پتھر کے ٹکڑے سے خدائی کا طالب ہے۔ جواب میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ برہمن کی تعریف کیوں نہ کروں کہ بڑے بڑے

پتھروں کو ٹکڑے ٹکڑے کرڈالتا ہے۔ سخت پتھروں سے خدا تراشنا زور بازو رکھنے والے ہاتھوں کے سوا کسی اور سے ممکن نہیں ۔

ملا کمال

برہمن راستائش گر چرائی | چہ خیر اندر دریں مدحت سرائی
نمی بینی کہ آں فرسودہ ہمت | بہ لختِ سنگ می جوید خدائی

علامہ اقبال

برہمن را نگویم ہیچ کارہ | کند سنگِ گراں را پارہ پارہ
نیاید جز بہ زورِ دست و بازو | خدائے را تراشیدن زخارہ

اس پر ملا کمال گہرافشاں ہوتے ہیں کہ ہندی بت پرست گمراہ ہیں۔ ایمان کے نور سے محروم ہیں ظلمت میں جیتے اور ظلمت میں مرتے ہیں۔ بس تاریکی ہی تاریکی میں چلے جاتے ہیں جواب میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمان ان سے کس حالت میں کم ہیں۔ برہمن طاق میں مورتیاں سجاتے ہیں، مسلمانوں نے قرآن کو طاق کی زینت بنا رکھا ہے۔

ملا کمال

بت آرایانِ ہندی گم رہانند | کہ راہ منزلِ ایماں ندانند
حیات و مرگِ شاں در ظلمتِ کفر | زتاریکی بہ تاریکی روانند

علامہ اقبال

درِ صد فتنہ را بر خود کشادی | دو گامی رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست | تو قرآں را سرِ طاقی نہادی

اس پر ملا کمال اقبال کو ان کے مسلمان ہونے کا واسطہ دیتے ہیں۔ اور حیران ہیں کہ اپنے ہاتھ سے اپنے خالق کی تخلیق کیسے ممکن ہے۔ اور اپنی تخلیق کی پرستش کیسے ہو سکتی ہے۔ علامہ اقبال جواب میں فرماتے ہیں کہ خود پرستی انسان کے خمیر میں داخل ہے۔ اپنی ہی صورت کے بت وہ آپ بناتا ہے، اور آپ ہی اس کی پرستش کرتا ہے۔ خود پرستی سے اسے نجات کہاں مل سکتی ہے ۔

ملا کمال

تو ہم مردِ مسلمانی و دانی | خدا خالق، صنم مخلوق باشد
زکارِ برہمن در حیرتم من | ز سنگی خالقِ خود می تراشد

تراشیدم صنم بر صورت خویش | بہ شکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود بروں رفتن محال است | بہر رنگی کہ ہستم خود پرستم

ملاکمال موہوم اس پر بھی مطمئن نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ کیسی واہی تباہی باتیں کرتے ہو، ایسی باتوں سے کفر و اسلام میں امتیاز باقی نہ رہے گا۔ جواب میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے شیخ حرم! یہ ظواہر کے جھگڑے ہیں، جہانِ عشق میں نہ کوئی گناہ ہے نہ کوئی ثواب، نہ تول ہے نہ میزان، نہ کوئی کافر ہے نہ مسلمان ؎

ملاکمال

بایں سوزِ سخن محشر نوائی | نہ بینی امتیاز کفر و اسلام
دل معنی فروزت طرفہ مضراب | کہ می سازد بہ سازِ کفر و اسلام

علامہ اقبال

تو اے شیخ حرم شاید نہ دانی | جہانِ عشق را ہم محشرے ہست
گناہ و نامہ و میزان ندارد | نہ او را مسلمی نے کافرے ہست

ملاکمال ایک آخری کوشش اور کر دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں، بت خانوں کو مسمار کر کے وہاں مسجدیں بنائی جائیں اس کے سوا کفر کو مٹانے کی اور کوئی صورت میرے خیال میں نہیں آتی۔ جواب میں علامہ اقبال یہ مسکت جواب دے کر ملا کا منہ بند کر دیتے ہیں کہ آپ کنشت مسجد، بت خانہ اور دیر کی اصطلاحوں کے سوا سوچ ہی نہیں سکتے، حضرت دل پیدا کیجیے دل، یہ دل والوں کی باتیں ہیں، دل پیدا کیجیے۔ پھر دیکھیے یہ مسائل کس طرح آپ کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔

ملا موہوم

بنائے مسجدے خواہم در آں جا | اگر بت خانۂ مسمار بینم
جز ایں دیگر طریقِ رستگاری | نیاید در خیالم در یقینم

علامہ اقبال

کنشت و مسجد و بت خانہ و دیر | جز ایں مشتِ گلے پیدا نہ کردی
ز حکم غیر نتواں جز بہ دل رست | تو اے غافل، دلے پیدا نہ کردی

سخن مختصر، حضرت محروم نے اردو میں زیادہ لکھا ہے اور فارسی میں کم۔ وہ بنیادی طور پر اردو کے شاعر اور

ایک عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ لیکن انھوں نے جو کچھ بھی تھوڑا بہت فارسی میں لکھا ہے وہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کے مصداق، اچھا اور بہت اچھا لکھا ہے۔ ان کا یہ فارسی کلام عصرِ حاضر کے بہت سے پوچ گویانِ ایران کے بے رس، پھُس پھُسے بلکہ بے وقار کلام سے کہیں زیادہ رسیلا، بامعنی اور باوقار ہے، اور ہندوستان کے فارسی گو شاعروں کی اگلی صفوں میں ان کی جگہ کا ضامن!

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ

قومی تحریک کا شعلہ بار شاعر

مسلمان درباروں میں پروردہ اردو شاعری جو عہدِ وسطیٰ کی طرز کے درباروں میں اپنے ممدوح کی شان میں قصیدہ گوئی بن کر رہ گئی تھی۔ حب وطن کی گیتوں سے تقریباً عاری تھی۔ اپنے آقاؤں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا اس کی زبان کی شاعرانہ روایت بن گئی۔ عربی و فارسی میں قصیدے کی صنف سب سے قدیم ہے اور اسی رعایت سے اردو میں بھی جو کہ ان دو زبانوں کی جلو میں آئی ہے قصیدے کی صنف جاری رہی۔

جن شاعروں کو ان کے ممدوحین نے الطاف و عنایات سے نہیں نوازا انھوں نے انہی کی ہجو لکھنی شروع کردی۔ فردوسی نے شاہ نامہ کے لیے مناسب ہدیہ نہ ملنے پر محمود غزنوی کی ہجو لکھ ڈالی۔ اسی طرح اردو میں سودا اور دوسرے شاعروں نے ایسا ہی سودا کیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا آغاز اس درباری نظام کے لیے تہلکہ ثابت ہوا۔ جس کا سب سے بڑا اثر اردو شاعروں پر پڑا۔ اب تک تو انھوں نے اپنے ممدوحین کی مدح سرائی کے عوض حاصل کی ہوئی نعم و نعمت کی بدولت گزارہ کیا اور اب جو ان ممدوحین کے دن پورے ہوگئے تو وہ کہیں کے نہ رہے۔

اردو کے ہندو شعراء نے یا تو مذہبی قصہ گوئی شروع کردی یا پھر کوئی دنیاوی سی پیشہ یا کلرکی اختیار کرکے گزارہ کرنے لگے جو کہ مسلم حکمرانوں کے عہد میں تعلیم یافتہ ہندوؤں کے لیے واحد ذریعہ معاش تھا۔ ان کے نزدیک بھارت ان کی جنم بھومی ہی نہیں بلکہ پوتر بھومی بھی تھا۔ اور جب کبھی کسی بیرونی حملہ آور نے بھارت پر یلغار کی تو ہندو شعراء کے دل کے تار ہلنے لگے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب کہ مسلم سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا مسلم شاعروں نے یہ محسوس کرلیا کہ شاعری بذات خود کوئی پیشہ نہیں ہوسکتی۔ تا وقتیکہ اس سے کوئی مالی منفعت حاصل نہ ہو سکے۔ اس لیے انھوں نے اپنے رو بہ زوال سرپرستوں کا اس وقت تک ساتھ دیا جب تک وہ انھیں ان کی مدح سرائی کا معاوضہ دے سکتے تھے۔ کلکتہ میں اپنی اسیری کے زمانے میں واجد علی شاہ کے ہمراہ اردو شاعروں کا ایک اچھا خاصا قافلہ تھا جو بعد کو وہیں رہ بس گیا اور

دوسرے پیشوں مثلاً مصوری، ٹیچری، صحافت، طب کی طرف راغب ہوگیا۔ وہ درباروں کی گمشدگی کا ماتم کرتے، اور ان کی ناپید شان و شوکت کے تذکرے کرتے۔

دوسری طرف ہندو شعراء کو اپنے دبائے ہوئے جذبات و احساسات کو اجاگر کرنے کا موقعہ ملا۔ مسلسل ایک ہزار سال تک غیر قوموں کے بھارت پر استبداد نے ان کی روحوں کو مجروح کر دیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں شکست کھائی ہوئی اور نادم مسلم ملت کو اس کی عظمت گمشدہ کی یاد دلانے کے لیے سر سید احمد خاں نے مولانا حالی کو ان کی مشہور نظم "ہند میں اسلام کا عروج و زوال" لکھنے کی ترغیب دی۔ جس کے ردعمل کے طور پر ہندو شعراء کو بھی اپنی قدیم تر عظمت کی نغمہ سرائی کی تحریک ہوئی۔ درگا سہائے سرور جہان آبادی (سال وفات ۱۹۱۰ء) نے ہندو کلچر کے موضوعات پر ہندو تاریخ کے پس منظر پر نظمیں لکھیں۔ ان کے بعد پنڈت برج نرائن چکبست آئے۔ جنھوں نے اردو میں حب وطن کے نغموں کی داغ بیل ڈالی۔ یہ چکبست ہی کی جسارت تھی جو انھوں نے کلکتے میں ۱۹۱۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے سیشن میں حب وطن کا جری نغمہ بلند کیا۔ ان سے قبل اقبال نے بھی ایسی ہی آواز بلند کی تھی۔ لیکن ۱۹۰۸ء میں یوروپ سے واپسی کے بعد ان کا زاویۂ نظر بدل گیا تھا۔

۱۹۰۶ء میں اس جہانِ تاریک کا سب سے روشن ستارہ طلوع ہوا اور حب وطن کی شاعری کے آسمان پر تلوک چند محروم رونما ہوئے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ ۱۸۸۷ء میں پنجاب کے سب سے پست، غیر ترقی یافتہ ضلع میانوالی میں پیدا ہونے کے باوجود تلوک چند محروم نے ایسی شستہ، صاف اور عالی شان اردو لکھی کہ لکھنؤ، دہلی اور حیدر آباد کے استادانِ سخن اچنبھے میں پڑ گئے۔ اردو صحافت کے رہنما اور عظیم مصنف اور ایڈیٹر "مخزن" سر شیخ عبدالقادر اور "زمانہ" کے شہرۂ آفاق ایڈیٹر پنڈت دیا نرائن نگم نے محروم کے نفاستِ بیان اور بے داغ اسلوب کی تعریف کی۔ تلوک چند کی نگارشات ان دونوں رسالوں میں کبھی ان کے نام اور تخلص "محروم" کے ساتھ شائع ہوتی رہی ہیں۔ اور کبھی بغیر نام کے کیونکہ وہ ایک نیم سرکاری تعلیمی خدمت پر فائز تھے۔ آج کی فضا میں سانس لینے والے بہ مشکل ان قیود اور پابندیوں کا اندازہ کر سکتے ہیں جو آج سے ۳۶ سال پہلے لاگو تھیں اور جن کے تحت محروم کو اپنی شخصیت کو پس پردہ کر کے اپنا پیام پیش کرنا پڑا۔

بنگال کی تقسیم اہلِ ہند کے لیے تازیانہ ثابت ہوئی۔ اس نے خوابیدہ قومی شعور کو جگایا اور حقوق و واجبات کا احساس دلایا۔ محروم کی حب وطن کی شاعری اسی دور کے ہمرکاب ہے۔ جب کہ پنجاب سے لالہ لاجپت رائے کا دیس نکالا ہوا۔ اگرچہ ان کے بعض مجموعے چالیس سال پہلے شائع ہو چکے تھے۔ حال ہی میں ان کی حب وطن کی نظموں کا ایک مجموعہ "کاروانِ وطن" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے بھارت ماتا، سودیشی، اہنسا، جنوبی افریقہ کے ہندوستانی

ہندو مسلم اتحاد، رام راج، کمیونل ایوارڈ، حادثہ جلیان والا باغ، سائمن کمیشن، گاندھی جی، تلک، گوکھلے، لاجپت رائے سی، آر، داس، نیتاجی سبھاش چندر بوس، موتی لال نہرو، مولانا آزاد، تیج بہادر سپرو، سروجنی نائیڈو اور سردار بھگت سنگھ اور ہری کشن جیسے محبانِ وطن کی مدح سرائی۔ قحطِ بنگال، گول میز کانفرنس، آزاد ہند فوج اور بھارت کی تقسیم جیسے ہم عصر مسائل اور شخصیتوں پر نظمیں لکھی ہیں۔

مغربی پاکستان سے نکالے ہوئے ہونے کے ناطے انھوں نے اپنی نظموں میں اپنے جذبات کی بہت ہی متاثر کن عکاسی کی ہے۔

۱۹۰۶ء میں انھوں نے بھارت کی عظمتِ گم شدہ کو یوں للکارا تھا ؎

جس کی دولت سے ہوا ایک جہاں مالامال — جس کے دریائے کرم سے کبھی دنیا تھی نہال
آج کل گردشِ افلاک سے ہو کر پامال — سامنے غیر کے پھیلاتی ہے دامانِ سوال
تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا

سودیشی تحریک کی وکالت میں محروم کہتے ہیں ؎

یہیں کی روئی، یہیں کی ململ یہیں کا ریشم — نہ لنکا شائر، نہ مانچسٹر، سدیش وستو، سدیش وستو

پنجاب میں جلیان والا باغ کے حادثے نے ایک نئی ہلچل اور بغاوت پیدا کر دی تھی۔ محروم نے کرنل ڈائر کو نادر شاہ کا رفیق گردانتے ہوئے لکھا ؎

ڈائر نے قتلِ عام کیا اس مقام پر — مرتے جہاں ہیں لوگ اطاعت کے نام پر
جن کی وفات کے گیت ڈوائر نے گائے ہیں — برطانیہ کے کام برے وقت آئے ہیں
یورپ ہوئے جن کے ابھی لالہ زار ہے — اب تک ہوائے دشت میں جن کا غبار ہے

اسی طرح لالہ لاجپت رائے کی شہادت نے بھی محروم کے شدید جذبۂ قومیت کو پکارا ؎

تیرے مرنے پر نہ خوش ہوں بد سگالانِ وطن — زعم میں اپنے سمجھ کر پیکرِ فانی تجھے
زندۂ جاوید تو، پائندۂ جاوید تو — لاجپت رائے مبارک ہو یہ قربانی تجھے
زندگانی تھی تری شمع فروزانِ وطن
موت ہو جائے گی تیری شعلہ سامانِ وطن

بھگت سنگھ کے بلیدان پر محروم نے کہا ؎

یوں آ رہے ہیں جیسے ہو نوشاہ شاد کام — اہلِ وطن کو کرتے ہوئے آخری سلام

پھانسی کی رسیوں کو دیا بوسہ شوق سے — چہرے ہیں رنگِ ذوقِ شہادت سے لالہ فام

دیکھا اے ہلالِ شام

بنگال میں قحط کی روح فرسائیوں اور سرکارِ وقت کی بے رحمی نے محروم کے حساس دل کو جھنجھوڑا۔ کہتے ہیں ؎

بنکم کے ترانوں کا وطن نالہ کناں ہے — ٹیگور کے نغموں کا چمن وقفِ خزاں ہے

جس خطے سے آئی تھی صدا حبِ وطن کی — ملتی ہے اسے آج سزا حبِ وطن کی

ٹوٹا نہ اگر حلقۂ زنجیرِ غلامی

اس سے بھی خطرناک ہے تقدیرِ غلامی

نیتا جی سبھاش چندر بوس کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے ؎

وطن کے لیے بے وطن ہو کے نکلا — سراپا اسیرِ محن ہو کے نکلا

وقارِ وطن تجھ سے پھیلا جہاں میں — چمن سے شمیمِ چمن ہو کے نکلا

ان کی رفیقۂ حیات اور بیٹی کی وفات حسرت آیات نے ان کی شاعری کو حرفِ الم سے روشناس کیا۔ ان جدائیوں پر انھوں نے جو غم کے آنسو بہائے ان میں سنگ دل انسان بھی ان کا شریک ہو گیا۔

مذہب کے گہرے مطالعے نے انھیں قدرت کی جبریت کا قائل کر دیا ہے۔ اسی لیے وہ امن و آشتی کا پیغام دیے جاتے ہیں۔ پنجاب کے شاعر منش فقیر سوامی رام آنند تیرتھ کی زندگی اور فلسفے نے انھیں بہت متاثر کیا ہے۔ اس عظیم ہستی نے جن کا ۱۹۰۶ء میں ۳۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا پنجاب کے ہر نوجوان کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر چھوڑا جس سے اقبالؔ اور محرومؔ آزاد نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کا پیام فرقہ وارانہ محبت اور جذبۂ قومیت کا فروغ تھا۔ جس نے پنجاب کے نوجوانوں کو ابھارا اور محروم نے اس سرچشمہ سے فیض پایا۔

اپنے سوامی کے مانند محروم بھی ہمیشہ ایک استاد رہے اور انھوں نے ملک کے بچوں کا ماضی کی عظمت کی روشنی میں کردار بلند کرنے کے لیے نظمیں لکھیں اپنے مسلم ہم عصروں کی مانند دوسرے ملکوں کی تاریخ و روایت سے تحریک حاصل کرنے کی بجائے محروم نے اپنے ہی ملک کی روایات اور اس کی تاریخ کو غور سے دیکھا تاکہ ملک کو عظیم مستقبل اور دنیا کی اقوام میں اعلیٰ مقام کے لیے تیار کر سکیں۔

حبِ وطن، سوز و گداز، امید اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی محروم کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ ابتدا تو اردو

درباروں میں پرورش پاتی رہی اور جب دربار اجڑ گئے تو وہ مشرق وسطی کی فرسودہ روایاتی شاعری کی نہج پر چلی گئی۔ جس میں گل و بلبل، شراب و شباب اور ہجر و وصل کے تذکروں نے مقصدیت کو پنپنے نہیں دیا۔ اور اس طرح وہ بیکار افراد کی ذہنی عجت کا ایک بہانہ بن گئی۔ لیکن محروم نے اسے دوبارہ زندہ کیا اور مضبوط تر بنیادوں پر قائم کیا۔ اس میں حقیقی زندگی کے ٹھوس و تلخ حقائق کو کھولا، اور حلقۂ دام خیال سے نجات دلائی۔

بھارت کی تقسیم اور اس کے بعد کی لوٹ و غارت گری نے محروم کو افسردہ بنا دیا، لیکن یہ افسردگی عارضی تھی، کیونکہ محروم اپنے ملک کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ حکومت پنجاب نے انھیں اعزاز دے کر واقعی ایک نیک قدم اٹھایا ہے یقیناً دوسرے اور شاعروں کے مقابلے میں محروم اس سے بھی بڑے اعزاز و اعتراف کے مستحق ہیں۔ اپنے حق گوئی کی خاطر انھوں نے سختیاں جھیلی ہیں۔ ان کی 'کاروان وطن' ایک نغمہ ہے حب الوطنی کا اور قوم پرستی کا، جس میں نہایت ہی حسین و شستہ زبان میں آسمان سے باتیں کرنے والے تخییل نے نئی نئی گل کاریاں کی ہیں۔ محروم نے اردو کو ایک نئی زندگی دی ہے اور اسے نئی نئی وسعتوں سے روشناس کرایا ہے، جو مسلم اصطلاحات، تکنیک اور روایات کی بندشوں سے اونچی ہے۔

پروفیسر عالم خوندمیری

تلوک چند محروم

اردو نظم کو سنوارنے اور اس کی تزئین و آرائش میں محروم نے جو حصہ لیا ہے وہ اردو کی ادبی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش ورق ہے۔ آزاد اور حالی نے اردو کی اس نئی صنفِ سخن کو جہاں چھوڑا تھا سرور، تلوک چند محروم، چکبست اور اقبال نے اس کو ایک عظیم سرمایہ میں بدل دیا۔ ان بزرگوں سے پہلے اردو نظم محض ایک تجربے کی منزل میں تھی۔ اردو ادب کی ایک جاندار وراثت نہ بن سکی تھی۔ جن لوگوں نے اردو نظم کو ہمارے ادب کی ایک روایت بنایا، ان میں محروم ایک انتہائی مقام کے حامل ہیں۔ بیسویں صدی ادبی تحریکوں کی صدی ہے۔ ان میں سے اکثر تحریکیں ایک دوسرے سے ممتاز اور باہمدگر مختلف رہیں۔ ان میں سے بعض تحریکیں زندہ رہیں اور بعض وقت کی نذر ہوگئیں۔ بعض تحریکوں نے گہرے اثرات مرتب کئے اور اردو ادب کے دھارے کو موڑ دیا تو بعض ایک ہلکا سا تلاطم پیدا کر کے خاموش ہو رہیں۔ وطنیت، قومیت، بین القومیت، انسانیت، مذہب اور لامذہبیت، روحانیت اور دہینیت ان سب تحریکوں نے ہمارے جدید ادب کو متاثر کیا اور بڑے گہرے نقوش چھوڑے۔ اور اندازِ بیان میں غیر یقینی اور آزاد شاعری کے تجربوں نے ہماری نظم کو نئی نئی منزلوں سے روشناس کروایا۔ کبھی روحانیت کا غلبہ رہا تو کبھی کلاسیکیت کی آواز بلند ہوئی اور چند لوگوں نے ان دونوں میں خوشگوار امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس صدی میں بعض ایسے بھی شاعر ہیں جن کی ادبی زندگی کے مختلف ادوار ان تمام تحریکوں کی کم و بیش نمائندگی کرتے ہیں۔ محروم کی شاعری کی عمر اتنی ہی ہے جتنی اس صدی کی عمر۔ لیکن ان کی شاعری کے غالب رجحانات ہر دور میں کم و بیش وہی رہے۔ یہ نہیں کہ انھوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے محرکات سے اثر نہیں لیا اور اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ بلکہ ہر دور میں ان کی دل نواز انسانیت، ان کی وسیع قومیت ان کا وطنی جذبہ اور ان کی پر وقار روحانیت ان کی شاعری کے راہنما عناصر رہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب بھی محروم کا ذکر آتا ہے ہمیں سرور اور چکبست کے نام یاد آتے ہیں اور اقبال کا ابتدائی دور ذہن میں ابھرتا ہے۔ وطن سے والہانہ محبت فطرت اور اس کے جلال اور جمال دونوں سے گہری وابستگی، انسانیت کا درد اور انسانوں سے بے غرضانہ دلچسپی ایک وسیع لیکن گہری مذہبیت اور مذہبی اقدار سے دل بستگی انسان کی عظمت لیکن اس کائنات میں انسان کی بے مائگی تقریباً یہ سب ان کی شاعری کے محرکات بنے اور شروع سے اب تک ان کے شاعرانہ شعور کی رہنمائی کرتے رہے

ان کے شاعرانہ نغموں میں نورازل کا سرور اور حسن ازل کا کیف ملتا ہے۔

زندگی کا کونسا ایسا واقعہ ہے جو ان کی شاعری کا موضوع نہیں بنا لیکن موضوعات کی اس ہمہ گیری کے باوصف ان کی شاعری میں ایک تسلسل اور ایک اندرونی ربط نظر آتا ہے۔ جو فطرت، انسان اور وطن سے ان کی گہری دل بستگی کا نتیجہ ہے وہ اخلاق، اور مذہب کی حد تک قدیم مکتب کے حامی ہیں۔ اور جب عصر حاضر کے انسان کو ان قدروں سے بے نیاز پاتے ہیں تو انھیں قدرتی طور پر دکھ ہوتا ہے، لیکن کہیں بھی ان کی شاعری میں کلبیت اور آزار رساں طنز کے پہلو نظر نہیں آتے۔ ان کی بنیادی انسانیت اور حسن کے بنیادی احساس کی وجہ سے وہ کہیں بھی تلخی کا شکار نہیں ہوتے انھیں اپنے عظیم وطن ہندوستان سے عشق ہے۔ لیکن انھیں اپنا وہ چھوٹا سا وطن جہاں ان کی جوانی کے بہترین دن گزرے بھی عزیز ہے۔ ——— تقسیم نے انھیں اس وطن سے محروم کر دیا۔ تقسیم میں انھوں نے ان تمام روایات کو پامال ہوتے دیکھا جو انھیں عزیز تھیں۔ لیکن انسانیت پر ان کا اعتماد اور ایقان متزلزل نہ ہو سکا۔ ان میں غم کو خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی محسوس کرنے کی صلاحیت ہے، لیکن غم ان پر کبھی مسلط نہیں ہوتا۔ ان کی غمگین طبیعت کبھی غم پرست نہیں بنتی۔ وہ غم سے متاثر ہوتے ہیں۔ موت انھیں مغموم کرتی ہے۔ لیکن ہندی فلسفے اور مذہب کی اعلیٰ روایات انھیں ذات پرستی سے روک لیتی ہیں۔ شاعری میں ہندوستانی روایات اور اعلیٰ ہندو مذہب اور فلسفے کے تصورات کا محروم سے زیادہ کسی نے اظہار نہیں کیا ہے۔ ہندوستانی فکر کی انانیت، بنیادی انسانیت اور کثرت میں وحدت کی تلاش ان کی شاعری کے بہترین اجزائے ترکیبی ہیں۔ کونسی صنف سخن ہے جس میں محروم نے طبع آزمائی نہیں کی۔ نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، مثنوی اور غزل ان سب میں ان کا کمال نمایاں ہے۔ نظم کے علاوہ رباعی اور مرثیہ میں بھی انھوں نے انفرادی مقام حاصل کر لیا۔ یہ بات کھٹکتی تھی کہ ایسے باکمال شاعر کے بارے میں اردو میں ایک بھی مستند کتاب موجود نہیں تھی۔ جگن ناتھ آزاد نے صرف فرزندانہ سعادت مندی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ ایک بڑے فرض کی تکمیل کی۔ یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو پچھلے تیس سال میں محروم کی شاعری کے بارے میں لکھے گئے۔ مضامین محروم کی شاعری اور شخصیت کے تقریباً تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ لیکن کسی نے ان کی قدر متعین کرنے کی کوشش نہیں کی۔ موضوعات کے تنوع میں بیسویں صدی کا کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ صرف نظیر ایک استثنائی مثال ہیں۔ لیکن جمالیاتی اظہار میں محروم بہت آگے نظر آتے ہیں۔ محروم ایک وطنی شاعر ہیں اور یہ ان کی عظمت کا ایک سبب ہے۔ لیکن انھیں صرف وطنی شاعر کہنا انھیں محدود کر دینا ہے۔ یہ کتاب ایک آغاز ہے اور ایک اہم فرض کی تکمیل کی ایک ابتدائی منزل۔ اور ادب کے طالب علموں کے لیے یہ ایک نادر تحفہ ہے اور اس لحاظ سے جگن ناتھ آزاد

ہم سب کے شکریے کے مستحق۔

(آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے شکریے کے ساتھ)

ہنس راج رہبر

محرومؔ صاحب اور بچوں کی شاعری

محروم صاحب نے مسلسل محنت، خلوص اور نیکی سے اردو شاعری میں جو بلند درجہ حاصل کر لیا ہے وہ صرف انھیں کا حصہ ہے چند سال پہلے اردو کے ایک مشہور ادبی جریدے نے انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے. بجا طور پر لکھا تھا.

"تلوک چند محروم کی بہت سی ایسی نظمیں بھی ہیں جو آج سے بیس پچیس سال بیشتر پڑھی گئی تھیں مگر آج بھی جب یہ ہمارے سامنے آتی ہیں تو وہی ذوق و شوق زندہ ہو جاتا ہے جو پہلی بار انھیں نصاب کی کتابوں میں دیکھ کر ہمارے دلوں میں پیدا ہوا تھا۔ وقت کے سمندر میں کئی ادبی تحریکوں کے طوفان آئے اور ختم ہو گئے۔ مگر ہمارے یہ بزرگ شاعر چپ چاپ روشنی کا مینار بنے کھڑے ہیں اور برابر روشنی دیتے جا رہے ہیں۔"

(ادبِ لطیف لاہور)

ان کی نظمیں "یہ کس کے جلوے ہیں سارے" اور "پرانا کرتہ" میں نے ساتویں آٹھویں جماعت میں پڑھی تھیں. اس وقت یہ نظمیں کلاس کے سبھی لڑکوں کو زبانی یاد تھیں. لطف کی بات یہ ہے کہ انھیں یاد کرنے میں ہمیں کوئی خاص کوشش نہیں کرنی پڑی تھی۔ دو چار بار پڑھنے سے آپ ہی آپ از بر ہو گئی تھیں. اب بھی جب کہیں تنہائی کے لمحوں میں طالب علمی کے زمانہ کی یاد آتی ہے تو ان نظموں کے بعض مصرعے ذہن میں گونج اٹھتے ہیں اور محروم صاحب کا پٹھانی چہرہ اور باوقار شخصیت نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ یہ محروم صاحب سے میرا پہلا تعارف تھا جس کا نقش دل پر بہت گہرا ہے۔

محروم صاحب نے اپنی ساری زندگی دیس کے بچوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح میں بسر کی ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں انھوں نے بڑوں کی اصلاح و تربیت کے لیے شاعری کی ہے وہاں بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مدرس کے طویل تجربہ کے باعث محروم صاحب بچوں کی نفسیات کو خوب سمجھتے ہیں اور وہ اس راز سے بخوبی واقف ہیں کہ بچوں کے لیے کون سے موضوع مفید ہیں اور ان کی بھلائی کس بات میں مضمر ہے۔

آج جو بچے ہیں کل انھیں دیس کے رہنما اور اچھے شہری بننا ہے. اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کی روح شروع

ہی سے دیس بھگتی کے جذبہ سے سرشار ہو۔ یہ بھی ممکن ہے جب ان کے ذہن پر دیس کی عظمت اور خوب صورتی کے لیے گہرا نقش ہو جائے۔ چنانچہ محروم صاحب نے عام فہم اور سیدھے سادے الفاظ میں دیس کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بچپن جیسی پیاری اور معصوم ہے۔ "ہمارا دیس" نظم کے یہ دو بند ملاحظہ فرمایئے۔

اونچے اونچے پربت اس کے لہراتے ہیں جن پر جنگل
مور پپیہے اور کوئل سے جنگل میں ہوتا ہے منگل

کیسا خوب نظارا ہے
بھارت دیس ہمارا ہے

اس کی خاک سے ہو کر پیدا ہم نے سدھ بدھ پائی ہے
کیوں نہ کریں گے اس کی سیوا اپنی اس میں بھلائی ہے

اس کے سوا کیا چارہ ہے
بھارت دیس ہمارا ہے

دوسری چیز محنت ہے جو انسان کو واقعی انسان بنا دیتی ہے۔ جس کی بدولت قومیں ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں اور جو انفرادی طور پر ہر شخص کو شریف بناتی ہے اس کے اندر نہاں خوبیوں کو ابھارتی اور سنوارتی ہے، بچے اگر شروع زندگی ہی سے محنت کے قابل ہو جائیں تو زندگی میں ان کے لیے کامیابی کے راستے کھل جاتے ہیں۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے محروم صاحب نے "محنت" کے عنوان سے بچوں کے لیے کتنی پیاری نظم لکھی ہے۔ بڑے بھی پڑھیں تو طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے اور دل میں کام کرنے کی امنگ اٹھتی ہے۔ ابتدا کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

تم کو خیال محنت گر صبح و شام ہوگا کہتے ہیں بخت جس کو آکر غلام ہوگا
جو دل کا مدعا ہے حاصل تمام ہوگا محنت سے کام ہوگا، محنت سے کام ہوگا

محنت کرو عزیزو! محنت سے نام ہوگا

محنت بغیر جینا ممکن نہیں جہاں میں محنت سے وہ بنا ہے رہتے ہیں جس مکاں میں
محنت کا پھل ہیں پودے جتنے ہیں گلستاں میں محنت لگی ہوئی ہے بلبل کے آشیاں میں

محنت کرو عزیزو! محنت سے نام ہوگا

اچھے شہری بننے اور زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اچھی تعلیم نہایت ضروری ہے چھوٹے بچے پڑھائی

ہیں دل تبھی لگائیں گے جب تعلیم کی خوبیاں ان کے ذہن پر نقش ہو جائیں۔ جب وہ کتاب سے جو تمام علموں کا خزینہ ہے پیار کرنا سیکھ لیں اور اسے اپنا بہترین رفیق سمجھیں۔ محروم صاحب نے بچوں کو کتاب پڑھانے ہی میں عمر صرف کی ہے اس لیے کتاب کی خوبیاں ان سے بہتر اور کون سمجھے گا۔ چنانچہ انھوں نے "کتاب" پر ایک طویل نظم لکھی ہے۔ نظم کیا ہے کتاب کو واقعی ہنستا بولتا اور چہچہاتا ہوا رفیق بنادیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

لڑکو! برے بھلے کی جنھیں کچھ تمیز ہے — کیا چیز انھیں کتاب سے بڑھ کر عزیز ہے
بہتر کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے — اچھا کوئی شفیق نہیں ہے کتاب سے
ساتھی یہ وہ نہیں کہ کبھی ساتھ چھوڑ دے — کیا دوست ہے کہ ہاتھ میں جو ہاتھ چھوڑ دے
گرچہ نہیں ہے اس کے دہن میں زباں کوئی — اس سا نہیں زبان میں شیریں بیاں کوئی
روئے زمیں کے سارے مظاہر اسی میں ہیں — باغ جہاں کے سارے مناظر اسی میں ہیں
دیکھا ہے سب کتاب میں جو کچھ جہاں میں ہے — موجود ہے زمین پہ یا آسماں میں ہے

اور پھر لکھا ہے۔

کھولو اسے کہ اس میں خزانہ ہے علم کا — اٹھو! پڑھو پڑھو کہ زمانہ ہے علم کا

اس بات سے بھلا کون انکار کرے گا کہ آج علم نے بہت ترقی کرلی ہے اور اس کی ضرورت بھی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے جو فرد یا قوم علم کے حصول میں پچھڑ جاتی ہے۔ اس کے لیے ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ سائنس کے اس زمانہ میں علم حاصل کرنے کے لیے کتاب کے علاوہ اور بھی بہت سے ذرائع ہیں جیسے سیر و تفریح قدرت کا مشاہدہ، ریڈیو، سنیما اور نمائش وغیرہ۔ محروم صاحب نے ان باتوں کی طرف بھی بچوں کی توجہ مبذول کی ہے "نمائشی گاڑی" میں انھوں نے نئی تہذیب کے معماروں اور ہنروروں کی جی کھول کر داد دی ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہوں۔

سجی سجائی کمالات سے بھری گاڑی — ہنروروں نے یہ تیار خوب کی گاڑی
نئے زمانے کا مظہر ہے یہ نئی گاڑی — زبانِ علم و خرد جانِ آگہی گاڑی

چلو! چلو! کہ وہ آئی نمائشی گاڑی

چمک دمک میں نہیں ماہ و مشتری سے کم — نہیں ہے حسن کے پروانہ میں پری سے کم
ادا نہیں کوئی اس کی فسوں گری سے کم — یہ سحر ہے جو نہیں سحر سامری سے کم

چلو! چلو! کہ وہ آئی نمائشی گاڑی

نمونے صنعت و حرفت کے اس میں دیکھو گے   شگوفے نخلِ زراعت کے اس میں دیکھو گے
طریقے جسم کی صحت کے اس میں دیکھو گے   خزانے علم کی دولت کے اس میں دیکھو گے
چلو! چلو! کہ وہ آئی نمائشی گاڑی

اس نظم کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر اسے فارسی ترکیبوں نے کسی حد تک بوجھل بنا دیا ہے۔ زبان ثقیل ہو تو بچے اور لڑکے اور بعض اوقات بالغ بھی معنوی خوبیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بہر کیف محروم صاحب کا یہ عام رنگ نہیں ہے۔ بچوں کے لیے انھوں نے حتی الوسع سہل اور سلیس زبان استعمال کی ہے۔ اس نظم میں مشکل زبان کا استعمال شاید موضوع کا تقاضا تھا۔

علم کے اس زمانہ میں ہوشیاری اور چالاکی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اگر آدمی فطرتاً نیک نہ ہو تو سارا علم، ساری قابلیت اور ساری خوبیاں شعبدہ بازی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ محروم صاحب چونکہ خود فطرتاً نیک واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے نیکی کی تعلیم دینا نہایت ضروری خیال کرتے ہیں "نیک بنو" ہے تو انگریزی نظم کا ترجمہ لیکن محروم صاحب نے اسے بڑی خوبی سے اپنایا ہے۔ دیکھیے کیسی صاف زبان میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

چھوٹے بچو! نیک بنو تم   نیکی اچھی ہوشیاری سے

"نیکی اچھی ہوشیاری سے" ایک ایسا منہ بولتا مصرع ہے، جس میں محاورہ بن جانے کی ہر ایک خوبی اور صلاحیت موجود ہے محروم کی نظموں میں ایسے مصرعے اکثر ملتے ہیں۔

نیکی کو محروم ہر چیز پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کا اپنا طبع زاد قطعہ ملاحظہ ہو۔

فکر کیا گر لکھنے پڑھنے میں نہیں ہوشیار تم   ایک دن محنت سے پوری یہ کمی ہو جائے گی
نیک اطواری و نیکی سے اگر رغبت نہیں!   یہ کمی پوری نہ ہو گی اور مصیبت لائے گی

"جیسی کرنی ویسی بھرنی" کے عنوان سے محروم صاحب نے ایک طویل کہانی نظم کی ہے۔ اس کا مقصد بھی بچوں کو نیکی اور شرافت کی تلقین کرنا ہے۔ کہانیوں سے یہ بات ان کی سمجھ میں بخوبی آجاتی ہے

دراصل ہمارے دیس میں بچوں کے اچھے ادب کی بہت کمی ہے۔ ہوتا یہ رہا ہے کہ ہم اپنی اولاد کو بچپن ہی میں اپنشد پڑھاکر اور وید منتر رٹا کر رِشی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن شروع ہی سے ادق مضمون پڑھانے سے ان کی نشو و نما رک جاتی ہیں۔ بچوں کا ادب عام طور پر بالغوں سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے۔ وہ آسان اور سلیس زبان میں لکھی ہوئی کہانیوں اور نظموں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کہانیوں اور نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ

ہوتی ہے کہ وہ بچوں اور لڑکوں کو بنا کسی وقت کے ایک یا دو بار پڑھنے سے زبانی یاد ہو جاتی ہیں۔ وہ انھیں اپنے دوستوں، بہنوں اور بھائیوں کو سناتے ہیں۔ اور تنہائی اور کھیل کے وقت گنگناتے اور دہراتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی گہرے معنی اور فلسفہ پوشیدہ ہے تو بڑے ہو کر سمجھ میں آجاتا ہے اور ان کے علم کا حصہ بن جاتا ہے جس طرح محروم صاحب کی مذکورہ بالا نظموں "یہ کس کے جلوے ہیں سارے" اور "پرانا کرتہ" میں ویدانت کا جو فلسفہ جاری وساری ہے اسے ہم نے طالب علمی کے زمانے میں بالکل نہیں سمجھا تھا، لیکن اب اسے بخوبی سمجھتے ہیں اور اس سے مخالفت یا موافقت کا اظہار کر سکتے ہیں۔

انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بچوں کے ادب پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ محروم صاحب نے نہ صرف انگریزی کی اچھی نظموں کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا بلکہ بچوں کے لیے خود بھی اچھی اور طبع زاد نظمیں لکھیں۔ بلند پایہ شاعر ہونے کے باوجود محروم صاحب کا اس ضرورت کی طرف متوجہ ہونا ہی ان کی نیک نفسی اور شرافت کی دلیل ہے۔

غزل

زوالِ حسن کو حسنِ نگار کیا جانے — خزاں قدم بہ قدم ہے، بہار کیا جانے

لکھا ہے اس کے مقدر میں اضطرابِ دوام — قرار کیا ہے دلِ بے قرار کیا جانے

سمجھ رہے ہیں جسے سب گناہگار یہاں — اسی پہ ہو کرم کردگار کیا جانے

کئے پہ اپنے ہو خود منفعل بشر آخر — یہی ہو جبر، یہی اختیار کیا جانے

کہاں یہ شامِ غریباں، کہاں وہ صبحِ وطن — یہ فرق گردشِ لیل و نہار کیا جانے

جو پاؤں توڑ کے بیٹھے سرِ رہِ منزل
وہ کب اٹھیں گے، کوئی شہسوار کیا جانے

محروم

سعید ہاشمی دہلوی

محروم اور شاعری کا ایک اہم پہلو

شاعری احساس وجذبات کی مصوری ہے۔ اس میں پیرایۂ جمالیات نظم کرنا یقیناً تحسین آفریں ہے اور بلاشک وشبہ شاعری میں عشقیہ یا جمالیاتی مضامین کا وجود ہماری شاعری کا ایک عمدہ عنصر ہے اس سے کسی کو انکار نہیں کہ شاعری کا وجود جمالیاتی ساخت اور حسین تصورات پر مبنی ہے۔ لیکن شاعری میں ایک شاعر کے ذاتی احساسات سے بڑھ کر تقاضوں کی ترجمانی بھی ہو سکتی ہے۔ اردو شاعری میں متقدمین شعراء نے جو مضامین وقف کیے وہ صرف ایک آرٹ کی حیثیت رکھتے ہیں اور شعرائے قدیم کے کلام سے بنی نوع انسان کی اصلاح کے لیے یا زندگی کی تعمیر کے لیے ہمیں کوئی جز حاصل نہیں ہوتا، لیکن یہ ان کو دوش دینے کی بات نہیں کیونکہ اس وقت کی معاشرت اور آج کی معاشرت میں بالکل تضاد ہے۔ قدیم شعرا نے تعمیری ادب یا تعمیری مضامین کی طلب کیوں محسوس نہ کی، اس کے لیے برسرِ پیکار ہونا مجھے مقصود نہیں، لیکن کیوں کہ اس وقت کے تقاضے، ضروریات محدود تھیں اور وہ ادب صرف ایک ادب ہی تھا شاعری قدیم نظریے کے تحت عیش وعشرت کی آماجگاہ تھی اور اس میں گل وبلبل، جام وسبو، رنگ وچمن اور رند وساقی کے مضامین ہوتے تھے۔ جن کو شعراء الف لیلوی انداز سے پُرشوکت الفاظ میں گوندھ کر شعروں کی مالائیں بنایا کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب کہ شاعری صرف پتھر کو کاٹ کر جام بلوریں بنا دینے کا نام تھا۔ اردو شاعری اب ضعیف العمر ہو چکی ہے۔ اس کے ہر انداز، ہر پہلو، ہر روش میں ایک نیا رنگ ہے۔ ابتدا سے آج تک اس کا رختِ سفر گامزن رہا، یہ بہت سے نشیب وفراز سے گزری ہے۔ کبھی اسے جام وسبو سے دوچار ہونا پڑا کبھی بادِ نسیم کی سبک رفتاری نے اس کو مدہوش کیا ہے۔ کبھی ساقی نے الف لیلوی انداز سے اسے مسکرا کے دیکھا۔ کبھی رنگِ بہار سے اسے رشک آیا تو کبھی ناصح کی ناخوشگوار باتوں نے اس کا دل دکھایا۔

اردو شاعری میں جہاں رعنائیاں اور شادمانیاں ہیں وہاں یہ حسرت وغم، مایوسی، افسردگی کے ماحول سے بھی آشنا ہے۔ الغرض اردو شاعری ہر پہلو میں منعم ہے۔

شاعری کو آج تک مختلف شعرا نے ایک نئے پہلو سے دیکھا ہے لیکن عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ اکثر شعرا اپنے

احساسات اور جذبات کو شعروں کے روپ دیتے رہے ہیں۔ ایک فلاسفر کا کہنا ہے کہ ہر شخص میں مادۂ احساس کمتری (INFERIORITY COMPLEX) ہوتا ہے خواہ کسی بھی پہلو کے تحت ہو، اور یقیناً صحیح کہا ہے، کیوں کہ اردو شعرا میں اس جذبہ کے تحت یا اسے اردو شاعری کی بدبختی سمجھیے ایک ایسا رواج (بلکہ میں تو اسے فیشن کہوں گا) پڑ گیا ہے کہ ہر ایک شاعر ایک ہی قسم کے مضمون نظم کرتا ہے۔ آج کل موجودہ شاعروں میں ساحر اگر تاج یا طوالف پر لکھتا ہے تو ہر ترقی پسند کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی نظمیں لکھے اور اگر نہ لکھے گا تو وہ ترقی پسند کیسے کہلائے گا۔ اگر فیض کسی خاص مضمون کو نظم کرتا ہے تو فوراً بعد ہی ویسے مضامین دوسرے شعراء کی نگارشات میں پائے جانے لگتے ہیں۔ میں آج کے شاعر کو ہی دوش نہیں دے رہا ہوں بلکہ متقدمین شعرا میں بھی یہ نظریہ مقبول رہا کہ شاعری ایک محدود میدان ہے اور اس راہ سے یا اس میدان سے تجاوز کرنا ادب کی ذات کو گھن لگانا ہے۔

یہ نظریہ بالکل بے سود ہے اور جنھوں نے اس نظریہ کی خلاف ورزی کی ہے وہ باغی کہلائے ہیں، لیکن چند اہل شعور نے ان باغیانہ کارکردگیوں کو صحت مند زیست کا جامہ پہنایا اور آج دنیا کو ان سے انسیت ہے۔ یہ وہ دور آیا جب کہ انسان کو زندگی کی تعمیر کے لیے اٹھنا پڑا اور حیاتِ نو کی تعمیر کے اسباب کی تلاش ہوئی۔ حالی سب سے پہلا باغی تھا جو میدانِ عمل میں آیا۔ اس نے قدیم روش اور شعری تمثیلات و خیالات میں نمایاں اجتہاد پیدا کیا اور ادب برائے زندگی اور ادب میں تعمیری مضامین شامل کیے۔

مختصراً یہ کہ جدید شاعری بھی رخِ تحریر پر آ ہی گئی اور درحقیقت یہی اردو شاعری کے ایام عروسی تھے۔ جدید شعراء نے اصلاح کے ہر پہلو کو سراہا لیکن اردو شاعری میں ایک بڑا فقدان جو پہلے تھا وہ یہ کہ بچوں کی اصلاح اور صحت مند ترجمانی کے لیے شاعری میں کوئی جزء نہ تھا۔ شعراء نے اس پہلو (ASPECT) کو نہ جانے کیوں یا شاید اس کو دقیانوسی ادب سمجھ کر اس کی طرف نظر نہ کی۔ اردو شاعری کا یہ میدان دراصل جدید شاعری کے وجود کے بعد ہی پیدا ہوا۔ اگرچہ یہ میدان دیکھنے میں بہت بے رنگ اور خشک معلوم ہوتا ہے لیکن اگر تجربہ کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کی غیر موجودگی ادب کی صحت مند زیست میں ایک کمی کے مانند تھی۔

اردو میں اس قسم کی شاعری کا رواج حالی، اقبال، اکبر، اسمٰعیل میرٹھی اور سورج نرائن کی سخت کاوشوں کا سبب ہے، ان شعراء نے بچوں کی صحیح طور پر تربیت اور ترجمانی کے لیے شعری میدان کی ساخت کی اور جس طرح انگریزی شاعری میں (NURSERY RHYMES) ہوتی ہیں اس طرز پر بلکہ اس سے بھی کہیں وسیع میدان میں بچوں کے لیے نظمیں لکھی جانے لگیں۔ کچھ شعرا کا نظریہ اس شاعری کے بارے میں یہ رہا کہ یہ شاعری نہیں بلکہ تک بندی ہے۔

لیکن ان شعرا نے یہ ثابت کردکھایا کہ شاعری ایک حیاتِ نو کی تعمیر کا ذریعہ ہے تو اس کو نئی نسل کی صحیح تربیت کا ذریعہ بھی بنانا پڑے گا۔

اب ہمارے ادب کی وادیاں بہت وسیع اور عمیق ہو گئی ہیں، اور اس طور پر ہماری شاعری کی بھی ابتدا غزل تھی اور اب ہمیں رباعی، مخمس، مسدس، نظم، خیالی شاعری (UTOPIAN) انقلابی شاعری، آزاد نظم، منظوم ڈرامہ، قصیدہ، ہجو، مثنوی اور مرثیہ اردو شاعری میں بہ آسانی دستیاب ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد زبانوں اور ان کے ادبی اصناف سے بھی ہماری شاعری نے بہت کچھ مستعار لیا ہے۔ مثلاً بالکل جدید اجزا جو ابھی اردو شاعری میں شامل ہوئے ہیں۔ سانیٹ، پیروڈی اور بیلیڈ BALLEDS وغیرہ۔ یعنی شاعری کا دامن بہت وسیع ہو چکا ہے۔ جہاں یہ سب اجزا ہیں وہاں بچوں کی شاعری بھی یقیناً ہونی چاہیے۔

الغرض حالی، اکبر، اقبال اور کافی اہم اضافے جو اس شاعری میں ہوئے وہ اسمٰعیل میرٹھی اور سورج نرائن کے تھے ان دونوں شعرا نے تو اپنے آپ کو اس میدان کے لیے وقف کر دیا۔ ایک قابل قدر اضافہ جو اس میدان سے ہوا وہ یہ کہ اردو شاعری میں پہلے جو مضامین تھے وہ خیالات پر مبنی تھے اور سوائے حسن وعشق یا حسن پرستی کے اور کچھ نہ تھا۔ اگر اس قسم کی شاعری بچوں کو پیش کی جاتی تو وہ ابتدا سے ہی محض حسن پرستی یا حسین وجمیل خیالات کے علاوہ اور کچھ اخذ نہ کرتے ان کے لیے یہ شاعری تخریبی پہلوؤں سے لبریز ہوتی اور اس utopian خیالی شاعری کا ماحصل آرام طلبی اور غلط فہمیوں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ لیکن خوبی قسمت سے بچوں کی شاعری کی ارتقا ہوئی اور نئی پود کو خیالی شاعری یا جمالیات پرستی سے محفوظ کر دیا گیا۔ ایک دوسرا فائدہ اس سے یہ بھی ہے کہ بچوں کو اصلاح، تعمیر، تہذیب وتمدن کی سوجھ بوجھ کے ساتھ ہی ساتھ ان کو شاعری اور اس کی قیود و بند سے بھی واقفیت ہوگئی اور اس طرح شعر وادب کی ساخت کا شعور بچوں کے ذہن میں پیدا ہو گیا۔

اس میدان کی جاذبیت کو بڑھانے کے لیے شعرا نے کچھ اہم راستے اختیار کیے جن کی وجہ سے اس کو مؤثر بنادیا گیا۔ یہ صرف بچوں کی نفسیات کے تحت کیا گیا۔

مثلاً اقبال نے وطن پرستی کے مقصد سے ترانے اور نظمیں لکھیں اور ان کو اس طرز پر نظم کیا کہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ بچے ایسی نظموں کو شیریں ترنم میں ڈھال کر بارہا دہراتے ہیں۔ ابتدا میں ان کو گانا سمجھ کر اس کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ ادراکیت مقصد نظم کو پا لیتی ہے۔

ان شعرا کے بعد بیش بہا اضافہ جو اس میدان میں کیا وہ محروم کا تھا۔ محروم نے بچوں کی شاعری کو ایک عظیم پہلو

بنا دیا۔ اگرچہ محروم صرف بچوں کی شاعری کے لیے وقف نہ تھے، پھر بھی انھوں نے اس میدان کو لامتناہی حکمت عملیوں سے ایک قومی اور ٹھوس پہلو بنا دیا۔ انھوں نے اقبال کی طرح اشعار میں پُر شوکت الفاظ، نفیس اور مانوس طرز بیان پیدا کیا جس سے اس شاعری کی خوب صورتی دوبالا ہوئی۔ بلکہ کہیں کہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ محروم کی ایسی نظمیں نہ صرف بچوں کے ہی لیے ہیں بلکہ بڑے اور باشعور لوگوں کے لیے بھی قابلِ قدر ہیں۔ انھوں نے بچوں کی نظموں میں شعریت کو بڑی کامیابی سے قائم رکھا۔

یہ محروم کی شخصیت کے لیے ایک بہت بڑا معرکہ ہے کہ انھوں نے اس شاعری کو تک بندی کہلانے سے محفوظ کر دیا ان کی نظموں میں جو بچوں کے لیے لکھی ہیں اصنافِ سخن کی مکمل جمال سامانی موجود ہے اور یہ نظمیں شعریت کی ان حدود سے کبھی گرنے نہ پائیں جو شاعری کی اصل خوب صورتی اور جمالیات میں ملحوظ ہے۔ اس خیال کے تحت کہ الفاظ کی بندشیں عمدہ ہوں محروم نے صرف اس حد تک ہی قدم اٹھایا ہے۔ جہاں تک کہ بچوں کی ذہنی قوت کی اجازت تھی اور انھوں نے ایسی نظموں کو تعقیدِ لفظی سے بھی محفوظ رکھا تاکہ بچوں کی ادراکیت پر بار گراں نہ ہو۔

بچوں کی شاعری میں محروم کا طرز بیان ایسا رہا کہ اس میں شاعری کی لاتعداد خوبیاں مثلاً تشبیہات اور استعارات تک پائے جاتے ہیں اور وہی میدان جس کو لوگ خشک اور بے رنگ سمجھتے تھے محروم نے ایسا مرصع کیا کہ شاید و باید۔

بچوں کے مضامین نظم کرنے میں بڑی دور اندیشی اور احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ کیونکہ اگر بچوں کی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ بچوں کی نفسیات کس طرح اور کس قسم کے مضامین قبول کر سکتی ہے، اور اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ انھیں کس طرح اور کن الفاظ میں پرویا جائے اور ان کا طرز بیان کیا ہو کہ بچوں کی رغبت اور لگن اُن پر مرتکز ہو سکے۔

ان تمام باتوں کا خیال محروم نے بڑی کامرانی کے ساتھ رکھا اور متعدد نظمیں متعدد پہلوؤں پر نظم کیں۔ محروم نے تعمیر و اصلاح کا طرز بیان اکثر بلاواسطہ (DIRECT) رکھا تاکہ بچوں کی نفسیات انھیں قبول کر سکے مثلاً ان کو قادرِ مطلق کی مثال مقصود ہے تو انھوں نے قدرتی مناظر اور کرشمہ سازیوں کی تعریف کر کے پس پردہ خدا کی تعریف کی ہے۔ اگر انھوں نے حیات جاوداں کے زریں اصولوں پر اشارہ کیا ہے تو وہ اس طرح کہ زندگی کے تاریک پہلوؤں اور انسان کے تاریک ارادوں کی منظر آرائی کی اور اس کے مضر نتائج بھی بتائے۔ اس طرزِ بیان سے محروم نے بچوں کے دلوں میں نہ صرف اپنے مقصد کو بٹھایا۔ بلکہ اپنی ذات کے لیے بھی بہت جگہ پیدا کی اور اس طرح ادب سے بھی مانوس کرا دیا۔ محروم نے بچوں کے لیے جس قدر عنوانات پر نظمیں لکھیں ان کو بہت سادہ زبان میں کہا۔ اور اس کے ساتھ

ہی ساتھ اس کا ہر جگہ خیال رکھا کہ شاعری کی خوب صورتی بھی رفع نہ ہو۔ 'بہارِ طفلی' محروم کا بچوں کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں جس قدر منظومات ہیں ان سب میں ایک جاذبیت اور خوب صورتی ہے جس کی وجہ سے بہتوں کو اور خاص کر مجھے محروم سے لامتناہی عقیدت ہے۔

یہاں میں محروم کی چند مشہور نظموں کے اشعار پیش کروں گا جن سے ان کے فن اور تخلیق کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

جو لوگ بچوں کی شاعری کو خشک اور تک بندی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کے لیے ایک زندہ ثبوت یہاں موجود ہے۔ یہاں ایک نظم ہے جس میں محروم نے کام کرنے کی تبلیغ کی ہے۔ خشک عنوان کے باوجود اس نظم میں شعری رعنائیاں موجود ہیں اور طرزِ بیان بھی اتنا موثر ہے کہ اثر مقصد کے مطابق ہو۔

فارغ جہاں میں کوئی نہیں کام کاج سے — مجبور ہے ہر ایک جہاں کے رواج سے
قدرت بنا رہی ہے یہ اپنے نظام سے — ہے کارگاہِ دھر کی تکمیل کام سے

اگلے اشعار میں بھی کتنا دلآویز طرزِ بیان ہے۔

خورشید و ماہ و انجمِ تاباں ہیں کام میں — مصروف ہیں کسی نہ کسی انصرام میں
ہیں ابر و برق و باد بھی مامور کام پر — شاہد ہیں ان کی کارگزاری کے بحر و بر

آگے چل کر یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ کام کا مقصد کس سے ہے تاکہ مقصدِ بیان صاف طور پر واضح ہو جائے۔

پابندیوں تو سب ہیں زمانے میں کام کے — اچھے وہی ہیں کام جو ہیں فیضِ عام کے

ایک نظم میں مقصدِ بیان علم و ادب کا شوق پیدا کرتا ہے۔ اور اس کے لیے ایک انوکھا طرز لیا ہے۔ کتاب پر مضمون نظم کیا ہے اور اس کی تعریف کر کے اصل میں علم کی قدر و قیمت اور اہمیت کو بچوں کے ذہن نشیں کرایا ہے۔ کہتے ہیں۔

بہتر کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے — اچھا کوئی شفیق نہیں ہے کتاب سے
دنیا کے دوستوں کی محبت سدا نہیں — اس سے مگر جدائی کا کھٹکا ذرا نہیں

اوپر کے بند میں دوسرا شعر ذو معنوی ہے یعنی ایک تو کتاب (مقصدِ علم) کی تعریف اور اس سے رغبت پیدا کرنا دوسرے کتاب کو دوست کے لفظ سے پکار کر یہ بتایا ہے کہ دوست کے معنی کیوں کہ ساتھی کے ہیں۔ اس لیے یہ ایسا رفیق ہے (مقصد علم سے ہے)، جو کبھی دامن نہ بچائے۔

ساتھی یہ وہ نہیں جو کبھی ساتھ چھوڑ دے — کیا دوست ہے کہ ہاتھ میں جو ہاتھ چھوڑ دے

اور یہاں طرزِ بیان اور اصلاح کے تلخ؛ تلخ صرف اس لیے کہتا ہوں کہ شاعری میں ناصح کی سنجیدگی شاعروں کو تلخ گزرتی ہے۔ یہ صرف شعری رسم ہے اور یہاں بطور طنز یہ لفظ استعمال کیا ہے، پہلو کو اتنے دلآویز روپ میں ڈھالا ہے کہ اچانک محروم کی اس میدان پر قدرت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

گرچہ نہیں ہے اس کے دہن میں زباں کوئی — اس سا نہیں جہاں میں شیریں بیاں کوئی
روئے زمیں کے سارے مظاہر اسی میں ہیں — باغ جہاں کے سارے مناظر اسی میں ہیں

اور یہاں بھی بالکل نیا ڈھنگ ہے۔

سوکھے ہوئے درخت ہیں یا میوہ دار ہیں — پھولوں سے ہیں سجے ہوئے یا خاردار ہیں
سب کچھ کتاب ہم کو دکھاتی ہے ہو بہو — ان سب کا حال ہم کو سناتی ہے مو بہ مو

اور یہاں کتنا حسین انداز بیان ہے اور خوبی یہ ہے کہ حسنِ تعلیل بھی پیدا کیا ہے۔

دیکھو تو ہے اسی میں چمن کی بہار بھی — شمشاد بھی ہیں، سرو بھی، لالہ زار بھی
بوٹے گلاب کے بھی ہیں اور کیاریاں بھی ہیں — صحنِ چمن میں پھولوں کی گل کاریاں بھی ہیں

اور آخر میں اپنا اصل مقصد اختیار کیا ہے۔

کھولو اسے کہ اس میں خزانہ ہے علم کا — اٹھو! پڑھو پڑھو کہ زمانہ ہے علم کا

جذبۂ وطن پرستی بچوں کے ذہن میں پیدا کرنے کے لیے بھی مضمون میں وطن کی تعریف کی اور اس طور پر نفسیاتی اثر بچوں پر اصل مقصد کی شکل پیدا کرتا ہے۔ یہاں ان کی نظم "ہمارا دیس" کے چند اشعار ہیں۔ طرزِ بیان کتنا سادہ اور عام فہم ہے۔

سب سے اچھا دیس ہمارا — دنیا بھر سے نیارا ہے
پیارا دیس ہمارا بھارت — ہم کو دل سے پیارا ہے
اونچے اونچے پربت اس کے — لہراتے ہیں جن پر جنگل
مور پپیہے اور کوئل سے — جنگل میں ہوتا ہے منگل

اور آخر میں اصل مقصد کو بیان کیا ہے۔

اس کی خاک سے ہو کر پیدا — ہم نے سدھ بدھ پائی ہے
کیوں نہ کریں گے اس کی سیوا — اپنی اس میں بھلائی ہے

بلبل اردو شاعری میں بہت کچھ جانی پہچانی مخلوق ہے۔ شاعروں نے اسے بارہا اپنے شعروں میں دوہرایا ہے لیکن محروم نے یہاں بلبل پر نظم نیچرل شاعری کے تحت لکھی ہے۔

انگریزی ادب میں نیچرل شاعری کا بہت زیادہ مواد ملتا ہے۔ لیکن اردو میں صرف چند شعراء نے ہی قدرتی عناصر پر مضمون نظم کیے۔ یہاں بلبل کا ذکر ہے۔ لیکن پس پردہ قدرت کی کاریگری کو سراہا گیا ہے۔

ہوں شاخِ گل پہ اپنا میں آشیاں بناتی　　　شام و سحر گلوں کو میں گیت ہوں سناتی

گل میرے زمزموں پر جب کان ہیں لگاتے　　　سن سن کے میرا گانا پھولے نہیں سماتے

اوپر کے اشعار میں ایک نئی بات اور پیش آتی ہے، وہ یہ کہ محروم نے کتنی خوب صورتی کے ساتھ بچوں کو محاوروں سے بھی آشنا کرانے کی کوشش کی ہے، کان لگانا اور پھولے نہیں سمانا وغیرہ محاورے میں موجود ہیں۔

یہاں اگر ہم یہ کہیں کہ محروم اس میدان کا کامیاب ترین شاعر ہے، اور اس نے ہر پہلو پر دھیان دیا ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بلبل پر نظم لکھنے کا مقصد دراصل کرشمہ سازیٔ قدرت کی تعریف ہے۔ یہاں ان اشعار میں یہ مطلب بآسانی واضح ہو جاتا ہے۔

لڑکو! اگر ہو دانا بتلاؤ بھید کیا ہے؟　　　ہے کیا سبب کہ دل کش اتنی مری صدا ہے

آؤ تمھیں بتا دوں اس کا سبب عزیزو　　　تم غور کر کے سننا یہ بات سب عزیزو

وہ خالقِ دو عالم یعنی خدا ہمارا　　　ہر ایک پیاری شے سے ہے جس کا نام پیارا

جس نے زمیں بنائی جس نے جہاں بنایا　　　جس نے بنائے تارے اور آسماں بنایا

اور آخری شعر میں بڑی کامیابی سے بچوں کو قدرت اور حاکم دو جہاں کے محامد و مکارم کے لیے راغب کیا ہے۔

ہوں گیت روز و شب میں اس کی ثنا کے گاتی
باعث یہی ہے لڑکو ہوں سب کے دل کو بھاتی

اقبالؔ جدید شاعروں میں تعمیری پہلو کا سب سے زیادہ کامیاب شاعر تھا۔ اس نے اپنا نظریہ یہ ظاہر کیا تھا کہ زندگی ایک مسلسل کشمکش، جدوجہد کا نام ہے اور اگر زندگی کے لمحات میں حرکت نہ ہو تو اس کا وجود بیکار ہے اسی نظریہ کی تائید اور پیروی محروم نے بھی کی ہے۔ انھوں نے متعدد تعمیری پہلوؤں پر مضامین نظم کیے۔ ایک نظم اس

پہلو پر بعنوان "محنت" بہت مشہور ہے۔ اس کو انھوں نے کتنے باکمال طریقہ پر نظم کیا ہے یہ صرف اس کے مطالعہ سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔

تم کو خیالِ محنت گر صبح و شام ہو گا کہتے ہیں بخت جس کو آکر غلام ہو گا
جو دل کا مدعا ہے حاصل تمام ہو گا محنت سے کام ہو گا محنت سے نام ہو گا
محنت کرو عزیزو! محنت سے نام ہوگا

محنت بغیر جینا ممکن نہیں جہاں میں محنت سے وہ بنا ہے رہتے ہو جس مکاں میں
محنت کا پھل ہیں پودے جتنے ہیں گلستاں میں محنت لگی ہوئی ہے بلبل کے آشیاں میں

اوپر کے بند میں دو خوبیاں ایسی پیدا کی ہیں جن سے ذہن اور تخیلات کی بلندیاں جھلکتی ہیں۔ ایک تو پھل اور پودے کے الفاظ کے استعمال کی خوبی دراصل مراۃ النظیر ہے، دوسرے اپنے مقصد کی ادائیگی کا طرز بھی خوب ہے کہ بلبل کے آشیاں کی تکمیل محنت سے ہوئی۔ اور یہاں یہ ظاہر کیا کہ ایک کمزور پرند بھی محنت کرتا ہے۔ اس طرح یہ واضح کر دیا کہ محنت کی لگن ہر فرد میں ہونی چاہیے۔ واہ کیا خوب انداز ہے۔

علم نفسیات میں ایک نظریہ (LEARNING BY CODTIONING OF REWAD) ہے اور غالباً اس نظریہ کے تحت اس قسم کے اشعار محروم نے پیش کیے جن سے اس نظریہ کے ذریعہ محنت اور جدوجہد کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی ہے۔

گر چاہتے ہو عزت محنت سے وہ ملے گی درکار اگر ہے شہرت محنت سے وہ ملے گی
ہے جس کا نام دولت محنت سے وہ ملے گی کہتے ہیں جس کو قسمت محنت سے وہ ملے گی

الغرض یہ کہا ہے کہ ارض و سما کی ہر نعمت اس میں ملحوظ ہے۔ اگلے بند میں کاہل اور محنت سے مفرور انسانوں کا ذکر بھی خوب کرتے ہیں۔

کاہل جو ہیں جہاں میں ان کا مآل دیکھو افلاس اور مرض سے ہیں خستہ حال دیکھو
رہتے ہیں ہر گھڑی وہ غم سے نڈھال دیکھو جو لوگ محنتی ہیں وہ ہیں نہال دیکھو

آگے چل کر محنت کے عظیم کارناموں اور نتائج کی منظر آرائی کی ہے۔

محنت نے کارِ مشکل آسان کر دکھائے چیرے پہاڑ لاکھوں دریا کئی بہائے
پربت کی چوٹیوں پر بھی رہ گزر بنائے بیڑے سمندروں میں محنت نے ہی چلائے

محروم نے بچوں کے لیے جتنی بھی تخلیقات کیں جی چاہتا ہے ان سب کو یہاں درج کیا جائے اور ان کے ہر پہلو

اور ہر خوبیوں کو سراہا جائے۔ لیکن بات پہلے ہی کافی طول سے کہی جا چکی ہے۔ مختصراً محروم نے کوئی ایسا عنوان نہیں چھوڑا جو اس میدان کے لیے ضروری ہو اور ان کی مقبول ترین نظموں میں صفائی، دشمنی، ادب، پھول، اچھا آدمی، تندرستی برسات، اور ایک طویل منظوم کہانی جو کہ نصیحت کا پہلو لیے ہے۔ بہ عنوان "جیسی کرنی ویسی بھرنی"۔ بڑی مشہور ہیں۔

محروم نے انگریزی نظموں اور (NURSERY RHYMES) کے ترجمے بھی اردو نظموں میں پیش کیے۔ جو اپنے دائرہ میں بے مثال ہیں۔ ان مترجم تخلیقات میں انگریزی زبان کی شاہکار نظمیں شامل ہیں، جو کہ انگریزی ادب کی راگنیاں ہیں۔ مثلاً "اندھا لڑکا" جس میں زور بیان کسی حد تک سو پر نیچرل ہے۔ اس نظم کو بڑے نفیس پیرائے میں نظم کیا ہے۔ ایک دوسری نظم "نیک بنو" پند و حکمت سے لبریز ہے۔ لیکن ان سب میں ایک نظم جو بے حد مقبول ہوئی اور بلاشبہ ایک بہترین ترجمہ ہے وہ ہے "ٹکرائے جا سر اپنا" پہلا بند ملاحظہ ہو ؎

ٹکرائے جا سر اپنا ساحل کے پتھروں سے   ٹکرائے جا سر اپنا ٹکرائے جا سمندر
اے کاش میں بھی ان کو لفظوں میں ڈھال سکتا   حالت گزر رہی ہے اس وقت جو کہ دل پر

اضطرابی حالات اور تلاطم کو پیش کرنے کا ڈھنگ اور اس پر کسی انسان کی لاعلمی کا اظہار ادب کی عظیم ترین راہ پر پہنچ گیا ہے۔ یہ پوری نظم ایک پہلو سے اگر دیکھیں تو انگریزی زبان کے MISTERIOUS LITERATURE سے ماخوذ ہے۔

ایک اور بند میں MIYSTERIOUS پہلو کی پہچان بخوبی ہو سکتی ہے۔

کیا شاندار بجرے بندر کو جا رہے ہیں   دامانِ کوہ میں ہے آرام گاہ جن کی
جو ہاتھ چھپ گئے ہیں اے کاش ان کو چھو لوں   اور وہ صدا سنوں جواب ہے تہِ خموشی

اور پھر اختتام میں بند پیش کیا ہے۔

ٹکرائے جا سر اپنا ساحل کے پتھروں سے   ٹکرائے جا سر اپنا ٹکرائے جا سمندر
لیکن وہ دن جو تجھ کو تھا باعثِ مسرت   واپس نہ آئے گا وہ افسوس زندگی بھر

اور اوپر کے بند میں جا کر ادب کے طلسمات کو ختم کیا ہے۔

محروم نے تمام عمر تعلیم و تدریس سے متعلق گزاری۔ کیونکہ وہ محکمۂ تعلیم سے متعلقہ کاموں پر مامور رہے، اسی لیے انھوں نے بچوں کی شاعری میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ جس سے ہندوستانی طریقۂ تعلیم کی اصلاح ہوئی اور ادب اور شاعری کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں محروم کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔

بچوں کی شاعری کے بارے میں لکھتے لکھتے میں بہت دور آگیا ہوں۔ لیکن اب بھی بہت سے ایسے پہلو باقی ہیں جو اس مذاکرے کے دائرے سے باہر ہیں۔ یہ سب محروم کی شخصیت اور ان کی تخلیقات کا صدقہ ہے۔ بہر کیف قطع تحریر کرتا ہوں۔ کیونکہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا مسئلہ درپیش ہے۔

غزل

بار ہا حیرت کے عالم میں جہاں گم ہو گیا — اس پہ کیا حیرت جو کوئی بے نشاں گم ہو گیا

جذب ہو کر رہ گئیں دل میں ہزاروں حسرتیں — جس طرح دامن میں ہر اشکِ رواں گم ہو گیا

فکرِ جاں کیا کیجیے، جب موت سر پر آگئی — ذکرِ دل سے کیا غرض، جب بستاں گم ہو گیا

کشتیٔ امید اپنی دور ساحل سے رہی — جب چلی بادِ موافق، بادباں گم ہو گیا

کس بہارِ ناز کے جلوؤں سے ہو کر بدحواس — ڈھونڈتی پھرتی ہے بلبل، آشیاں گم ہو گیا

عشق نے سو بار پیمانِ وفا باندھا تو کیا — حسن فانی بن کے زیبِ داستاں گم ہو گیا

چشمِ حیرت بن گیا ہر حلقۂ دامِ زیست کا — طائرِ جاں ہو کے آخر پر فشاں گم ہو گیا

کیا کرے کوئی حیاتِ جاوداں کی آرزو — خضر مانندِ حیاتِ جاوداں گم ہو گیا

بے دلی میں کٹ گئی محروم ساری زندگی
کیا کہیں دل کس طرح؟ کب؟ اور کہاں گم ہو گیا

محروم

شاذ تمکنت

گنجِ معانی

تلوک چند محروم اردو شاعری کے عابدِ شب زندہ دار ہیں۔ فن کے معبد میں ان کی عبادت و ریاضت کی عمر اتنی ہو چلی ہے کہ لفظ دعا اور معانی اثر بن گئے ہیں۔ حضرت محروم نے اردو نظم کا بچپن بھی دیکھا، لڑکپن بھی اور آج اپنی آنکھوں سے ان کا شباب بھی دیکھ رہے ہیں۔ دراصل اردو نظم حضرت محروم اور ان کے رفقا کی آغوش میں پلی بڑھی اور انہی شاعروں نے جدید نظم کو گھٹنوں چلنا سکھایا اور اپنا خونِ جگر پلا کر جوان کیا۔ آج جدید اردو نظم جو اس قدر خوش گفتار اور خوش قطع ہے وہ حضرت محروم اور ان کے معاصر شاعروں کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ جدید اردو نظم کی مشاطگی میں حالی، آزاد، اکبر، اسمٰعیل میرٹھی، اقبال، چکبست، سرور جہان آبادی اور تلوک چند محروم ایسے شاعروں کا ہاتھ رہا ہے ورنہ اردو شاعری غزل کے تنگ نائے میں کھل کھیل رہی تھی اور مغلیہ تہذیب کے زوال دیدہ شعرا بوماچاٹی ہی کو فن کی معراج سمجھ بیٹھے تھے۔ اگر بروقت حالی کی آواز صورِ اسرافیل کی طرح نہ گونجتی تو شاید اردو شاعری جنسیات اور استلذاذِ نفس کی حکایت بن کر رہ جاتی۔ حالی کی آواز پر آواز دینے والے شاعروں میں حضرت محروم بھی ہیں۔ جن کی شاعری کا خمیر اصلاح پسندی اخوت حب الوطنی اور انسان دوستی سے اٹھا ہے۔

حضرت محروم کا زیرِ نظر مجموعہ "گنجِ معانی" کئی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے شاعری کی بے پناہ قوتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ موضوعات کا تنوع دیکھ کر شاعر کی ہمہ گیر صلاحیت کا اعتراف ضروری ہو جاتا ہے۔ حضرت محروم نے ذرے سے لے کر آفتاب تک کے ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ان کے ہاں حمد و معرفت بھی ہے فطرت نگاری بھی، سماوی کیفیات کا بیان بھی، پند و نصائح جیسی شے بھی، ماضی کا ماتم اور مستقبل کی نوید، غرض کہ محروم کائنات کے ذرہ ذرہ کی فصد کھولنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ ایک طرف انگریزی شاعری کے تراجم ہیں تو دوسری طرف قند پارسی کی حلاوتیں۔ جہاں پند و نصیحت کا دفتر ہے وہیں عاشقانہ کلام کی سرمستیاں بھی پورے شباب پر ہیں۔ مختصراً یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ حضرت محروم نے شاعری کے لیے اس شعر کو اپنا موضوع قرار دیا ہے۔

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

شاعری میں موضوعات کا تنوع بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کسی بھی قابلِ لحاظ شاعر کے شعری کارناموں پر نظر ڈالیے

تو سب سے پہلے ہمیں اس کے ہاں موضوعات کی افراط نظر آتی ہے ۔ کائنات کا ذرہ ذرہ دعوت طبع آزمائی دیتا ہے۔ بشرطیکہ شاعر (CALAUT BLIND) نہ ہو ۔ عام طور پر ترقی پسند شاعروں کی پوری کھیپ سے یہی شکایت ہے کہ ۳۶ء کے لکھنے والوں میں کوئی بھی ایسا شاعر نہیں ہے جسے ہم (VERSATILE) کہہ سکیں ۔ فیض اس دور کے نمائندہ شاعر سمجھے جاتے ہیں ۔ لیکن ان کا لہجہ موضوع کے ساتھ بدلتا نہیں ہے اور پھر ان کے موضوعات محدود ہیں ۔ فیض دیا سلائی پر شاندار نظم نہیں کہہ سکتے ۔ کیونکہ ان کی فکر ایک خاص نہج پر گامزن رہتی ہے ۔ (میں نے فیض کی مثال اس لیے دی کہ موجودہ دور میں اور ان کے معاصرین میں وہ آپ اپنے حریف ہیں) جوش کو بڑا شاعر بنانے میں جہاں بہت سے عوامل کارفرما ہیں وہیں ان کے موضوعات کا تنوع بھی ہے ۔ جوش خالی بوتل پر بھی نظم کہہ سکتے ہیں اور اچکن کے تھان کے زرد چکنے کاغذ پر بھی طبع آزمائی کر سکتے ہیں ۔ جو دوسرے شاعروں کے لیے شعر کا موضوع نہیں بن سکتا ۔ اس تمہید کا مقصد محض حضرت محروم کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ کرنا تھا ۔ جو کم شاعروں کے حصے میں آئی ہے ۔ چند نظموں کے عنوانات ملاحظہ ہوں ، پیمانا کرنہ ، سارس کا جوڑا ، چڑیا کی زاری ، مچھلی کی بیتابی اور کولھو کا بیل وغیرہ وغیرہ ۔ ایک آدھ عنوان کو چھوڑ کر بقیہ عنوانات بظاہر کس قدر غیر شاعرانہ ہیں ۔ لیکن حضرت محروم کی کاوش سخن نے ہر ریگ زار کو چمنستان بنا دیا ہے ۔

حضرت محروم اپنے تخلص کی نسبت سے غم پسند واقع ہوئے ہیں ۔ غم پسندی بجائے خود شاعرانہ بات ہے ۔ بشرطیکہ شاعر کو غم کی قوت کا ادراک ہو ۔ غم جذبات و احساسات کو طہارت بخشتا ہے غم فکر کو ایسی سنجیدگی عطا کرتا ہے جو طرب کے بس کا روگ نہیں ہے شیلے نے صحیح کہا تھا "OUR SWEETEST SONGS ARE THOUSE

THAT TELL OF SADDEST THOUGHT"

حضرت محروم کے غم ذاتی ہیں ۔ ان کی زندگی کا عظیم حادثہ ان کی رفیقۂ حیات کی موت ہے ۔ دوسرا غم ان کی بیٹی کی دائمی مفارقت کا ہے ۔ ان غموں نے حضرت محروم کے کلام میں ایسا چٹیلا پن بھر دیا ہے کہ ان کے لفظ زخم بن گئے ہیں ۔

"اشکِ حسرت" کے یہ بند ملاحظہ ہوں جو حضرت محروم نے اپنی شریک زندگی کی موت پر کہے ہیں ؎

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری ہے بے طرح مترشح نظر سے بیزاری

کہاں ہے آج تمہاری وطرزِ غم خواری کہ بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری

یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی ؛

چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی

ذرا تو دھیان کرو میرے سوزِ غم کی طرف | چلے ہو چھاؤں میں تاروں کی کیوں عدم کی طرف
نظر اٹھاؤ ذرا میری چشمِ نم کی طرف | بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جاں مرے قدم کی طرف

مجھے تو روکتے ہو بار بار رونے سے
رکوگے کیا نہ مرے زار زار رونے سے

حضرت محروم کی منظریہ شاعری بھی اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہے۔ مناظرِ فطرت کا بیان اردو شاعری کے لیے نئی بات نہیں ہے۔ انیس کے مراثی میں ایسے ایسے مناظر بھرے پڑے ہیں جن کی مثال دوسری زبانوں میں بھی کم ہی ملے گی۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں ایسی بھی منظریہ شاعری ہے جسے مصوری نہیں فوٹو گرافی کہنا چاہیے۔ شاعر منظر کی ترجمانی نہیں کرتا، بلکہ منظر کی روح اور اس کے پیدا ہونے والے اثرات کی مصوری کرتا ہے اور یہ کام جان جوکھوں کا ہے۔ یہ روح کی تصویر کشی ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔

حضرت محروم اس فن سے واقف ہیں کہ کس طرح شبنم کا ذکر کیا جائے کہ قاری اپنے دل میں شبنم کی طراوت بھی محسوس کرلے۔

"گنجِ معانی" میں "پند و نصائح" کے عنوان کے تحت بھی چند نظمیں درج ہیں۔ پند و نصائح اور شاعر خدا ساز بات ہے۔

حضرت محروم کے منہ سے نصیحت بھی بھلی لگتی ہے۔ ورنہ شاعر ناصح بن جائے تو "گناہ" کی حرمت اور آبرو معلوم۔

مجھے آخر میں حضرت محروم کی زبان کے بارے میں کہنا ہے، حضرت محروم پنجاب کے ایک قصبہ میانوالی کے رہنے والے ہیں۔ ان کے طرزِ گفتگو اور شعر سنانے کا انداز بھی خالص پنجابی ہے لیکن ان کی زبان پر مجھے ہمیشہ اہلِ زبان ہونے کا گمان گزرا ہے۔ حضرت محروم کے ہاں زبان کی نوک پلک کچھ اس قدر درست اور بانکی ہے کہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ لکھنؤ اور دہلی ہی زبان دانی کے مراکز نہیں رہے بلکہ میانوالی بھی زبان داں ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

"گنجِ معانی" میں چند غزلیں بھی شامل ہیں جنھیں حضرت محروم کے ایامِ شباب کی یادگار کہنا چاہیے اور یہ یادگار ولولہ انگیز بھی ہے اور حکایت آفریں بھی۔

شعر

وہ کہہ گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے
نمودِ شام سے پہلے جگر کے داغ جلے

محروم

شاذ تمکنت

تلوک چند محروم

کسی شاعر یا ادیب کو اس کی زندگی میں خراج تحسین پیش کرنا یوروپ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں، ادب کا ذوق رکھنے والے اپنا اخلاقی اور سماجی فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں لے دے کے صرف ایک برسی کی روایت ہے جس کا شور چہلم تک ہے۔ ہمارے قارئین اور نقاد اپنے حافظے کے باب میں خاصے ضعیف واقع ہوئے ہیں۔ کوئی مجنوں دیوارِ دبستاں پر لام الف لکھتا رہے لیکن انھیں تکلیفِ توجہ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ ہاں اگر کوئی ادیب یا شاعر اپنی داد ممالکِ غیر سے وصول کر سکتا ہے تب ہمارے پڑھنے والے یقیناً آہٹ لیں گے۔ شکر ہے کہ ادھر چند برسوں سے یہ رجحان صحت مند تبدیلیوں کے ساتھ پھل پھول رہا ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کی موت کا انتظار نہ کیا جائے۔ بلکہ اس کے کارناموں پر اس کی زندگی ہی میں چھان پھٹک کی جائے۔ چنانچہ اس طرف رسائل نے بھی توجہ دی ہے اور ایسے نمبر پیش کیے ہیں۔

تلوک چند محروم کے فرزند دل بند اور ملک کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد نے حضرت محروم کی شاعری اور زندگی پر مضامین کا ایک گلدستہ تیار کیا ہے جس کے ذریعے حضرت محروم کی شخصیت اور شاعری کے پورے خدوخال ابھر آتے ہیں۔ تقریباً تمام مضامین حضرت محروم کی شاعری پر لکھے گئے ہیں۔ کسی نے محروم کی رباعی کو سراہا ہے اور کسی نے ان کی قومی اور وطنی شاعری کے نکات بیان کئے ہیں۔ غرض کہ ان مضامین میں ان تمام اصنافِ سخن کا ذکر آگیا ہے جن پر حضرت محروم نے طبع آزمائی فرمائی ہے۔

میں گنج معانی پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت محروم کے کلام پر اظہار رائے کر چکا ہوں کہ حضرت محروم اس دور سے نظم نگاری کے گرویدہ رہے ہیں جب غزل کے آگے نظم کا چراغ جلانا سورج کے سامنے چراغ جلانے کے مترادف تھا آج نظم ہیئت اور مواد کے اعتبار سے شاعری کا سنگھار بن گئی ہے۔ نظم کے گیسو سنوارنے میں حضرت محروم کا کس قدر ہاتھ ہے، اس کی تفصیل 'گنج معانی' کے تبصرے میں آچکی ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت محروم بڑے دم خم کے شاعر ہیں۔ یعنی کسی شاعر کا اتنی مدت تک ادب کے اکھاڑے میں پاؤں جمائے رکھنا بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ جب تک شاعر صلاحیت کے ساتھ ساتھ علم کی دولت سے مالا مال نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ وہ نسل در نسل متاثر کرتا رہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں جگن ناتھ آزاد کا مضمون کئی لحاظ سے اہم اور قابل لحاظ ہے۔ آزاد نے محروم کی شاعری کا ضمناً ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور کردار نگاری کا عمدہ نمونہ بھی۔ آزاد نے حضرت محروم کی نجی زندگی کا جس ڈھب سے خاکہ کھینچا ہے اس کے ذریعے ہم حضرت محروم کی تصویر اپنی آنکھوں کے سامنے پاتے ہیں۔ میں نے آزاد کے مضمون سے جو تاثرات اخذ کئے ہیں انھیں اجمالاً بیان کرتا ہوں۔ پہلی بات جو حضرت محروم کے کردار کو اجاگر کرتی ہے وہ ہے ان کی باسلیقہ اور محتاط صبح و شام، جس میں کہیں بے اعتدالی نظر نہیں آتی۔ غذا سے لے کر لباس تک" سفر سے لے کر قیام تک ہر جگہ ان کے مزاج کا سنبھلا ہوا پن نمایاں رہے گا۔ دوسری اہم بات جو آزاد کے بین السطور سے نمایاں ہے وہ ہے حضرت محروم کی میانہ روی اور سیدھے سادے شریف آدمی کی سی زندگی بسر کرنے کی عادت۔ ہمارے ہاں عام طور پر شعرا اپنی شاعری کو سرٹیفکٹ کے طور پر استعمال کرتے ہیں یعنی اپنے کردار کے ہر جھول پر شاعری کی استری پھیرنا چاہتے ہیں اور اپنی فطرت کی ان کمزوریوں کو ہنر کا روپ دے کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ قوم شعرا میں یہ وبا عام ہے اگر اس گروہ میں کوئی سلامت رو بھلا آدمی نظر آجائے تو تعجب بھی ہوتا ہے اور خوشی بھی۔ حضرت محروم بھی ایک (NORMAL) آدمی ہیں۔ وہ شاعر ہو کر (ABNORMAL) نہیں بن گئے۔ یہی ان کی ذات اور شخصیت کی بڑائی ہے۔

حضرت محروم کی ذات اور شخصیت پر دوسرا اہم مضمون تاجور سامری کا ہے جو اگرچہ عقیدت ہی عقیدت ہے لیکن اس مضمون کے ذریعہ ہمیں حضرت محروم کی وضعداری اور شرافت نفس کا اندازہ ہوتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی یہ تالیف اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک خاصے کی چیز ہے، جب کہ ہمارے ادب میں اس قسم کے شخصیاتی ادب کی رسم نہیں ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے بعد دوسرے اہل قلم بھی شخصیات نگاری کی طرف توجہ دیں گے اور ہمارے ادب کی اس دلآویز صنف کو فروغ کے راستے سجھائیں گے۔

رباعی

مذہب کا عمل جہاں کہیں ہوتا ہے　　فتنہ داخل وہاں نہیں ہوتا ہے
اغراض سے بے نیاز، آلام سے پاک　　جنت وہ خطۂ زمیں ہوتا ہے

محروم

شاذ تمکنت

کاروانِ وطن

کسی اچھے شاعر کی شعری تخلیقات کا مطالعہ قاری کے لیے غور و فکر کی ہزار راہیں کھول دیتا ہے۔ شاعر کی اپنی ذات اور کائنات کا رشتہ شاعر کی شخصیت اور اس کی وسعت، شاعر کی حدِ نظر، داخلی اور خارجی دنیا کے ساتھ شاعر کا رویہ، غرض کہ اس نوع کے سیکڑوں سوالات قاری کے ذہن میں پیدا ہو کر شاعر کے حسن و قبح کا جواز بن جاتے ہیں۔

ہماری کلاسیکل شاعری عشق و محبت کی شاعری ہے۔ عشق و محبت کا موضوع وارداتِ ذاتی کی دین ہے۔ اس وارداتِ ذاتی کی حکایتِ دراز اردو کے ہزارہا اشعار میں بکھری پڑی ہے۔ یہ حکایت کچھ سچی کچھ جھوٹی ہے۔ اس حکایت کی بنیاد ذاتی تجربہ پر رکھی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بیشتر شعراء اس تجربۂ ذاتی سے بھی عمر بھر کورے رہے اور اپنی آخری سانس تک لکیر پیٹتے رہے، فن کے ذریعے ذات کو کائنات میں ضم کر دینا یا کائنات کو ذات کا عکس قرار دینا ہر شاعر کے ظرف کی بات نہیں ہے۔ کسی اچھے شاعر کی بڑائی کو جانچنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے خارجی لب و لہجہ پر بھی غور کیا جائے یہ دیکھا جائے کہ اس کی آواز میں کس قدر سر سرگم کی آہیں گونجتی ہیں۔ پند و مواعظ شاعر کا کام نہیں اس کارِ ثواب کے لیے پنڈت اور ملا قرن ہا قرن سے موجود ہیں۔ اگر کوئی شاعر اپنی ذات کو دکھ اور اپنی آرام کہانی میں چاشنی پیدا کرتا ہے تو یہ کوشش قابلِ تعریف ضرور ہے۔ لیکن ہم اسے کوئی بڑا خوشگوار حادثہ نہیں تصور کریں گے۔ بڑی بات تو یہ ہوگی کہ ہم دیکھیں کہ شاعر ان موضوعات کو جو بظاہر اس کی شخصیت کا جزو نہیں ہیں، کس طرح فن کے قالب میں ڈھالتا ہے اور اس فن پارے کا وزن کیا کچھ ہے۔ کسی بھی خارجی موضوع کو اپنی شخصیت کا اظہار بنا دینا توفیق کی بات ہے۔ خارجی موضوعات کی شاعری کسی شاعر کی صلاحیتوں کے حق میں کسوٹی سے کم نہیں ہے۔

جیسا کہ اوپر کہیں بیان کیا گیا ہے کہ ہمارا کلاسیکل شعری ورثہ تقریباً عشق و محبت کا موضوع ہی ہے۔ یہ عشق و محبت کا موضوع غزل کی صنف . . . . تک محدود رہا ہے۔ صنف نظم اگلے وقتوں میں کچھ زیادہ مقبول نہیں رہی ہے۔ مرثیے، قصیدے، ہجویات، سلام وغیرہ نظم ہی کے روپ ہیں، مگر غزلوں کے انبار کے آگے اس صنفِ سخن کی حیثیت درخورِ اعتنا نہیں ہے۔

ہمیں اپنے ورثے میں وطنیت کی شاعری تو سرے سے ملی ہی نہیں۔ قومیت کے جذبات کہیں کہیں ایک

اردو شعر میں جھلک پڑیں تو اور بات ہے ورنہ ہمارے شعر کا ماضی غزل ہے، اور غزل کے ہزار شیوۂ انداز کے آگے کچھ نہیں ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم حضرت تلوک چند محروم کی شاعرانہ ژرف نگاہیوں کی طرف آتے ہیں۔ محروم ان شاعروں میں سے ہیں جن کی نواصورِ اسرافیل کا درجہ رکھتی ہے۔ محروم کی شاعری نے زمانہ کے اس دھندلکے میں آنکھ کھولی جب ایک طرف بادۂ شبانہ کی سرمستیاں لوٹ رہی تھیں اور دوسری طرف حالی اور آزاد کی نوائے صبح تاب گونج رہی تھی محروم اسی قبیلہ کے ایک تیز گام مسافر ہیں جس میں اقبال، اکبر، اسمٰعیل میرٹھی اور چکبست شامل ہیں۔ (ناقدانِ کرام اس عنایتِ خصوصی کو کیا کہیئے کہ قومی اور وطنی شاعری کے باب میں محروم کو پانچ سواروں میں شامل نہیں کیا جاتا ہے)

زیرِ نظر مجموعہ "کاروانِ وطن" محروم کی ان نظموں کا مجموعہ ہے۔ جو وطن دوستی اور قومی کے جذبے سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں۔ ان نظموں میں رنگ آمیزی ہے نہ مصلحانہ خشکی۔ ان نظموں کے مطالعہ سے یوں لگتا ہے جیسے محروم اپنے آپ کو اس آب و گل کے خیر و شر میں برابر کا شریک پاتے ہیں ورنہ اس نوع کی شاعری میں ایک اندیشہ یہ بھی لگا رہتا ہے کہ شاعر کسی اونچے منبر پر بیٹھ جائے اور خلقِ خدا سے رعونت آمیز لہجے میں خطاب کرے۔ جس طرح جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری جس میں شاعر کف در دہاں ہو کر گالی پر اتر تا ہے۔

قومی اور ملی شاعری بذاتِ خود ایک کارِ آہن گدازی ہے۔ صدق و خلوص کے باوجود یکسانیت اور سپاٹ پن کا خدشہ قدم قدم پر لگا رہتا ہے۔ ہم اور ہمارا شعری مزاج روایت کی آغوش کا پروردہ ہے۔ ہماری روایتیں اہلِ ایران سے مستعار ہیں۔ ہم اپنے اشعار میں ہر بات در پردہ کہنے کے عادی رہے ہیں۔ چنانچہ ہم نے بیشتر باتیں استعارہ کے غلاف میں بند کر دی ہیں لیکن قومیت آزادی اور وطن پرستی کے موضوعات لب و رخسار کے موضوعات کے مزاج سے بالکل علیحدہ ہیں لہٰذا شعریت اور اس کے اقدار جو متعینہ ہیں ان میں محروم اور ان کے معاصرین نے اپنے خونِ جگر کی شمولیت کے ساتھ اس طرح تبدیل کیا کہ آج کا شعری دور ان سارے موضوعات کو چھوتے ہوئے ڈرتا نہیں جو یا دشس بخیر کبھی "غیر شاعرانہ" کہلائے جاتے تھے۔

"کاروانِ وطن" کی نظموں کے مطالعہ سے چند ایک باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ سب سے پہلا وصف جس نے ہمیں متاثر کیا وہ شاعر کی ذات اور موضوع کی نفسیات کا آپس میں شیر و شکر ہونا ہے۔ دوسری بات جو قاری کے ذہن پر خوشگوار اثر مرتب کرتی ہے وہ ہے شاعر کا لہجہ۔ جو صدق و صفا، مہر و محبت اور خلوص و یگانگت کے ساتھ ساتھ شعریت کی عمدہ مثال ہے۔ محروم زبان و بیان کی صحت اور نوک پلک کی درستگی کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔

محروم کی پیشانی پر "اہل زبان" ہونے کا تمغہ آویزاں نہیں ہے۔ ان کی زبان کوثر و تسنیم کی بجائے پانچ دریاؤں میں دھلی ہوئی ہے جس کی مٹھاس کا جیتا جاگتا ثبوت ان کے اشعار ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ "کاروان وطن" ادبی حلقوں میں محبت کے ساتھ ساتھ عقیدت مندانہ نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ مکتبہ جامعہ نے کتاب نہایت سلیقہ سے چھاپی ہے۔ ضخامت کا لحاظ کرتے ہوئے قیمت بھی نامناسب نہیں ہے۔

رباعیات

دنیا تھی یہی صدق و صفا کی دنیا — رحم و کرم و مہر و وفا کی دنیا
انساں نے بنا دیا بالآخر اس کو — جور و ستم و کذب و ریا کی دنیا

دنیا میں سعادت ہو میسر تجھ کو — رکھے محفوظ ذاتِ برتر تجھ کو
اے نورِ نظر[1] دعا یہی ہے میری — حاصل ہو فروغ ماہ و اختر تجھ کو

پرّاں شام و سحر ہوئے جاتے ہیں — ایام یونہی بسر ہوئے جاتے ہیں
جب سے ہوئے دور ہم سے مرنے والے — ہم ان سے قریب تر ہوئے جاتے ہیں

محروم

---

[1] فرزند مصنف جگن ناتھ آزاد

شفا گوالیاری

تہذیب ساز شاعر

دنیائے ادب میں ابتدائی دور سے آج کے دور تک ہزاروں شعراء وادبا گزرے ہیں، جن میں سے چند ہر دور کے نمائندے اور ممتاز و مشاہیر تسلیم کیے گئے، اور باقی وقتی طور پر کچھ چمک دمک دکھا کر بے نام و نشان ہو گئے۔ یہ چند مشاہیر فن کار بھی دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک حصہ تو ان اکابرین کا جو اپنے فن کے نمایاں اور منفرد اور کسی ایک صنف کے امام یا کئی اصناف کے علم بردار مانے گئے، کوئی غزل کا نمائندہ۔ کوئی نظم میں بے مثال۔ کوئی رباعی میں منفرد، کوئی نثر نگاری میں یکتا۔ اور کچھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے بھی مگر بہت ہی کم جو تمام اصناف پر قادر، مجتہد العصر اور فخر روزگار۔

غرضکہ طرح طرح سے ادب و شعر۔ سیاست و معاشرت، امن و اتحاد، قوم و وطن وغیرہ وغیرہ پر قلمی احسانات فرمائے اور مختلف محاذ سے مختلف شعبوں کی خدمات انجام دیں۔ انھیں محسنین ادب کی جاں سوزیوں اور جگر کاویوں کا نتیجہ ہے جو آج شعر و ادب انسانیت کے ہر شعبے کی روح میں سما کر اپنی تابانیوں سے دنیا کو جگمگا رہا ہے۔

مجھے ہر عہد کے نمائندوں اور اکابر اور ان کی فن کارانہ عظمتوں نیز ان کے احسانات جلیلہ کو تفصیل کے ساتھ شمار کرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کون کس صنف کا امام یا نمایندہ تھا، یا ہے۔ اور کس کا مقام کس بلندی پر ہے۔ نہ کسی کا کسی سے تقابل کر کے کسی کو کسی سے برتر یا کمتر ثابت کرنا ہے۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ تاریخ کے اوراق پر چاند سورج کی طرح روشن ہیں۔ اور ہر وہ شخص جس کو ادب و شعر سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے اور ہر وہ فرد جو تھوڑا بہت بھی پڑھا لکھا ہے ہر ایک کے کارنامے اور ہر ایک کی ادبی منزلت سے واقف ہے۔

میں نے سطور بالا میں عرض کیا ہے کہ اکابرین و مشاہیر دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک حصہ کے حضرات کا اجمالی ذکر یہاں تک کیا گیا ہے، اب دوسرا حصہ جن حضرات پر مشتمل ہے وہ ایسا ہے کہ اس معیار کے ہر صدی میں زیادہ سے زیادہ دو تین اور بعض صدی میں اس سے بھی کم حضرات کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً دور ماضی بعید اور قریب میں میر، غالب۔ انیس۔ اسمٰعیل میرٹھی۔ نظیر۔ شبلی۔ حالی۔ اقبال۔ کیفی۔ چکبست۔ سیماب حسرت۔ ظفر علی خاں۔ جوش وغیرہ وغیرہ ان حضرات نے ادبی۔ قومی۔ وطنی۔ سیاسی۔ تہذیبی۔ اخلاقی اصلاح و تعمیر اس

شان سے کی کہ اپنے عہد کی قسمت کو چمکا دیا، اور انسانیت کو سنوار اور نکھار کر فلک بوس کر دیا۔ اور مصلحین اعظم کہلائے حقیقت یہ ہے کہ رہتی دنیا تک ان کے فن اور قلم کی روشنیاں انسانیت کی پیشانی جگمگاتی رہیں گی اور تاریخ ان مقتدر ہستیوں پر ہمیشہ نازاں رہے گی۔

دورِ حال اور زندہ (خدا ان کو تا دیر زندہ رکھے) حضرات اساتذہ اور متذکرہ قسم کے مصلحین کرام اور عظیم فن کاروں میں محترمی جناب پروفیسر تلوک چند صاحب محروم مدظلہ، نظر آتے ہیں۔ جنھیں چند خصوصیات کی بنا پر اس دور میں منفرد کہا جاتا ہے۔

حضرت محروم کی چند خصوصیاتِ ادبی تو مشترک ہیں جو موجودہ عہد کے بیشتر اساتذہ وقت میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بعض چیزیں مستزاد ہیں، جو ہمیں ان کو منفرد اور ممتاز کہلوانے پر مجبور کرتی ہیں۔ محروم صاحب دیگر عمائدینِ فن کی طرح ایک با شعور غزل گو، باوقار نظم نگار، ممتاز رباعی گو، معتبر نثر نگار، کامیاب مترجم اور صاحبِ علم و فضل، صاحبِ تصانیف صاحبِ تلامذہ اور ۵۰ سالہ مشاق، پختہ کار مصلح، غرض کہ ایک کامل استاد میں جو کمالات ہونا چاہئیں سب موجود ہیں۔ لیکن وہ مستزاد خصوصیت جو حضرت محروم کو موجودہ اہلِ کمال کی صف میں ممتاز بناتی ہے اور منفرد مقام عطا کرتی ہے وہ ہے ان کی "تہذیب سازی" و "انسانیت گری" جس کو انھوں نے اپنی دیرینہ بلکہ عمر بھر کی علمی و تعلیمی جاں سوزیوں اور خون پاشیوں سے پروان چڑھایا اور ملک و قوم اور انسانیت کی آبرو میں چار چاند لگائے۔

یہ امر تو مسلمہ ہے کہ روزِ اول سے آج تک متذکرہ فن کاروں اور مصلحین نے جو خدمات انجام دیں ان کا اثر کم و بیش براہِ راست یا بالواسطہ انسانیت پر پڑتا رہا، اور محفلِ انسانیت روشن ہوتی رہی سب کا مقصد پاک ایک ہی تھا۔ راستے اور طریقہ ہائے کار مختلف تھے اور وہ مقصد تھا انسان گری اور انسانیت افروزی، اور یہ واقعہ ہے کہ اس نیک اور بلند مقصد کا درخشاں انجام نظر آیا اور انسانیت آج کسی حد تک بھی انھیں حضرات کی ادبی کاوشوں کی بدولت فلک پیمائی کے لیے مائل ہے۔

یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ انسانیت کی اصل "روحِ تہذیب" ہوتی ہے۔ ہر شے کی نشو و نما، ترویج و ارتقا، کامیابی و کامرانی، رفعت و عظمت کا انحصار تہذیب کے سہارے پر ہے۔ انسانی زندگی چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا حتیٰ کہ مرنا جینا غرض کہ ہر حرکت و سکون میں تہذیب ہی کارفرما ہے۔ اس کے بغیر ہر قدم، ہر نفس اور ہر نظر بے ربط ہے۔ بے ترتیب ہے اور بے ہنگم۔ تہذیب کا ایک قدرتی طریقہ اور ایک فطری سلیقہ نظامِ حیات و کائنات میں رواں دواں ہے۔ جس قدر قومی اور موثر تہذیب انسانیت پر اثر انداز ہوگی وہ انسان اتنا ہی مہذب

ہوگا اور وہ ملک وقوم اتنی ہی عظیم اور تابناک۔

چنانچہ متذکرۂ بالا اکابرین فن نے اپنی اپنی افق ادب سے مختلف رنگوں کے ستاروں کی تہذیبی شعاعیں انسانی دل و دماغ تک پہنچائیں اور معاشرۂ انسانی اور نظام کائنات کو مہذب بنانے کی سعی مشکور فرمائی۔ کسی نے سیاسی ادب سے، کسی نے اسلامی ادب سے، کسی نے اصلاحی و اخلاقی ادب کو اپنایا۔ کسی نے حقائق و معارف کے دریا بہائے۔ کسی نے عشق و محبت کے راگ الاپے۔ غرض کہ طرح طرح کی روشنیاں انسانیت کے خاکوں میں سمو کر تہذیبی کہکشاں بنائی اور انسانیت افروز مقصد کو پورا کیا۔

حضرت محروم نے نہ صرف ایک افق سے بلکہ ہر سمت کی افق سے قوس و قزح بن کر ادبی رنگ و نور کی بارشیں کیں اور تہذیبی اجالوں کو انسانی محفل تک پہنچایا ہے۔

میرے خیال سے یہ بھی بے ضروری ہے کہ محروم صاحب کے تصنیفی کارنامے اور ادبی خدمات کی تفصیلات یا کلام کے نمونے اور مثالیں پیش کی جائیں اور ان کی تہذیبی جلوہ پاشیوں سے متعارف کرایا جائے۔ اس لیے کہ یہ چیزیں پردۂ اخفا میں نہیں ہیں۔

غرض کہ ان ادبی حدود اور فن کارانہ میدان تک تو محروم صاحب مذکورہ اکابرین تہذیب افروز اور مصلحین انسانیت نواز کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن ان کی پرواز شعور اور جذبۂ اصلاح نیز نگاہ تہذیب ان کو ان حدود سے بلند لے گئی جہاں سے محروم صاحب نے انسان اور انسانیت کو تہذیبی روشنی دی۔ ان کی امتیازی شان علمی خدمت اور تعلیمی احسان ہے حضرت محروم نے اس عظیم اور خاص افق سے علمی آفتاب کی شعاعوں سے ساڑھے پینسٹھ برس سے ضیا پاشی کی اور کرتے رہے۔

ظاہر ہے کہ تعلیم و تربیت اور علم و فضل کے اجالے تہذیب سازی کے لیے کس قدر اہم، مفید اور مستحسن ہیں، اور وہ تہذیب گری، کتنی کامیاب، اثر آفریں اور تابناک ہوتی ہے جو علم و تعلیم کے انوار سے منور کر کے انسانیت میں جذب کی گئی ہو۔ محروم صاحب نے ملک و قوم اور انسانیت عظمیٰ پر دو قسم کے احسانات کیے ہیں، ادبی اور علمی۔

اول الذکر کی توجیہہ اس سے قبل میں کرچکا ہوں اور ان بزرگوں کی عظمتوں کا ذکر بھی جن کے ہمدوش محروم صاحب نے وہ سب ادبی خدمات اسی شان و شوکت کے ساتھ انجام دیں جس طرح دیگر متذکرہ حضرات نے اور موخر الذکر خدمت میں محروم صاحب کا دور حاضر میں کوئی شریک نہیں ہے۔ دور ماضی میں بھی معدودے چند ہی محروم صاحب کے ہمدوش کھڑے کیے جا سکتے ہیں۔ محمد اسمٰعیل میرٹھی اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ خصوصیت سے میرے نزدیک علمی و تعلیمی اور تربیتی و اصلاحی خدمات میں صرف اسمٰعیل میرٹھی ہی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

مرحوم صاحب نے سینکڑوں نہیں ہزاروں بچوں، بچیوں، نوجوانوں اور جوانوں کو اپنے علمی و تربیتی فیض سے سرفراز کیا، اور ان کے ہزاروں تربیت یافتہ (علاوہ ادبی تربیت کے) بڑے بڑے عہدوں اچھے اچھے منصبوں اور اونچے اونچے مرتبوں پر فائز ہیں۔

اکتسابِ علم اور حصولِ تربیت سے تہذیب نکھر کر اور جلا پاکر کہاں پہنچتی ہے اور اس کے سبب سے انسانیت کن رفعتوں پر مسکراتی اور وجد کرتی ہے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا، اور پھر ان رعنائیوں میں ادبی رنگ و بو بھی شامل ہوں تو یہ دو آتشہ تہذیبی روح شباب بصیرت و حقیقت کی جن منزلوں میں انگڑائیاں لیتی ہے وہاں تک خیال و تصور کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی۔

حضرت مرحوم نے علمی و ادبی رنگ و نکہت سے حیات انسانی کو مکمل بہارِ تہذیب بخشی ہے اور انسان کو گھٹنوں چلنے سے لے کر لکڑی ٹیک کر چلنے تک کے تہذیبی مدارج طے کرائیں ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز کو اصلاح و تربیت اور تعلیمی مشوروں سے سکھایا سمجھایا اور عمل کرانے کی تلقین و ترغیب دی۔

ساری زندگی تعلیم و تربیت کے راکٹ کے ساتھ شعر و ادب کے تہذیبی چاند فضائے انسانی میں بھیجتے رہے اور انسان کے لیے درک و بصیرت اور حقائق و معارف کے دریچے وا کرتے رہے۔

سینکڑوں نظمیں تعمیری و اصلاحی اور اخلاقی کورس کی کتابوں کے ذریعے کروڑوں شعوروں کو چمکاتی رہیں اور متعدد تصانیف کے توسل سے بے شمار دل و دماغ جگمگائے اور بڑا کمال یہ ہے کہ موصوف کے پورے لٹریچر میں کہیں کوئی ایک بات بھی پست یا غیر مہذب نام کو نہیں ہے۔ اور کیوں ہو؟

ایک شاعر کا معلم اخلاق و تہذیب ہونا اور شعر کے ذریعے اخلاقی و تہذیبی تربیت دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بڑا پتہ مارنا پڑتا ہے۔ بڑا ایثار اور جہادِ نفسی کرنا پڑتا ہے۔ بچپن کی الھڑ امنگیں خاک کرنا پڑتی ہیں۔ سینکڑوں کافوری صبحیں اور صندلیں راتیں خون ہو جاتی ہیں۔ انتہائی مقدس و محتاط رہ کر زندگی کی راہوں کو اختیار کرنا ہوتا ہے جب تک خود اوصافِ حسنہ اور بلند کرداری نیک سیرتی کا نمونہ اور آئینہ بن کر پیش نہ ہو۔ سامنے والا کیا خاک اس کی بات اور اس کے پیام کا اثر لے سکتا ہے۔

حضرت مرحوم ممدوح نے کمسنی سے راہ شباب تک اور شباب سے شیب تک شریف النفسی۔ سلامت روی سنجیدگی و متانت، ادب و تہذیب، خلق و مروت اور فراخدلی و عالی حوصلگی سے رابطہ رکھا، اور ایک صالح معلم تہذیب میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ بدرجۂ اتم مرحوم صاحب میں موجود ہیں اور اسی لیے آج سارا ملک اور

ساری قوم ان کا احترام کرتی ہے۔

بہرصورت محترم محروم صاحب پر میں نے کوئی مبسوط یا باقاعدہ تبصرہ نہیں کیا ہے۔ نہ کہیں ان کے یا ان کے فن کے متعلق کہیں بھی تفصیل و تشریح سے کام لیا ہے۔ اجمالاً اشارات کئے گئے ہیں۔ اس لیے کہ یہ کام مدت سے دوسرے اہلِ نظر اور قلمکار کر رہے ہیں۔ اور اس نمبر میں بھی یقیناً بہت سے معزز ارباب قلم اس پر روشنی ڈالیں گے۔ اس کے علاوہ ایک مستقل ضخیم کتاب بھی ان کے فرزند اور صحیح مسند نشین جناب مکرم جگن ناتھ آزاد صاحب نے شائع کی ہے۔ اس میں ان کی تقریباً پوری ادبی، سماجی، تعلیمی و تہذیبی، تعمیری و اصلاحی، خدمات اور جلالت کا شرح و بسط کے ساتھ ذکر ہے۔

میں نے سرِدست سرسری طور پر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت موصوف نے اپنے علمی و ادبی آفتاب و ماہتاب سے موجودہ صدی اور اپنے پورے عہد کو روشن اور تابناک بنایا ہے۔ ان کے علمی و ادبی احسانات آج کی تاریخ پر چھائے ہوئے ہیں اور تاریخ مستقبل اور آئندہ کی کئی صدیاں اور کئی عہد ان کی تہذیبی خدمات کے گیت گاتی رہیں گی اور فیض جاریہ بن کر آئندہ کی نسلوں کو جگمگاتے رہیں گے۔

محروم صاحب نے تہذیب سازی کے واسطے سے انسانیت نوازی فرمائی ہے۔ اس لیے میں ان کو ایک "تہذیب ساز" شاعر سمجھتا ہوں۔ اور ان کو اپنے مقام کا بلا شرکت غیرے منفرد اور امین و وارث۔

رباعیات

مذہب کی زباں پر ہے نکوئی کا پیام — حسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی — مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

لڑتے نہیں واقف مقام آپس میں — برہم ہوتے ہیں کج خرام آپس میں
مذہب کے نام پر بحکم ابلیس — لڑتے ہیں نفس کے غلام آپس میں

محروم

طاہر شادانی

محروم کی حزنیہ شاعری

محروم کی شاعری کے فکری عناصر کا بنظرِ غائر تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درد، احساسِ محرومی اور یاسیت ان کی شاعری کے عناصرِ ترکیبی میں جزوِ غالب کی حیثیت رکھتے ہیں، اور غم کی یہ کیفیت جب بھی شعر کے سانچے میں ڈھلی ہے اہلِ دل کو تڑپا تڑپا گئی ہے۔ اردو شاعری میں میر تقی میر۔ غالب اور فانی بدایونی عرفانِ غم میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔

غالب کے غم میں ایک فلسفیانہ شان نظر آتی ہے۔ وہ زندگی اور غم کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ ع

غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

وہ ایک جواں ہمت اور اولوالعزم انسان کی طرح غم کو منشائے فطرت سمجھ کر گوارا کرتے ہیں۔ جبھی تو ہجوم غم میں بھی اپنی حوصلہ مندی اور طبعی زندہ دلی کی شان کو قائم رکھتے ہیں۔ چنانچہ عارف کے مرثیے میں غالب کی یہ خوبی پوری طرح نمایاں ہے ؎

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

میر تقی میر کا غم ایک عام انسان کا غم ہے۔ ان کے اشعار عاشقانہ ہوں یا حکیمانہ۔ ان میں احساس کی گہرائی اور تفکر کا خلوص موجود ہوتا ہے۔ انھوں نے زمانے کے پیہم حادثات اور صدمات کا مقابلہ ایک غیرت مند اور خوددار انسان کی طرح کیا۔ غموں کی مسلسل یلغار سے ان کی تمکنت اور آن میں کبھی فرق نہ آیا ؎

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

فانی غم سے محبت کرتے ہیں، اور اسے عیش کا درجہ دیتے ہیں۔ زندگی کو ہیچ سمجھتے ہیں اور موت کو زندگی کی متاعِ عزیز جانتے ہیں ؎

آج روزِ وصالِ فانی ہے — موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

موت جس کی حیات ہو فانی — اس شہیدِ ستم کا ماتم کیا

محروم کے کلام کے مطالعہ سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ وہ غم و مصائب کے مسلسل چرکوں کے باعث دنیا سے دل برداشتہ ہیں اور غم کی کوئی شاعرانہ یا فلسفیانہ تعبیر کرنے کی بجائے دل میں آرزوؤں کا ہنگامہ رکھنے والے ایک عام انسان کی طرح غم سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے محروم کا غم اس دنیا میں چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے انسانوں کا غم ہے۔ اور اس قسم کی غم پذیری فطرتِ انسانی کا صحیح تقاضا ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ ان معنوں میں محروم کا غم نہایت نیچرل اور انسان کے فطری جذبات کا صحیح عکاس ہے۔ اس مصور غم کے منظوم افکار میں ہمیں جو درد کا گداز ملتا ہے اس کا گہرا خلوص پڑھنے والوں کو خاص طور سے متاثر کرتا ہے۔ غم کے اظہار میں محروم کا اندازِ بیان سراسر جذباتی ہے۔ اس کے برعکس غالب اور اقبال موت کی فلسفیانہ توجیہہ کر کے دل کی تسکین کا سامان کر لیتے ہیں مثلاً غالب کہتا ہے ؎

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا	نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

اقبال نے موت کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے اکثر اس قسم کی سخن سرائی کی ہے ؎

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے	خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں	یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

لیکن موت کی ان فلسفیانہ تعبیروں کے علی الرغم محروم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہے کہ عقل کی بڑی سے بڑی تاویل بھی غم کی عمیق جذباتیت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ اپنی دو سالہ بچی کے انتقال پر موت کی کوئی خوشگوار تاویل کر کے دل کو تسکین دینے کی بجائے محروم نے اس صدمۂ جانکاہ کا اظہار غم میں ڈوبی ہوئی بھرپور جذباتیت سے کیا ہے۔ یہ نظم پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک شفیق باپ کی روح اپنی بچی کو قبر کے خوفناک اور تاریک گوشے میں دیکھ کر بلبلا اٹھی ہے اور اس کی مجبور محبت انتہائی اضطراب کے عالم میں یوں فریاد کرتی ہے ؎

کیوں ہم سے روٹھ کر نکل آئی ہے تو یہاں	اٹھ میرے ساتھ چل مری پیاری شکنتلا
وحشت فزا مقام ہے جنگل ہے ہولناک	یاں رات تو نے کیسے گزاری شکنتلا
خوش ہو کے پھر اچھل کہ جگن میرے ساتھ ہے	آنکھوں سے اس کی اشک ہیں جاری شکنتلا
آنکھوں میں آگیا دلِ صد چاک کا لہو	پتھر یہ تجھ پہ دیکھ کے بھاری شکنتلا
ویرانہ ہو گیا ہے بھرا گھر ترے بغیر	کہتے ہیں سب کہاں ہے ہماری شکنتلا

اقبال کی شاعری میں بھی فلسفے کی سنگ آمیزی سے پہلے ہمیں اظہارِ غم کا وہی نیچرل انداز ملتا ہے جو

محروم کی شاعری کا مابہ الامتیاز ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار میرے اس خیال کی تائید کے لیے کافی ہیں۔

گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پائندہ ہے ‏ ‏ ‏ ‏ دردکے عرفاں سے عقل سنگدل شرمندہ ہے
موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا ‏ ‏ ‏ ‏ گنجِ آب آورد سے معمور ہے دامن مرا

دیکھیے ذیل کے اشعار سے تو محروم کا ساجذباتی اسلوب نمایاں ہے۔ شاعر اپنی والدہ کی روح سے ہم کلام ہو کر کہتا ہے ؎

کس کو ہوگا اب وطن میں آہ میرا انتظار ‏ ‏ ‏ ‏ کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا ‏ ‏ ‏ ‏ اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی ‏ ‏ ‏ ‏ میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

محروم کی جو شعری نگارشات اس نوع کے جذباتی غم کی تیز آنچ میں ڈھل کر نکلی ہیں ان میں شاعری کا حقیقی رنگ خوب خوب نکھرا ہے۔ ان کے حزنیہ افکار میں مجبوری و محرومی کا گہرا تاثر کچھ اس طرح جاری وساری ہے جس طرح ستار کے تاروں میں نغماتی کیفیتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعر کا دل غم کے سدا بہار زخموں سے معمور ہے۔ اور ان ناقابلِ علاج زخموں نے اس کے افکار میں بلاغت، گہرائی اور آفاقیت کی ایک ماورائی شان پیدا کر دی ہے۔ بعض نظمیں تو اس قسم کی ہیں کہ جن کا ہر لفظ کسی دکھے ہوئے دل کی پکار ہے۔ جو اپنے درد کو ضبط نہ کر سکنے کے باعث آہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ جب ہم محروم کی حزنیہ شاعری کے محرکات و عوامل کا تجزیہ کرتے ہیں تو دو چیزیں سامنے آتی ہیں ایک تو قسامِ ازل کی طرف سے محروم کو درد کی دولت بے بہا نہایت فراوانی سے عطا ہوئی، دوسرے انھیں زندگی بھر جن احوال سے واسطہ رہا، وہ بھی بے حد حوصلہ فرسا اور ہمت شکن تھے۔ وہ تمام عمر حسرتوں اور ناکامیوں کی آگ میں سلگا کئے۔ یہ دنیا ان کے لیے ہمیشہ رنج و محن اور آلام و مصائب کا گہوارہ بنی رہی۔ آخر غم کی مسلسل گراں باریوں کے باعث کائنات کے ہر ذرّے میں انھیں اپنے ہی مغموم دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگیں۔ جبھی تو چاندنی رات کے پر کیف مناظر، ابلتے ہوئے چشموں کی روانی، بہاروں کے دل کشا موسم، جھومتی ہوئی گھٹاؤں کی مستی، نسیم صبح کے خوش گوار جھونکے محروم کی افسردگیوں اور پریشانیوں کا مداوا نہ کر سکے۔

محروم زندگی کے خوشگوار پہلوؤں سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس عالمِ رنگ و بو کے حسن و جمال کی رعنائیاں انھیں اپنی طرف راغب کئے بغیر نہیں رہتیں۔ لیکن وہ ابھی ان مناظر سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہونے پاتے کہ اچانک ان کے دل پر نشاط کی اس عارضی کیفیت کا ردِّ عمل شروع ہو جاتا ہے، اور کائنات کے اعتباری

حسن کی بے ثباتی کا تصور کر کے ان کے دل پر گہری چوٹ لگتی ہے۔ ان کی رگ رگ میں کسی انجانی بے اطمینانی کا گہرا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ شاید اس عالمِ فانی کے جمال جہاں تاب کی ناپائداری کا خوفناک تصور انھیں تڑپنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

محروم کے اس غم کی کیفیت شیخ عبدالقادر کی زبان سے سنیے۔ موصوف "گنجِ معانی" کے دیباچے میں کہتے ہیں۔ شاعر راوی کے کنارے بیٹھا اس کے پر کیف ماحول سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ لیکن غم کی فطری کسک اسے یہاں بھی چین لینے نہیں دیتی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

آنکھ کھولی ادھر ستاروں نے　　جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے
گو اشارے کیے ہزاروں نے　　آنکھ اٹھائی نہ غم کے ماروں نے

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

میکدوں میں چراغ روشن ہیں　　نورِ مے سے ایاغ روشن ہیں
کرمکِ شب چراغ روشن ہیں　　یا مرے دل کے داغ روشن ہیں

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

عید بھی ہو مجھے محرّم ہے　　میرا سینہ ہے خنجرِ غم ہے
ضوفشاں کب سے چشمِ پرنم ہے　　دشتِ غربت ہے شامِ ماتم ہے

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

ایک نظم میں بہار کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

گل و غنچہ سے بھرے گا وہ چمن کے حبیب و داماں　　اسی دیکھ بھال میں ہے ابھی باغبانِ قدرت
بس پردہ ہو رہے ہیں جو بہار کے یہ ساماں　　دل و دیں کو لوٹ لے گا وہ دکھا کے شانِ قدرت

لیکن نکلتی سردیوں کا یہ بہار آفریں سماں شاعر کی محرومیوں کی تلافی نہیں کر سکا۔ حسنِ فطرت اپنی رنگینیاں لٹا رہا ہے لیکن محروم کے دل کی ویرانیاں بدستور ہیں۔

مگر آہ جس چمن کا میں ہوں عندلیب نالاں	ہوئیں مدتیں کہ اس میں نہ کبھی بہار آئی
جو گری فلک سے شبنم رہی تا سحر وہ گریاں	جو صبا کہیں سے آئی تو لئے غبار آئی

بادِ بہاری چلی ہے۔ گلشن کھلکھلا اٹھے ہیں۔ ہر طرف سرود و شادمانی کا دور دورہ ہے۔ لیکن محروم کی فطری خزاں نصیبی اسے بہاروں کی آغوش میں بھی مضطرب رکھتی ہے۔ موسمِ گل کی رنگینیوں کو دیکھ کر نوشگفتہ کلیوں کے تبسم کا نظارہ کرکے اس کا دل شگفتہ ہونے کی بجائے افسردہ ہو جاتا ہے اور وہ بیتے ہوئے دور کی حسین یادوں کے تصور میں تڑپ تڑپ جاتا ہے۔ "بادِ بہاری چلی" کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

گلشنِ آفاق میں پھول کھلاتی ہوئی	ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی	عطر اڑاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی

اگلی بہاروں کے دن یاد دلاتی ہوئی	صبر اڑاتی ہوئی
پھر دلِ افسردہ میں آگ لگاتی ہوئی	درد اٹھاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی

شاعر ایک موقع پر پنجاب کے سرسبز و شاداب میدانوں کی دلآویزیوں کا نقشہ اپنے موقلم سے کھینچ رہا ہے۔ دیکھیے اس نظم میں اظہار کا خلوص اور اندازِ بیان کی سادگی کس قدر خیال افروز ہے ؎

کس قدر ہے آہ! دامن گیر دل تیری زمیں	دل کشئ پنجاب کتنی تیرے میدانوں میں ہے
تیری وسعت میں ہوئی گم رفعتِ چرخِ بریں	ایک ایوانِ فلک بھی تیرے ایوانوں میں ہے

پنجاب کے حسن جہاں افروز کی منظر کشی کرتے ہوئے بھی محروم کا دل اپنی غمگین فطرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتا اس کے پہلو میں پھر کوئی پرانا درد کروٹیں لینے لگتا ہے۔ احساسات پر غم کی ایک رومان انگیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ ماضی کی درد انگیز یاد میں ڈوب کر پکار اٹھتا ہے ؎

عاشقی پرور سماں تیری چراگاہوں میں ہے	یاد جس سے تازہ ہے رانجھے کی اور مہینوال کی
اور غبار سا جو منظر دشت کی راہوں میں ہے	خاک اڑتی ہے یہ عشاقِ پریشاں حال کی
دل تڑپ اٹھتا ہے پہلو میں یکایک جب کہیں	بانسری کی کوک اٹھتی ہے سکوتِ شام کی
مائلِ فریاد ہوتا ہے دلِ اندوہ گیں	اور دل سے ہوک اٹھتی ہے سکوتِ شام کی

"سندھ کو پیغام" محروم کی ایک نہایت کامیاب نظم ہے۔ شاعر نے آغاز سخن میں دریائے سندھ سے اپنی والہانہ شیفتگی کا اظہار نہایت موثر پیرائے میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے معصوم بچپن کے چند حسین اور دلکش خواب دہرائے ہیں۔ جو اس نے ساحلِ دریا کی آزاد فضا میں دیکھے تھے۔ نظم میں اس قسم کی فضا تخلیق کرنے کے بعد شاعر ہمیں دریا اور کنارِ دریا کے خوب صورت ماحول میں لے آتا ہے۔ جہاں ہوا پانی کی سبک خرام موجوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہے۔ بجرے سطح آب پر تیرتے ہیں۔ ملاحوں کے رسیلے گیت دریا کی خوشگوار فضاؤں میں گونجتے ہیں۔ اس روح پرور ماحول کی عکاسی کے بعد شاعر کی طبعی غم پسندی اسے ایک ایسے گوشے کی طرف لے آتی ہے۔ جہاں وہ ایک دردانگیز کیفیت میں ڈوب کر اپنے جذبۂ غم کی تسکین کر لیتا ہے۔ سندھ کی طوفانی موجیں بپھر رہی ہیں۔ پانی کی سطح پر چلنے والی ایک کشتی گرداب کی زد میں ہے۔ اس میں بیٹھی ہوئی ملاح کی ایک عورت نہایت اضطراب کے عالم میں شور مچا رہی ہے۔ اس کی دلدوز فریاد کی کیفیت محروم کی زبان سے سنیے ؎

قابو سے نکل کشتی کا گرداب میں آنا — ملاح کی عورت کا وہ یوں شور مچانا

اللہ بچالے مرے اللہ بچالے — عاجز ہوں میں سب کچھ ہے مرا تیرے حوالے

اور ورطۂ خونخوار یہ بیداد نہ کرنا — اے میرے خدا مجھ کو تو برباد نہ کرنا

ہاں المدد اے حضرت الیاس بچانا — بیکس ہوں بچانا ہے تری آس بچانا

کس کنج میں خوابیدہ ہو پورب کی ہواؤ — پہنچو مری کشتی کو تمہیں آکے بچاؤ

تقدیر نے کشتی جو پھنسائی ہے بھنور میں
کشتی مری امید کی آئی ہے بھنور میں

شب تاریک میں ستاروں کے حسنِ دلفریب کا تذکرہ اکثر شاعروں نے اپنے اپنے رنگ میں کیا ہے۔ لیکن محروم سے صبح کے ان فسردہ و حیران ستاروں کی دردناک کیفیت سنیے جن کی متاعِ نور لٹ چکی ہے۔

ماہ دل گیر، اُداس تارے ہیں — چشمکیں ہیں نہ وہ اشارے ہیں

گویا بجھنے کو یہ شرارے ہیں — پھر بھی دل کش ہیں پیارے پیارے ہیں

اترے چہرے ہیں ماہ جبینوں کے
رخ پژمردہ ہیں حسینوں کے

محروم کی یہ طبعی غم پسندی اور دردمندی انھیں غیر ذوی العقول جانداروں کے دکھ درد پر بھی خون کے آنسو

رلاتی ہے۔ وہ صرف بنی نوع انسان کے مصائب پر ہی آنسو نہیں بہاتے بلکہ حیوانات کو تکلیف میں دیکھ کر بھی ان کے دل کو ٹھیس لگتی ہے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

میرا خیال ہے کہ اردو کے تمام شاعروں میں صرف جناب محروم ہی اس شعر کا صحیح مصداق ہیں۔ انھیں بعض ایسے جانداروں کی مظلومیت اور بیچارگی کا گہرا احساس ہے۔ جن کو سنگ دل انسان صدیوں سے تیرِ ستم کا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ چنانچہ بلبل کی فریاد، چڑیا کی زاری، مچھلی کی بے تابی اور کولھو کا بیل اسی سلسلے کی چند نظمیں ہیں۔

جب تک شاعر کے مسلک میں ہمہ گیر وسعت نہ ہو وہ غیر جانبداری کے ساتھ اپنے گرد و پیش کا مطالعہ نہیں کر سکتا اور جب تک وہ طبقاتی حد بندیوں اور گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر کائنات کا گہرا مشاہدہ نہ کرے اس کا کلام انفرادیت آفاقیت اور بقائے دوام کے جوہر سے خالی رہتا ہے۔ چنانچہ محروم بھی چند بہت بڑے بڑے شاعروں کی طرح نہایت وسیع المشرب اور انسان دوست شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ہمیں جا بجا عالمگیر اخوت اور انسان دوستی کے پاکیزہ خیالات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اپنے اسی اعلیٰ انسانی مسلک کی بنا پر انھوں نے بلا امتیازِ مذہب و ملت اپنے ہمعصر شعرا کی موت پر نہایت کامیاب مرثیے لکھے ہیں۔ مرثیہ نگاری بے شک ایک مستقل صنفِ سخن ہے۔ لیکن اردو کے تمام شاعروں میں محروم ہی غالباً واحد شاعر ہیں جنھوں نے ہمعصر شعرا کی موت پر بڑے جذباتی انداز میں نوحہ سرائی کی ہے ان کی یہ مرثیہ خوانی محض روایتی نہیں بلکہ فی الحقیقت ان کے فطری جذبۂ غم کے اظہار کی ایک عملی صورت ہے۔ ان نظموں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے خونیں آنسوؤں نے صفحۂ قرطاس پر دردناک شعروں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ان مراثی میں سے سرور، نادر کاکوروی، طالب، چکبست، گرامی، اقبال، سر عبدالقادر اور سالک کے مرثیے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ "نور جہاں کا مزار" میں بھی شاعر کی یہ ماورائی خصوصیت شروع سے آخر تک نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظم درسِ عبرت کی ایک نہایت روشن مثال بھی ہے۔

اس موقع پر میں طوالت کے خوف سے صرف گرامی، اقبال، سالک اور چکبست کے مرثیوں میں سے چند اشعار پیش کروں گا۔ ذرا گرامی کے مرثیے کی اٹھان دیکھیے ؎

تصویرِ درد و حسرت و رنج و محن ہے آج
ماتم میں آہ کس کے عروسِ سخن ہے آج

لٹتے تھے جس میں بادۂ شیراز کے سبو
عبرت فزا اجڑ کے وہ بزمِ کہن ہے آج

اورنگِ خسروی سخن سے اٹھا ہے کون؟
سامانِ شعر بندشِ گور و کفن ہے آج

نغموں کو آہ موت نے شیون بنا دیا　　لبریز آہ و نالہ فضائے وطن ہے آج

یہ اشعار پڑھ کر جہاں قاری کے دل میں گرامی کی شاعرانہ عظمت کا گہرا احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہاں وہ یہ بھی محسوس کرنے لگتا ہے کہ گرامی کے اٹھ جانے سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ کبھی پُر نہ ہوگی۔ گرامی نہیں مرا شاہنشاہِ اقلیم سخن مر گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم نے گرامی کا یہ نوحہ لکھ کر اسے زندۂ جاوید اور گرامی تر بنا دیا ہے۔ یہ شعر بھی قابل مطالعہ ہیں ؎

خاموش ہو گیا غزلِ فارسی کا ساز　　بزمِ سخن سے اب نہ اٹھے گی نوائے راز

اے یادگارِ حافظ و عرفی ہے تو کہاں　　اب ہم کریں گے کس کے کمالِ سخن پہ ناز

تجھ کو اٹھا کے عالمِ بالا میں لے گئے　　تھا قدسیوں کو ذوقِ نوا ہائے دل نواز

اقبال کا مرثیہ جناب مرحوم نے اس کی شاعرانہ عظمت کے شایانِ شان اور اپنی روشِ عام سے ہٹ کر لکھا ہے اس نوحے کے ایک ایک لفظ سے موت کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نگاہ مترشح ہے۔ اس نوحے کا ہر مصرع اقبال کے لافانی ہونے کا اعلان ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کا مرثیہ ہے جس کی خودی مستحکم اور پائندہ ہو چکی ہے۔ اور موت اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔ بقول اقبال ؏

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات

اور پھر مرنے کے بعد ؎

مقامِ بندۂ مومن ہے ماورائے سپہر　　زمیں سے تابہ ثریا تمام لات و منات

حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی　　نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاک داں بروں جستند　　طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

اقبال کے یہ اشعار نظر میں رکھیے اور پھر ذیل کا قطعہ جو مرحوم نے اقبال کی موت پر لکھا ہے۔ معانی کی گہرائیوں میں ڈوب کر پڑھیے۔ آپ یقیناً محسوس کریں گے کہ اس قطعہ میں اسلوبِ بیان اور اندازِ فکر کے اعتبار سے مرحوم اقبال کے روپ میں جلوہ گر ہے ؎

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا　　احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا

کنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر　　قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا

کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا　　ویرانۂ فنا سے سلامت گزر گیا

باغِ جہاں میں صورتِ گلہائے تر رہا	باغِ جہاں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق	روشن ترا اس حقیقت روشن کو کر گیا

محروم کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو
یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مرگیا

سالک سے محروم کے زندگی بھر نہایت دوستانہ مراسم رہے بالآخر موت نے دونوں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ وہ اس ابدی مفارقت پر اپنے دلی غم کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

آیا نہ قرار بے قراری کے بعد	پھر آہ و فغاں ہے اشکباری کے بعد
پنجاب میں پھر بپا ہے ماتم افسوس	سالک کی موت پر بخاری کے بعد

محفل آرائی و خوش بیانی نہ رہی	بذلہ سنجی و نکتہ دانی نہ رہی
تاراجِ خزاں ہوا چمن اردو کا	سالک کے قلم کی گلفشانی نہ رہی

پنڈت برج نرائن چکبست اردو کے ایک شیوا بیان شاعر تھے۔ ان کا انتقال عین عالمِ شباب میں ہوا۔ محروم کو اپنے اس ہم مشرب دوست کی ملاقات کا ازبس اشتیاق تھا۔ لیکن چکبست کی بے وقت موت نے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ ان کی وفات پر محروم نے ایک نہایت دردناک نظم لکھی ہے اور اپنے اس نادیدہ دوست کو یوں خراجِ محبت پیش کیا ہے ؎

بپا زمینِ سخن پر ہے محشرِ شیون	گرا ہے آج کوئی آسمانِ اوجِ سخن
اماں کسی کو نہیں یوں تو زیرِ چرخِ کہن	فلک بلند خیالوں کا خاص ہے دشمن
تلا ہے جو ہر عالی کو پست کرنے پر	دیا نجوم کو بھی ڈوبنا ابھرنے پر
سخن طرازوں میں چکبست بیمثال رہا	شہیدِ جلوۂ معنی وہ خوش خصال رہا
متاعِ سوزِ قدیمی سے مالامال رہا	کہ شمعِ انجمن دانش و کمال رہا
مٹا دیا اسے سفاک نے مٹانا تھا	کہ زد پہ تیرِ اجل کی بڑا نشانہ تھا

سطورِ بالا کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ محروم کی طبیعت فنا اور بے ثباتی کے رنگوں سے زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے اور موت کا مضمون ان کے کلام میں ایک مستقل عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے

جب بھی دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائداری کا کوئی تاثر پیش کیا ہے۔ پڑھنے والوں کو درد کی جاں نواز لذتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ دردِ غم کی یہ لازوال کسک ان کے کلام میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔

محروم کی جواں سال بیوی کی موت ان کی زندگی کا ایک ایسا المیہ ہے جس نے ان کے فکر و نظر کا رخ ہی بدل ڈالا۔ اس سانحۂ دل گداز سے متاثر ہو کر انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ اردو کی حزنیہ شاعری کا ایک نمایاں ترین باب ہیں۔ ان منظومات میں اگرچہ شاعر کا غم ذاتی اور داخلی نوعیت کا ہے لیکن بایں ہمہ آلام و مصائب کی اس دنیا میں بسنے والے اس درد کی ٹیسوں کو محسوس کئے بغیر نہیں رہتے۔ سر عبدالقادر کا بیان ہے کہ محروم کی شادی کو ابھی چند برس ہی ہوئے تھے کہ ان کی جواں سال بیوی ایک ننھی سی بچی کو چھوڑ کر چل بسی اس کو بسترِ مرگ پر دیکھ کر جو اُن کے دل پر گزری، ننھی سی بیٹی کی بے بسی سے جو رنج ہوا۔ اپنی خانہ ویرانی کا جو مسلسل نقشہ آنکھوں میں پھرا یہ تمام کیفیتیں شاعر نے نہایت موثر اور دردناک پیرائے میں بیان کی ہیں۔ ان منظومات میں سے ایک میں دنیاوی رشتوں کی ناپائداری کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن	رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں
چاہت کا وہ طلسم سمایا ہے آنکھ میں	عمرِ دو روزہ پر ہیں دھوکے بقا کے ہیں
محروم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم	جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں
کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی	اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

زندگی کے المناک پہلوؤں کو نظم کرنے کا جو ملکہ قدرت نے محروم کو ودیعت کر رکھا ہے۔ اس میں ان کا ایک مخصوص اور منفرد مقام ہے، جو کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں۔ آپ کے المیہ شاہپاروں میں یوں تو ہر نظم اپنے موضوع کی گہرائی اور زبان و بیان کی دلکشی کے اعتبار سے کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن "اشکِ حسرت" "دردناک منظر، کسی کے پھول، نومبر کی ایک صبح اور سوزِ دل تو اس پائے کی اثر انگیز اور غیر فانی نظمیں ہیں کہ انھیں پڑھ کر دل سے صبر و ضبط کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ ان شاہپاروں میں "نومبر کی ایک صبح" میں محروم کے فکر و فن کی دلکشی خاص طور سے نمایاں ہے۔

نومبر کی ایک صبح میں شاعر نے ابتدا میں مناظرِ شبانہ کی ایک دلکش اور نظر فریب کیفیت بیان کی ہے۔ لیکن اس رو پہلی اور مستانہ رات کی پرسکون فضاؤں میں خود شاعر کے لیے تسکین کا کوئی پہلو نہیں۔ عالم میں ہر طرف انوار کی بارش ہو رہی ہے۔ لیکن شاعر کے دلِ پر غم کا مہیب اندھیرا مسلط ہے۔ زندگی کے روشن اور تاریک

پہلوؤں کا یہ تقابل بڑا دردناک ہے۔ "ہر منظرِ شبانہ پہ آرام کی جھلک" لیکن شاعر کے غمکدے پر موت کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ اس کی رفیقۂ حیات زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اپنی دنیا یوں برباد ہوتے دیکھ کر اس پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں، اور اس کا نالۂ شب گیر شعر کے پیرائے میں ڈھل کر نظم کی صورت اختیار کر لیتا ہے ؎

ہوتی ہے خوشگوار نومبر کی رات کیا	وہ رات چاندنی ہو تو پھر اس کی بات کیا
لبریز نور سے طبقِ آسماں تمام	فیضِ مہ تمام سے روشن جہاں تمام
دل کش نظر فریب در و بام کی جھلک	ہر منظرِ شبانہ پہ آرام کی جھلک
جاں بخش بعد شدتِ گرما کی راحتیں	دلچسپ آمد آمد سرما کی راحتیں
چاروں طرف ہوا کی خموشی سکوں فزا	یک رنگیِ فضا کی خموشی سکوں فزا

ماحول کی یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد شاعر جب یہ کہتا ہے کہ

آدھی سے کچھ سوا شبِ ماتم تھی ڈھل چکی

تو دل پر اچانک غم کی ایسی چوٹ لگتی ہے کہ تمام کائنات فغاں بلب ہو کر رہ جاتی ہے۔ قاری کا دل جبرِ مشیت سے لرز جاتا ہے اور وہ اس ماتم خانۂ برنا و پیر کی بے ثباتی کا جانگداز منظر دیکھ کر ایک بیکراں غم میں ڈوب جاتا ہے۔ شاعر کی رفیقۂ حیات پر نزع کا عالم طاری ہے، وہ نہایت بے بسی کے عالم میں اپنے قصرِ آرزو کو برباد ہوتے دیکھ رہا ہے۔ یہ لمحہ شاعر کے لیے کچھ کم صبر آزما نہیں۔ اپنی وفا شعار بیوی کی نگاہِ واپسیں کا منظر اس سے دیکھا نہیں جاتا۔ اور موت کی ہچکیوں میں اس پیکرِ عصمت کا ہاتھ جوڑ کر اپنے سرتاج سے معافی طلب کرنا تو اس پر اور بھی قیامت ڈھاتا ہے۔ اس موقع پر شاعر کا غم اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔

آدھی سے کچھ سوا شبِ ماتم تھی ڈھل چکی	شمعِ امید آہ قریباً پگھل چکی
جب چارہ گر کو موت کا چارہ نہ مل سکا	مجھ کو بغیر یاس سہارا نہ مل سکا
حالت نگاہ نازِ پسیں کی نظر میں ہے	اک تیر تھا کہ آہ ابھی تک جگر میں ہے
حسرت بھری نگاہ کا پھرنا مری طرف	ہاتھوں کا آہ جوڑ کے وہ کرنا مری طرف

اور پھر شبِ مہتاب کی جلوہ باریوں میں جب کہ دنیا والے میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں شاعر کی شمعِ وفا کا شمعِ سحر سے پہلے ہی گل ہو جانا اور اس کے اپنے چاند کا غروبِ قمر سے پہلے ہی ڈوب جانا اتنا حسرت ناک

ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر پڑھنے والے کو اپنے دل پر قابو نہیں رہتا، اور وہ غم کے طوفان میں ڈوب کر یوں محسوس کرتا ہے کہ شاعر کا غم اس کا اپنا غم ہے۔ یہ جگر خراش المیہ خود شاعر کو جس رنگ میں متاثر کرتا ہے اس کا اظہار آخری تین شعروں میں کیا گیا ہے۔ شاعر کی محبت کا چاند غروب ہو جانے کے بعد آفتابِ قیامتِ ہجر کا طلوع ہونا نیچرل شاعری کی کتنی عمدہ مثال ہے۔

آخری بند پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر فرطِ غم سے دیوانہ ہو چکا ہے۔ اور اسے اب صرف موت کی آغوش ہی میں سکون مل سکتا ہے۔ درد و کرب کی بھر پور نمائندگی سے قطعِ نظر اس نظم میں مشرقی عورت کے جذبِ وفا کا ذکر جس پیرائے میں کیا گیا ہے وہ موجودہ دور کی مغرب زدہ خواتین کے لیے تازیانہ عبرت سے کم نہیں۔

زوروں پہ جلوۂ شبِ مہتاب تھا ابھی — مائل بخواب دیدۂ بے خواب تھا ابھی
وہ شمعِ گل تھی شمعِ سحر سے بھی پیشتر — ڈوبا وہ مہ غروبِ قمر سے بھی پیشتر
سورج چڑھا قیامتِ ہجرِ دوام کا — نظروں سے امتیاز مٹا صبح و شام کا
گو دم میں اپنے کثرتِ شیون سے دم نہ تھا — غم خانہ میرا عرصۂ محشر سے کم نہ تھا
مارا ہوا ہوں ایک نومبر کی صبح کا — ہے انتظار اب مجھے محشر کی صبح کا

شاعر پر یہ المیہ گزر جانے کے بعد عالم میں ہر طرف بہار کی تابانیاں بکھر جاتی ہیں۔ نونہالانِ چمن اودے اودے، نیلے نیلے اور پیلے پیلے پیرہن زیبِ تن کئے اہلِ نظر کو دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ حسنِ فطرت پورے جوبن پہ ہے۔ لیکن شاعر ابھی اپنی رفیقۂ حیات کے غم سے فارغ نہیں۔ ابھی موت کا مہیب تصور اس کے حواس کو مختل کئے ہوئے ہے۔ اس لیے گلشن میں کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر اس کا دل داغ داغ ہو جاتا ہے۔

گلشن کے پھول دل پہ مرے داغ دھر گئے — کانٹے تمام آہ جگر میں اتر گئے
سنتے تھے شاہدانِ لبِ جو نکھر گئے — ہم ان کے دیکھنے کو بہ مژگانِ تر گئے

اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے

محروم مدعا ہے باغِ جہاں میں حیف — گزری بہارِ عمر غمِ جاوداں میں حیف
پایا نہ فرق ہم نے بہار و خزاں میں حیف — ہیں صرف دل کے حوصلے آہ و فغاں میں حیف

اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے

ماتمِ جاناں میں آمدِ بہار کا جو ردِ عمل شاعر کے دل پر ہوا اس کی جگر دوز کیفیت آپ نے سن لی۔ لیکن ان

نالہ سامانیوں کے باوصف ابھی اس کے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا۔ ابھی اس کی روح کی گہرائیوں میں شورِ ماتم بپا ہے ابھی اس کا سوزِ جدائی برابر شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ اس ناشکیبائی اور پریشان خاطری کی ایک اور جھلک "سوزِ دل" میں دیکھیے ؎

پھر دلِ سوختہ مصروف فغاں ہوتا ہے ۔۔۔ ذکرِ سوزِ غم و اندوہ نہاں ہوتا ہے
کچھ خبر ہے تجھے شمشان کو جانے والی ۔۔۔ سوزِ فرقت سے بُرا حال یہاں ہوتا ہے
صبحدم یاد مجھے تیری چِتا آتی ہے ۔۔۔ شعلۂ سرخ جو مشرق میں عیاں ہوتا ہے
اور سرِ شام تری رونقِ طلعت کے بغیر ۔۔۔ غم کدے میں مرے وحشت کا سماں ہوتا ہے
تھا جلانا تو مجھے شمع بنایا ہوتا! ۔۔۔ یا وہ پروانہ جو محفل میں تپاں ہوتا ہے

آج محروم نکالے ہیں بہت گرم اشعار
دل جلوں کا یہی اندازِ بیاں ہوتا ہے

ہجرِ محبوب میں روتے روتے آخر ایک مقام پر پہنچ کر شاعر کا دل پتھر ہوجاتا ہے۔ غم کی حدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہوجاتے ہیں۔ کثرتِ آلام نے اسے بے حس بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر غم کی سیاہ رات طاری ہے، اب وہ آلام کی ایک ایسی تاریک دنیا میں ہے۔ جس میں اس عالم کے دن رات اور اس کے رنج و راحت کا دور دور تک پتہ نہیں۔ گویا موت نے شاعر کی متاعِ آرزو کو لوٹ کر اسے دنیا کی ہر خواہش سے مستغنی اور بے نیاز کر دیا ہے ؎

پیکانِ تمنا نہیں جاتا ہے جگر تک ۔۔۔ خوں ناب دل آتا نہیں اب دیدۂ تر تک
رہتا نہیں میں گوش بر آواز سحر تک ۔۔۔ اٹھتی نہیں مشرق کو دمِ صبح نظر تک

نومیدیٔ ما گردشِ ایام ندارد
روزے کہ سیاہ شد سحر و شام ندارد

عالم میں بدلتا رہے اوقات کا عالم ۔۔۔ رہتا ہے یہاں تو وہی ظلمات کا عالم
دیکھا نہیں امید کے لمعات کا عالم ۔۔۔ پیشِ نظر اب تک ہے وہی رات کا عالم

نومیدیٔ ما گردشِ ایام ندارد
روزے کہ سیاہ شد سحر و شام ندارد

اس طویل اشک باری اور ماتم سرائی کے بعد بالآخر ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب طوفانِ گریہ تھم جاتا ہے اور شاعر جبرِ مشیت کے آگے سپر انداز ہو کر ضبطِ فغاں پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مگر غم کا جو تیر اس کے سینے میں ترازو ہو چکا ہے۔ اس کی خلش مرتے دم تک نہیں جا سکتی۔ غم واندوہ کی اس جاودانی کیفیت کا اظہار ذیل کے قطعے میں ملاحظہ کیجیے ؎

بظاہر ہو چکا ماتم کسی کا ہوئے رو پیٹ کر خاموش آخر
دل بیتاب ہے اور غم کسی کا مگر دنیائے فانی میں ہوں جب تک

محروم کی حزنیہ شاعری پر اظہارِ خیالات کرتے ہوئے میں نے ان کے مجموعۂ کلام "گنجِ معانی" کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ موصوف کے شعری سرمائے میں دردِ غم کا موضوع اتنا ہمہ گیر ہے کہ پورے کلیات پر حاوی ہے، جابجا مضامین ومعانی کے دو شاہوار بکھرے پڑے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ حزنیہ افکار کے ان تابدار موتیوں کو سمیٹ کر مرتب صورت میں قارئین کے ذوقِ شعری کی نذر کروں اور ان کے دلوں کو سوز وگداز کی دولتِ بے بہا سے مالا مال کر دوں۔ لیکن طولِ کلام کا خدشہ دل ودماغ پر بے طرح مسلط ہوا جا رہا ہے۔ اس لیے میں دردِ گراں مایہ کی یہ روح پرور اور دل پذیر داستان بادلِ ناخواستہ یہیں ختم کرتا ہوں اور دست بدعا ہوں کہ اردو شاعری کا یہ محسنِ اعظم ابدالآباد تک سلامت رہے اور ہماری بزمِ شعر وسخن اس شمعِ روشن کی ضیا پاشیوں سے رہتی دنیا تک فیض یاب ہوتی رہے۔

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

عالم فتح پوری

تلوک چند محروم

بجھتے ہوئے چراغ بھی ہیں کام کے اثر
شمعیں نئی انھیں سے جلاتے چلے چلو
(اثر لکھنوی)

آج ہی نہیں بلکہ گزشتہ نصف صدی سے اور زبانوں کے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے شعراء، افسانہ نگار اور نقادانِ سخن بھی دو صفوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ ایک صف ان ادیبوں اور شاعروں کی ہے۔ جو "ادب برائے ادب" کے قائل ہیں۔ نثر و نظم، افسانہ و غزل، کسی صنف سخن میں بھی "خارجیت" کی نمائندگی نہ کرنے پر یہ عذر بھی نہیں کرتے کہ "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے" بلکہ ادب میں خارجیت کے اظہار کو کفر سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کو فنی اصولوں سے بغاوت اور گمراہی تصور کرتے ہیں۔ وہ آج بھی گل و بلبل کے ہم سفیر، شمع و پروانہ کے ہم مجلس اور چرخِ کج رفتار کے فریادی ہیں۔ وہ آج بھی غمِ جاناں سے تنگ آکر اس دنیا سے فرار اختیار کرنے کے آرزومند اور موت کو زیست پر ترجیح دینے والے مردہ فلسفۂ حیات کے قائل ہیں۔

دوسری صف ان فن کاروں اور کلاکاروں کی ہے جو اپنی تخلیقات کو زندگی کے ہر شعبہ کی خواہ وہ سماجی ہو یا سیاسی، معاشی ہو یا اقتصادی، معاشرتی ہو یا ادبی، عکاس تصور کرتے ہیں۔ ان کو تنگنائے غزل کا شکوہ ہے نہ بندش ردیف و قوافی کی شکایت، انھیں غم جاناں سے کہیں زیادہ غم دوراں نشاط انگیز نظر آتا ہے۔ وہ عصرِ حاضر کی غیر صحت مند روایات کے خلاف بغاوت کرنے، سائنٹیفک قدروں سے ادب کو مالا مال کرنے اور کش مکش زندگی سے سینہ سپر ہو کر کامیاب ہو نکلنے کے پیغام کو اپنی تخلیقات کا جزو اعظم تصور کرتے ہیں۔

صف دوم کے نظریات قابل قبول ہی نہیں بلکہ قابلِ تقلید و قابل احترام بھی۔ مگر ادبی کش مکش نے جو ہر دو صنفوں کے مابین عصبیت کی لہر اور اختلافات کی شدت کو جنم لیا ہے، اس کے نتائج ادب کے حق میں بے حد مہلک اور حد درجہ ضرر رساں ثابت ہو رہے ہیں۔

بے شمار تُک بند بطور فیشن صنف دوم میں شامل ہو کر غزل کے مزاج، نظم کے اہتمام، محاورے کی صحت، عروض کے مسلم قواعد اور تلفظ کی شیرینی کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان تھوتھے اور خام کار خود

ساختہ ترقی پسند قلم فرساؤں نے اپنے کلاسیکل ادب کا مطالعہ کرنا خود پر حرام کرلیا ہے۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کلاسیکس کے پڑھنے والے بغیر اپنے عظیم و قدیم ادب سے بے بہرہ رہ کر ایک قدم بھی ترقی کی جانب نہیں بڑھایا جا سکتا ہے ہمارا کلاسیکل ادب ایک دولت ہے۔ ایک رہبر کامل ہے۔ ایک منارۂ علم و ترقی ہے جس کی اعانت اور نشاندہی کے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھنا گم گشتگی اور گمراہی سے کم نہیں۔ کاش ہمارے نوآموزانِ ادب اور علم بردارانِ ترقی پسندی پر یہ حقیقت روشن ہو سکتی۔

ادبی کش مکش کے اس دور میں جسے میر کے الفاظ میں "نازک" کہا جا سکتا ہے دونوں ہاتھوں سے دستار تھامنے کے باوجود دستار کی خیریت مشکوک ہے۔ مگر اسی دور میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے جو اپنی ادبی تجلیوں اور فنی عظمتوں کے ساتھ ہر دو محور بالاقبیل پر محیط نظر آتی ہے۔ وہ ایک برزخِ ادب کی مانند ہے جو دونوں صفوں میں شامل اور دونوں سے علاحدہ ہے۔ وہ شخصیت ایک ایسے رواں دواں سرچشمہ علم و فکر کے مانند ہے جو ہر طبقہ اور ہر علاقہ کے پُرپیچ اور مہیب راستوں سے جو فلسفۂ نظریات کے اختلافات کی پیداوار ہیں۔ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ گزر کر کل کے ادبی گلستان کو شاداب کرتا ہوا آج کے نئے تجربوں اور نئی ادبی جدلیاتی قدروں کے چمنستانِ ادب کو سرسبز کر رہا ہے۔

وہ ادبی عظیم شخصیت بلا مبالغہ تلوک چند محروم کی ہے۔ محروم ہی ایک ایسا صاحب طرز، ژولیدہ نظر فن کار ہے جس کی زندگی میں اس کی تخلیقات کلاسیکس میں شمار کی جاتی ہیں۔

محروم میں احساس کمتری یا برتری دونوں نہیں۔ وہ ہر مکتبِ فکر و نظر کے قابلِ قدر فن کاروں کا مداح اور ہر مدرسۂ علم و دانش کی بالغ النظر افراد کی صلاحیتوں اور کاوشوں کا قدردان ہے۔

محروم کی شاعرانہ شخصیت ایک بزرگ پیر مدرسہ جیسی ہے۔ محروم نے ہماری پیڑھی کے شاعر کو مدرسہ کی چہار دیواری سے انگلی پکڑ کر آبادیوں اور انجمنوں کی سیر کرائی۔ پھر کھلی ہوئی فضاؤں میں لے جا کر نہ صرف کوہ و دمن۔ دشت و بیاباں کنارِ دریا و لب جوئبار کے قدرتی مناظر کی سیر کرائی بلکہ ان مناظر سے جو بادی النظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اپنے فکر و نظر کی گہرائیوں میں ڈوب کر فلسفۂ موت و حیات اور وجودِ مطلق کے روشن اور بیّن ثبوت پیش کر کے حقائق سے روشناس کرایا۔ محروم نے جو منظر جتنا حسین و دلفریب تھا اس کے بیان کے لیے اتنا ہی لطیف اور حسین پیرایۂ زبان و بیان وضع کیا۔ جو واقعہ جتنا المناک اور جاں گداز پایا اس کے لیے اتنا ہی پُرتاثیر اندازِ بیان اختیار کیا۔ وہ ہمیں ان تمام حسین اور دل کش راہوں سے گزر کر عصرِ حاضر کی بدلتی ہوئی ادبی قدروں اور حیات کی جدلیاتی تحریکات کے قریب تر لے آیا۔

محروم کا تخلص ان کی شخصیت پر غالب ہے۔ اس زندگی میں قدم قدم پر انھیں محرومیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔

اپنی قاتلِ دل معصوم بیٹی کی اچانک موت کے غم اور اپنی شریکِ حیات کی جدائی کے جاں گداز تاثر نے ان کی محروم زندگی کو اور زیادہ محروم بنا دیا۔ وہ سراپا درد اور مجسم غم بن کر رہ گئے۔ وہ ہر اس شئے میں جو بظاہر نشاط و مسرت کی آئینہ دار ہو ایک جانگداز غم کا رخ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ ان کی زبان سے ہر نغمہ سوزِ بے پایاں کا امانتدار بن کر نکلتا ہے۔ جو تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔ وہ تاثیرِ جاوداں جو شاعری کا جزوِ اعظم ہے ان کی زندگی کی شکستوں کی ناکامیوں سے پیدا ہو کر لازوال حقیقت بن گئی ہے۔

محروم عصرِ حاضر کی شاعرانہ گٹھ بندیوں اور پارٹی بازیوں سے دور اور پروپیگنڈے کے سیلاب سے بے تعلق ہیں نہ محروم کے پیچھے شاگردوں کی فوج ہے جو ان کی استادی اور پختہ کاری کا ڈھنڈورہ پیٹتی پھرے۔ پھر بھی محروم کی صلاحیتوں اور فنی چابکدستی کا یہ انعام ہے، اور ان کی خاموش ادبی خدمت کا یہ صلہ ہے کہ محروم آج علم و ادب کی قندیلِ روشن بن کر نہ صرف پنجاب ہی کے گوشہ گوشہ میں اجالا کر رہے ہیں بلکہ اردو دنیا میں ایک پائندہ و تابندہ منارۂ علم و ادب بن کر چمک رہے ہیں۔

کسی بھی شاعر کی تخلیقات کا تذکرہ، تنقید یا مقدمہ لکھتے وقت مضمون میں شاعر کے اشعار بطور نمونہ پیش کرنا ایک رسمی طریقہ بن گیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس طرح لکھنے والے کو اپنے حسنِ انتخاب کی خوش سلیقگی کا اظہار مقصود ہو یا شاعر کو یقین دہانی کرانا ضروری سمجھا گیا ہو کہ صاحبِ مضمون نے اس کے کلام کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ اکثر کہنے والے تذکرہ لکھتے یا ریفرینس دیتے وقت ایسے مقدموں یا تذکروں کے منتخب اشعار ہی پر اکتفا کر لیتے ہیں اور اس طرح شاعر کے مکمل کلام کا مطالعہ نہیں ہونے پاتا۔ لہٰذا میں دانستہ طور پر محروم کے کسی ایک شعر کو بھی نقل کرنا نہیں چاہتا۔ چاہتا یہ ہوں کہ اہلِ علم اور اربابِ فن میری اس مختصر اور تشنہ تحریر کو پڑھ کر محروم کے فرموداتِ عالیہ پر گہری نگاہ ڈالیں اور خود فیصلہ کریں کہ یہ چند سطور مبالغہ آمیزی یا مدح سرائی سے پاک ہیں یا نہیں اور اپنی تشنگی محروم کے میکدہ کی اس بادۂ صد رنگ و ہزار آتشہ سے بجھائیں جس کے کیف و سرور کے اکبر و اقبال جیسے شعراء اور سر عبدالقادر اور مولوی عبدالحق جیسے متبحر ادیب و نقاد مدح سرا ہیں۔

شعر

زندگی کیا ہے غمِ ہجر کا طوفانِ عظیم
موت کیا ہے اسی طوفاں کا فرو ہو جانا

محروم

وارث کرمانی

تلوک چند محروم

یہ کتاب اردو کے مشہور اور بزرگ شاعر حضرت تلوک چند محروم پر لکھے ہوئے مختلف مضامین، تبصروں اور تعارفوں کا مجموعہ ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے ان مضامین کو کتابی شکل میں ترتیب دے کر حضرت محروم اور اردو زبان دونوں کے لائق فرزند ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ پچھلے تیس سال کی طویل مدت میں شمالی ہندوستان کے مختلف حصوں سے ذی علم حضرات نے جس جس طرح کلامِ محروم پر اپنی رائے پیش کی ہے اور جس افادیت و اہمیت کا اسے حامل ٹھہرایا ہے وہ سب یکجا ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے۔ اس سے ایک طرف جناب محروم کی شخصیت اور فن نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے، دوسری طرف اردو تنقید کی ایک دستاویز بھی تیار ہو جاتی ہے۔ جس میں ہر مکتبِ خیال اور ہر عمر کے لکھنے والوں کی رائیں محفوظ ہیں۔

سر عبدالقادر اور جوش ملسیانی جیسے بزرگ ادیبوں سے لے کر اردو زبان کے تازہ ادیب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تک بیشتر اہلِ قلم اس میں شامل ہیں۔ آخر میں خود مرتب کا ایک مضمون بھی ہے۔ جو "نقوش" کے شخصیات نمبر میں آچکا ہے مضامین کی ندرت اور فکر و نظر کی تگ و تاز کا قدم قدم پر احساس ہوتا ہے۔ ان تنقیدوں میں پرانے اور نئے اندازِ فکر کا خوشگوار امتزاج ہے۔ حضرت جوش ملسیانی کے لہجے میں نسیم صبح گاہی کی خنکی اور زبان و بیان کا شکوہ ہے۔ پرمان سنگھ، مانک رام اور عطاء اللہ کلیم کے مضامین میں جدید علمی نظریات کی جھلک ملتی ہے۔ لیکن طرزِ تحریر میں وہ کھردراپن نہیں جو اکثر جدید لکھنے والوں میں پایا جاتا ہے۔ جے کشن چودھری نے کلامِ محروم میں موت اور غم کے عناصر پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس سے پیدا ہونے والی کشمکش کو بے نقاب کیا ہے۔ تاجور سامری نے محروم صاحب سے اپنے ذاتی تعلق اور عقیدت کو بڑی معصومیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کافی شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے وطن پرستی اور آزادی کے رجحانات کو نمایاں کیا ہے۔ آخر میں جگن ناتھ کا مضمون ہے جسے پڑھ کر ایک فرشتہ خصلت انسان کی تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ یہ انسان جو نصف صدی تک حوادثِ روزگار کے تھپیڑے کھاتا رہا، لیکن حق و انصاف اور انسان دوستی کے جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہوا۔ اس مضمون سے محروم صاحب کے کلام کو سمجھنے اور جدید نظریات سے اس کا محاکمہ کرنے میں بھی بڑی مدد ملے گی۔

محروم صاحب اردو ادب میں اپنی جگہ حاصل کر چکے ہیں۔ ان پر بہت سے ادیبوں اور نقادوں نے مضامین بھی لکھے ہیں، جیسا کہ اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ابھی ان پر لکھنے کی گنجائش باقی ہے زیر نظر مضامین میں زیادہ تر ان کی خصوصیاتِ کلام کو ظاہر کیا گیا ہے۔ جس کے ثبوت میں مختلف اشعار پیش کئے گئے ہیں انھیں غمِ حریت اور وطن دوستی کا شاعر ثابت کیا گیا ہے یا زیادہ سے زیادہ معلم اخلاق بتایا گیا ہے۔

اس اندازِ نقد میں مقصدیت پسندی کی طرف جھکاؤ ملتا ہے۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے وطن آزادی اور اخلاق پر نظمیں کہی ہیں۔ شراب کی برائی کی ہے، نوجوانوں کو تادیب و تنبیہہ کی ہے لیکن یہ ان کی شاعری کا زیادہ بہتر حصہ نہیں۔ اسے ہر ناقد کو تسلیم کرنے میں جھجک محسوس ہوئی ہے۔ حالانکہ اس میں کوئی گھبرانے کی بات نہیں تھی۔ ہر شاعر کے یہاں اس کے کلام کا کافی بڑا حصہ قابل انتخاب نہیں ہوتا۔ میر، ذوق، فراق اور نہ جانے کتنے شاعروں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ محروم صاحب بھی اس سے مبرا نہیں بلکہ انھیں پڑھ کر انگریزی زبان کے مشہور شاعر ورڈز ورتھ (WORDS WORTH) کی بے ساختہ یاد آجاتی ہے۔ وہی تعلیم و تبلیغ اور وہی حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ ورڈز ورتھ کے کلام کے انتہائی قلیل حصہ کو چھوڑ کر باقی سب مولوی کے وعظ کی طرح بے کیف و بدمزا ہے۔ تاہم میتھیو آرنلڈ نے اسے انگریزی زبان کا تیسرا سب سے بڑا شاعر مانا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ محروم صاحب کی اصلاحی شاعری پر نقادوں کو زیادہ اصرار نہ کرنا چاہیے بلکہ اس چیز کی تلاش کرنا چاہیے جسے مڈلٹن مرے نے خالص شاعری (PURE POETRY) کہا ہے۔ یہ خالص شاعری محروم کے یہاں موجود ہے اور یہی ان کے کلام کا عطر ہے۔ محروم کو صرف رنج و غم کا شاعر کہنا بھی صحیح نہیں۔ ان کے کلام میں ایک دیوقامت انسان نظر آتا ہے۔ جس نے پنجاب کے ریگ زاروں میں پرورش پائی ہے۔ اس کے چہرے پر آندھیوں اور سیلابوں نے خراشیں ڈال دی ہیں زمانے کی کڑی دھوپ نے رنگ کو سونلا دیا ہے۔ لیکن اس کا زورِ طبیعت فطرت کے ان سرکش مظاہر میں بھی سرگرم عمل ہے۔ اس کی جوانی میں لکھنؤ کا بانکپن نہیں بلکہ تاتاریوں کا خروش ہے۔ اس لحاظ سے محروم کا غم بھی تندو تیز اور وسیع و عریض ہے۔ غم کا ردِ عمل توانا شخصیتوں ہی میں نمودار ہوتا ہے۔ فردوسی نے ہنگامۂ جنگ و جدل کے علاوہ جہاں کہیں بھی غمناک داستان چھیڑی ہے اسی وسعت و پہنائی کا احساس ہوتا ہے۔ محروم کی ایک اور نظم "آندھی" بھی اس توانائی کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے اگرچہ اس کا غم سے تعلق نہیں۔ ان نظموں میں حیاتی شدت اپنے عروج پر ہے۔ جس کے سبب سے الفاظ کی نشست میں فصاحت اور موسیقی اور آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔

(ہماری زبان علی گڑھ)

۸ / نومبر ۱۹۵۹ء

عبدالرشید نقاد
صدر مدرس مدرسہ سلطانیہ کنگ

مراسلہ

۸ نومبر کے "ہماری زبان" میں "تلوک چند محروم" پر تبصرہ کرتے ہوئے وارث کرمانی صاحب نے "کیف اور مزے" کی جو توضیح کی ہے وہ درست نہیں ہے۔ فرمایا ہے۔

"ورڈزورتھ" کے کلام کے انتہائی قلیل حصے کو چھوڑ کر باقی سب مولوی کے وعظ کی طرح بے کیف اور بدمزا ہے۔"

اخیر کا لفظ "بدمزا" آپ نے "بے کیف" کی توضیح اور بیان کے لیے استعمال کیا ہے۔ حالانکہ دونوں الفاظ مترادف میں سے نہیں ہیں بلکہ اضداد سے ہیں۔ بے کیف کے معنی ہیں کسی کیف کا نہ ہونا۔ یعنی کسی مزے کی عدم موجودگی اور بدمزا تو وہ کیف ہے جو خوش مزا نہ ہو۔ تو مطلب یہ ہوا کہ بے کیف بھی ہے اور باکیف بھی ہے۔ ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

کرمانی صاحب نے اضداد سے ترادف کا کام لینا چاہا ہے جو سراسر غلط ہے۔ "بے کیف" کی توضیح کے لیے آپ کو لفظ "بے مزا" لانا چاہیے تھا۔ کلامِ محروم اور کلامِ ورڈزورتھ کے لیے جو سراسر تعلیم و تبلیغ اور تنبیہ و تادیب کا خزانہ ہے یہ لفظ "بے مزا" کتنا موزوں اور مناسب ہے اس کا اندازہ تو کچھ ذوقِ سخن رکھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ انسانی شرافت بالخصوص جب کہ وہ علوم و فنون سے آراستہ ہو اخلاقیات اور اصلاحیات کو گو وہ اپنے نفس کو تسکین دینے والے کیف سے خالی ہوں "بدمزا" کیوں کر قرار دے سکتے ہیں۔ بدمزا سے تو طبیعت کو نفرت ہوتی ہے۔ ناک بھوں چڑھ جاتے ہیں۔ ممکن ہے کرمانی صاحب کے لیے ان کے اصلاحی کلام میں کسی وجہ سے کوئی لذت اور مزا کا سامان موجود نہ ہو۔ لیکن ان پاکیزہ خیالات کو "بدمزا" کہنا ورڈزورتھ یا محروم کی عمر بھر کی کمائی اور زندگی بھر کی دل سوزی اور جگر پاشی کا جو یقیناً کسی کیف و لذت سے سرشار ہونے ہی کا نتیجہ ہے۔ بڑی بے دردی کے ساتھ مضحکہ اڑانا ہے۔ کرمانی صاحب اگر اس کا دعویٰ کریں کہ اس قسم کا کلام ہر ذوق کے لیے "بدمزا" ہے تو یہ سراسر حقیقت سے چشم پوشی ہے۔

رہا "بے کیف" تو اس کے متعلق گزارش ہے کہ سوائے ذات خداوندی کے کوئی شے بھی مخلوقات میں سے

خالی نہیں۔ اشیاء مختلف ہیں تو اس لحاظ سے کیف بھی مختلف ہوگا۔ بلکہ ایک ہی جنس کے مختلف افراد کے کیف میں تنوع کا موجود ہونا رات دن کا تجربہ ہے۔ تو شعرا کے کلام "بے کیف" یا کیف سے خالی کیسے کہے جا سکتے ہیں۔ البتہ اصنافِ کلام کے اعتبار سے کیف میں تنوع کا ہونا لازمی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر ذوق ہر ایک کلام سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ اقبال اور محروم یا ورڈزورتھ کے کلام سے کیف اندوز اور لذت یاب ہونے والا اگر داغ اور جگر کے کلام میں کوئی کیف اور مزا حاصل نہ کرے تو کیا اس کو یہ کہنے کا حق ہے کہ داغ اور جگر کا کلام "بے کیف" اور "بدمزا" ہے تو اس وقت کرمانی صاحب بھی یہی فرمائیں گے کہ بھائی تمہارے ذوق میں ان شعرار کے کلام سے کیف اندوز ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ کرمانی صاحب نے جہاں اپنی رائے پیش کی ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے "میرا ذاتی خیال ہے کہ محروم صاحب کی اصلاحی شاعری پر نقادوں کو زیادہ اصرار نہ کرنا چاہیے" تو اس پر ہمیں یا کسی شخص کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس کی مخالفت یا تردید کرے۔ مگر انداز نقد و تبصرہ تو بتا رہا ہے کہ "بے کیف اور بدمزا" کہہ کر آپ ادارے اور ادیبوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

کرمانی صاحب نے محض اپنے ذوق کے اعتبار سے نقادانِ کلام محروم پر عینیت پسندی کی طرف جھکاؤ" کا الزام لگایا ہے اور مولوی کا وعظ" بھی اسی بنا پر آپ کے لیے "بے کیف اور بدمزا" ہے۔

افسوس ہے کہ آپ کو کبھی اس کوچے سے گزرنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ ورنہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ جو لوگ اس صلاحیت سے بہرہ مند ہیں۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ بعض وقت ایک گھنٹہ نہیں دو گھنٹے نہیں مشاہدہ شاہد ہے کہ لگاتار چار چار پانچ پانچ گھنٹوں تک ہمہ تن گوش و ہوش بن کر ساکت و صامت واعظ کے وعظ میں محو رہے ہیں پھر بھی حسرت رہ گئی ہے اور پیاس نہیں بجھی ہے۔ یہ مولوی کے وعظ" میں کیف ہی کا تو کرشمہ ہے یا اس کے سوا اور کچھ؟ طوالت مانع ہے ورنہ وعظ کے کیف سے متاثر ہونے والوں کے بے شمار تاریخی واقعات گنائے جا سکتے ہیں۔

کسا نیکہ یزداں پرستی کنند
بآواز دولاب مستی کنند

ایک صاحب دل کا واقعہ کتابوں میں لکھا ہے کہ چلے جا رہے ہیں لوہار کے ہتھوڑے کی آواز سے وجد میں آگئے اور رقص کرنے لگے۔ کرمانی صاحب کس کیف کی تلاش میں ہیں؟ آپ کا "بے کیف" نہ حقیقت ہی پر صحیح اترتا ہے نہ مجاز پر۔

(ہماری زبان علی گڑھ ۸، دسمبر ۱۹۶۳ء)

مفتوں کوئٹی

محروم کی ایک غزل

ایک فارسی گو استاد نے کیا خوب کہا ہے ؎

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی زآفتاب　　　لعل گردد در بدخشاں یا عقیقے در یمن

"دانائے راز" ہونے کے لیے انسان کو ایک عمر چاہیے۔ زندگی کے نشیب و فراز، زمانہ کے گرم و سرد اور انقلابات کے اتار چڑھاؤ ایک نہیں، کئی بیت جاتے ہیں۔ مختلف بھٹیوں میں زندگی تپتی ہے۔ متعدد طوفانوں اور حادثوں کے تھپیڑے کھانے پڑتے ہیں۔ پھر کہیں انسان اس قابل ہو پاتا ہے کہ بصیرت و شعور سے نوازا جائے۔ اس کے نظریات میں ٹھہراؤ اور اس کے مشاہدات میں جماؤ پیدا ہو۔ تجربات پھر اسے وہ پختگی و مشاقی عطا کرتے ہیں کہ حالات و حادثات کے اسباب و نتائج تک اس کی نظر عام لوگوں کی نظروں سے بہت پہلے پہنچ جاتی ہے۔ ایسی ہستیاں قابلِ قدر ہوتی ہیں ایسی شخصیتوں کی عظمت کے لیے دل خواہ مخواہ جھکا پڑتا ہے۔ وہ نئے راہ چلنے والوں کے لیے رہبرِ منزل ہوتے ہیں۔ اور نوآموزوں کے لیے استادِ کامل۔ ان کا وجود بطور خود ادارہ ہوتا ہے۔ ایک انجمن ایک مکتبِ فکر، جس فن کی وادیوں میں فن کار اپنی عمر گزار چکا ہوتا ہے، اس فن کو اپنی کافی جگر کاویاں اور دماغ سوزیاں نذر کئے ہوئے ہوتا ہے ادھر فن بھی کئی بصیرتوں اور حقیقتوں سے اسے لذت آشنا کر دیتا ہے، ہر راہ کھل جاتی ہے اور ہر راز اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی زندگی کار آگہانہ ہوتی ہے۔ اس کا کوئی قدم بے خبرانہ نہیں اٹھتا۔ دونوں کی تابانی و درخشانی ایک دوسرے کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ فن، فنکار سے عروج حاصل کرتا ہے۔ اور فن کار کو فن حیاتِ جاوید بخش دیتا ہے اگر کوئی یہ کہے ؎

بہ دریا در منافع بے شمار است　　　اگر خواہی سلامت برکنار است

تو اس تجربے کو سرسری ارادے سے نہیں ٹالا جا سکتا۔ ان الفاظ میں کہنے والے کا برسوں کا مشاہدہ و مطالعہ موجود ہے۔ ایک عمر تجربہ و تجزیہ میں گزاری گئی ہے۔ پھر کہیں وقت نے یہ شعر شاعر کی زبان سے کہلوایا ہے۔ اس سے کہنے والے کے مقام کی بلندی اور منصب کی بزرگی کا پتہ چلا۔ ساتھ ہی جس زبان میں یہ کہا گیا ہے اس کے خزانہ میں ایک انمول موتی کا

اضافہ ہوا۔ فن اور فن کار، ادب اور ادیب دونوں کی شان و عظمت نے جلا پائی۔ جناب تلوک چند محروم بھی عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں تجربہ و مشاہدہ نے انھیں وہ مقام بخش دیا ہے کہ ان کی معمولی گفتگو کے فقرے بھی ضرب المثل کا کام دے سکتے ہیں۔ اگر وہ کہیں کہ ؎

سفر کرتے ہوئے منزل بہ منزل جارہے ہیں ہم مجھے یہ ساری دنیا کارواں معلوم ہوتی ہے

تو اسے اتفاقی حادثہ نہ سمجھیے۔ اس شعر کے پس پشت شاعر کی وسیع معلومات مخفی ہے۔ برسوں کا غور و خوض کار فرما ہے ایک عمر کا مطالعہ و مشاہدہ موجود ہے۔ شعر و ادب میں انھوں نے عمر کھپائی ہے۔ رات کا آرام اور دن کا چین حرام کیا ہے۔ اس کی روایات سے آگہی اور حکایات سے وابستگی پیدا کی ہے۔ اس کے جمال و کمال سے اپنے دل و دماغ کو منور کیا ہے۔ فن نے انھیں بہت کچھ دیا ہے اور اب وہ اس مقام و منصب پر ہیں کہ اس کے خزانوں میں بیش بہا جواہر پاروں کا اضافہ کر سکیں۔ اپنی ذہانت و ذکاوت سے اس کے نقوش و خطوط کو وہ جلا بخشیں کہ فن اس پر ناز کرے اور فخر سے اپنا سر بلند کر سکے۔ اخذ و قبول کے اثرات فن اور فن کار دونوں پر نمایاں ہیں۔ وہ اپنے فن سے آسمانِ شہرت پر جگمگا رہے ہیں، ادھر فن ان کے خونِ جگر سے رنگ و آرائش کے اعلیٰ مدارج میں دمک رہا ہے۔ میں ان کی ایک غزل پیش کر رہا ہوں جس سے اربابِ ذوق پر ظاہر ہو سکے کہ فن کو فن کار نے کیا دیا اور فن کار نے فن سے کیا حاصل کیا۔

شہر سے ایک طرف دور بہت آج رویا دل مہجور بہت

اردو اصنافِ ادب میں غزل ایک مخصوص زبان و بیان چاہتی ہے، عاشقانہ جذبات و واردات اس کی زینت ہیں۔ محبت بھری گفتگو، دھیما دھیما لہجہ، رکا رکا سا انداز، کچھ بات کچھ اشارات، عرض حال بھی مودبانہ اور شکوہ و شکایت بھی عقیدت مندانہ۔ جو کچھ کہا جائے آدابِ عاشقی کے تحت۔ تسلیم و رضا کی پابندیاں ساتھ میں لیے ہوئے۔ ان سانچوں میں ڈھال کر اگر کوئی بات کہی گئی تو وہ غزل کی زبان میں ہے۔ ورنہ انداز بیان کی اور صورتیں، دیگر اصناف سخن میں جگہ پا جائیں گی۔ غزل سے ان کا واسطہ نہ ہوگا۔ غزل کا یہ مطلع کتنے حسن اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ ہے۔ لیکن ایک بھی بیکار نہیں۔ اور یہ مطلع کا بڑا حسن ہے۔ یہ فن کارانہ مشاقی اور ماہرانہ چابک دستی کی دلیل ہے۔ برسوں کے ریاض سے ایسا تحکم پیدا ہوتا ہے، ورنہ اس وادی میں بالعموم لوگ بھٹکتے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ ہر مصرع کا ہر لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے۔ کوئی لفظ بے کار و زوائد نہیں، اور پھر ایسی موزوں نشست پر موجود ہے کہ اس کے بجائے دوسرا لفظ رکھیے موزوں نہ بیٹھ سکے گا۔ مجبور قافیہ میں آیا ہے۔ لیکن دل کے ساتھ مہجور نے آکر شعر کو بڑا پاکیزہ، پُر مغز اور بامعنی بنا دیا ہے۔ اس سے دل کے رونے کا سبب بھی معلوم ہو گیا کہ دل فرقت زدگی کے باعث

انتہائے رنج وملال میں رویا ہے۔ دل مجبور کے بجائے دل رنجور پڑھیے، پھر دل مجبور کی قدر وقیمت معلوم ہوگی۔ آج رویا دلِ مجبور بہت، میں "بہت" کی تشریح ذرا اس شعر میں دیکھیے ؎

اے جوشِ الم کب تک گریہ، دل آج تو ڈوبا جاتا ہے
موجیں ہیں کہ بڑھتی جاتی ہیں طوفاں ہے کہ امڈا آتا ہے
(دل شاہجہاں پوری)

یہ سب کچھ لفظ "بہت" میں سمو دیا گیا ہے۔ 'آج رویا دلِ مجبور بہت' کا لہجہ کتنا درد انگیز اور ہمدردانہ ہے۔ "آج" کے تعین نے کیسی تخصیص پیدا کردی ہے۔ دل روتا تو روز ہے۔ لیکن "آج" تو وہ بہت ہی رویا —— پھر آج رونا آدابِ عاشقی کے تمام لوازمات کے ساتھ ہے۔ محبوب کی بدنامی و رسوائی کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ شہر سے ایک طرف بہت دور جاکر دل رو رہا ہے، تاکہ بھڑاس بھی نکل جائے۔ اور کوئی واقف حال بھی نہ ہوسکے۔ ورنہ یہ دنیا ہے، رائی کا پربت، اور تل کا پہاڑ بن جاتا ہے۔ قدم قدم پر رسوائی کا اندیشہ ہے۔ پھر انسان اپنی رسوائی گوارا کرلے، محبوب کی رسوائی اسے کیوں کر گوارا ہوسکتی ہے۔

یہ نقوش ایسے ہی جہیا نہیں ہوجاتے۔ اس رکھ رکھاؤ کے لیے ایک عمر کی مشاقی ضروری ہے۔ یہ فنی پختگی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ دل و دماغ کا تمام خون نچڑ جاتا ہے۔ خیال و بیان کی پرپیچ وادیوں اور پُرخطر راہوں سے گزر کرآنا پڑتا ہے۔ پھر کہیں ایک ایسا شاہکار ہاتھ آتا ہے جس پر بلاغت بھی ناز کرتی ہے اور فصاحت بھی فخر کرتی ہے، پھر ملاحظہ کیجیے ؎

شہر سے ایک طرف دور بہت　　آج رویا دلِ مجبور بہت

اب اگلا شعر قابلِ ملاحظہ ہے ؎

دور ہے صبحِ شبِ غم اے دل!　　ہے ستاروں میں ابھی نور بہت

بے تابئ دل شبِ غم میں صبح کی منتظر ہے۔ اسے رات بھاری ہے۔ ایک ایک لمحہ بارِ گراں ہے۔ بڑی ناگواری اور بارخاطری سے گزر رہا ہے۔ کب رات ختم ہو۔ کب صبح ہو، لیکن صبح ہے کہ نمودار نہیں ہوپاتی۔ ابھی ستارے چمک رہے ہیں اور کافی نور اور روشنی کے ساتھ، مشاہدۂ فطرت کی خوگری دیکھیے، ستاروں میں زیادہ نور نظر آرہا ہے اس لیے نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ابھی رات بہت ہے، یہ "نظر" اربابِ شعور ہی کو حاصل ہوتی ہے ہر اک کو نہیں۔ اس شعر میں بھی کوئی لفظ زائد نہیں، اور اپنی نشست پر ایسا جما ہوا ہے کہ اس کا بدل ممکن نہیں۔ سہلِ ممتنع اور کس کو کہتے ہیں۔ درحقیقت بڑا پُرنور شعر ہے۔

ہجر کی رات کاٹنے والے　　کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
(عزیز لکھنوی)

اس میں شاعر کا پہلو یاس انگیز ہوگیا ہے، ظاہراً اور صریحاً۔

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے ۔۔۔ اے دردِ ہجر! تو ہی بتا کتنی رات ہے (فراق گورکھپوری)

اس شعر میں شاعر نے کچھ اور عالم پیدا کر دیا ہے۔ لیکن جناب محروم نے جس اسلوب سے شعر کہا ہے اور جو باتیں اس میں مخفی رکھی ہیں خواہ یاس انگیزی ہو یا بے تابی، اس کی مثال نہیں ہو سکتی۔ پھر دل سے تخاطب ساتھ ہی اندازِ بیان کی ندرت! قربان جائیے، ایک دفعہ پھر اس شعر کو پڑھئے، اور اس کی روشنی میں اس کے مخفی پہلوؤں پر نظر دوڑائیے دل سے بے ساختہ داد نکل آئے گی۔

دور ہے صبح شبِ غم، اے دل ۔۔۔ ہے ستاروں میں ابھی نور بہت

کس کو منظور تھا رسوا ہونا ۔۔۔ دل کے ہاتھوں ہوئے مجبور بہت

بے شک راہِ عاشقی میں انسان دل کے ہاتھوں بڑا بے بس ہوتا ہے۔ عقل و دانش اس راستے میں کوئی رہنمائی نہیں کرتے انھیں بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے، اور دل دیوانہ کے کہنے پر چلنا پڑتا ہے ؎

عقل و دانش سے تو کچھ کام نہ نکلا اپنا ۔۔۔ کب تک آخر دل دیوانہ کا کہنا نہ کریں (وحشت کلکتوی)

پاسبانِ عقل کی زیادہ نگرانی نہ گوارا ہو سکتی ہے نہ کوئی نتیجہ خیز۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ دل سے یہ دور ہو جایا کرے

بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل ۔۔۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

(اقبالؔ)

خواہ بربادی ہو خواہ رسوائی۔ طریقِ عشق میں دل ہی رہنمائی کا سہارا ہوتا ہے ؎

طریقِ عشق میں ہے رہنما دل ۔۔۔ پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل (میرؔ)

لیکن جب باگ ڈور دل کے ہاتھوں آجاتی ہے، تو پھر یہ حضرت ایسا کھل کھیلتے ہیں کہ خدا کی پناہ! ناک میں دم آجاتا ہے۔ کلیجہ پک اٹھتا ہے۔

کلیجہ پک گیا میں کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے
ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس میں خیالِ خام رہتا ہے (امیر محمد اثر)

کلیجہ پکنے اور خیالِ خام کے موجود رہنے کی لفظی صنعتوں سے قطعِ نظر، شعر کے تیور کتنی بیزاری اور مجبوری لیے ہوئے ہیں۔ جلال کا یہ شعر بھی انھیں تیوروں کا حامل ہے ؎

دل سے تنگ آئے ہیں ہم جوش جنوں کا کیسا؛ یوں گریباں نہیں کیا پھاڑتے ؟ سودا کیسا؟

رسوائی کس کو منظور ہوتی ہے۔ دل کے ہاتھوں ہی انسان مجبور ہوتا ہے" بہت" ردیف یہاں بھی اپنا کمال دکھا رہی ہے۔ عاشق کی بے بسی کا نقشہ ہو بہو نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہی تو وہ فن کارانہ کمال ہے جو مشاق و پختگی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ یہ نقوش خونِ جگر سے مکمل ہوتے ہیں۔ یہی خیال داغ کے یہاں ملاحظہ کیجیے۔ لیکن ان کا رنگ و اسلوب، ان کا لب و لہجہ اپنا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے داغ سب یہ حضرت دل کے سلوک ہیں جو کچھ کہا جناب نے رسوا کیا مجھے

شکوہ و شکایت کی یہ جھلاہٹ مرحوم کے یہاں بڑی دبی دبی سی ہے پاسِ عاشقی اور آدابِ محبت کے لحاظ کے ساتھ ساتھ رسوائی کا سبب۔ بڑی معذوری اور بے بسی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ؎

کس کو منظور تھا رسوا ہونا دل کے ہاتھوں ہوئے مجبور بہت

اگلے شعر کا مفہوم دیکھیے اور اس کا اندازِ بیان ملاحظہ کیجیے ؎

موت ایام جوانی میں بھی نظر آتی تھی مگر دور بہت

جوانی مستی و سرشاری کا زمانہ ہوتا ہے ع جوانی ہے کہ اک سیلاب رنگ و بو کا دھارا ہے۔ نہال سیوہاروی کے نزدیک یہ وقت ارمانوں کی آندھی کا وقت ہوتا ہے ؎

نام ہے کیا اسی ہنگامہ کا آغازِ شباب ایک آندھی سی چلی آتی ہے ارمانوں کی

پیری اور اس کے بعد موت۔ جوانی کا انجام ہے۔ جوانی چھاؤں کی طرح گزرنے والی چیز ہے۔ ایک موجِ نسیم ہے کہ ادھر آئی اور ادھر گئی ؎

اے ہم نفس نہ پوچھ جوانی کا ماجرا موجِ نسیم تھی اِدھر آئی ادھر گئی (محروم)

جوانی کو موجِ نسیم بتا کر ہم نفس سے تخاطب شاعرانہ فن کاری ہے۔ لیکن شباب و جوانی کی یہ حقیقتیں اس عالم میں نہیں سوجھتیں۔ سیماب نے ایک شعر میں اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؎

جوانی خواب کی سی بات ہے دنیائے فانی میں مگر یہ بات کس کو یاد رہتی ہے جوانی میں

جوانی کا نشہ جب تک چڑھا رہتا ہے مآل و انجام پر نظر نہیں پہنچتی۔ عاقبت بینی اور دور اندیشی تصور کو بھی اِدھر لے آتی ہے۔ مثلاً ؎

آیا تھا ساتھ لے کے محبت کی آفتیں جائے گا جان لے کے زمانہ شباب کا

لیکن یہ عارضی خیال اور گریز پا جھلک ہوتی ہے۔ بالکل اجنبی، بالکل غیر متعلق، مرحوم صاحب کے کہنے کے انداز کے قربان جائیے۔ اس بات کو کس اسلوب سے ادا کیا ہے ۔

موت ایام جوانی میں بھی نظر آتی تھی مگر دور بہت

ردیف یہاں بھی مزا دے رہی ہے۔ یہی شاعرانہ مشاقی و مہارت کی دلیل ہے۔

فطرتِ حسن میں یہ عیب نہ تھا کر دیا عشق نے مغرور بہت

عشق ہی تو حسن کو خود بین و خود شناس بنا دیتا ہے ع چاہنے والے ہی کم بخت سکھا دیتے ہیں۔ ورنہ حسن تو اپنے غمزہ و ناز سے بیگانہ محض ہوتا ہے۔

عشق والے دیکھنا کیا کیا بنا دیں گے اسے حسن سادہ ہے ابھی، بے عشوہ و بے ناز ہے

اول تو جوانی حسن کو بہکانے کا سبب بنتی ہے ۔

یہ ناز یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھے کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

پھر عشاق کی مدح گزاری اور قصیدہ خوانی حسن کے دل میں وہ چنگاری پیدا کر دیتی ہے کہ آگے چل کر وہ آتش غرور بن کر بھڑک اٹھتی ہے۔

انداز بیان کا ایک پہلو یہ بھی تو دیکھیے کہ فطرت حسن کو غرور و ناز سے بہت دور بتایا گیا ہے۔ ان خراب عادتوں کی تخلیق کا الزام عشق نے اپنے سر لیا ہے۔ حسن اس الزام سے مبرا ہے۔

ایک عارفانہ شعر ملاحظہ کیجیے ۔

منحصر وادیٔ سینا پہ نہیں جذبِ موسیٰ ہو اگر طور بہت

نظر چاہیے، شوقِ نظارہ کی ضرورت ہے۔ جذبۂ دید موجود ہو تو اس کی طور افروزیاں ہر جگہ نظر آئیں گی شرار سنگ میں اس کی ضو پاشیاں موجود ہیں۔ ع ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار ۔

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا (خواجہ میر درد)

کمی ہے تو صرف نظر کی ہے، نظارہ کی نہیں ع

جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

طورِ کلیم کی تخصیص کوئی خاص تخصیص نہیں۔ طور سینا ہی اس کی جلوہ پاشی کا مرکز نہیں۔ نظر میں لائیے اور ہر جگہ اس کا نظارہ کر لیجیے۔

اس موقع پر ریاض خیرآبادی کا شعر لکھنے کو جی چاہتا ہے جو انھوں نے اپنے خاص انداز بیان میں کہا ہے
شعر کی لطافتوں سے اہل ذوق خود لطف اندوز ہوں گے۔ اب تک جو اشعار میں نے درج کئے ہیں اس سے میری
مراد کوئی مقابلہ آرائی نہیں، نہ کسی شاعر کی برتری و کمتری مقصود ہے۔ ایک ہی موضوع پر مختلف شاعروں کی فکر
آرائیاں دکھانی مقصود ہیں تاکہ اہل نظر ان سے محظوظ ہوسکیں۔ ریاض فرماتے ہیں ؎

نہ رو کے طور تو ہم جائیں عرش سے اونچے — ہماری راہ سے پتھر ذرا ہٹا دینا

اگلا شعر۔

ایک ہی دار کے قابل نکلا — یوں تو کہنے کو ہیں منصور بہت

جھوٹے عاشقوں اور جھوٹے دعویداروں کا راز کس طور پر فاش کیا ہے ؎

ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند — کانرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

نخشب چارچوی کا یہ اردو شعر اس کا ترجمہ ہے ؎

کوئی ان کو سمجھ بھی لے تو پھر سمجھا نہیں سکتا — جو اس حد پر پہنچ جاتا ہے وہ خاموش رہتا ہے

دارورسن کے معیار پر اترنے والے منصور آج عنقا ہیں ؎

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا — ہر مدعی کے واسطے دارورسن کہاں (رند)

خلوص وصداقت کی کمیابی کس بہترین انداز میں بیان کی گئی ہے۔ منصور ہونے کو تو بہت ہیں، لیکن دار کے
قابل اب تک صرف ایک ہی منصور نکل سکا ہے۔ عاشقوں کی اس کمیابی پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔
مقطع استادانہ اطوار کا حامل ہے۔ محروم سے فائدہ اٹھائے گئے ہیں ؎

تم کو کس رنج نے مارا محروم — کہ نظر آتے ہو رنجور بہت

خود نے رنج وغم کا اظہار نہیں کیا ہے، دیکھنے والا ہی دریافت پر مجبور ہوا ہے۔ یہاں تو آئین ضبط ووفا کی
مکمل پابندی ہے۔ لیکن عشق ومحبت نے حالت وہ بنادی ہے کہ چھپائے نہیں چھپتی۔ رنج کے مارے ہوئے نظر آتے
ہیں۔ ہمدردی وغمگساری کرنے والا خود چیخ اٹھتا ہے کہ نظر آتے ہو رنجور بہت۔ ردیف ہر شعر میں ایسی پیوست
ہے کہ اصل شعر کا جزو خاص بن کر رہ گئی ہے، یہ استادانہ کمال ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ وہ نقوش ہیں
جن کا رنگ جاودانی ہے۔ جن کی چمک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی اردو ادب ان نقوش سے زندہ وپائندہ
رہے گا۔ غزل ان رنگینیوں اور خوش جمالیوں سے ہمیشہ پُر بہار رہے گی، اور فن کار اس فردوس میں

بقائے دوام کے جھولے جھولتا رہے گا۔

رباعیات

بیادگارِ اقبال

اقبال کی موت پر بپا ماتم ہے
اے اہلِ وطن! بہت بڑا ماتم ہے
نغموں سے کہو کہ آج نالے بن جائیں
رضوانِ ریاضِ شعر کا ماتم ہے

تھی باعثِ نازشِ وطن ذات تری
وہ ذات تھی مجمعِ کمالات تری
ہر بات تری تھی بہر تزئینِ عمل
اقبالِ سخن طراز کیا بات تری

اونچا سب سے کہیں ترا مسلک تھا
اوجِ اہلِ یقیں ترا مسلک تھا
آتی ہے صدا بانگِ درا سے پیہم
حبِ وطن اولین ترا مسلک تھا

روشن کیا خوب نامِ مشرق تو نے
کردی پر نور شامِ مشرق تُو نے
اے شاعرِ بے مثال! صدیوں کے بعد
مغرب کو دیا پیامِ مشرق تُو نے

ایقان کو پستی سے نکالا تُو نے
اور اس کو دیا مقام بالا تُو نے
کرتے ہیں ہم وطن کی جس میں پوجا
تعمیر کیا ہے وہ شوالا تُو نے

کم تر ہے حکیمِ ہند اگر تجھ کو کہوں
یا لعلِ گلیمِ ہند اگر تجھ کو کہوں
اللہ سے ہم سخن ہُوا تُو اکثر
زیبا ہے کلیمِ ہند اگر تجھ کو کہوں

محرومؔ

انور صابری

تلوک چند محروم

وطنِ عزیز کی علم ریز اور ادب خیز سرزمین ہمیشہ ان شخصیتوں کو جنم دیتی رہی ہے جن کی تاریخِ حیات کا ہر ورق کائنات کے لیے باعثِ فخر و ناز ہو۔ ۱۸۵۷ء کی انقلاب انگیز کروٹوں کے بعد سمجھا یہ جا رہا تھا کہ حکومت کے ساتھ علم و ادب کا بھی جنازہ نکل چکا ہے، اور اب ہم ان تخلیقاتِ فکر و خیال سے بہرہ مند نہ ہو سکیں گے۔ جن پر عظمتِ ہندوستان کا دار و مدار ہے۔ لیکن گردشِ ایام کی چند یورشوں کا دور ختم ہوتے ہی ذہنی "عروج و ارتقا" کی راہیں خود بخود پیدا ہوتی شروع ہوئیں۔ بجھے بجھے ضمیروں میں زندگی کی روشنی ابھرنے لگی۔ تفکر کی پژمردہ کلیوں میں جان آنے لگی۔ اور ۱۹۰۱ء سے جب منظر اپنے پس منظر کو صاف کر کے سامنے آیا تو شعور و دانش کی پھلواریاں بہار دینے لگیں۔ موسمِ گل کا نیا فیضان دلّی اور لکھنؤ تک محدود نہ رہا۔ اس کی وسعتیں پنجاب کے شمالی اضلاع اور صوبہ سرحد تک پہنچیں۔ غیر ملکی اقتدار کے خلاف باغیانہ جذبات مٹے نہ تھے۔ سینوں میں ان کی خراشیں دبی دبی کراہوں کو دعوت ترجمانی دیتی رہیں۔ گفتگو کا لب و لہجہ بدل گیا۔ غیر مبہم اندازِ بیان کے عوض "اشاراتی" انداز نے نظم و غزل پر چھانا شروع کیا۔ وقت کی آوازیں سازِ حسن و عشق کے پردوں کو گدگدانے لگیں۔ روحوں کے تاروں سے جو نغمے ابلے وہ ہر طرف پھیلے تو حقیقی تاثرات سے گوشِ وطن کو آشنا کرتے گئے۔ غزل ان فضاؤں میں بے حد ممد و معاون ہوئی۔

علامہ تلوک چند محروم نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی۔ فطری تقاضوں کی صلاحیت نے جادۂ حیات کی جانب رخ موڑا۔ میانوالی کی علاقائی شجاعت مندی شریکِ طبیعت تھی۔ ذوقِ علم اور شوقِ عمل دونوں ہم آہنگ ہو گئے۔ پاکیزگیٔ نفس دانش کی راہوں میں خضرِ منزل بنی۔ اس لیے جرأتِ گفتار اور معصومی کردار کا شریف ہیولیٰ ان کے خیالات کے خاکوں میں گھل مل گیا۔

وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ابتدائے نگارش سے وطن، عظمتِ وطن، آزادیٔ وطن، اور جذبۂ حبِ وطن کو اپنایا ان کی وہ تمام نظمیں جو اس زمانے کے آغوش میں رونما ہوئیں انھیں جذبات سے معمور نظر آتی ہیں۔ وہ روایتی محبوب کے نہیں حقیقی محبوب کے عاشق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں جنسی تحریک سے قریب ہو کر گزرنے والی لفظی لچک موجود نہیں۔ وہ جس کوچۂ سخن سے ہو کر گزرے اسے اگلے کاروانِ شعر و ادب کے لیے شاہراہ فکر و خیال بناتے گئے۔

حیات کا جو معنوی تصور ان کے دماغ میں تھا آج تک اسی کے مطابق تلاشِ الفاظ میں ان کو کامیابی نصیب ہوتی رہی۔

"سوز و کرب اور درد و گداز" کی وہ زندۂ جاوید تصویر ہیں۔ ان کے یہاں ان کیفیات کے باوجود نالہ و شیون نہیں آہنگِ استغنا ہے وہ برساتی نالوں کی تیز روی کے قائل نہیں۔ ان کے کلام میں نرم خرام دریا کی موجوں کا تحمل و وقار ہے۔

خیام الہند حضرت امجد حیدر آبادی مرحوم نے مجھ سے دورانِ قیام حیدر آباد میں کئی بار فرمایا کہ تلوک چند محروم کی رباعیات کا گہراؤ مجھے بہت پسند ہے اور میں کسی نہ کسی حد تک انھیں کا مقلد ہوں۔"

اس سے بڑی سندِ فضیلت میرے نزدیک اور کیا ہو سکتی تھی۔ حضرت امجد مرحوم کو "مرقد نور جہاں پر محروم کی اشک افشانی" مدتوں رلاتی رہی۔ انھوں نے ایک مرتبہ مجھے خط میں لکھا کہ اس نظم میں محروم نے لفظوں کے ہیر پھیر میں حقائق کو گم نہیں کیا بلکہ جو کچھ دیکھا اسی کو حقیقی خد و خال میں پیش کر دیا۔

اس شعر پر وہ گھنٹوں سر دھنا کرتے تھے۔

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی ہوتی ہے مگر یوں سر صحرا نہیں ہوتی

شاید ہی کوئی صنف کلام ایسی ہو جس پر محروم کے قلم نے جوہرِ فن نہ دکھائے ہوں۔ نظم کا معیار بلند، غزل میں اسلاف کا شکوہ فکر و خیال، رباعیات میں لافانی کیف و نشاط۔ قطعات میں زندگی کا مکمل جائزۂ شعور۔ ان کے گنجِ معانی میں ہر گوہر نایاب علم و فن آپ کو ملے گا۔ جو ہر شناس نگاہ ان موتیوں سے اپنا دامن ہر وقت بھر سکتی ہے۔

علم و فن اور دانش و حکمت کے اس قدر عظیم خزانے کا مالک ہوتے ہوئے بھی قبلہ محروم صاحب عجب و تکبر، انانیت و غرور کی راہوں سے یکسر الگ رہ کر چلتے ہیں۔ میں ان کی خاکِ پا کے ذروں سے بھی حقیر ہوں۔ لیکن جس شفقت و محبت اور احترام کے ساتھ وہ ملتے ہیں اس سے ان کے قصرِ عظمت کی تعمیر خلاؤں کے بجائے دلوں میں اونچی ہوتی رہی ہے۔ کسی کا اچھا شعر سنیں گے تو داد میں بخل سے کام نہ لیں گے۔ ہمت افزائی کی ادا کبھی زندگی سے جدا نہیں ہوتی۔ نظر گہری۔ خیال ہمہ گیر، مشاہدہ کی قوت بے مثال ہے۔ اس لیے جب چاہتے ہیں اپنے متعینہ موضوع کلام پر روانی کے کمالات دکھا دیتے ہیں۔

آج کے دور میں عام طور پر شاعر وہ باتیں موزوں فرماتے ہیں جو ان کی زندگی پر کبھی طاری نہیں ہوتیں۔ لیکن حضرت محروم کے کسی شعر کو آپ ان کی زندگی سے الگ نہیں کر سکتے۔ خدا انھیں تا دیر زندہ رکھے۔ وہ جب تک زندہ ہیں،

علم وفن اور شعروادب کے لیے عرش پیما ضمانت ہیں۔ برے شعر پر پیشانی کے پراسرار نقوش اور اچھے شعر پر ان کے ہونٹوں کا حسین تبسم اربابِ نظر کو فیصلہ کرنے میں خاص مدد دیتا ہے۔

میرے نزدیک وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اپنی زبان سے کسی کے لیے کبھی کوئی نامناسب لفظ استعمال نہیں کیا یہ خوبی آسانی سے قدرت عطا نہیں کرتی۔

محروم کی زندگی، کلام، تجربات اور خدمت نہ کبھی فنا ہو سکے ہیں اور نہ کبھی فنا ہو سکتے ہیں۔ وہ جس طرح آج زندہ ہیں، ابد تک زندہ رہیں گے۔ ہم اگر ان کی ابدی خصوصیات وحیات سے فائدہ نہیں اٹھا سکے تو یہ ہماری بدقسمتی کی آخری دلیل ہے۔

غزل

خزاں سے پیشتر سارا چمن برباد ہوتا ہے
غضب ہوتا ہے جب خود باغباں صیاد ہوتا ہے

تجھے اِس پر گمانِ نغمہ اے صیاد ہوتا ہے
قفس میں نالہ کش مُرغِ گلستاں زاد ہوتا ہے

خوشی کے بعد اک تو ہی نہیں ہے مُبتلائے غم
یونہی اکثر جہاں میں، اے دلِ ناشاد ہوتا ہے

روا رکھتا ہے وہ بیداد پہلے اپنی فطرت پر
جو انساں دوسرے پر مائل بیداد ہوتا ہے

جو کرتا ہے نثارِ نوعِ انساں اپنی ہستی کو
وہ انساں افتخارِ عالمِ ایجاد ہوتا ہے

مرے اشعار کی توصیف ہوتی ہے مرے ہوتے
نہیں معلوم میرے بعد کیا ارشاد ہوتا ہے

نہ کر محرومؔ تُو فکرِ سخن، اب فکرِ عقبےٰ کر
نوا پرداز بزمِ شعر میں آزاد ہوتا ہے

محرومؔ

محمد رضا انصاری

کاروانِ وطن

"کاروانِ وطن" اردو کے ممتاز اور بزرگ شاعر حضرت تلوک چند محروم کی ان سیاسی نظموں کا مجموعہ ہے جن میں بڑی آسانی کے ساتھ ہندوستان کی پچاس سالہ سیاسی تاریخ کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اگرچہ اس مجموعے میں ہر نظم کے ساتھ اس کے عہد کا تعین نہیں کیا گیا ہے، پھر بھی ملکی سیاست میں عملی دلچسپی لینے والوں میں "حوصلہ افزا یادوں" کی حیثیت سے اور تاریخِ سیاستِ وطن کا مطالعہ کرنے والی نسل کے لیے ایک اہم سیاسی دستاویز کی حیثیت سے یہ نظمیں زندہ اور پائندہ رہیں گی۔

حضرت محروم کی سیاسی شاعری، نمائش اور اسٹیجوں کی زیبائش کے جذبے کے بالکل برعکس اس اندرونی بے چینی کا نتیجہ ہے، جب دلِ شاعر اظہارِ خیال سے لاچار ہو کر کھولتا اور پیچ و تاب کھاتا اور بالآخر پھوٹ پڑتا ہے۔

بقول مولانا حالی کے پکے ہوئے پھل کا ٹپک پڑنے والا رس جس طرح لذیذ اور خوش گوار ہوتا ہے اسی طرح وہ شعر بھی زیادہ پر اثر دل نشین ہوتا ہے جو "لایا" نہ گیا ہو، بے اختیار "آ گیا" ہو۔

حضرت محروم نے سیاسی موضوع پر جو کچھ کہا ہے اس میں "لانے" کی کوشش کا دور دور پتہ نہیں چلتا حقیقت یہ ہے کہ حضرت محروم کی زندگی کی مصلحتیں ایک طرف اور سرزمین پنجاب پر خاص طور پر کی جانے والی برطانوی سیاست دوسری طرف ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ سوائے ایسے شخص کے جو جذبہ حب وطن سے بے چین ہو کر کفن بردوش دار و رسن کی طرف بڑھ سکتا ہو کوئی اور ایسی سیاسی شاعری کر سکے جس میں نادر شاہ کے دلّی کے قتل عام سے جلیانوالہ باغ کے قتال جنرل ڈائر کی سفاکی کو عظیم تر بہ ہوں قرار دے۔

"کاروانِ وطن" سے ظاہر ہے کہ نصف صدی پر مشتمل ملکی سیاست کی تاریخ کا کوئی چھوٹا بڑا واقعہ ایسا نہیں ہے جس پر حضرت محروم نے پورے سیاسی احساس کے ساتھ شاعرانہ انداز میں اظہارِ خیال نہ کیا ہو۔

تحریکِ خلافت کے زمانے میں مسلمان محبانِ وطن کو اسیرِ زنداں پا کر محروم صاحب نے "زندانیوں کی عید" کہی اور بھگت سنگھ کی پھانسی پر "دیکھ اے ہلالِ شام" اکالیوں کے نظریۂ عدم تشدد قبول کر لینے پر اکالی آغاز میں پاکستان پنجاب کے "صوفی اللہ داد خاں" جنھوں نے عیسیٰ خیل میں سخت ہنگاموں کے زمانے میں انسانیت کی شمع فروزاں

رکھی، وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن سے سیاست سے کہیں زیادہ خود حضرت محروم کی وسیع المشربی اور اعلیٰ ظرفی کا اثر طبیعتیں قبول کریں گی۔

حضرت محروم کی سیاسی نظموں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کا سیاسی شعور اس وقت بھی پوری طرح بیدار اور نکتہ شناس تھا جب سیاسی ماحول جذباتی اور ہیجانی عالم میں مستقبل کے صحیح تصور سے بالکل بے نیاز معلوم ہوتا تھا۔

علامہ نیاز فتحپوری نے "کاروانِ وطن" کے آغاز میں "حرفے چند" کے تحت لکھا ہے کہ "جب میں نے دیکھا کہ وہ (محروم صاحب) ۱۹۰۶ء میں بھی، جب کہ ان کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ اور میری ۲۱ سال کی، اپنی ایک وطنی نظم میں اتنی اونچی بات سوچ سکتے تھے کہ

اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کر دے

تو میں اپنے اندر بڑا احساس کمتری پاتا ہوں کیوں کہ اس وقت کیا اس وقت بھی یہ بات میرے ذہن میں نہیں آسکتی کہ کوئی نوجوان شاعر حسن و عشق کے علاوہ کچھ اور سوچ بھی سکتا ہے۔ اور محض سوچنا ہی نہیں بلکہ حد درجہ خلوص وصداقت کے ساتھ کہہ بھی سکتا ہے۔ یہی "حد درجہ خلوص وصداقت" حضرت محروم کی پوری شاعری کا وہ امتیاز ہے جسے نہ صرف "کاروانِ وطن" بلکہ "گنجِ معانی" اور "رباعیاتِ محروم" میں بھی بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

اشعار

وہی ارمان، جیتے جی، جو مشکل سے نکلتے ہیں
بہ شکلِ آہ و فریاد و فغاں دل سے نکلتے ہیں

کسی میں حوصلہ ہوتا ہے طوفانوں سے لڑنے کا
سفینے یوں تو سب دامانِ ساحل سے نکلتے ہیں

ہمارے ہم سفر ہم مکدر ہیں بس اِتنے پر
کہ ہم بچ کر غبارِ راہِ منزل سے نکلتے ہیں

غضب ہے اے زمیں، تو اِن حسینوں کو نگل جائے
جو حسن ضو فشاں ہیں ماہِ کامل سے نکلتے ہیں

محروم

پروفیسر عبدالباقی ایم۔ اے

تلوک چند محروم

تلوک چند محروم صرف ایک شاعر کا نام اور تخلص نہیں ہے جو ہندوستان و پاکستان کا ایک کہنہ مشق بالغ النظر اور حقیقت پسند شاعر ہے بلکہ ایک خوبصورت کتاب کا نام ہے جو ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ نے شائع کی ہے اور جس کے مؤلف محروم صاحب کے لائق فرزند جگن ناتھ آزاد ہیں۔ کتاب میں بہت کچھ ہے اور سر عبدالقادر کا ایک چلتا ہوا مقدمہ اور علامہ پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی کی تقریظ بھی ہے جو کتاب کے وزن میں اضافہ کرتی ہے اور تبرکات معنوی سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی بہم پہنچاتی ہے۔

پھر بھی ہم جناب جگن ناتھ آزاد سے کہنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے والد محترم اور ہندوستان کے ایسے شاعر سے پورا انصاف نہیں کیا۔ جس نے برصغیر ہند کی کم و بیش دو نسلوں کو زندگی اور توانائی بخشی ہے۔ اس اعتبار سے جگن ناتھ آزاد صاحب کا مقالہ جو اب سے کئی برس پہلے "نقوش" لاہور کے شخصیات نمبر کے لیے لکھا گیا تھا۔ تشنہ اور ناکافی ہے۔ "نقوش" کے شخصیات نمبر کے لیے یہ مقالہ موزوں ہو سکتا ہے لیکن زیر نظر کتاب کے لیے کچھ اور چاہیے تھا۔ ایک سفینہ چاہیے تھا اس بحر بیکراں کے لیے، جو افسوس ہے کہ جگن ناتھ آزاد ایسا لائق فرزند بھی نہ بہم پہنچا سکا۔ کتاب تو چھپ گئی اور اچھی چھپی، لیکن محروم صاحب کی پوری فن کاری کا جب تک جائزہ نہ لیا جائے اور قدیم و جدید شاعری میں ان کی شاعری کا مقام نہ دکھایا جائے۔ اس وقت تک مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اور زیر نظر کتاب کی افادیت محدود ہو جاتی ہے۔ جگن ناتھ آزاد صاحب نے غضب یہ کیا ہے کہ اپنے مقالہ میں کچھ غیر ضروری باتیں بھی لکھ دی ہیں جن کا تعلق خواہ مخواہ ہندو مسلم سوال سے ہو جاتا ہے۔ آزاد صاحب نے اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہے پھر بھی اپنے والد محترم سے ایسی باتیں منسوب کر دی ہیں جو نہ منسوب کی جاتیں، تو اردو شاعری کا کچھ نقصان نہ ہوتا۔ کسی رسالہ کے خاص نمبر کے لیے یہ باتیں ضروری ہو سکتی ہیں، لیکن کسی مستقل تالیف کے لیے بالکل غیر ضروری ہیں۔ سر عبدالقادر کا فرمودہ بھی بس چل چلاؤ کی ایک بات ہے۔ ورنہ کلام محروم کے لیے اس سے بہت زیادہ سنجیدہ مطالعہ کی ضرورت ہے، کلام محروم کے سمجھنے کے لیے اقبال اور محروم کا موازناتی مطالعہ بھی

ضروری ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں جگن ناتھ آزاد کو لکھنا چاہیے تھا۔

بہر حال زیرِ نظر کتاب اچھی ہے لیکن کلامِ محروم کو ابھی اور کتابوں کی ضرورت ہے اور ہمیں امید ہے کہ جگن ناتھ آزاد صاحب یہ ضرورت پوری کریں گے ابھی فرضِ کفایہ بھی ادا نہیں ہوا۔

غزل

خنجر بدست ہے وہ بتِ شنگ آج کل
چھڑنے کو ہند میں ہے کوئی جنگ آج کل

ممکن ہے مر گیا ہو ترا وحشیِ حزیں
لڑکوں کے ہاتھ میں جو نہیں سنگ آج کل

کس مست ناز کے لب لعلیں کو دیکھ کر
پانی ہے شرم سے مئے گل رنگ آج کل

لیتا ہے نام ونگ کی مستوں کے سامنے
ناصح جو آبرو سے ہے کچھ تنگ آج کل

اس گل کی بو صبا! نفس دوست، اے صبا
غنچے سے بھی زیادہ ہوں دل تنگ آج کل

الفت بھی چل رہی ہے زمانے کے ساتھ ساتھ
اگلے سے عاشقی کے نہیں ڈھنگ آج کل

بزمِ سخن کا رنگ ہے پھیکا پڑا ہوا
محروم کیوں خموش ہے نیرنگ[1] آج کل

محروم

---

[1] میر غلام بھیک نیرنگ انبالوی جن کا کلام مخزن میں شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ غزل بھی مخزن میں شائع ہوئی تھی۔

تاجور سامری

امن اور انسانیت کا شاعر ــــ محروم

منشی تلوک چند محروم آدھی صدی سے بھی زیادہ مدت سے ہمارے ملک کی ادبی فضا کو سریلے اور دل نواز ترانوں سے معمور کئے ہوئے ہیں اور ابھی تک ان کے سازِ شعر کی تخلیقی قوت قائم و تازہ ہے۔ اور خلوص، محبت اور تاثیر کے ترانے ہمارے ذہنوں اور دلوں کو جلا دے رہے ہیں۔

محروم صاحب کے متعلق عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے نظم زیادہ کہی ہے غزل کم۔ لیکن "گنج معانی" کے دوسرے ایڈیشن اور "شعلۂ نوا" کی اشاعت کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ غزل کے دامن پر محروم صاحب کی گلکاریاں بھی کسی دوسرے بڑے شاعر سے کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ بلکہ انھوں نے ہر صنفِ شعر کو اپنے خیال اور جذبے کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

جس طرح ان کی شاعری میں اصناف اور ہیئت کی رنگارنگی اور حسن کا وفور ہے اسی طرح ان کی شاعری میں کئی رجحان پائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک رجحان وطن پرستی کا بھی ہے۔ ان کی یہ وطن پرستی ہے تو روایتی، لیکن اقبال کی وطنیت پرستی کی طرح منفی نہیں ہے۔ محروم کی وطن پرستی صالح اور مثبت ہے۔ اور یہ رنگ ابھی تک قائم ہے۔ جب کہ اقبال منفی اور جارحانہ وطن پرستی (جس کی مثال ان کی مشہور نظم "ہندوستان ہمارا ہے" جس میں دوسرے ملکوں کو حقیر بنایا ہے) پر بھی قائم نہیں رہے اور انھوں نے منفی اور جارحانہ بین الاقوامیت کا نظریہ بھی اپنا لیا تھا۔ اس معکوس ارتقار کا باعث تھا اقبال کا ایک خاص طبقہ کے مفاد کا حامی ہو جانا۔ بلاشبہ محروم صاحب کا کوئی واضح نظریہ نہیں بن سکا۔ حالات ہی ایسے رہے کہ وہ کسی سماجی اور سیاسی نظریہ کو اپنا نہ سکے۔ لیکن انسان کے ساتھ محبت اور دوستی کا جذبہ ان کے ہاں لامحدود ہے۔ جہاں اقبال جدید قوموں اور مذہبوں کو انسانی سماج میں بدامنی اور خرابی کا مجرم ٹھہراتے ہیں وہاں محروم کے ہاں عام طور سے انسان دوستی اور رواداری ہے۔ وہ بین الاقوامی ذہن نہ رکھتے ہوئے بھی ایک عالم گیر جذبۂ محبت کے پیامبر ہیں۔ انسان دوستی اور محبت جس کو امن پسندی یا صلح پسندی کا نام دینا زیادہ موزوں ہوگا۔ ان کی ساری سماجی مذہبی اور عملی زندگی کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہی رجحان ان کی شاعری کا اہم ترین پہلو ہے۔

امن پسندی اور راحت کی تمنا انسان ہی کو نہیں، پرندوں اور حیوانوں کو بھی مضطرب رکھتی ہے۔ جنگ، انتشار بدامنی، زندگی کے ہر پہلو کو بُری طرح متاثر کرتے ہیں۔ اس لیے ان سے ہر کوئی نفرت کرتا ہے۔ پچھلی دو بڑی لڑائیوں نے انسان کو لرزا دیا ہے۔ شاید آج اسی لیے امن کا سمبل فاختہ کو بنا دیا گیا ہے۔ اس کا کارن یہ ہے کہ فاختہ نہ صرف امن پسند ہے بلکہ جارحانہ تشدد کا مقابلہ بھی کرتی ہے۔

یورپ کے سامراجیوں نے اپنے بازار کو تنگ پاکر دوسرے ملکوں کی آبادیوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے جنگ کا ہتھیار اپنایا۔ قریب کی دو جنگوں نے پوری انسانیت کو ایک بھاری خوف اور خطرے میں مبتلا کر دیا ہے۔ سامراجی اب تیسری جنگ چھیڑنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے ساری دنیا میں جنگ کے خلاف آندولن چلا رکھا ہے۔ اس عالم گیر آندولن کا سمبل فاختہ ہے جس کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے۔ چڑیا، کبوتر یا فاختہ بہت امن پسند واقع ہوئے ہیں خاص طور سے کبوتر نہ بیچارا تو انتہائی شریف ہے، اور عام طور سے اس کی یہ شرافت تو بزدلی کی حدوں کو چھو لیتی ہے۔ اس کی امن پسندی کوئی تعمیری روح اپنے اندر نہیں رکھتی۔ البتہ فاختہ کے امن پسند کردار میں ایک خصوصیت ہے۔ وہ اپنے چاروں طرف امن و سکون کی خواہاں ہے۔ لیکن جب اس کے امن میں کوئی خلل انداز ہوتا ہے تو وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتی کہ اس کا اپنا وجود ظالم کے مقابلے میں کتنا حقیر عنصر اور کمزور ہے، وہ ایک طوفانی جذبے سے اس پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ اس دفاعی حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے بازیا کوا میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ عوام کا بھی بالکل یہی کردار ہے۔ اسی لیے فاختہ کو امن کا سمبل بنایا گیا ہے۔

محروم کی شاعری میں امن پسند فاختہ ذرا خفیف صورت میں اپنی امن پسندی اور حفاظت خود اختیاری کے طوفانی جذبے کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن محروم کی شاعری کی روح بھی دو کردار رکھتی ہے۔ امن پسندی، سکون اور زندگی سے محبت کرتی ہوئی اور حملہ آوروں اور ظالموں کے سامنے سینہ سپر ہوتی ہوئی، لیکن یہ کردار اپنے حالات کے زیر اثر شدت اختیار نہیں کر سکا، مصلحت آمیز رہا۔

سب سے پہلے ان کی شاعری کی امن پسند روح پر نظر ڈالیے اور اس کے لیے زیادہ تلاش اور زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کے کلام کی طرف متوجہ ہوتے ہی لہلہاتے کھیتوں، مترنم ندیوں، جوئباروں، برف پوش پہاڑوں کی دل کش دنیا نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ کہیں دودھیا بھور ہے.. جو امرت برساتی زندگی کے ترانے گاتی اپنے دامن میں پرندوں کے سنگیت اور ندیوں، آبشاروں کے زمزمے لیے جلوہ گر ہوتی ہے۔ کہیں شام ہے جس کے شفق گوں آنچل میں انوکھے مناظر نظر آتے ہیں کچھ رات کے حسین روپ، کہیں چاندنی رات ہے تو کہیں اندھیری تاروں بھری رات ہے۔

جہاں ایک اور ہی قسم کا سکون اور خیال آفرینی کا سماں چھایا نظر آتا ہے۔ ایک امن پسند کے لیے یہی سماں جنت ہے۔ اور اسی کو وہ اپنی زندگی کا آدرش مانتا ہے۔

ذرا دیکھیے کلام محروم کی فاختہ اس دنیا کو کس نظریے سے دیکھتی ہے۔ ایک صبح کا منظر یوں شروع ہوتا ہے۔

بہار سحر سے جہاں شادماں ہے
شفق سے فلک تختۂ ارغواں ہے — زمیں روکشِ ساختِ گلستاں ہے
مسرت سے لبریز سارا جہاں ہے
سہانا سہانا سحر کا سماں ہے

پیام مسرت صبا لے کے آئی — ہنسے پھول ہر اک کلی مسکرائی
شگوفے ہوئے مائل لب کشائی — طیورِ چمن محو رنگین نوائی
ہجوم طرب باغ کے درمیاں ہے
سہانا سہانا سحر کا سماں ہے

جب سورج نکل آتا ہے تو اس کی سنہری دھوپ سے دنیا جگمگا اٹھتی ہے۔ ایسا لگتا ہے اس سے محروم صاحب کی روح کے سمندر میں بھی روشنی کا طوفان آجاتا ہے۔

چمکتا ہے سورج دمکتی ہے دنیا — بھکتی ہیں موجیں دمکتے ہیں دریا
چٹکتی ہیں کلیاں مہکتا ہے دریا — مہکتا ہے گلزارِ عالم سراپا
چہکتی اڑی بلبل نغمہ خواں ہے

یہ چہکتی اور گاتی ہوئی بلبل جو ابھی ایک پھول کی ٹہنی سے اڑی ہے۔ وہ دراصل محروم صاحب کی سکوں پرور امن پسند روح ہے۔ جو کہیں فاختہ کا روپ دھارن کرتی ہے تو کبھی بلبل کا۔ کبھی بھنورے کا۔ کبھی منہ اندھیرے اٹھ کر ان کی حسن پرست روح کی فاختہ امن، سکون مستی کی فضا میں تیرتے لگتی ہے۔

ہل چل ہیں ہے کاروانِ انجم — مغرب کو چلا نشانِ انجم
وہ شب کا سیاہ شامیانہ — اب لے کے قمر ہو روانہ

مشرق میں نور ہلکا ہلکا — ظلمت کا ظہور ہلکا ہلکا

صبح خنداں عروس تازہ آئی مل کر شفق کا غازہ
آئی اور کس ادا سے آئی شانوں پہ کاکلیں طلائی

صبح کے ایسے سحر آفریں نظارے میں ناممکن تھا کہ نغمے کی تمنا نہ کی جاتی۔ شاعر کی روح اس کے لیے جمنا کے ساحلوں کی طرف پرواز کرتی ہے اور صدیوں کی تہوں کو چیر کر دورِ ماضی میں جا پہنچتی ہے۔ جب کرشن اپنی مدھ بھری بانسری کے ترانوں پر برندا بن اور ساحل جمنا کو آباد کیا کرتے تھے۔ دھیان جانے کی دیر تھی کہ کرشن سامنے آگئے۔

لعل معجز نما سے بنسی اے لو وہ شام نے لگا دی
پیدا ہوا نفس سے اک اعجاز اب اس سے زیادہ کون دمساز
ہر اک ترانہ دل رُبا ہے! جنگل نغموں سے گونج اٹھا ہے
عالم طاری ہے بے خودی کا! نغمہ ساری ہے بانسری کا

اور اس طرح یہ بانسری کا جادو پھیلتا جاتا ہے انسانی روحوں سے گزر کر قدرت کے مناظر میں حسن ورنگ بھرا جاتا ہے زندگی کی تلخیوں کو شیرینیوں سے بھرتا جاتا ہے۔ جب بنسی کی آواز کا یہ جادو دھیرے دھیرے ختم ہوتا ہے، تو شام اپنے دل آویز حسن کے ساتھ لالہ گوں لباس میں دلہن بنی سامنے آتی ہے ؎

واہ کیا دل فریب منظر ہے شفقِ شام جلوہ گستر ہے
یا اڑاتا ہے چرخِ شعبدہ کار
باغ ہائے زمیں سے رنگ بہار
یہ نمائش ہے لالہ زاروں کی یا کہ بستی ہے شعلہ کاروں کی
بزم ہے کوئی گل عذاروں کی انجمن یا ہے نوبہاروں کی

دیدنی ہے یہ منظر رنگیں دل ربائی میں دلبر رنگیں
شاہدِ شام پیکر رنگیں زیر دامن ہے چادر رنگیں
دشمنِ ہوش ہے یہ رنگینی

جب زندگی کی سختیوں سے شاعر کی بیتاب روح تڑپ اٹھتی ہے، تو وہ بہار کی تمنا کرتی ہے۔ تاکہ یہ سکڑی سمٹی دھرتی گا اٹھے ؎

کہیں پھولتی ہے سرسوں کہیں پھوٹتا ہے سبزہ — نئی کونپلیں نکلتی ہیں کہیں کسی شجر سے
نکل آئے فصلِ گل کے وہ طیور گھونسلوں سے — کوئی دن میں گونج اٹھیں گے بہار کے ترانے
چلی آئیں گی مسرت کی صدائیں جنگلوں سے — کوئی شادیوں میں گاتا ہو خوشی کے جیسے گانے

اور پھر جب بہار آتی ہے، تو ۔۔۔ ؎

دامنِ کوہسار سے، ساحلِ رود بار تک — ساحلِ رود بار سے، دامن کوہسار تک
مسندِ شاہد بہار، تختۂ سبزہ زار ہے — شبنمِ ترے کشتِ زار، تختِ گہر نگار ہے
مظہرِ جلوۂ طرب، نغمۂ آبشار ہے — منظرِ صاف سطحِ آب، آئینہ بہار ہے

اور پھر بہار اپنی رنگینی اور سرخوشی کی دولت کو عام کر دیتی ہے۔ حیوان، چرند ے، پرندے انسان بچے، بوڑھے خوشی میں جھوم اٹھتے ہیں۔ حتیٰ کہ پالنے میں پڑے بچے بھی کوئی بہاریں خواب دیکھ کر مسکرا اٹھتے ہیں۔ یہ معصوم مسکراہٹ جب شاعر کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہے تو یہ نغمہ پیدا ہوتا ہے ؎

تری ایک مسکراہٹ — ہے دوا ہزار الم کی
تجھے دیکھ کر نہ دیکھے — دلِ زار شکل غم کی
مرے دل کو بھا گئی ہے
تری ایک مسکراہٹ
نہ قمر کے نور میں ہے — نہ سحر کی روشنی میں
نہ شفق کے رنگ میں ہے — نہ ہے پھول کی ہنسی میں
جو سماں دکھا گئی ہے
تری ایک مسکراہٹ

لیکن جب ان مناظر پر خزاں اپنا دستِ جبر دراز کرتی ہے، یا موت ان معصوم مسکراہٹوں کو ان معصوم چہروں سے نوچ لیتی ہے اور محبوبوں کو منوں خاک کے سپرد کر دیتی ہے تو مخدوم صاحب کی 'فاختہ' زندگی سے محبت کرنے والی فاختہ روح تڑپ اٹھتی ہے اب اس سے دکھ رنج اور غم کے نغمے پھوٹنے لگتے ہیں اور یہ غمگین نغموں کا سیلاب طوفانِ غم بن جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں یہ غم محروم صاحب کا ذاتی ہے. لیکن اس غم کی روح آفاقی ہے. وہ جہاں بھی کسی دکھی کو دیکھتے ہیں یا کوئی پژمردہ پھول نظر آتا ہے تڑپ اٹھتے ہیں ؎

سامنے میرے کوئی دم توڑے   اور دیکھوں میں دیدۂ تر سے
جا کے شمشان میں وہ تن پھنک جائے   جو ہو نازک سوا گلِ تر سے
ہائے یہ واقعات دیکھوں میں   گردشِ چرخِ فتنہ پرور سے
حسرتِ مرگ ہو مگر نہ مروں   جان ہو جائے سخت پتھر سے

عام طور سے محروم صاحب کے کلام میں ایسے موقعوں پر مایوسی اور نا امیدی کا اظہار ہوتا ہے. اس کو قدرتی امر نہیں کہا جا سکتا ہے. بلا شبہ محروم صاحب کے یہاں وہ مادی شعور نہیں ہے، جو انسان کو خرابی کے اسباب پر غور کرنے اور اپنا راستہ نکالنے کے لیے رہنمائی کرتا ہے. لیکن ایک بات تو یہاں صاف عیاں ہوتی ہے کہ وہ حادثوں اور موت کی اس دخل اندازی کو ناپسند کرتے ہیں، جو وہ زندگی کی امن پرور پیش قدمیوں میں کرتی ہے.

لیکن دوسرے حالات میں محروم صاحب ظالم کے خلاف آواز بھی اٹھاتے ہیں. ظاہر ہے یہ ظالم قاہر قدرت کے مظاہر اور حادثے نہیں، بلکہ انسانی رجعت پسند طاقتیں ہیں. جو انسانی حقوق کو غصب کرتی ہیں. انگریز سامراج کے قبضۂ ہند کے زمانے میں محروم صاحب نے بے شمار نظمیں ایسی کہی ہیں. جو ان کی آزادی پسند روح کا اظہار کرتی تھیں. اگرچہ ان میں سے بیشتر ضائع ہو چکی ہیں. لیکن "کاروانِ وطن" میں ایسا کلام مل جاتا ہے جو ظالم اور جابر کے خلاف انسان کو بڑھنے اور سینہ سپر ہونے کی نہ صرف تلقین کرتا ہے بلکہ ابھارتا ہے.

ایک نظم کے چند بند دیکھئے ؎

یہ مجبوری و بے نوائی کی باتیں   یہ ناطاقتی نارسائی کی باتیں
زمانے کی بے اعتنائی کی باتیں   یہ ہیں سربسر جگ ہنسائی کی باتیں
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

پر و بال اپنے اسیرو سنبھالو   اٹھو اور پھڑک کر قفس توڑ ڈالو
بگڑ جاؤ پھندے سے گردن نکالو   بہم ہو کے بگڑی ہوئی کو بنا لو
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

ہندوستانی عوام کے فرقہ وارانہ اور نجی جھگڑوں سے بھی شاعر زچ تھے.

اگر دانے دانے پہ لڑتے رہو گے　　جو اک دوسرے سے بگڑتے رہو گے
قفس میں اگر تم اکڑتے رہو گے　　پڑے قید میں یوں ہی سڑتے رہو گے
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

جب سامراجی افسر شاہی اپنی من مانی کرتی ہے تو اس کے بنیادی کردار کو بے نقاب کرتے ہیں ؎

جو لوگ ہند میں آتے ہیں غیر ملکوں سے　　اور اس کو اپنا بناتے ہیں ملجا و ماوا
وطن سے اپنے وہ آئے ہوں گو پھٹے حالوں　　بدل ہی جاتا ہے دو چار دن میں حال ان کا
وطن میں گو نہ میسر ہوں بے نمک آلو　　یہاں اڑاتے ہیں مکھن کے طشت صبح و سا

اس نظم میں طنز زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن چونکہ شاعر طبقاتی بنیادوں سے ناواقف ہیں۔ اس لیے وہ اکثر قوموں کے بارے میں سوچنے میں غلطی کر جاتے ہیں، اور ہندی عوام کے اصلی دشمن سامراجیوں کے ساتھ انگریز عوام کو بھی رگید جاتے ہیں شاید اس کا کارن محروم صاحب کے نزدیک یہ ہو کہ جنرل ڈائر کے انگریز فوجیوں نے جلیانوالہ باغ کا قتل عام کیا۔ ان کے نزدیک یہ ایک بڑی حقیقت ہے جیسے کہ وہ فرماتے ہیں ؎

ڈائر کے قتل عام نے خون دفا کیا
لو ہو سے لال دامن برطانیہ کیا

اس میں کلام نہیں کہ محروم کی امن پسندی کی گواہی ان کے کلام سے عام ملتی ہے اور فاختہ کی دماغ پسندی کم، بلکہ بہت دبے ہوئے انداز میں، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن ہی نہیں کہ وہ ظلم و ستم کے خلاف رہے ہیں۔ انسان کے ہمدرد وہ پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ ہمارے لیے یہ فخر اور خوشی کا مقام ہے کہ آدھی صدی سے زائد تاریخ کا یہ سمبل ہمارے درمیان موجود ہے، اور اس کا ساز شعر اپنا کام کیے جاتا ہے۔ اگرچہ محروم کی نگاہ ابھی انسانیت اور امن کے اصلی دشمن کو نہیں پہچان سکی۔ لیکن ان کی ذات سے یہ امید رکھنی بے معنی نہیں ہے کہ وہ انسان کے اچھے مستقبل کے نہ صرف حامی ہیں بلکہ اس کے محافظوں میں سے بھی ایک ہیں۔ ان کے پرامید اور امن پرور نغمے عوام کے سہمے ہوئے دلوں اور خوف سے مکدر ذہنوں کو روشنی بخشتے رہیں گے۔

نسیم کنجاہی

تلوک چند محروم

جناب تلوک چند محروم کا شمار اردو زبان و ادب کے بزرگ اور مشاہیر شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ اس دور سے متعلق ہیں جس نے درگا سہائے سرور جہاں آبادی۔ برج نرائن چکبست لکھنوی، نادر کاکوروی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، سید غلام بھیک نیرنگ اور چودھری خوشی محمد ناظر کو پیدا کیا۔ محروم اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ اپنی زندگی ہی میں انھوں نے شہرت و عظمت کی ساری منزلیں طے کر لی ہیں۔ "تلوک چند محروم" تالیف ہے۔ جس میں اردو کے نقادانِ فن کے ان تمام مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ جن میں ہمارے عہد کے اس عالی مقام شاعر کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ نقادانِ فن کی اس صف میں سرفہرست جناب شیخ سر عبدالقادر مرحوم ہیں۔ جنھوں نے کلامِ محروم کا بنظر غائر مطالعہ فرمایا ہے، اور اس سلسلے میں ان کے مقامات شاعری کی صحیح نشاندہی کی ہے۔ دوسرے تنقید نگاروں میں علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی مرحوم حضرت جوش ملسیانی (جن کے استادِ سخن ہونے میں کلام نہیں)، شیخ محمد اقبال، جناب مالک رام ایم۔اے۔ عطا اللہ کلیم۔ ممتاز حسن احسن۔ گوپی چند نارنگ اور دیا نرائن نگم مرحوم کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک نے جی کھول کر حضرت محروم کو دادِ سخن دی ہے واقعہ یہ ہے کہ محروم صاحب اس تعریف و توصیف کے یقیناً مستحق بھی ہیں اور یہ دیکھ کر ہمیں حیرت آمیز مسرت ہوتی ہے کہ محروم صاحب کے معاصرین نے بھی ان کے اعترافِ عظمت میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ اصل میں محروم صاحب کا فن اور اخلاق دونوں ہی یہ تقاضا کرتے تھے کہ وہ معاصرانہ چشمکوں سے محفوظ رہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس امتحان میں بھی وہ کامیاب رہے ہیں۔ ان مضامین میں محروم صاحب کے کلام کے قریب قریب ہر پہلو پر خامہ فرسائی کی گئی ہے اور اس طرح محروم صاحب کی شخصیت اور فن کے کئی تابناک رخ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مندرجہ بالا حضرات کے ماسوا محروم صاحب پر لکھنے والوں میں ہمیں اقبال، ورما سحر، علی جواد زیدی، وقار انبالوی، تاجور سامری، عدم، عبدالعزیز فطرت، حامد علی خاں رضا انصاری، پرمان سنگھ، جے کرشن چودھری، ہر بھگوان شاد اور کیلاش ماہر کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک نے بقدر ذوق و ظرف محروم کی شاعری سے حظ اٹھایا ہے لیکن ان سارے مضامین کو پڑھ جانے کے بعد بھی خدا معلوم کیوں ذہن کو ایک تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ غالباً اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ محروم جیسے صاحب کمال کے فن کا دو تمام تر اصنافِ نظم پر

حاوی ہے) مطالبہ کچھ اس سے زیادہ ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ مستقبل کے مورخ اور مصنف نقاد ابھی محروم پر اور بھی تفصیل اور شرح و بسط سے لکھیں گے۔ تاکہ تاریخ اور تنقید دونوں کا حق ادا ہو جائے۔ کتاب کے آخر میں محروم صاحب کے بلند اقبال صاحبزادے جگن ناتھ آزاد کا مضمون بھی کافی دلچسپ ہے جس سے محروم صاحب کی شخصیت کے بعض نقوش واقعی ابھرتے ہیں مگر اس کوشش کو بھی سعیٔ ناتمام ہی کہنا چاہیے۔ کیوں کہ محروم صاحب کا مکمل سراپا اس سے بھی سامنے نہیں آیا تا۔ بہر حال یہ تالیف اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ نیاز مندان محروم ان تحریروں کے آئینہ میں کسی حد تک محروم صاحب کے عکس جمال کا نظارہ فرما سکتے ہیں۔ عزیز دوست جگن ناتھ آزاد نے ان مضامین کو مرتب کر کے تاریخِ ادب کی عظیم خدمت انجام دی ہے اور ہمارے خیال میں کسی بھی صاحب ذوق کو اس کتاب کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہیے۔ کتاب معنوی خوبیوں سے قطع نظر حسن صوری کے اعتبار سے بھی جاذب اور دل کش ہے۔ ہم جگن ناتھ آزاد کو اس گراں قدر تالیف کے پیش کرنے پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

غزل

گھبرائیے کیوں؟ زندگی بے کیف اگر ہے
آخر شبِ تاریک کا انجام سحر ہے

افسانۂ غم سینۂ بلبل میں ہے فریاد
اوراقِ گلِ تر میں بہ عنوانِ دگر ہے

بے درد ہے انساں تو ہیں سب اُس کے ہنر عیب
ہے دل میں اگر درد تو ہر عیب ہنر ہے

ثابت ہے بہ ہر طور غمِ عشق رمِ حسن
آرام کو پوچھو تو اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

پھولوں میں ترا رنگ ہے کانٹوں میں تری نوک
یہ حسن ترا ہے کہ مرا حُسنِ نظر ہے

محروم

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

محروم کی شاعری

اردو دنیا کی بہت کم عمر زبان ہے۔ اس نسبت سے اس کے ادب پارے بھی مختصر ہیں۔ لیکن اس کیت کے باوجود اہمیت میں کمی نہیں۔ چنانچہ دنیا کی دوسری بڑی زبانوں میں جس نوع کے اصنافِ سخن موجود ہیں وہ اس مختصر ترین اور کم عمر زبان میں بھی موجود ہیں۔ اس میں سب سے بڑا کارنامہ ان حضرات کا ہے جنھوں نے اس نئی زبان سے اپنا رشتہ جوڑا اور آخری دم تک اس سے وابستگی باقی رکھی۔ بے غرض اور بے لوث ہو کر اس سے رشتہ استوار کیا۔ اردو کے ایسے ہی اچھے اور مخلص محسنوں میں قبلہ تلوک چند محروم کا نامِ نامی بھی ہے۔ آپ ۱۸۸۷ء میں عیسیٰ خیل ضلع میانوالی مغربی پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد کا نام بھگت رام دیال تھا۔ شاعری کا شوق ابتدائے عمر سے ہے۔ کلام میں پختگی اور سادگی پورے جاہ و جلال سے نمایاں ہے۔ اگرچہ تعجب اور حیرت اس بات پر ضرور ہے کہ سرحد جیسے خشک اور غیر موزوں خطے میں جہاں کی زمین خود سنگلاخ اور بے ترتیب ہے محروم جیسا شاعر کیسے پیدا ہوا؟ زبان اور لطفِ بیان کے تین شعر کے بعد ایک مقطع ملاحظہ ہو۔

پردہ جو اُٹھے تری جبیں کا — شرمندہ ہو چاند چودھویں کا

کم بخت کے پیچھے کس کو بھیجوں — قاصد بھی تو ہو رہا وہیں کا

آرام کہیں نہیں ہے دل کو — ہر وقت خیال ہے وہیں کا

سُنے کون سرحد میں محروم ان کو
ترے شعر ہیں داد پانے کے قابل

لیکن یہ سوال اردو زبان کی حلاوت و شیرینی سے تو کیا جا سکتا ہے، سرزمین سرحد سے نہیں۔

اچھی طرح یاد ہے کہ بارہ تیرہ سال کی عمر تھی کہ زمانہ اور مخزن میں محروم صاحب کی نظمیں پڑھا کرتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے اور سادہ الفاظ ایسے آسان اور سادہ کہ ہم ساتھی آپس میں ان نظموں کی کئی کئی نقلیں کرتے اور آپس میں تقسیم کر لیتے۔ مخزن ہمارے معیار سے بلند ہوتا۔ یہی حال زمانہ کا تھا۔ اچھی نظم اور اچھی غزل جس شمارہ میں نظر آتی اس کو ذوق شوق سے پڑھتے لیکن حضرت کی زیارت کا شرف فراق گورکھپوری کی آمد دہلی پر ایک خاص نشست میں حاصل ہوا جس کا انتظام جگن ناتھ آزاد

(جو خود اچھے اور باوصف شاعر اور ادیب ہیں) نے کیا تھا۔ میں کچھ پہلے سے موجود تھا۔ ابھی لوگ آئے نہیں تھے۔ فراق، محروم اور آزاد صاحب آپس میں بیٹھے ہمکلام تھے۔

اردو شاعری موضوع بحث تھی۔ فراق ہندی کے مقابلہ میں اردو کے محاسن بیان کر رہے تھے۔ اختصار اور ایجاز کا ذکر کر رہے تھے۔ محروم صاحب نے اثباتی اشارے کرتے ہوئے کہا۔

زندگی ایک کشاکش کا نام ہے اور غزل اس رمز سے آگاہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو والے پابندی کو بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ مگر کشاکش سے چھٹکارہ حاصل کرنا گوارا نہیں کرتے۔

کتنا حقیقت آگیں تصور ہے۔ چنانچہ محروم کی شاعری کا اگر تجزیہ کیا جائے۔ تو یہ عکس ان کے یہاں جا بجا ملے گا۔ ان کی نظموں میں بھی یہ التزام موجود ہے۔ قطعات و رباعیات میں بھی اس کا التزام ہے۔ اس لیے ایک وقت آئے گا جب محروم کی شاعری کو ایک پیغامِ خاص کا درجہ دیا جائے گا۔ ان کے یہاں تصنع اور آورد سے کام کم لیا گیا ہے۔ الفاظ کی تراش خراش اور موزونی پر نظر زیادہ رکھی گئی ہے۔ پند و نصائح اور ترغیب اصلاح نفس پر بھی زیادہ زور ہے۔

قدماء کی طرح پامالی مضامین کی بھی افراط ہے۔ لیکن اس میں محروم کا قصور نہیں۔ وہ جس دور کے شاعر ہیں اس کا یہ طرۂ امتیاز تھا کہ کہی ہوئی باتوں پر طبع آزمائی کرو۔ اس سے جہاں نقصانات ہوئے وہاں فائدے بھی ہوئے۔ مقابلہ ویسے بھی ایک فن ہے مگر اب اس حقیقت سے گریز کیا جاتا ہے۔ طرحی مشاعرے کو زبان ادب کے لیے زہر ہلاہل سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ اس زہر میں جو امرت پوشیدہ ہے اس پر نظر نہیں کی گئی۔ بہرحال محروم کا تعلق قدیم و جدید دو دور سے ہے یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ہر دور کا اندازِ کلام موجود ہے۔

فارسی میں رباعی ایک فن ہے۔ اردو میں جہاں اور اصناف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے، رباعی کو بھی بامِ عروج پر پہنچا دیا گیا ہے، قدماء میں میر انیس اور دورِ جدید میں امجد حیدر آبادی، جوش اور فراق و محروم کے نام سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ میر انیس نے اپنے اعجاز سے اردو رباعی کے ہر چوتھے مصرعے کو وہ بلندی عطا کی ہے جس نے اسے فارسی رباعیات کے مقابل کر دیا ہے۔

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

یہ رباعی تو اپنا جواب آپ ہے۔

مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں — رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں

چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل　　اس واسطے کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

اسی طرح امجد حیدر آبادی کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

سانچے میں اجل کے ہر گھڑی ڈھلتی ہے　　ہر وقت یہ شمعِ زندگی جلتی ہے
آتی جاتی ہے سانس اندر باہر　　یا عمر کے حلق پر چھری چلتی ہے

واقعات و مشاہدات کو صرف چار مصرعے بلکہ چوتھے مصرعے میں جمع کر دینا شاعر کا کمال ہے۔ اب حضرت محروم کی دو رباعیاں ملاحظہ ہوں۔ دوسری رباعی میں اپنے تخلص سے کیسا فائدہ اٹھایا ہے۔

لائے تھے ساتھ کچھ نہ لے جائیں گے　　ہمراہ عمل بُرے بھلے جائیں گے
جس کو اپنا سمجھ رہے ہیں سب کچھ　　رہ جائے گا اور ہم چلے جائیں گے

ہے صبح بہار جلوہ افگن محروم　　رشکِ خلد بریں ہے گلشن محروم
اس جوشش بہار میں، وفورِ گل میں　　کانٹے ہیں اور اپنا دامن محروم

ایک اور رباعی پڑھیے۔

پھولوں کا نکھار لے کے آئی ہے بہار　　گلبانگ ہزار لے کے آئی ہے بہار
پھر ہوتی ہے دل میں اک خلش سی محسوس　　شاید کوئی خار لے کے آئی ہے بہار

حالی نے غالب اور اقبال نے داغ کی موت پر جو مرثیے نظم کئے ہیں وہ اردو شاعری کی میراث ہیں۔ اقبال کی موت پر جو مرثئے نظم کئے گئے ہیں ان میں محروم کا مرثیہ بے مثال ہے۔

اقبال کی موت پر بپا ماتم ہے　　اے اہلِ وطن بہت بڑا ماتم ہے
نغموں سے کہو کہ آج نالے بن جائیں　　رضوانِ ریاضِ شعر کا ماتم ہے

ان الفاظ میں جو سوز، درد، ٹیس اور حقیقت پنہاں ہے اس تصور میں انسانیت کا درد اور اس بلا کا سوگ پوشیدہ ہے کہ اس کا احساس دل درد مند ہی کر سکتا ہے۔

محروم کی غزل اپنے اجائی اقدار کے لحاظ سے محض گل دیا سمن کا تذکرہ نہیں، اس میں وجدانی اور حقیقی عناصر کا پرتو بھی ہے۔ اگرچہ غزل ہمارے معاشرے کا ایک اہم جز و ہے لیکن محروم نے محض ایک فرد کی حیثیت سے اسے محسوس نہیں کیا بلکہ اجمائی لحاظ سے انھوں نے وہ کیف پایا جو غزل کی عناصر ترکیبیں کا خاصہ اور روح ہے۔

اور بقول میرؔ

پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

محرومؔ کے یہاں انسانیت کا درد اور سماج کا رکھ رکھاؤ اس اہتمام سے ہے جس نے "دلِ گداختہ" کا حق ادا کر دیا ہے چنانچہ ان کی غزلیات کے یہ اشعار آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی ؎

دنیا میں اے زباں، روشِ صلح کُل نہ چھوڑ — جس سے کسی کو رنج ہو ایسا بیاں نہ چھوڑ

سرِ راہِ فنا اٹھ اٹھ کے اکثر بیٹھ جاتا ہوں — جو ہو بے گانۂ منزل وہ گردِ کارواں ہوں میں

دل ان کا چمن میں نہ لگا ہے نہ لگے گا — جو ہیں ترے کوچے کی فضا دیکھنے والے

ایک غزل کی مشکل اور سنگلاخ زمین کے دو شعر ملاحظہ ہوں

کردے نہ سست رو، یہ ترا ہم سفر تجھے — اے تیغ یار ساتھ نہ مل کر اجل کے چل

چالیں تو چل چکا ہے تو، کتنی ہی آج تک — اب ایک چال رہ گئی وعدے پہ کل کے چل

خالص ٹکسالی اور دہلوی زبان ملاحظہ ہو ؎

ہم گلشنِ دہر میں اے ہمدم آزارکشِ بیداد رہے — سبزے کی طرح پامال ہوئے نکہت کی طرح برباد رہے

جوں شمع ہماری قسمت میں تھا گریۂ غم اور سوزِ نہاں — اے بزمِ جہاں کیا ترا گلہ تو حشر تلک آباد رہے

اے چرخ یہ جھوٹے دعوے ہم جیسے ستم کے ماروں کے
تاثیر اگر ہو آہوں میں قائم تیری بنیاد رہے

ایک اور غزل کے چار شعر پڑھیے۔

نہ سوز و ساز کے پیری میں چھیڑ افسانے — سحر ہے شمع کہاں اب؟ کہاں ہیں پروانے

کہیں نہ بادہ کشوں کے یہ دل ہوں اے ساقی — جو میکدے میں پڑے ہیں شکستہ پیمانے

خرد پناہ اسیرِ امید و یاس رہے — نجات پا گئے ان الجھنوں سے دیوانے

بہت عزیز تھے غربت کے سبزہ زاروں سے
جنوں نواز وہ اپنے وطن کے ویرانے

وارداتِ قلبی اور داستانِ دل کس خوبی سے بیان کئے ہیں۔

یہی انجامِ مسرت ہے کہ خنداں ہوکر — شاخساروں سے گرے پھول پریشاں ہوکر
دیکھئے حسن کا اعجاز کہ بے جاں ہوکر — آئینہ دیکھ رہا ہے انھیں حیراں ہوکر
قیس و فرہاد کے انجام پہ روتا ہے دل — غمِ جاناں نے رلایا غمِ دوراں ہوکر
پھوٹ نکلا کہیں پھولوں میں کہیں تاروں میں — دل کی تسکین ملی حسن کو پنہاں ہوکر
دیکھتے دیکھتے آباد ہوئے ویرانے — دل کی بستی نہ بسی پھر کبھی ویراں ہوکر

یہ شعر تو قیامت کا ہے

پھر وہیں شوق اسے کھینچ کے لے آتا ہے — جو تری بزم سے جاتا ہے پشیماں ہوکر

جوانی دیوانی کی داستان کی غمازی ان اشعار سے بھی ہویدا ہے۔

تاب نظارا نہیں گو مجھے خود بھی لیکن — رشک کہتا ہے کہ ایسا ہی جمال اچھا ہے

داغِ غمِ حیات میں الجھا گئی امید — ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی

بس اتنا ہوش تھا مجھے روزِ وداعِ دوست — ویرانہ تھا نظر میں جہاں تک نظر گئی

یہ شعر تو جدید اردو غزل گوئی میں میراث کا درجہ رکھے گا۔

بیاں کرتا ہے جب کوئی کہیں روداد غم اپنی — مجھے یکسر وہ اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

غزل اور خالص غزل کا یہ شعر جدیدیت کے پرستاروں کو اور اردو غزل کے معترضین کو خاص طور پر متوجہ کرتا اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

گھر بیٹھے سیر ہوتی ہے ارض و سما کی روز — محوِ سفر ہیں طبع کی جولانیوں سے ہم

اور یہ شعر

جب کسی غنچے کو کھلتے ہوئے دیکھا میں نے — آگیا یاد وہیں دل کا پریشاں ہونا

آخری شعر پڑھیے اور زبان و بیان کا لطف اٹھائیے۔

بالائے بام تم ہو کہ ماہ تمام ہے — کیسی یہ زیرِ بام، نمایاں ہے چاندنی

حضرت تلوک چند محروم کی قابلِ قدر تصانیف جو اردو ادب میں معتد بہ اضافہ ہیں اور ضرورت ہے کہ ان کی ان عظیم خدمات کے صلے میں قدر دان ادب ان کی ہمت افزائی کریں اور اپنے کتب خانہ کو ان سے مزین کریں۔ اسی طرح حکومت ان کے علم وفضل کی قدر کرے گی۔

تصانیف محروم :۔

گنجِ معانی، رباعیاتِ محروم، کاروانِ وطن، شعلۂ نوا، نیرنگِ معانی اور بہارِ طفلی۔

غزل

تن خاکی رہے گا ہمرہِ انوارِ جاں کب تک
چلے گی کارواں کے ساتھ گردِ کارواں کب تک

ادھر بھی ایک جھونکا اے نسیمِ فصلِ آزادی
رہوں زنجیریٔ اندیشۂ سود وزیاں کب تک

نہ کیوں ہم دیدۂ خونبار سے گلکاریاں کرلیں
رہیں آخر بہ امیدِ بہارِ گلفشاں کب تک

وطن کی یاد مٹتے مٹتے مٹ جاتی ہے غربت میں
قفس میں تابشِ داغِ فراقِ آشیاں کب تک

اجل آکر بلند و پست کو ہموار کر دے گی
کوئی بالا نشیں کب تک، کوئی پستی نشاں کب تک

سبک ہے یا گراں، اے زندگی، آخر ہے تو اپنی
تجھے اپنائیں گے، تجھ سے رہیں گے سرگراں کب تک

صِلہ حُسنِ عمل کا خونِ دل ہے اس زمانے میں
مرے کام آئے گی رنگینیٔ حسنِ بیاں کب تک

محروم

امر چند قیس

کاروانِ وطن

تلوک چند محروم کی یہ نظمیں عہدِ غلامی اور دورِ آزادی کے وطن اور حبِّ وطن پر مرکوز ہیں۔ لیکن ہمسایہ ممالک سے گزر کر دوسرے براعظموں کے سیاسی تعلقات پر بھی گئی جگہ روشنی ملتی ہے۔

محروم میدان نظم کے شاہ سوار ہیں۔ لیکن غزل میں سیاسی رنگ داخل کرنے والے قومی شعرا، میں وہ کسی سے پیچھے نہیں "رام راج" اور "بزم نو" دو مسلسل غزلیں ہیں جن میں وہ ان بلندیوں پر اڑ رہے ہیں۔ جہاں سے ٹیگور یہ نغمہ الاپتا ہے۔

"WHERE THE MIND WITHOUT FEAR AND THE

HEAD IS HELD HIGH"

"INTO THAT HOUSE OF FREEDOM

MY FATHE, LET MY COUNTRY MOTHER")

ایک غزل کے ان شعروں میں ظفرؔ کی روح بول رہی ہے۔

نہ وہ ہند رشکِ جناں رہا نہ وہ اس میں جوشِ بہار ہے — نہ گلوں پہ اب وہ سماں رہا نہ ترا نہ سنج ہزار ہے

نہ دلوں میں ہیں وہ صداقتیں نہ وہ الفتیں نہ رفاقتیں — ہیں کدورتوں پہ کدورتیں تو غبار زیر غبار ہے

اس مجموعے میں قطعات اور رباعیات کی تعداد بھی غزلیات کی طرح تھوڑی ہے۔ مگر یہ کلام بھی سیاست کا کوئی نہ کوئی پہلو لیے ہوئے، ہنگامی ہونے کے باوجود پختہ اور کامیاب ہے۔

"کاروانِ وطن" میں نظموں کا حصہ وافر ہے۔ مخمس، مسدس، مثمن، مثنوی۔ ہر صنف تنقید کی کسوٹی پر کھرا کس دیتی ہے "بھارت ماتا کیوں روتی ہے؟" اور ہندوستانی نوجوانوں کی دعا" ایسے مخمس ہیں جو ہر ایک کی زبان پر ہیں۔ لیکن ظفرؔ کے مصرع کی نظمیں "اسیرو! کرو کچھ رہائی کی باتیں" تو رسوائی کی حد تک مشہور رہے۔

مختلف تحاریکِ آزادی کے راہ نماؤں کے متعلق خواہ وہ کسی مذہب وملت سے وابستہ ہوں. حضرت محروم نے پُرتاثیر اندازِ بیان میں وہ روح پرور خیالات نظم کیے ہیں جو مردہ رگوں کے منجمد خون میں بجلیاں بھر دیتے ہیں. "ویرپوجا" کی یہ سپرٹ اردو میں اور کہیں نظر نہیں آتی. ہندو مسلم اتحاد کے حامی کی حیثیت سے جب کبھی باہمی نفاق پر انھوں نے منظوم آنسو بہائے، قارئین بھی آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکے.

تیوہاروں کے متعلق نظمیں ــــ خواہ وہ "بسنت" کی طرح موسمی ہوں خواہ "دیوالی" کی طرح روایتی اور خواہ "عید" کی طرح مذہبی ــــ سب پر سیاسی رنگ غالب ہے. یہ نظمیں جناب محروم کی ہمہ گیر طبیعت کی دلیل ہے.

اردو شاعری کو فارسی روایات کا مقلد اور پابند ٹھہرانے والے، نصف صدی پیشتر کہی گئی نظم "دعا" میں ذرا ہندوستانی رنگ ملاحظہ فرمائیں ؎

رام و لچھمن کی جبیں میں جو کبھی روشن تھا — پھر اُسی نور کے جلوؤں کو ہویدا کر دے

صومعے رشیوں کے تاریک نظر آتے ہیں — پھر ہمالہ کی گپھاؤں میں اُجالا کر دے

اسی نظم کا پہلا شعر ہے ؎

اے خداوندِ مہ و مہر، دعا ہے تجھ سے — اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کر دے

صاف ظاہر ہے کہ حضرت محروم نے عنفوانِ شباب کی بھی گرم جوشیوں کو، حُسن و عشق سے دامن بچا کر "حُبِّ وطن" کے لیے وقف کر دیا. وہ اب تک اسی راستے پر استقلال سے گامزن ہیں ــــ لیکن حیرت ہے کہ قومی شعراء کی صفِ اول میں جگہ رکھنے کے باوجود، ان کی سیاسی شاعری کے ساتھ نقادوں نے کماحقہٗ انصاف نہیں کیا.

اصنافِ سخن کی تشکیل کے سلسلے میں ایک آدھ مقام پر جناب محروم نے جدید روش اختیار کی ہے ورنہ وہ روایت پرست ہیں. ہاں، معنوی حیثیت سے انھوں نے شاعری کا رخ ضرور موڑا ہے. وہ بلند بانگ نقیب نہیں. وہ نشتر فصاد اور رجز خواں بھی نہیں (بقول نیاز فتحپوری) لیکن سادگی، خلوص اور صداقت نے ان کی شاعرانہ عظمت کو چار چاند لگا دئے ہیں. متحدہ ہندوستان کے اس نامور شاعرِ پنجاب کی زباں دانی کا اعتراف اہلِ زبان نے بھی کیا ہے.

"کاروانِ وطن" نصف صدی کی منظوم سیاسی تاریخ ہندوستان ہے.

یاور علی خاں شاہد

تلوک چند محروم

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کی جانب سے ایک کتاب اردو کے مشہور و معروف اور بزرگ شاعر تلوک چند محروم پر شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں حضرت محروم کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ہندوستان و پاکستان کے مشاہیر اہلِ قلم کے مضامین یک جا کر دئے گئے ہیں۔ کتاب کے مرتب حضرت محروم کے لائق و فائق فرزند جناب جگن ناتھ آزاد ہیں، جو خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں۔ مضمون نگاروں میں سر عبدالقادر، برج موہن دتاتریہ کیفی، پروفیسر شیخ محمد اقبال، تاجور سامری، جوش ملسیانی، عبدالمجید عدم، دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ، گوپی چند نارنگ، حامد علی خاں مالک رام، عطاء اللہ کلیم، وقار انبالوی، ممتاز حسن احسن، اقبال ورما سحر، عبدالعزیز فطرت اور خود فاضل مرتب جگن ناتھ آزاد جیسے سخن سنج اور سخن گو شامل ہیں۔ جس شاعر کی بارگاہِ سخن میں ایسی ادب نواز ہستیوں نے اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا ہو اور مرتبہ شناسی کا مظاہرہ کیا ہو، اس کی شخصیت کتنی عظیم اور اس کی شاعری کتنی بلند ہوگی۔

حضرت محروم کی جنم بھومی مغربی پنجاب میں واقع ہے پنجاب کے خالص دیہی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی شروع سے ان کا پیشہ مدرسی رہا۔ دورانِ ملازمت ہی میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ساتویں آٹھویں جماعت میں جب پڑھتے تھے، اسی زمانے سے شعر کہتے ہیں۔ شاعری میں کسی کی شاگردی قبول نہیں کی۔ اپنے ذوقِ سلیم اور ملکۂ شعری کو اپنا رہنما بنایا۔ ایک پنجابی ہوتے ہوئے بھی اردو زبان و بیان پر وہ قدرت حاصل کی کہ اہلِ زبان سے اپنا لوہا منوالیا، آج سے ربع صدی پہلے جن شاعروں نے اردو نظم کے گلدستے کو رنگا رنگ پھولوں سے آراستہ کیا اور جن کے کلام کی اردو شعر کی دنیا میں دھوم مچی ہوئی تھی ان میں حضرت محروم کا نام و کلام ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اردو کا بڑے سے بڑا رسالہ محروم کے کلام سے اپنے صفحات کو زینت بخشنا اپنے لیے مایۂ ناز سمجھتا تھا۔ اردو کے بے بدل شاعر حضرت اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے کلام محروم کی تعریف و توصیف ان الفاظ میں کی تھی ؎

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم — لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم

ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز — ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

رسالہ مخزن مرحوم کے ایڈیٹر سر عبدالقادر نے ان کے کلام کو اس طرح آنکا اور پرکھا ہے۔

"الفاظ کی برجستگی، بندش کی چستی، خیالات کی پاکیزگی حضرت محروم کے اشعار کی خصوصیات ہیں۔ مگر ان کی شاعری کا جو وصف مجھے خاص طور پر پسند ہے وہ یہ ہے کہ اس میں صلح و محبت کی تلقین ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے مذہبی پیشواؤں کی خوبیاں جناب محروم کے پیش نظر ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان والے سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور ان کی بیش بہا زندگیوں سے سبق حاصل کریں۔"

اس کتاب کی اشاعت سے ہمارے ایک عظیم شاعر کی پاکیزہ و ستودہ زندگی اور اس کے شعری کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔

غزل

حسن گرداب فنا ہے، پھر یہ طوفانِ سحر — صبح کے تارے! سنبھل کر تھام دامانِ سحر

یوں پشیماں ہوں میں غفلت میں جوانی کاٹ کر — جس طرح دن بھر پشیماں ہو پشیمانِ سحر

خونِ انجم پردۂ شب میں نہ پنہاں رہ سکا — لالہ گوں دیکھا زمانے بھر نے دامانِ سحر

یاس سے امید ہو جاتی ہے اکثر رونما — رات کے پردے میں ہو جاتا ہے سامانِ سحر

حسن یہ سارا اسی کا ہے کہ جس کے عشق میں — چاک روزِ ابتدا سے ہے گریبانِ سحر

سوئے در کیا دیکھتا ہے اے دلِ غم دیدہ، دیکھ — یہ شبِ فرقت ہے، اس میں کم ہے امکانِ سحر

میں بھی جانوں، تم نے کیا دیکھا ہے، جس کو دیکھ کر

ہے یہ طوفانِ نوا، اے نغمہ سنجانِ سحر

محروم

ہنس راج رتن

اردو ادب میں حضرت محروم کا مقام

زندہ ادیبوں کی عزت افزائی کی اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے حکومت پنجاب نے ۳ مارچ ۱۹۶۲ء کو اردو کے عظیم شاعر حضرت تلوک چند محروم کو ایک خلعت عطا کی۔

اہلِ پنجاب اور خاص طور پر اردو داں ہندوستانیوں کے لیے حضرت محروم کا نام غیر معروف نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک فسانہ بن گئے ہیں۔ ہم میں سے وہ سب جو ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ مرثیۂ نورجہاں کے شاعر کی حیثیت سے ان سے متعارف ہیں۔ اس مرثیے کے بعد مناظر قدرت پر ان کی نظموں اور حب وطن کے گیتوں کے ذریعے وہ ہم سے قریب تر ہوتے گئے ہیں۔ ان دنوں حب وطن کے نغمے دنیائے ادب میں ایک نادر چیز تھے

ابتدائی زندگی

محروم ۱۸۸۶ء میں دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں گاجراں والہ میں پیدا ہوئے۔ بنوں میں اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کر کے وہ ۱۹۰۰ء میں لاہور چلے آئے۔ جہاں انھوں نے ٹیچرز ٹریننگ حاصل کی۔ ان کا مرثیۂ نورجہاں کا مزار" اس زمانے کی تخلیق ہے اور اسی کی تحریک کا نتیجہ ہے، جس کسی نے بھی اسے ایک بار سنا ہے وہ اب تک گنگناتا ہے:

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر　　آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائے سیاہ خانوں میں بہتر　　اڑ اڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکر

معمور ہے یوں محفلِ جانا نہ کسی کی
آباد رہے گور غریبانہ کسی کی

ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی پختگی نے زیادہ دیر نہیں کی۔ کیوں کہ وہ شروع ہی سے ایک اعلیٰ و بلند پایہ فن کار ہیں۔ ۱۹۰۰ء کے بعد سے انھوں نے جو بھی لکھا ہے اس میں ایک مخصوص سوز و گداز، نزاکتِ خیال اور لطیف سا اپنا پن ہے۔

داغِ الم

ہم میں سے بیشتر لوگوں کے مانند محروم کی گھریلو زندگی بھی کئی ایک المیوں کا نشانہ رہی ہے۔ اور اس حزن وملال نے ان کے حساس ذہن پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں لیکن ان کے نظریۂ زندگی پر ان کا سایہ نہیں پڑ سکا۔ ان کے کلام میں تلخی، تلون مزاجی کا کہیں پتہ نہیں۔ ان کی محبت ہمہ گیر ہے۔

حالی، چکبست اور اقبال کی روایت میں پلے ہوئے محروم کو ملک کی بدحالی نے بہت متاثر کیا ہے اور انھوں نے اپنی زندگی اور ذات کو انسان اور خدا کی ایک امانت اور ایک ذمہ داری سمجھا ہے۔ ان کے ذہن میں ملک کو آزاد دیکھنے کی تمنا سب سے نمایاں رہی ہے۔ کہتے ہیں ؎

محروم وطن جب تک آزاد نہیں ہوتا — سو بار بسنت آئے، دل شاد نہیں ہوتا
دل شاد نہیں ہوتا، ایام طرب میں بھی — محروم وطن جب تک آزاد نہیں ہوتا

اس نصب العین کی تکمیل کے لیے انھوں نے بڑی جانکاہی سے کام لیا ہے۔ سننے والے کانوں اور حساس دماغوں پر شعر کے اعجازِ سحر سے واقف محروم نے اپنے مخاطبوں میں اخلاقی برتری، حب وطنی اور فرض شناسی پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ اسی نازک ذریعۂ اظہارِ خیال کا سہارا لیا۔

آفاقیت

محروم کی شاعری کا تاثر کسی خاص نسل یا فرقے یا کسی خاص فلسفیانہ یا سیاسی گروہ تک محدود نہیں۔ ان کے نزدیک خدا ایک ہے اور سب کے لیے ہے۔ وہ فیاض بھی ہے اور مہربان بھی۔۔۔۔ انسان کا مذہب محبت اور احترام آدم ہے۔ خدا ہو کہ نہ ہو محروم کا تقاضہ یہی ہے کہ ہمیں اس وسیع دنیا میں یگانگت اور رواداری سے رہنا چاہیے ان کا خیال ہے کہ ایک عظیم انصاف ہمیں ایک دوسرے سے وابستہ کئے ہوئے ہے اور بدنیتی اور سنگدلی سے اٹھایا ہوا کوئی بھی قدم ہمیں زندگی کی اندرونی وحدت سے الگ کر سکتا ہے ؎

کسی قانون پہ چلتا ہے نظامِ عالم — زیرِ انصاف بدلتا ہے نظامِ عالم

محروم کسی انتشاریت کا شکار نہیں، وہ اپنے نقائص یا غلطیوں کے لیے دوسروں کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے۔

جب ہماری آزادی نے ہماری شرافت وانسانیت کا بلیدان مانگا تو محروم نے برنگِ سرخ صدائے احتجاج بلند کی۔ اہلِ ملک کی بہیمانہ حرکتوں کی جذباتی تکذیب سے بڑھ کر انھوں نے نہایت متانت اور قوت کے ساتھ درندگی کی تصویر کھینچی۔

انگریز سے منسوب کیا کرتے تھے اس کو — آتی تھی نظر ہم کو وطن میں جو برائی
کہتے تھے کہ لاچار ہے مجبور ہے محکوم — محکوم کے نقصاں میں ہے حاکم کی بھلائی
دو سال ہوئے دورِ غلامی کو سدھارے — اب حاکم و محکوم کا جھگڑا نہیں باقی
کوئی یہ بتائے کہ ہے وہ کون برائی — ویسے ہی وجود آج بھی جس کا نہیں باقی

محروم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے سادہ حقائق کو اس شدتِ احساس کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ہم میں اپنے ظالمانہ خیالات سے کتراؤ پیدا ہونے لگتا ہے۔ ان کی نظر میں عظیم انسان وہ ہے جو اپنے ملک کی خاطر ایک آدرش کے لیے اور انسان کی اخلاقی سربلندی کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دے۔

نغمگی

ان کی نظموں میں روایتی شراب یا عشق پرستی نہیں ملتی۔ نہ ہی خواہش و آرزو کی جذباتی لہریں اپنا سر اٹھاتی ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی غزل بھی اقبال، شبلی اور چکبست کے مانند، اپنے اندر ایک مقصد لئے ہوتی ہے۔ لیکن یہ مقصدیت انھیں سستی نعرہ بازی کی طرف جو کہ بیشتر ترقی پسندوں کا خاصہ ہے، نہیں لے جاتی۔ محروم بحیثیت ایک فرد کے اپنے ماحول سے آگاہ ہیں۔ وہ انھیں متاثر بھی کرتے ہیں اور اس پر تنقید بھی۔ دونوں ایک دوسرے سے فیض پاتے ہیں۔ سیاسی صورت حال ہو کہ سماجی بکھیڑا یا کوئی سیدھی سادی انسانی جبلت۔ محروم کے کلام میں اس کا سچا عکس اپنے فنکارانہ حسن کے ساتھ صاف دکھائی دے گا۔

نہ سوز و ساز کے پیری میں چھیڑ افسانے — سحر ہے، شمع کہاں اب، کہاں ہیں پروانے
بگڑ گئے ہیں وہ نقشے، بدل گیا عالم — اجڑ گئے ہیں خیالات کے پری خانے

یا

تجھ کو ہے ذوقِ سخن اے دلِ بیتاب ابھی — صبح ہے، اور ہے تو منتظرِ خواب ابھی
مجھ سے محروم تقاضائے غزل ہے بیسود — کہ مری فکر میں ہے نوحۂ پنجاب ابھی

یا پھر ؎

تم ہو صحنِ باغ میں جب زینت افزائے بہار	کیوں بہارِ لالہ و گل پر نہ آجائے بہار

ان کے تمام کلام میں جس کے اب تک چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور خدا کرے کہ اور شائع ہوں۔ ہمیں بلند پایہ خیالات پورے حسن و جمال کے ساتھ بیان کئے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کا نصب العین انسان کو عناد کے چنگل سے چھڑانا ہے اور انسانوں میں بھائی چارگی کو فروغ دینا ہے ـــــ آج ہم ان کی عزت افزائی کر کے زندگی کی ان اعلیٰ قدروں کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں جو ایک بامقصد زندگی کا زیورِ حسن ہوا کرتے ہیں۔

غزل

عشق کی دنیا میں جنسِ غم کو ارزاں کر دیا	ہم غریبوں کے لیے جینے کا ساماں کر دیا

زیست کی دشواریوں نے یہ تو احساں کر دیا	موت سی مشکل کو میرے حق میں آساں کر دیا

حُسن کو جاں بخشیاں دیں تو نے اے حسنِ آفریں	آہ! لیکن پھر اسی کو دشمن جاں کر دیا

میں تو جب مانوں کہ میرے دل کی بیتابی مٹے	کیا ہوا اگر آئینے کو تم نے حیراں کر دیا

کر دیا ظاہر وہ کچھ جس سے پریشاں ہو نظر	جس سے تسکیں دل کو ہو وہ راز پنہاں کر دیا

شوق سے جا کر علاج کشتگانِ شوق کر	دل کو ہم نے بے نیازِ درد و درماں کر دیا

ہے یہ دنیا ایک ہی افسانۂ ناکامِ شوق	جس نے جو چاہا الگ تجویز عنواں کر دیا

طبعِ رنگیں نغمہ زارِ شوق تھی اپنی، مگر
حادثاتِ دہر نے اس کو بیاباں کر دیا

مخدوم

ہنس راج رہبر

تلوک چند محروم

منشی تلوک چند محروم اردو کے ان چند خوش نصیب شاعروں میں ہیں جن کی حیات میں ان پر لکھے ہوئے مقالات ایک کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ یہی نہیں غالباً وہ اس اعتبار سے واحد شخص ہیں جن کے فرزند ارجمند نے جو خود ایک نامور ادیب اور شاعر ہیں ایسی کتاب مرتب کی ہو۔ یہ کہدینا کہ منشی تلوک چند محروم پر مقالات کے اس مجموعے سے اردو ادب کے سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے کوئی مبالغہ نہیں۔ کتاب اگر کئی اعتبار سے تشنہ نظر آتی ہے تو اس کی وجہ صاف طور پر یہ ہے کہ مختلف ادیبوں کے مقالات میں کئی چیزوں کی تکرار لازمی تھی نیز عام تنقیدی مضامین میں بہت کم لوگ شاعر کی ابتدائی زندگی اس کے ذہنی ارتقا اور اس کے ذاتی حالات پر کچھ لکھتے ہیں۔ قدرتی طور پر ان مقالات کے مجموعہ میں ان امور پر زیادہ مواد دستیاب نہیں ہو سکتا۔

اردو ادب میں ذاتی حالات کی کرید کوئی بڑا فن نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ اس امر پر توجہ دی جا رہی ہے کہ شاعر کو ڈھالنے، بنانے اور بگاڑنے میں ماحول اور حالات کا کتنا دخل ہوتا ہے۔ شاعری کو شاعر کی ذات سے الگ دیکھنے کی ایک رسم پڑ چکی ہے

ان وجوہ کی بنا پر جناب محروم کی شخصیت کے بیشتر گوشے پنہاں ہی رہے ہیں۔ کسی حد تک مسٹر جگن ناتھ اس کمی کو پورا کر سکتے تھے۔ اور ان کا مضمون جو پہلے نقوش میں شائع ہوا، اس کمی کو بھی پورا کر رہا ہے۔ تاہم یہ احساس بار بار پیدا ہوتا ہے کہ مقالات کے مجموعہ کے ساتھ ساتھ اگر شاعر کی مکمل حیات اور اس حیات کے تعمیر کرنے والے عوامل کا نقشہ بھی دیا جاتا تو اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جاتا۔

منشی تلوک چند محروم اس وقت ۸۰ برس کے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے انیسویں صدی کے دور سکون سے لے کر تقسیم برصغیر کے دور خونیں تک سب اطمینان بخش اور الم زا حالات کو دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا اپنا ذاتی غم بھی خاصا اہم ہے اور ان تجربات نے مل کر ان کی شاعری کو ایک پیارا ٹھہراؤ، ایک فلسفیانہ انداز دیا ہے۔ وہ نظیر کی طرح الفاظ پر قدرت رکھتے ہیں اور منظر کشی میں ان سے کسی صورت کم نہیں ہیں۔ لیکن جہاں نظیر

الفاظ کے استعمال پر کوئی فن کارانہ محنت صرف کرتے دکھائی دیتے، وہاں محروم ہر لفظ کو ذہنی کسوٹی پر کئی بار پرکھتے ہیں دونوں کی روانی دونوں کی سلاست اور دونوں کی تصویر کشی اگرچہ قابلِ داد ہے۔ لیکن وہاں محروم میں ایک رچاؤ، ایک متانت، ایک گہرائی ہے وہاں نظیر میں تیزی، شدت اور عوامی مضمون کی تھکا دینے والی بہتات کا احساس ہونے لگتا ہے۔

محروم شاعری کو مذہبی پرچار کا آلۂ کار نہیں سمجھتے۔ اس لیے جب کبھی انھیں اکبر کے میدان میں کسی قومی کردار کی تصویر کشی کا موقع پیش آتا ہے تو وہ محض مذاق اور پھبتی پر ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک دل کش پند کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اگر غزل کے سوز وگداز، نظم کی شدت جاذبیت، تسلسل اور استعارات میں مطالب کے بیان کی روانی کا اندازہ لگانا ہو تو بہت کم شاعر محروم کے قریب پہنچ سکیں گے۔

محروم نے منظر کشی، ذاتی غم کے بیان، حب الوطنی، پند و نصائح اور اپنے بزرگوں کے کارناموں پر نظمیں لکھی ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ لیکن ملکہ نور جہاں کے مزار پر محروم صاحب نے جو نظم لکھی شاید ہی کوئی شخص ہو گا جسے وہ ہر دم اپنے کانوں میں گونجتی سنائی نہ دے۔ منشی تلوک چند محروم بجائے خود ایک انجمن ہیں۔ وہ زیادہ بولتے نہیں ہیں۔ لیکن جس قدر کم بولتے ہیں اسی قدر زیادہ سوچتے ہیں، اور یہ فکر وہ عام طور پر رباعیات کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ رباعیات کے ذریعے اپنے مداحوں سے اپنے دل کی بات کرتے ہیں۔ اردو ادب میں اس وقت بہت کم شاعروں کو رباعی پر ملکہ حاصل ہے۔ اور ان بہت کم لوگوں میں محروم کسی سے دوسرے نمبر پر نہیں ہیں۔

زیر نظر کتاب میں محروم کی شاعری کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اگر کسی تشنگی کا احساس ہوتا ہے تو وہ ہے ان کی زندگی پر سیر حاصل تبصرہ۔ اگر ان کے خیالات و نظریات ادب اور زندگی پر ایک مبسوط مقالہ شامل کر دیا جاتا تو یہ کتاب اور زیادہ جامع ہو جاتی۔

ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کو جگن ناتھ سے فرزند ملتے ہیں تو بہت کم — لیکن اس کے باوجود اگر کتاب پر کوئی اعتراض ہو تو یہ کوئی بہت اچھی بات نہیں۔ تاہم یہ کتاب ایک عمدہ اضافہ ہے اور امید کرنی چاہیے کہ جگن ناتھ اس کتاب کی تشنگی کو دوسری کتاب کے ذریعے دور کر دیں گے۔ کاش وہ اپنے والد کی طویل عمری اور ان کے شاعری کے پس منظر کو قلم بند کر سکیں۔ قدرتی بات ہے اس طرح وہ گزشتہ صدی بھر کے ادب پر ایک نظر بھی ڈال رہے ہوں گے۔ کیوں کہ محروم کی تربیت انیسویں صدی میں اور ان کے علم کی اشاعت بیسویں صدی میں ہوئی۔

کتاب کی طباعت اور اس کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ اور اس کے لیے اس کے ناشر ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب کی ضخامت ۲۰۲ صفحات اور قیمت چھ روپے ہے۔ اس میں چار تصاویر بھی شامل ہیں۔

ہنس راج رہبر

وطن کا شاعر

اردو زبان میں وطن دوستی کے جذبات کا اظہار بہت بعد کی بات ہے۔ ایسا ہونا قدرتی بھی تھا۔
اردو زبان لشکری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اس میں عوام اپنے حکمرانوں سے بات چیت کرتے تھے اور جب تک عوام اور حکمراں ایک ہو پائے سلطنت کا تختہ ہی الٹ گیا۔

۱۸۵۷ء میں غالباً پہلی بار لوگوں کو معلوم ہوا کہ بنگال سے لے کر صوبہ سرحد تک ہندوستان ایک ملک ہے جس کے باشندوں میں وحدت جذبات کار فرما ہے۔ لیکن ایسے دور میں بھی بہت سے شاعر ایسے تھے جو بیزوں کا دم بھرتے رہے جسے وطن سے دور کی بھی نسبت نہ تھی اور افسوس ناک بات تو یہ تھی کہ وطن دشمنی کو مذہب پرستی کے مترادف تک قرار دینے کی تاویلیں کی گئیں۔

۱۸۵۷ء میں قوم ہند نے قربانیاں دے کر حب الوطنی کے جذبہ کو تقویت بخشی بلکہ یوں کہیے کہ وطن دوستی کے تصور کو عزیز تر کیا۔ کئی شعرائے اردو نے ان کا یوں مذاق اڑایا۔

آفت اس شہر پہ قلعہ کی بدولت آئی   واں کے اعمال سے دہلی کی بھی شامت آئی

روز موعود سے پہلے ہی قیامت آئی   کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

ایک شاعر نامدار نے فرمایا۔

زباں سے کہتے ہوئے دین دین آئے ہیں   جو مانا دین تھا کوئی تو کوئی گنگا دین

یہ جانتے ہی نہ تھے چیز کیا ہے دین متین   کئے ہیں قتل زن و بچہ کیسے کیسے حسین

روا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا
غرض وہ کام کیا، کام ہی تمام کیا

اور جب برطانوی راج قائم ہو گیا تو خدا کی شان دیکھیے درجنوں شاعروں نے درجنوں قصیدے لکھے، نہایت عمدہ کاغذ پر وطن کے خلاف اشعار کہے اور شائع کرائے، وظیفے پائے اور نامور کہلائے۔

حالی غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے قوم کی خوابیدہ تقدیر کو جگانے کے لیے اشعار کا سہارا لیا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے وطنی نغمے گائے لیکن ان کی وطن دوستی ایک محدود مقصد اور ایک محدود نقطۂ نظر سے تھی۔ اور اگرچہ وہ بیسویں صدی کے پہلے دس برس میں زندہ رہے۔ لکھتے رہے لیکن ان کے نظریے یا انداز میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی۔ حالی کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ حالی تو ایک شاعر تھے اس دور میں خود کانگریس سرکار پرست تھی اور اس کے اپنے ذہن میں بھی وطن کی خالص آزادی کا تصور بہت مبہم سا تھا۔ وائسرائے کی آمد پر اظہار خوشنودگی بلکہ خود کانگریس کا مدتوں تک شیوہ رہا۔

لیکن عجیب سی بات نظر آئے گی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ منشی تلوک چند محروم اس دور میں بھی خالص وطن دوستی کا نعرہ لگا رہے تھے۔ ان کی دعا کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے خدا دندہ مرد وہر دعا ہے تجھ سے — اخترِ ہند کو ہم اوج ثریا کر دے

کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ منشی تلوک چند محروم ایک ہندو ہونے کی وجہ سے فطری اور قدرتی طور پر حب وطن کی طرف مائل تھے۔

ہندو وطن کو ماتا کا درجہ دیتے آئے ہیں اور اس جذبۂ عقیدہ یا احساس کا اظہار کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔

اسی دعائیہ کے دو شعر اور ملاحظہ کیجیے۔

کبھی سینے تری توحید کے آئینے تھے — عکس سے اپنے انھیں پھر متجلا کر دے

رام و لچھمن کی جبیں میں جو کبھی روشن تھا — پھر اسی نور کے جلووں کو ہویدا کر دے

یہ ۱۹۰۶ء کا ذکر ہے، مسلم لیگ کو وجود میں آئے صرف ایک سال ہوا تھا، لیکن منشی تلوک چند محروم کی دور بین آنکھوں نے شاعرانہ بصیرت سے مستقبل کا نقشہ دیکھ لیا۔

لٹل جون کے عنوان سے محروم صاحب نے انھی دنوں جو تمثیلہ نظم کہی اس میں غیر کے طعن کا سہارا لے کر ذرا کھل کر بھی بات کہی ہے۔ لٹل جون ہندوستان کو 'سارے جہاں سے اچھا' تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ بلکہ اس کے خلاف یہ کہتا ہے۔

اچھے اگر یہ ہوتے کچھ بافراغ ہوتے — ایجادِ فن کے قابل ان کے دماغ ہوتے

اچھے اگر یہ ہوتے رکھتے ملاپ باہم　　　ہرگز نہ وار کرتے اک دوسرے پہ پیہم

یوں تو ادب قومی تحریکوں کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے اور انسانی ترقی، مادی ترویج اور صنعتی پیش رفت کے ضمن میں جو کچھ بھی اضافہ ہوتا ہے، ادب کسی نہ کسی صورت میں اس کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن اگر وطن کی تاریخ کو جذبات کے ردعمل سے کسی نے لکھا دیکھنا ہو تو محروم کی وطنی شاعری سے بہتر کوئی چیز نہ ملے گی اس اعتبار سے محروم صاحب کا وطنی کلام جسے بجا طور پر "کاروانِ وطن"[1] کا نام دیا گیا ہے، وطن کی سیاسی، ذہنی اور سماجی تحریکوں کی شاعرانہ تاریخ ہے۔

یہی نہیں اس شاعرانہ تاریخ میں نہ واقعات مسخ ہیں، نہ حالات پر کوئی پردہ ڈالا گیا ہے بلکہ جس طرح ہندوستان کو پایا اور جس طرح اس کو دیکھنا چاہا اسی طرح لکھ دیا۔ دوسرے الفاظ میں محروم صاحب کی وطنی نظمیں، قطعات اور غزلیں ایک خاص، حسین اور بلند مقصد کی آئینہ دار ہیں۔ یعنی محروم صاحب اپنے وطن کے قافلے کو آزادی کی منزل پر پہنچے دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کی ہیئت کو بدل کر اسے ایک قابلِ فخر ملک بنانے کے بھی تمنائی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ محروم صاحب کی شاعری کا زمانہ وطن کی جدوجہد آزادی کا زمانہ ہے۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر بہت آگے نکل جاتا ہے اور پھر جب وہ اپنے ساتھی کو دیکھتا ہے تو کف افسوس ملتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔

یہ ہمارا عہد جب ہو جائے گا عہد کہن　　　گل کھلائے گی نئے جب گردشِ لیل و نہار

ثبت ہوگا برگ و گل پر لاجپت رائے کا نام　　　اور گائے گی پرانے گیت گلشن میں ہزار

ہم نہ ہوں گے، ہم نہ ہوں گے آہ اے چشمِ خیال
کچھ نظر آتی ہے تجھ کو گردشِ دوراں کی چال؟

لیکن محروم صاحب نے اپنی زندگی میں ہی آزادی کی دیوی کے درشن کر لیے۔ یہ اور بات ہے کہ حالات کچھ ایسے ہوئے کہ امیدوں پر پانی پھر گیا اور جس چیز کی تمنا، تلاش اور حصول میں جان کی بازی تک لگا دی تھی اس سے یک گونہ مایوسی ہوئی۔

یہ مایوسی ایک سچے دوست، ایک حقیقی محب وطن اور ایک خلوص مند انسان کی مایوسی ہے۔ اس میں

---

[1] کاروانِ وطن محروم صاحب کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے جو آزاد ہندوستان میں شائع ہوا۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے بہت اہتمام سے یہ کتاب شائع کی۔

شدت غم کا ایک طوفان ہے جو ہر گوشے سے بہتا چلا آرہا ہے۔

خدا کا شکر ہے وہ دورِ ابتلا گزرا — ہمارے خون سے گو کھیلتا ہوا گزرا
خدا کا شکر کہ آزاد ہے وطن اپنا — ہوا کبھی تو بہار آشنا چمن اپنا

چراغ اب کے بصد کرو فر جلائیں گے
مکاں نہیں تو سرِ رہ گزر جلائیں گے

اگرچہ محروم صاحب کو آزاد ہند سے بے پناہ پیار ہے لیکن انھیں اس وطن عزیز کی وہ بدعنیں پسند نہیں آئیں جنھوں نے آزادی کے لطف کو کرکرا کر دیا۔

ہماری برائیوں کے عنوان سے ان کے اشعار دیکھیے۔

انگریز سے منسوب کیا کرتے تھے اس کو — آتی تھی نظر ہم کو وطن میں جو بُرائی
کہتے تھے کہ لاچار ہے، مجبور ہے محکوم — محکوم کے نقصاں میں ہے حاکم کی بھلائی

دو سال ہوئے دورِ غلامی کو سدھارے — اب حاکم و محکوم کا جھگڑا نہیں باقی
کوئی یہ بتائے کہ ہے وہ کون بُرائی — ویسا ہی وجود آج بھی جس کا نہیں باقی

وطن سے ہر کوئی پیار کرتا ہے بلکہ وہ لوگ بھی وطن کے پیار کے دعوے دار ہوتے آئے ہیں جنھوں نے اس کو غلام بنایا، اور غلام بنائے رکھنے کے لیے ہر ستم ایجاد کیا۔

یہ محروم صاحب کا حوصلہ ہے کہ انھوں نے ایسے دورِ ابتلا میں جب معمولی سی جرأت دکھانے پر کالے پانی کی سزا ہو جاتی تھی وطن دوستی کو زندہ رکھنے اور جوانوں کے خون کو گرمانے کے لیے نظمیں لکھیں انھیں اپنے جذبے کی شدت کا جس قدر احساس تھا اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اکثر و بیشتر نظمیں گمنام رکھیں۔ گویا حصولِ زر یا تلاشِ ناموری کوئی چیز بھی ان کے سامنے نہ تھی۔ انھیں عزیز تھا اپنا وطن۔ اور اس وطن کی ہر وہ چیز جس سے آزادی قریب تر لائی جا سکے۔

اس جذبے نے انھیں اپنے لیڈروں اور اپنے نوجوانوں کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے قوم پرست لیڈروں کی ہر ادا پر قصیدے کہے۔ یہ قصیدے دراصل وطن کی شان میں ہیں، اور وطن کی روح اس کے لیڈروں میں نظر آرہی ہے اس ضمن میں گوکھلے، تلک، لاجپت رائے، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، سی۔ آر۔ داس، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد

اور دوسرے فدائیانِ وطن کی مدح خوانی کی گئی ہے لیکن ایک فرق ہے ان قصیدوں میں حرص وطمع مقصد نہیں مقصد بہت بلند ہے اور یہی مقصد انھیں شاعری کے اعلیٰ معیار پر بلند ترین مقام دلاتا ہے۔

لیڈروں کی توصیف کے علاوہ محروم صاحب نے مختلف قومی تحریکوں پر بھی نظمیں کہیں۔ سودیشی تحریک پر ان کی غزل خاص طور پر ذکر کے قابل ہے۔ ۱۹۰۶ء میں ایک ۱۹ برس کے نوجوان سے سودیشی تحریک پر غزل کی توقع کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اور پھر غزل بھی ایسی جو ادبی معیار پر پوری اترتی ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس غزل کی ردیف نئی ہے۔ اور اس قدر خوب صورت کہ اس دور میں یہ ایک نعرہ بن گئی تھی۔

وطن کی الفت میں ہو زباں پر سدیش وستو سدیش وستو
سنا دو ہندوستاں میں گھر گھر سدیش وستو سدیش وستو

یہیں کی روئی، یہیں کی ململ، یہیں کا ریشم یہیں کی مخمل
نہ لنکا شائر، نہ مانچسٹر، سدیش وستو سدیش وستو

محروم صاحب نے اپنے وطن میں دو بھائیوں کو جن پر وطن کی آزادی یا یوں کہیے کہ محروم صاحب کی امیدوں کا انحصار تھا لڑتے دیکھا ہوگا تو خدا معلوم ان پر کیا گزری ہوگی اور کتنے روز تک اس درد کو سینے سے لگائے رکھا ہوگا کاروانِ وطن میں بہت سی نظمیں ایسی ملیں گی جن میں اس غم کا اظہار ہے اور یہ غم ایسا ہے جو اب بھی محروم صاحب کو کھائے چلا جا رہا ہے۔

درِ اغیار پر دونوں کو ہے ذوقِ جبیں سائی
کہ برپا ہندو و مسلم میں ہے ہنگامہ آرائی

انھیں برباد ہو کر بھی سمجھ اتنی نہیں آئی
نفاق ایسی بری شے ہے جو پربت کو کرے رائی

قریبِ ساحل اپنے ملک کا بیڑا ڈبونے کو
یہ بحث کفر و ایماں وقت پر یاروں کو یاد آئی

عمل پیرا ہوں مذہب پر اگر مذہب کے دیوانے
بہم دیگر گریباں گیر کب ہوں مثلِ سودائی

محروم صاحب نے اپنے ماحول میں جب بزرگانِ دین و مذہب کو لڑتے دیکھا ہوگا تو یقینی امر ہے کہ بچوں اور جوانوں کو اس مسموم ہوا سے بچانے کا خیال بھی کیا ہوگا۔

غالباً ماحول کی اس خرابی نے اقبال سے نیا شوالہ لکھوایا۔ لیکن جہاں اقبال وطنی دوستی سے گزر کر ایک اور منزل کی جانب چل دئے۔ چکبست کی عمر نے وفا نہ کی اور اکبر نے اپنا مقام ہی الگ چنا۔ وہاں محروم صاحب اس راستے پر گامزن رہے۔ اور انھوں نے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ تو اسی وجہ سے تا کہ فراخ دل وطن دوست اور شریف النفس استادوں کے ہاتھ آنے والی پود کی نشو و نما کی ذمہ داری رہے اور ان پر مذہب و ملت

یا شیخ و برہمن کی لڑائی کا کوئی اثر نہ پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ محروم صاحب کا اکثر و بیشتر کلام بچوں اور نوجوانوں کے اخلاق کو سدھارنے، ان کے حوصلوں کو بلند کرنے اور انھیں زندگی میں کامیاب انسان بننے کی تلقین کے لیے لکھا گیا ہے۔

محروم کی زبان اگر طلبا کی زبان ہو جائے اور ان کے اخلاق کا اثر طلبا پر براہ راست پڑنے لگے تو وطن کے درجنوں مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی اخلاقی شاعری کوئی شاعری نہیں ہے غالباً وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ گل و بلبل، شمع و پروانہ، شراب و کباب اور جنسی لذت کا لفظوں میں اظہار ہی شاعری کہلانے کا مستحق ہے۔

یہ کیسے تسلیم کریں کہ محبوب کی بے رخی سے تو میرے سینے میں ایک طوفان امڈ آئے۔ لیکن وطن کے غم سے میری آنکھیں بھی نم نہ ہوں۔ اور اس کے باوجود مجھے انسان مان لیا جائے۔ اگر میرے جذبات وطن کے غم سے پریشان نہیں ہوتے اور اس کے مقابلے میں معمولی سے ذاتی واقعہ سے بہہ نکلتے ہیں بے اختیار ہو جاتے ہیں تو اس میں قصور میری پرورش کا ہے میرے ماحول کا ہے، میری تعلیم کا ہے۔

میں نے وطن پر جان دینے والوں کو محبوبوں کے قصے گاتے نہیں دیکھا۔ میں نے ان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ سنا وہ کچھ اس قسم کا تھا۔

"میں توقع کرتا ہوں کہ میرا مالک حق بجانب ہے اور اگر توقع پوری نہیں ہوگی تو میں کیا کروں۔
میں تو وطن کے لیے جان دوں گا، وہ حق بجانب ہے یا نہیں۔ (کری ٹنڈن ۱۸۴۶ء)

اور ان فدائیان وطن کا تصور ہی تو کام کرتا رہا کہ

"کوئی قدم بھی اٹھے وطن کی بھلائی میں ہو"

بقول ہومر

"مجھے تو وہ شخص پسند ہے جو سب سے زیادہ وطن دوست ہے"

یہی نہیں بزرگوں کا قول ہے کہ وطن کی شان اسی سے بلند ہوتی ہے کہ اس پر جوانوں کی ہر تمنا قربان ہو۔

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں۔ کہ وطن کی معمولی سی آواز پر رستم و زال ایسے پہلوان اپنا ہر عیش و عشرت چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر وہ ادب جو محض عیش کے ترانے سنائے۔ یا جس میں سفلی جذبات کی نہایت حسین عکاسی ہی کیوں نہ ہو، صحیح ادب کیسے بنے گا اور اس کے مقابلے میں اخلاقی قدروں کی بلندی کا حامل ادب ایک مقصدی ادب کہہ کر دوسرے

درجے میں کیسے پھینک دیا جائے گا۔ حب وطنی کے مقصدی ادب سے اگر آپ کی روح میں بالیدگی، خون میں گرمی اور دماغ میں ہلچل پیدا نہیں ہوتی تو اس میں ادب کا نہیں آپ کا قصور ہے۔ اور جس نقاد نے بے مقصدی ادب کو بلند ادب قرار دیا ہے اس نے ادب کے معنی ہی نہیں سمجھے۔

محروم صاحب کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے مقصدی ادب کو ایسے انداز سے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے کہ حسن پرور جذبات کی تمام جزئیات کی تسکین ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے دورِ حیات کی ذہنی، سماجی اور سیاسی تاریخ کا جذباتی ردعمل پیش کیا ہے۔ ایک شاعر کی نظر سے ہمیں وہ حالات دئے ہیں جن سے ہمارے بزرگ گزرے، ہم گزرے اور اب ایشیا اور افریقہ کے درجنوں ملک گزر رہے ہیں۔ اس انداز سے اگر دیکھا جائے تو کلامِ محروم کی ایک بڑی افادیت نمایاں ہو جاتی ہے۔

محروم صاحب جوانوں کے مخاطب ہیں، انھیں ان پر بہت بھروسہ ہے۔ جس قدر اعتقاد محروم صاحب نے ان پر کیا ہے شاید کسی اور پر نہیں۔

اور اب نئے جوان جنھوں نے نہ بزرگوں کی ایسی سختیاں سہی ہیں نہ ہم جیسے ادھیڑ عمر لوگوں کا عبوری دور دیکھا ہے ان کے لیے کلام محروم خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش میں غلامی کے خلاف آزادی کی جنگ دیکھ رہے ہیں۔ کئی بار ہمیں خیال آیا ہے کہ اگر ہمارے حاکموں کے ہاتھوں میں وہ ہتھیار ہوتے جو ۱۹۴۷ء کے بعد عام ہوئے تو کیا ہم آزادی حاصل کر پاتے۔

درست کہ ہمارے رہنما بہت طاقتور تھے۔ درست کہ ان کے سینوں میں نہ بجھنے والی جوالا تھی۔ لیکن لوٹ کھسوٹ کی قوتیں بھی کم طاقتور نہ تھیں اور گوا کی صورت دیکھ کر تو خیال گزرتا ہے کہ یوروپی قوموں نے کچھ نہیں سیکھا۔ الجیریا میں جو کچھ ہوا ہے اسے کیا دوہرائیں۔

یہ سب کچھ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کا ایک پرتو ہے، اور ہند کے وہ جوان جنھوں نے ابھی بلوغت میں قدم رکھا ہے انھیں کلام محروم سے بہت کچھ ملے گا۔ ہم سے لوگوں کو اپنے بزرگوں کی جرأت کی داستان ملے گی اور بزرگوں کو اپنے کارناموں کی تاریخ۔

مجتبیٰ حسین

کاروانِ وطن

"کاروان وطن" منشی تلوک چند محروم کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس میں صرف ایسی نظمیں شامل ہیں جن کا تعلق جذبۂ حب وطن" سے ہے۔ اردو شاعری میں منشی تلوک چند محروم کا جو بلند مقام ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ لیکن اس ضخیم مجموعۂ کلام کو دیکھ کر جو تقریباً ۴۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح ایک ہی شاعر جذبۂ حب وطن پر اتنی کثیر اور ایسی معیاری نظمیں کہہ سکتا ہے۔ مجموعۂ کلام کیا ہے ملک کی گذشتہ نصف صدی کی سیاسی سرگرمیوں کی ایک منظوم تاریخ ہے شاید ہی ایسا کوئی سیاسی واقعہ گزرا ہو جس سے محروم صاحب متاثر نہ ہوئے ہوں اردو کے وطن پرست شعرا کی فہرست میں چکبست، اقبال، اکبرالٰہ آبادی اور اسمٰعیل میرٹھی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ لیکن ان سب کے انداز مختلف تھے۔ محروم صاحب کے پاس ہمیں ایک انوکھا پن نظر آتا ہے۔ ان کے سامنے کوئی سیاسی نصب العین نہیں، لیکن وہ سیاسی واقعات سے ایسے ہی متاثر ہوتے ہیں جیسے ایک عام دردمند انسان ہو سکتا ہے۔ خلوص کی گہرائی، پاکیزہ جذبات کی شدت اور خیال کی ندرت بس یہی محروم صاحب کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

سیاست کی پیچیدگیوں سے اپنے آپ کو الگ رکھتے ہوئے محروم صاحب نے پورے خلوص کے ساتھ سیاسی واقعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ ۱۹۰۶ء ہی میں جب کہ انگریزی حکومت کے خلاف کچھ کہنا بھی اپنے آپ کو آفت میں مبتلا کرنے کے برابر تھا۔ محروم صاحب نے بھارت ماتا کیوں روتی ہے۔" اور "سودیشی تحریک" وغیرہ جیسی نظمیں لکھیں۔ آج سے پچاس برس پہلے اس قسم کی نظمیں لکھنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ محروم صاحب ابتدا ہی سے وطن پرستی کے جذبے سے سرشار تھے اور اپنی بات کے اظہار سے نہ چوکتے تھے۔ علامہ نیاز فتح پوری نے "حرفے چند" کے عنوان سے محروم صاحب کی شاعری پر مختصراً مگر بہت جامع انداز میں تبصرہ کیا ہے۔

مجموعۂ کلام دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ "فریاد جرس" ہے۔ جس میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کی نظمیں شامل ہیں دوسرا حصہ "منزل" ہے جس میں ۱۹۴۷ء سے حال تک کی نظمیں شامل کر دی گئی ہیں۔

پہلے حصے کی نظموں میں محروم صاحب پورے خلوص اور درد کے ساتھ وطن کی بے بسی پر آنسو بہاتے ہیں۔ جگہ جگہ

ایک مشترکہ کلچر کی حمایت کرتے ہیں۔ اس میں ایسے موضوعات پر بھی نظمیں شامل ہیں جنھیں شاعرانہ کبھی نہیں کہا جاسکتا۔ جیسے "کیمونل اوارڈ" "گول میز کانفرنس" "سائمن کمیشن" اور "سودیشی تحریک" وغیرہ لیکن محروم صاحب کو زبان پر اتنی قدرت ہے کہ موضوع کو دلچسپ بنادیتے ہیں اور پڑھنے والوں کی پوری ہمدردی حاصل کر لیتے ہیں۔

آزادی کے بعد منشی تلوک چند محروم کو ایک طرف تو بے پناہ مسرت ہوئی جس کا اظہار وہ "سلام" اور "آزادی" جیسی نظموں میں کرتے ہیں۔ لیکن ملک کی تقسیم کے بعد محروم صاحب کو پاکستان سے ہندوستان ہجرت کرنا پڑا اور اس موقع پر انھوں نے "پاکستان کو الوداع" کے عنوان سے جو نظم کہی ہے وہ اپنے اندر بے پناہ سوز اور درد رکھتی ہے۔ ملک کی تقسیم پر اکثر شعرا نے نظمیں لکھی تھیں لیکن محروم صاحب کے یہاں خلوص کی گہرائی ملتی ہے۔ وہ اپنے آپ پر ہر قسم کی تکلیف کو برداشت کر سکتے ہیں، لیکن اپنے وطن پنجاب کی سلامتی کی دعا مانگتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان کی خوش حالی اور اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں کی بھلائی کی تمنا کرتے ہیں۔

محروم صاحب کے اس مجموعۂ کلام کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ ان کی پرانی نظمیں پہلی بار ان کے نام سے شائع ہو رہی ہیں۔ انگریزی دور حکومت میں مختلف پابندیوں کا خیال کرتے ہوئے انھوں نے دوسرے ناموں سے ملک کے مختلف رسائل میں اپنی نظمیں شائع کرائی تھیں اور بعض غیر مطبوعہ حالت میں تھیں، اب انھیں بھی اس کلام میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب کی قومی شاعری میں محروم صاحب کا یہ کلام ایک عظیم سرمایہ ہے جس میں نصف صدی کی سیاسی تاریخ کو شعر کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

محبوب حسین

گنجِ معانی

اردو شاعری پر غزل نگاری کا تسلط تھا، اور تمام دوسرے اصنافِ سخن دب سے گئے تھے۔ غزل گوئی میں بھی فارسی شعراء کے چبائے ہوئے نوالے پھر مزے لے لے کر چبائے جارہے تھے۔ روایت پرستی اپنی بدترین شکل میں عام تھی۔ وصال و ہجر، گل و بلبل، رند و ساقی کے پامال تصورات افقِ فکر پر چھائے ہوئے تھے۔ غزل کے میدان میں پرانی لکیر کچھ اس بری طرح سے پیٹی جارہی تھی کہ غالب جیسا تغزل گو سخنور تنگ نائے غزل سے تنگ آکر چیخ اٹھا۔

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

ان حالات میں محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے دور کی غزل پرستی کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ انھوں نے اردو شاعری میں نظم نگاری کی طرح تو ڈال کر وسعتِ بیان کی نئی راہیں کھول دیں۔ آج سے ٹھیک نصف صدی پہلے ہمارے شاعروں کا ایک گروہ آگے بڑھا اور آزاد و حالی کے لگائے ہوئے پودے کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کرنے لگا۔ اس گروہ میں اقبال، تلوک چند محروم، سرور جہاں آبادی، چکبست لکھنوی، نادر کاکوروی اور خوشی محمد ناظر ہراول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس گروہ نے ہمارے شعر و سخن کے گلدستے میں رنگا رنگ دل کش پھولوں کا بیش بہا اضافہ کیا اور نظم نگاری کو بلند مرتبے پر فائز کردیا۔ اس صفِ اول کے اساتذۂ سخن میں سے اکثر اپنا حق ادا کر کے اس دنیا سے سدھار گئے۔ لیکن تلوک چند محروم کی ہستی مغتنم روزگار ہے۔ جو اب تک ہم میں موجود ہے اور جو برابر دادِ سخنوری دیے جارہی ہے۔

محروم کی جنم بھومی سرزمین پنجاب ہے۔ انھوں نے آج سے پچاس برس پہلے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اس زمانے کے مؤقر ادبی رسائل مثلاً مخزن لاہور، زمانہ کان پور، ادیب الٰہ آباد، العصر لکھنؤ وغیرہ میں ان کا کلام چھپتا تھا اور قبولِ عام کی سند پاتا تھا۔ ان کی بعض نظمیں "شبِ غم" "نامۂ دل ربا" اور "دلِ بے قرار سو جا" تو اشاعت کے ساتھ ہی زبان زدِ خاص و عام ہو گئی تھیں۔

کلامِ محروم اب تک کئی بار مختلف حصوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اور ان کے مجموعۂ کلام "گنجِ معانی" کا دوسرا ایڈیشن ابھی

سال شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں حمد و معرفت، جذباتِ فطرت، مناظرِ قدرت، مذہب و اخلاق اور پند و نصائح کے موضوعات پر مرحوم نے جو نظمیں، قطعات اور رباعیاں لکھی ہیں وہ شائع کر دی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی غزلیں اور فارسی کلام کا کچھ حصہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کے پڑھنے سے حضرت مرحوم کی تمام اصناف سخن میں قادر الکلامی آشکارا ہوتی ہے۔ آپ کے کلام کے محاسن کا اعتراف حضرت اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ایک نظم میں یوں کیا تھا۔

ہے داد کا مستحق کلام محروم　　لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم

ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز　　ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

جہاں تک فنِ شعر کا تعلق ہے وہ ایسے پختہ کار شاعر ہیں کہ مشکل سے دو چار ہی ان کی بلندی کو پہنچ سکتے ہیں ان کا کلام سوز و گداز اور انسانیت کے اعلیٰ جذبات سے معمور ہے۔ انھوں نے گلستانِ سعدی کے بعض حصوں اور شیکسپیئر کے کلام کے بعض ٹکڑوں کو دلنشین انداز میں اردو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ کلامِ محروم پر یہاں شرح و بسط کے ساتھ تبصرہ کرنا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ ہم یہاں ان کی بعض ایسی نظموں کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں جن کی ایک زمانے میں ہندوستان بھر میں دھوم مچی ہوئی تھی۔

نہیں وعدۂ بتاں کا کوئی اعتبار سو جا　　نہ کر انتظار سو جا دلِ بے قرار سو جا

جو سمجھ ہو تجھ میں ناداں تو یہ بات خوب سمجھے　　کہ جہاں میں عہدِ خوباں نہیں استوار سو جا

نہ حبیب کا گلا ہے نہ رقیب کی خطا ہے　　یہ نصیب کا لکھا ہے نہیں اختیار سو جا

پڑی محوِ خواب راحت ہے خدائی دیکھ ساری　　مگر اک تجھی پہ ظالم ہے خدا کی مار سو جا

(دلِ بے قرار سو جا)

اے بادِ سحر! اے بادِ سحر!　　اے راہ سپارِ دشت سفر!

اے راحت بخشِ جان و جگر　　جب اس کی گلی میں ہو تیرا گزر

آہستہ ایک صدا دینا

گر نیند میں ہو وہ رشکِ قمر　　دامن کی ہوا سے جگا دینا

اے بادِ صبا، اے بادِ صبا

میرا پیغام سنا دینا

(پیغام)

وہی شام دھندلی دھندلی وہی رات کالی کالی　　وہی خامشی ہوائیں وہی بدلیوں کی کالی
وہی شمع پھیکی پھیکی مرے ساتھ رونے والی　　وہی میں وہی مرا دل وہی منتشر خیالی
شبِ غم بری بلا ہے شبِ غم بری بلا ہے

(شبِ غم)

شب و روز دل فگاری مجھے خوں رلا رہی تھی　　مرا گریہ، مری زاری، مرا تن گھلا رہی تھی
مجھے مرگِ نوجوانی جو کھڑی بلا رہی تھی　　نہ دوا میں کچھ اثر تھا نہ کوئی دعا رہی تھی
مری جانِ زار چپکے سے لبوں پر آ رہی تھی　　کہ پیام یار پہنچا مجھے موت سے چھڑانے
لکھا اپنے ہاتھ سے خط مجھے میرے دلربا نے

(نامۂ دلربا)

حضرت محروم کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو کے مشہور نقادِ ادب شیخ سر عبدالقادر نے بالکل سچ کہا ہے کہ الفاظ کی برجستگی، بندش کی چستی، خیالات کی پاکیزگی، حضرت محروم کے اشعار کی خصوصیات ہیں۔ مگر ان کی شاعری کا جو وصف مجھے خاص طور پر پسند ہے وہ یہ کہ اس میں صلح و محبت کی تلقین ہے۔ دنیا کے سب بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی خوبیاں جناب محروم کے پیشِ نظر ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان والے سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور ان کی بیش بہا زندگیوں سے سبق حاصل کریں۔ اسی ارفع و اعلیٰ پیام کو محروم نے شروع سے آج تک بڑے ہی استقلال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند کے خون آشام ہنگاموں سے بھی ان کے پائے استقامت میں ذرا سی لغزش نہیں ہونے پائی۔

اردو شاعری کے مختلف اصناف میں انھوں نے متنوع موضوعات پر دادِ سخن دے کر ہمارے شعری ذخیرے میں گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ رامائن کے سین اور مناظرِ قدرت پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اردو شعر کو ان کی ایک مستقل دین (CONTRIBUTION) کی حیثیت رکھتا ہے۔

نظم نگاری میں ایک بلند مقام حاصل کرنے کے علاوہ وہ برابر غزل لکھتے آئے ہیں۔ اور اس صنفِ سخن میں بھی اپنا شاعرانہ جوہر دکھایا ہے۔ یہاں بعض ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو محروم کے رنگ تغزل کے آئینہ دار ہیں۔

جس پہ رندوں کو گمانِ لغزشِ مستانہ تھا　　پائے ساقی پر وہ اپنا سجدۂ شکرانہ تھا

پژمردہ جب سے ہے دلِ غم دیدہ کی کلی　　میرے لیے ہیں ایک، خزاں کیا بہار کیا

چلو اب لطف ہی کو آزماؤ　　نہیں آتا تمہیں بیداد کرنا

اٹھانے کے قابل ہیں سب ناز تیرے　　مگر ہم کہاں ناز اٹھانے کے قابل

الفت بھی چل رہی ہے زمانے کے ساتھ ساتھ　　اگلے سے عاشقی کے نہیں ڈھنگ آج کل

خلوت نشیں حرم کے، ہیں یا دیر کے مکیں　　سب سجدہ کرنے والے اسی آستاں کے ہیں

اداسی تیرے کملائے ہوئے پھولوں کی ملتی ہے　　چراغِ صبح میں یا آخرِ شب کے ستاروں میں

مجھے کیا ہے جو میں شیخ و برہمن کی طرح بھٹکوں　　بنا لیتا ہوں دل کو گاہ کعبہ گاہ بت خانہ

اک بلا آنکھیں دکھاتی ہوئی آئی دیکھو!　　بیکسو! تاروں بھری کیا شب فرقت آئی

صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی

بہار طفلی

نظم و نثر لکھنے والوں کی اردو میں کچھ کمی نہیں، لیکن مقصد کے ساتھ لکھنے والوں کی کمی ہی نہیں قحط ہے۔ اور اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ قلم اٹھا کر کاغذ سیاہ کرنا آسان کام ہے لیکن کاغذ با مقصد طریقے پر سیاہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک ہی کام حوصلہ شکنی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ اس شہرت کو دھکا لگنے کا اندیشہ ہو۔ حاضر دماغی اور قلم کی روانی میسر ہو تو منٹوں میں، جو چاہے لکھ ڈالیے۔ لیکن کسی موضوع پر لکھنے اور غور و فکر کے بعد کسی مقصد کے تحت لکھنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ خصوصاً کوئی ایسا موضوع جس میں نفسیات کو بھی پیش نظر رکھنا ہو یہ کام ہر شخص نہیں کر سکتا بلکہ ہمیں یہی کہنا پڑے گا ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ایسے ہی مشکل کاموں میں ایک مشکل اور قلم اٹھانے کے لیے مشکل موضوع بچوں کے ادب کا ہے۔ خصوصاً بچوں کے لیے شاعری کا چند شاعروں کو چھوڑ کر اکثریت ہمارے یہاں ایسے شاعروں کی ہے۔ جنھوں نے زندگی کے کسی دور میں بھی اس طرف توجہ نہیں دی اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر لکھنا ہوتا ہے یعنی ایسی نظمیں لکھنی ہوتی ہیں۔ جو بچوں کو پسند نہ آئیں۔ ان پر ان کا اثر ہو۔ اب اس میں بھی ہمیں شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ کچھ لوگ تو ایسی شاعری کرتے ہیں جنھیں بچے مزیدار اور چٹ پٹی نظموں کا نام دیتے ہیں اور انھیں خوب مزے لے کر پڑھتے ہیں۔ اور دوسری وہ نظمیں جو مزیدار کے ساتھ ساتھ نتیجہ خیز اور عبرت انگیز بھی ہوتی ہیں۔ آخر الذکر موضوع پر تو بہت ہی کم قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس نوع کی شاعری کے سلسلے میں جن اونچے درجے کے شاعروں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان میں حالی، اقبال، اسمٰعیل میرٹھی کے بعد جناب تلوک چند محروم کا اسم گرامی ہمارے سامنے آتا ہے اور اسی وجہ سے حضرت محروم دنیائے شعر و شاعری میں مشہور ہوئے۔ وہ اردو پڑھنے والوں میں بچوں سے لے کر بوڑھوں تک سبھی سے متعارف ہیں۔ ہم لوگوں نے انھیں بچپن سے لے کر پڑھنا شروع کیا تھا اور آج تک پڑھ رہے ہیں۔ اور زندگی کے دور میں انھیں اپنا ترجمان اور دل چسپی اور ذوقِ طبع کے مطابق پایا۔

گنج معانی، رباعیات محروم کے بعد ان کی نظموں کا مجموعہ 'کاروان وطن' پچھلے دنوں شائع ہو چکا ہے۔ اور اب حال میں بچوں کی نظموں کا مجموعہ 'بہار طفلی' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ بچوں کی مناسبت سے کتاب کو باتصویر چھاپا گیا ہے۔ کتابت، طباعت بہت عمدہ ہے۔ لیکن کاغذ رف استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ صاف ہے۔ کاغذ ان دنوں ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ بلیک مارکیٹ سے کاغذ لینا اور کتاب چھاپنا انھیں لوگوں کے بس کا کام ہے جو کتاب تجارت کی غرض سے چھاپتے اور پڑھنے والوں کی جیبیں کاٹتے ہیں۔ کتاب مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی ہے۔ دیباچہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی نے اور مقدمہ بچوں کے مشہور شاعر پروفیسر شفیع الدین نیر نے لکھا ہے۔ اس میں ۴۴ طبع زاد نظمیں، پانچ ترجمہ کی ہوئی نظمیں اور چھ قطعات ہیں۔ بچوں کی سہولت کے لیے آخر میں فرہنگ دے کر ضروری اور مشکل الفاظ کے معنی بھی شائع کر دئے ہیں۔ ان میں کئی نظمیں ایسی ہیں جنھیں بچے یقیناً حفظ یاد کرنا پسند کریں گے۔ اور اپنی محفلوں اور مجلسوں میں پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے اور مجلسوں کا لطف دوبالا کریں گے۔ ان نظموں کو پڑھنے کے بعد جو تاثر دل میں پیدا ہوتا ہے اسے ڈاکٹر زور نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> "اس چمنستانِ سخن کا ہر ورق ایک دبستان بنا ہوا ہے۔ ہر نظم ایک سدا بہار گلستاں کا منظر پیش کرتی ہے۔ شاعر ہر نظم کے موضوع کے ساتھ خود کو اس سلیقے سے وابستہ کرتا ہے کہ وہ بھی بچوں کی برادری کا ایک فرد معلوم ہوتا ہے۔"

تمام نظمیں نہایت آسان اور بچوں کی زبان میں ہیں۔ پورا ماحول بچوں کا پیدا ہو جاتا ہے۔ انھیں پڑھتے وقت اکثر چھوٹی بحریں ہیں ان پر الفاظ کی ترتیب و بندش ایسی کہ مصرعے خود بخود مترنم ریز ہوتے ہیں۔ پہلی نظم دعا ہے۔ بچے کے دل و دماغ پر خدا کی خدائی کا سکہ جمانے کے بعد اس کی زبان میں کہتے ہیں ؎

حاضر ہیں تیرے در پر پروردگار ہم بھی ۔۔۔ ہیں رحم اور کرم کے امیدوار ہم بھی
علم و عمل کا رستہ یارب ہمیں دکھا دے ۔۔۔ جس سے ملے سعادت اس راہ پر چلا دے

یہ نظم ایسی ہے کہ اسکول میں بچوں کو حفظ کرائی جائے اور وہ صبح اسکول شروع ہونے سے پہلے دعا کی مجلسوں اور پرارتھنا سبھاؤں میں پڑھیں۔

آسان الفاظ سادہ زبان اور آسان بحروں میں نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

نظم "بچوں کو نیا سال مبارک" میں ؎

مبارک ہو تم کو نیا سال بچو! ۔۔۔ نئے سال میں تم ہو خوشحال بچو!

نئے ولولے ہوں نیا شوق پیدا　　نیا دل میں ہو علم کا شوق پیدا
نئے سر سے میدانِ ہمت میں آؤ　　نئے قابلیت کے جوہر دکھاؤ
پڑھو اور محنت سے تم نام کرلو　　بڑھے جس سے عزت وہی کام کرلو

ہمارا دیس

سب سے اچھا دیس ہمارا　　دنیا بھر سے نیارا ہے
پیارا دیس ہمارا بھارت　　ہم کو دل سے پیارا ہے

اپنے دل کا سہارا ہے
بھارت دیس ہمارا ہے

جھوٹ بڑا پاپ ہے۔

جھوٹ نہ بولو کبھی!　　جب بھی کہو سچ کہو
سچ سے محبت کرو　　جھوٹ سے بچتے رہو

جھوٹ بڑا پاپ ہے

برسات

آئی ہیں گھر کر　　کالی گھٹائیں
چلتی ہیں کیا کیا　　ٹھنڈی ہوائیں

برسات آئی
برسات آئی

اب ہر طرف ہے　　پانی ہی پانی
رت آ گئی ہے　　کیسی سہانی

نیک بنو

چھوٹے بچو نیک بنو تم　　نیکی اچھی ہشیاری ہے
دل کے تمہارے رازِ پنہاں　　چہرے ایسی یوں آئینہ دکھلاتے

تمام ہی نظموں میں درس و ہدایت اور وعظ و نصیحت کے پہلو موجود ہیں۔ ان میں اچھے کام محنت، صفائی، دشمنی

ہم ہرگز جھوٹ نہ بولیں گے۔ جھوٹ بڑا پاپ ہے۔ بدزبانی سے پرہیز کرو۔ اچھا آدمی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی" ایک دلچسپ منظوم حکایت ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی نے بچوں کو ایک نعرہ دیا تھا "کئے جاؤ کوشش مرے دوستو" اور مرحوم صاحب نے نعرہ دیا ہے "محنت کرو۔" کہتے ہیں ؎

تم کو خیالِ محنت گر صبح و شام ہوگا	کہتے ہیں بخت جس کو آکر غلام ہوگا
جو دل کا مدعا ہے حاصل تمام ہوگا	محنت سے کام ہوگا محنت سے نام ہوگا

محنت کرو عزیزو! محنت سے نام ہوگا

جو لوگ سست ہوتے ہیں اور محنت نہیں کرتے ان کی حالت سے خبردار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

کاہل ہیں جو جہاں میں ان کا مآل دیکھو	افلاس اور مرض سے ہیں خستہ حال دیکھو
رہتے ہیں ہر گھڑی وہ غم سے نڈھال دیکھو	جو لوگ محنتی ہیں وہ ہیں نہال دیکھو

محنت کرو عزیزو! محنت سے کام ہوگا

تندرستی کی طرف بچوں کو بچپن ہی میں متوجہ کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنی صحت کی حفاظت کرسکیں۔ حضرت مرحوم بھی اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ "تندرستی ہزار نعمت ہے" کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

کوئی کہتا ہے کہ دنیا میں ہے دولت اچھی	ہے کسی شخص کی دانست میں حکمت اچھی
کوئی کہتا ہے کہ اچھی ہے طبیعت اچھی	کوئی کہتا ہے کہ اچھی ہے تو صورت اچھی

میں یہ کہتا ہوں کہ ہر شے سے صحت اچھی

اور صحت کے اچھے ہونے کا راز بھی مرحوم صاحب نے فرمایا ہے۔

علم حاصل نہ ہو جب تک نہ ہو صحت اچھی

پھر وہ علم کے خزانے کی نشاندہی اپنی نظم "کتاب" میں یوں کرتے ہیں ؎

کھولو اسے کہ اس میں خزانہ ہے علم کا	اٹھو پڑھو، پڑھو کہ زمانہ ہے علم کا

یہاں تائید کی ہے مولانا حالی کی کہ انھوں نے کہا تھا ؎

گیا دورِ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری	جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عملداری

اور یہ علم و عمل ہی کی عملداری ہے کہ آج انسان خلا میں پرواز کر رہا ہے۔ چاند میں پہنچنے کی کوششوں میں

مصروف ہے۔

بہر نوع محروم صاحب کی ان نظموں کی یک جا اشاعت قوم کے لیے ایک خوش بختی ہے۔ اور یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر اسکول اور لائبریری میں ہی نہیں ہر گھر میں ہونی چاہیے۔

ہر دکھ میں ہے نسخۂ شفا نام ترا
ہے طبعِ سخن ورانِ نامی عاجز
ہر چیز پہ اندوہِ فنا طاری ہے
سرمایۂ دولتِ بقا نام ترا

ہر صبح بلند جب علم کرتا ہے
سر تیرے حضور اٹھ کے خم کرتا ہے
لوحِ افلاک پر شعاعی خط میں
خورشید تری ثنا رقم کرتا ہے

جامی و نظامی و گرامی عاجز
میدان ثنائے قادرِ مطلق میں
عاجز ہے قادر الکلامی عاجز

قائل ہم بھی ہیں دوزخ و جنت کے
معنی کے ہیں معتقد، نہیں صورت کے
دوزخ؟ تاریکیاں تری دوری کی
جنت؟ انوار ہیں تری قربت کے

محروم

جوہر چنیوٹی

محروم کی شخصیت اور شاعری

محروم کے کلام کا جائزہ لینے سے بیشتر اس کے مزاج اور ذہن و شعور کا مطالعہ لازمی ہے. کیونکہ جب تک کسی فن کار، شاعر، ادیب یا مصور کے عناصر ترکیبی معلوم نہ ہوں. جن سے اس کا ذہن اور شعور تشکیل پذیر ہوا. اس کی شاعری اور ادبی تخلیقات کا صحیح ادراک مشکل جان پڑتا ہے. ایک شاعر کے لیے پہلی منزل، منزلِ احساس. دوسری منزل، منزلِ تاثیر اور تیسری منزل، منزلِ تفکر ہوتی ہے. ان منازل سے گزر جانے کے بعد وہ جو کچھ کہتا ہے اسے ہم آفاقی کہہ سکتے ہیں. اور اگر محروم کے متعلق یہ کہا جائے کہ اسے بیدائش ہی سے دولتِ احساس، تاثیر و تفکر میسر تھی تو درست ہوگا. یہ ہونہار شاعر سات برس کی عمر میں جب اسکول میں داخل ہوا تو اس کے ذہن نے شعر اُگلنے شروع کر دئے تھے. رفتہ رفتہ تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری میں بھی نمایاں ترقی ہوئی. مگر اس کے وطن کی سنگلاخ زمین پر اس کا کوئی قدردان نہ تھا. کیونکہ محروم کا ضلع میانوالی ایک دور افتادہ ضلع تھا. جہاں شعر و سخن تو درکنار تعلیم بھی عام نہ تھی. جہاں اردو کا چرچا بہت کم تھا. محروم کو کلام کی تصحیح و مشورہ کے لیے کوئی استاد نہ ملا. ہم عمر یا ہم جماعت طلبا کو وہ اپنا کلام سنا کر داد یاب نہ ہو پاتا. پھر بھی اس کی طبع لطیف نے سخن سنجی کی ہمت افزائی کی. محروم کی دنیا کسانوں کی دنیا تھی. کسانوں کی دنیا اور کسانوں کے گانے اس کے ذوقِ سخن کی آرائش کا موجب بنے. حالی کی طرح اس کے مدرسۂ فکر میں کتنے موضوع تمثیلاً آسمان. سورج، ستارے، مناظرِ قدرت، مذہبیات. مراثی جنم لینے لگے. محروم کے گرد و نواح کے ماحول نے کاکلِ سخن کو سنوارا. اس کے قلب و نظر کو جلا بخشی. طالب علمی کے زمانے سے محروم کا کلام مخزن لاہور اور زمانہ کانپور میں شائع ہونے لگا. اردو کے ادبی افق پر اس وقت کئی ستارے حالی، اقبال، مولانا گرامی، طالب بنارسی، سرور جہاں آبادی نادر کاکوروی، چکبست، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی اور سورج نارائن مہر روشن تھے. لیکن محروم کا نظریاتی پہلو ان سب سے جداگانہ تھا. محروم کی زیادہ تر توجہ اس کے گرد جمی رہی. کیوں کہ اس کا ذاتی نظریہ ہمیشہ یہی رہا کہ شاعر سماج کا ایک رکن ہے. ایک حقیقی ترجمان ہے، اور اس لحاظ سے بے نیاز رہنا سماج کو علمی اور ادبی قوتوں سے محروم کرنا ہے. اور شاید یہی سبب ہے کہ اس کے

کلام پر مشرقیت کی گہری چھاپ ہے۔ بجا ہے کہ محروم کے کلام میں ایک آدھ جگہ شیکسپیر اور بائرن کے رجحان واضح طور پر لہراتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں لیکن میں انھیں محض اتفاق ہی کہوں گا، ورنہ اس کے اتنے ضخیم کلام میں اس ضمن میں کوئی مثال ضرور ملتی۔ البتہ محروم کے کلام میں کلامِ سعدی کے تراجم ضرور ملتے ہیں۔ سعدی کی طرح اس فنکار نے بھی اپنے عہد کے تہذیبی معاشرتی اور سیاسی بحران کے خلاف آوازیں بلند کیں۔ اس کے کلام کی مختصر خصوصیات یہ ہیں کہ مسائلِ حکمت فلسفہ، رموزِ تصوف اور المیہ نگاری پڑھ کر انسان دل بدست ہو جاتا ہے۔ جب ہم محروم کی شاعری کا بنظرِ غور مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام نہ صرف باطنی زمان ومکان اور خیالات واحساسات کی توضیح وتفسیر ہے بلکہ اس کی المقامی کشش بھی پر لطف ہے۔

یوں تو محروم نے شاعری کی تمام تر اصناف قطعہ، غزل، رباعی اور نظم کو نوازا ہے۔ محروم کے تین ضخیم مجموعے کلامِ محروم ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک چھپ کر عوام کے سامنے آئے۔ اور ان کی مقبولیت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ اس دور کا آج کل کوئی نسخہ دستیاب نہیں۔ ان حصص کے علاوہ مجھے گنجِ معانی، نیرنگِ معانی، رباعیاتِ محروم، شعلۂ نوا، کاروانِ وطن، بہارِ طفلی کو پڑھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ ان تمام مجموعوں میں فلسفہ، مذہب، روحانیت، توحید، مساوات، اخوت، انسانیت، رواداری، قومیت، غرضیکہ غم اور خلوص کی درد نگاری بھی پیش پیش ہے۔ اخلاق اور حکمتِ عملی کی صداقتیں جس قدر رباعیات میں عیاں ہیں شاید ہی آج تک ہندوستان کا کوئی رباعی گو شاعر پیش کر چکا ہو۔ رباعیات میں یوں تو انیس، حالی اور اکبر کے نام بھی پیش پیش ہیں لیکن محروم کا طرزِ بیان ان سب شعراء سے اچھوتا ہے۔ البتہ ہم ان رباعیات کو شیخ ابو سعید، افضل کاشانی، سحابی اور سرمد کی صدائے بازگشت کہہ سکتے ہیں۔

محروم نے آج تک اندازاً ۸۰ ہزار شعر لکھے۔ لیکن تعجب ہے کہ اس کے کسی شعر میں بھی عشقیہ یا ظریفانہ عنصر نہیں بلکہ ایک المیہ کرب، بے قراری، تذبذب دبیر اور انیس کے نوحوں کی طرح کروٹ کروٹ جلوہ گر ہے۔ اس کی بیشتر وجہ محروم کی ازدواجی اور خانگی حالات کے جانکاہ حادثے تھے۔ جس کی بنا پر اسے سکون اور سچی راحت میسر نہ آ سکی۔ انہی حادثات اور حالات نے اس کی شخصیت اور رنگِ سخن پر گہرے نقوش ثبت کر دئے۔ اگر زمانہ محروم کے دورِ مسرت کو محدود نہ کرتا تو اس کی زندہ دلی اور شگفتگی برقرار رہتی اور اس کے کلام میں غنائیہ پہلو بھی اجاگر ہوتے۔ دنیا نے زمانے بھر کی محرومیاں محروم کی جھولی میں ڈال دیں جس سے یاس وناامیدی کے احساس بڑھتے گئے۔ اور محروم میں ایک طرح کی مرعوبیت پیدا ہو گئی، جس نے اسے ایک انفرادی مقام بخشا۔ محروم کے کسی اور گوشۂ سخن کی طرف توجہ دلانے کے بجائے میں اس کی درد نگاری کی طرف راغب کروں گا جس میں ایک انتہائی بے چارگی، بے طاقتی اور بے بسی ہے

محروم اپنے صبر و سکون کو اجڑتے دیکھ کر آہیں بھرتا ہے۔ روتا ہے اور اوروں کو رلاتا ہے۔ اس کی المیہ نگاری کیفیات اور تاثرات غم سے معمور۔ محروم کی جواں سال بیوی اپنی ننھی سی بچّی کو چھوڑ کر اس دنیا کو خیر باد کہہ گئی۔ بچی کی بے بسی، خانہ ویرانی اور اسی طرح کے صدماتِ پیہم نے محروم کو درد کا پیکر بنادیا۔ آخر کار وہ بچی بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ محروم کا رہا سہا چین بھی چھن گیا۔ محروم چیخا، چلایا، رویا۔ لیکن اس کی آہ و زاری بے سود۔

بیوی کی موت پر محروم کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

لو اٹھ کے بیٹھو کہ وِدّیا سرہانے آئی ہے — تمہارے منہ سے وہ دامن اُٹھانے آئی ہے
وہ چل کے آئی ہے گھٹنوں پہ تھک گئی ہوگی — تمہارے پیار سے پھر اس کو تازگی ہوگی
اٹھا بھی لو کہ بہت بے قرار ہے وِدّیا — نہ چھوڑ جاؤ اسے شیر خوار ہے وِدّیا
پکارتی ہے تمھیں آج کس قرینے سے — اُبل کے شیر ٹپکتا نہیں ہے سینے سے

گھٹنوں پہ چل کے نکلی، بستر کے پاس پہنچی — ننھے سے دل میں اپنے کچھ لے کے آس پہنچی
کس کو پکارتی ہے منہ سے کفن اٹھا کر — منزل پہ ٹھنڈے ٹھنڈے پہنچے وہ لدلدا کر
ان سرد چھاتیوں میں کیا شیر ڈھونڈتی ہے — پتھر میں موم کی تو تاثیر ڈھونڈتی ہے؟
مُردے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہے — مجھ سخت جاں پہ یارب یہ کیا گزر رہی ہے

گزرنے پائے ہیں مشکل سے پانچ سال ابھی — شباب پر ہے تمہارا تو بال بال ابھی
نظر اٹھاؤ ذرا میری چشم نم کی طرف — بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جاں مرے قدم کی طرف
یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی — پھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی

شکنتلا محروم کی بچی تھی جسے اس کی نظروں کے سامنے دفنایا گیا وہ مسلسل تین روز تک اس کی قبر پر جاتا رہا تا کہ اس کی پیار بھری آواز سن سکے۔

پہلی صبح

کیوں ہم سے روٹھ کر نکل آئی ہے تو یہاں — اٹھ میرے ساتھ چل مری پیاری شکنتلا!
وحشت فزا مقام ہے جنگل ہے ہولناک — یاں رات تو نے کیسے گزاری شکنتلا

آنکھوں میں آگیا دل صد چاک کا لہو — پتھر پہ تجھ پہ دیکھ کے ہماری شکنتلا
ویرانہ ہو گیا ہے ہمارا گھر ترے بغیر — کہتے ہیں سب کہاں ہے ہماری شکنتلا

دوسری صبح

مایوس ہو کے کل گئے پھر آج آ گئے — اے کاش زیر خاک سے ہو آشکار تو
ہم دودھ لے کے آئے تھے گھر سے ترے لیے — دو دن کی بھوکی پیاسی ہے اے شیر خوار تو
گھر میں تو رات کاٹتی تھی تو نے تڑپ تڑپ — آسودہ ہو گئی یہ خاکِ مزار تو
افسوس عمر بھر ہمیں تڑپائے گی وہ رات — جب ہو رہی تھی بہر سفر بے قرار تو
جتنی مسرتیں ترے دم سے ہوئیں نصیب — اتنا ہی کر گئی ہے ہمیں دل فگار تو

ودّیا محروم کی دوسری لڑکی جو ۲۲ سال کی عمر میں کپڑوں پر تیل چھڑک کر جل گئی، محروم کے لیے یہ جہاں اندھیر کر گئی۔

شمشان کا نظارا دکھاتی ہے یہ دنیا — افسوس اسی شمشان میں کھائیں گے پئیں گے
تو مرنے پہ مجبور ہوئی مر گئی جل کر — ہم جینے پہ مجبور ہیں جل جل کے جئیں گے

دلِ بیتاب جلتا ہے اس کی حدت سے — زوالِ عمر میں جو داغ پنہاں دے گئی ودیا
جگر پھنتا ہے میرا آگ لگتی ہے کلیجے میں — تصور میں نظر آتی ہے جب جلتی ہوئی ودیا

المیہ نگاری میں مقبرۂ نورجہاں، پرانا کرتہ، نوحۂ اقبال وغیرہ محروم کی درد بیانی کی لافانی یادیں ہیں۔

گرنچن چندن

تلوک چند محروم

"گنجِ معانی" کا نیا ایڈیشن دیکھا۔ جہانِ سخن کا ہر گوشہ پروفیسر تلوک چند محروم کی مملکتِ تخیل کا قدرتی اور طبعی حصہ نظر آرہا ہے۔ ان کے کلام میں زور ہے، سادگی ہے۔ حسنِ بیان، ندرتِ خیال اور مضمون آفرینی ہے۔ پاکیزگی اور لطافت ہے الفاظ کی شوکت اور تراکیب کی چستی ہے۔ انھوں نے شاعری کی پرانی قدروں کو حیاتِ نو عطا کی ہے۔ اور ہر زمین کو ہم سر بنا دیا ہے۔ وہ تمام انواعِ سخن پر قادر ہیں۔ "موت"۔ رازِ ہستی، سرورِ جہاں آبادی، اور مناظرِ قدرت کے باب میں کئی نظمیں کافی طویل ہیں۔ لیکن کیا مجال جو زورِ طبع، سلاست اور روانی میں کہیں فرق آیا ہو۔ وہ زندگی کے سطحی عناصر تک کو انسانیت کے حقیقی پس منظر سے جدا نہیں ہونے دیتے اور ہلکے پھلکے موضوعات کے ساتھ حکیمانہ اور علمی مسائل بھی اتنی سادگی کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں کہ باید و شاید۔

محروم صاحب الحاد کے مبلغ نہیں۔ ایک ایسے دور میں جب شاعری کے قدیم اور جدید موضوعات کو بے تحاشا تخریب، خلفشار، اخلاق مطلق العنانی اور ذہنی بوکھلاہٹ کے گھناؤنے سانچوں میں ڈھالا جا رہا ہے۔ محروم نے گرد و پیش کے شب رنگ ماحول سے متاثر ہوئے بغیر اپنی ذہنی اور ادبی کاوشوں کو انوارِ قدیم کی غمازی کے لیے وقف رکھا اور وقت کے تاریک دھارے میں بہنے سے انکار کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ "گنجِ معانی" کا آغاز حمد و معرفت سے ہوا۔ حقیقی معرفت کے عالم میں دشمنی اور نزاع کی گنجائش کہاں، اس دنیا میں نفرت اور کینہ کی دیواریں تو خود بخود زمیں بوس ہو جاتی ہیں۔ "زمزمۂ توحید" میں آپ لکھتے ہیں۔

ناقوس میں تو اذاں میں تو ہے — ہر شور میں ہر فغاں میں تو ہے
ہے دیر و حرم میں تیرا جلوہ — القصہ مکاں مکاں میں تو ہے

صوفیائے کرام بھی اسی فکر و عمل کے علمبردار رہے۔ محروم صاحب نے صلح و محبت اور وحدت کی جو تلقین کی ہے وہ درحقیقت ہندوستان کی حقیقی آواز ہے۔ شویت کیتو اور مہاتما بدھ کی آواز ہے جو عصرِ حاضر میں گاندھی جی کی تعلیمات کا طرۂ امتیاز رہی۔ محروم صاحب نے دیش کے ازلی نغموں کو جامۂ اردو میں پیش کیا ہے۔

باب معرفت میں بھی مخدوم صاحب نے قدیم فلسفہ کی ترجمانی کی ہے۔ "رازِ ہستی" کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

تو ہے مہر مگر ہوا تجھ کو یہ کیا ؛   کہ بصورتِ ذرہ ہے جلوہ نما
ترا آئینہ زنگ میں چھپنے لگا   اِسے دے کے جِلا وہی روپ دکھا

دنیا کے تمام روشن ضمیر انسان بالعموم ایک ہی خود آگہی کی رو (STREE OF CONOCIOUSNESS) کے شناور ہوا کرتے ہیں۔ ملٹن نے بھی چشم ظاہر بیں سے محروم ہونے کے باوجود ذرے میں مہر حق کی جلوہ نمائیوں کا مشاہدہ کیا۔ اپنے پاکیزہ مشاہدہ کا اظہار اس نے یوں کیا ہے IN THEIR LOOKS DIVINE THE IMAGE OF THEIR MAKER STONS

جب اثر لکھنوی نے ع

ذرہ خورشید ہے ہمت ہے اگر

کہا تو ان کے سامنے بھی کم و بیش ویسا ہی نظریۂ حیات تھا جسے مخدوم حرزِ جاں تصور کرتے ہیں۔ لیکن اس باب میں ان کا اظہارِ غم تا حد وافر ہے جس سے دو جو ہر سامنے آجاتے ہیں۔ ان کی نظم "یہ کس کے جلوے ہیں سارے" خالص (MONISM) (وحدتِ وجود) ہے لیکن جب غم و اندوہ کا سیلاب امڈتا ہے تو وہ مخدوم کو بے اختیار (DUALISM) (ثنویت) کی طرف بہائے جاتا ہے۔ چنانچہ ہر چیز میں خدا ہی کا ظہور نظر آنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو اس سے مختلف خیال کرتے ہیں۔ ایک نظم کا بند ملاحظہ ہو ؎

غنچہ و گل میں ذرا دیکھ ادا کس کی ہے؛   سبزۂ تر میں مہک کس کی فضا کس کی ہے؛
سرو ریحاں میں بھلا نشوونما کس کی ہے؛   گہری سبزی جو ہے پتوں میں بتا کس کی ہے
جلوہ فرمائی یہ سب اس کے سوا کس کی ہے
اب بھی شاداں نہ ہوا ے دل تو خطا کس کی ہے

وحدتِ وجود کی صورت میں تو غم و اندوہ یا دل کے شاد و ناشاد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں تو زندگی کی حقیقت سکڑ سمٹ کر ایک باریک نقطہ پر پہنچ جاتی ہے جسے صوفیائے کرام نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

از موت و حیات چند پُرسی از من   خورشید بہ روزنے افتاد و برفت

مخدوم کی شاعری پر ان کی "روحِ مضطر" اور "دلِ حرماں نصیب" کی گہری چھاپ ہے۔ لیکن ان کے اظہارِ غم میں متانت ہے۔ توازن ہے اور نفاست ہے۔ یہ کوئی ماتم یا آہ و بکا کی سبیل نہیں۔ زندگی کے دکھ درد نے انھیں بہت

متاثر کیا ہے. لیکن وہ زندگی سے بیزار نہیں ؎

چند روزہ ہے اور فانی ہے　　　پھر بھی کیا لاجواب ہے دنیا

سر عبدالقادر مرحوم نے دیباچہ میں کہا ہے کہ" منشی تلوک چند محروم پر چند ذاتی صدمات ایسے پیش آئے کہ شاعر سراپا درد ہو گیا. ان صدموں میں سب سے زیادہ اثر اس جانکاہ زمانہ کا ہے جب محروم کی جوان بیوی شادی کے چند سال بعد ایک ننھی سی لڑکی چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسی." اس کے بعد ان کی شادی شدہ لڑکی کی خودکشی کی واردات ہوئی. جس کے بارے میں ان کے فرزند جناب جگن ناتھ آزاد نے ایک مضمون میں کہا ہے کہ" ودیا کی خودکشی نے ان کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے مسرت چھین لی." اس حادثہ پر انھوں نے جو نظم لکھی اس میں یہ اعتراف کیا ہے ؎

پہلے ہی غم افسانہ تھی وہ میری نظر میں　　　افسوس کہ اب اور بھی برہم ہوئی دنیا

اے لختِ جگر! آہ کہ بےحل مرنے سے تیرے　　　میرے لیے آتش کدۂ غم ہوئی دنیا

ودیا کے بعد ان کی ایک اور لڑکی شکنتلا دو برس کی عمر میں چند دن بیمار رہ کر مر گئی. اور پھر محروم کو اپنے ہم عصروں کی موت پر بھی آنسو بہانا پڑے. مولانا گرامی، طالب بنارسی، سرور جہاں آبادی، نادر کاکوروی، چکبست لکھنوی وہ حضرات تھے. جن کے ساتھ محروم کو غائبانہ انس تھا. مگر وائے محرومی کہ وہ یکے بعد دیگرے چل بسے."

یہ تمام صدمے برسوں محروم کے لیے شب بیداری کا سبب بنے رہے ہوں گے. اور ان طویل جانکاہ برسوں کی جگر گداز راتوں کی ہولناکی کا تصور کچھ ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے.

وہی غم کدہ ہے میرا وہی شام غم فزا ہے　　　وہی تو ہے اور تیری وہی غم بھری صدا ہے

شبِ غم بری بلا ہے، شبِ غم بری بلا ہے

محروم کو قدرت سے غم کی عکاسی کا جوہر معمولی سے کچھ زیادہ ودیعت ہوا ہے. سر عبدالقادر کی نگاہوں میں تو وہ "سراپا درد" ہیں. اظہارِ غم میں ان کے اثر و جوش کا وہ عالم ہے کہ پڑھنے والوں کو محروم کے غم پر اپنے غم کا گمان ہونے لگتا ہے. کیا مجال جو کہیں آورد اور تصنع کی جھلک دکھائی دے. تصویرِ غم تو اور بھی کتنے ہی مصوروں نے کھینچی ہے لیکن محروم کا سا سوز اور وفورِ درد کہاں؛ محروم بحرِ غم کا شناور ہے. اس کی کشتیٔ حیات مدتوں اسی سمندر کی متلاطم سطح پر اچھلتی رہی. سفینے ڈوبتے رہے اور وہ دیکھتا رہا. شاید اسی لیے وہ کسی وارداتِ دل کی جزئیات تک کی عکاسی میں ابتذال کا شائبہ پیدا نہیں ہونے دیتا. اس کے کلام میں تصورِ محض کی کارفرمائی نہیں. واردانی صداقت ہے.

اس کے سامنے بیوی کی لاش پڑی ہے۔ ننھی بیٹی سوکر اٹھی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ موت کیا ہوتی ہے، گھٹنوں کے بل لاش تک پہنچی۔ دودھ کی تلاش میں ماں کا سینہ ٹٹولا، محروم کے دل پر بجلی سی گری۔ بیٹی سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں ؎

ان سرد چھاتیوں میں کیا شیر ڈھونڈتی ہے ۔۔۔ پتھر میں موم کی تو تا نیر ڈھونڈتی ہے
مُردے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہے ۔۔۔ مجھ سخت جاں پہ یارب یہ کیا گزر رہی ہے

اس ننھی سی جان کی پریشانیوں کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

نظروں سے آہ کیا کیا حسرت ٹپک رہی ہے ۔۔۔ رہ رہ کے منہ ہمارا حیرت سے دیکھتی ہے
چہرے سے ہے نمایاں دل کی جو بے کلی ہے ۔۔۔ تیری تلاش اس کو اے مہرِ مادری ہے

وہ گود سے ہماری آخر مچل کے نکلی
جاتی ہے کس طرف کو گھٹنوں پہ چل کے نکلی

"اشکِ حسرت" میں رفیقۂ حیات کی جدائی کا منظر بھی بڑا پُر اثر ہے۔

ذرا تو دھیان کرو میرے سوزِ غم کی طرف ۔۔۔ چلے ہو چھاؤں میں تاروں کی کیوں عدم کی طرف
نظر اٹھاؤ ذرا میری چشمِ نم کی طرف ۔۔۔ بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جاں میرے قدم کی طرف

مجھے تو روکتے ہو بار بار رونے سے
رکو گے کیا نہ مرے زار زار رونے سے

محروم نے کتنے ہی لوگوں کی موت اور مصیبت پر آنسو بہائے ہیں۔ ان کے کلام سے ان پر کئی بار ایک چلتے پھرتے اور بولتے آنسو کا گمان ہونے لگتا ہے۔ نہ معلوم دستِ قدرت، نے ان کے سینہ کی تزئین کے لیے اتنا حساس اور نازک دل کہاں سے ڈھونڈھ نکالا تھا۔

"نور جہاں کا مزار" جو انھوں نے صرف ۲۴ سال کی عمر میں لکھی، ان کے جینیس کی عمدہ مثال ہے۔ اس روضہ کو دیکھ کر نور جہاں کی بے چارگی پر ان کا دل پگھل اٹھتا ہے۔

تجھ سی ملکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے ۔۔۔ غالیچہ سر فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بے چارگی اے تاجوری ہے ۔۔۔ دن کو یہیں بسرام، یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہے مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

محروم کی شاعری کا بیشتر حصہ آنسوؤں میں نہا کر نکھرا ہوا ہے ان کا شاید ہی کوئی ایسا شاہکار ہوگا جہاں الفاظ کی خوش سلیقگی میں جگر کے داغ نہ چمک رہے ہوں ؎

مے کدوں میں چراغ روشن ہیں　　نورِ مے سے ایاغ روشن ہیں
کرمکِ شب چراغ روشن ہیں　　یا مرے دل کے داغ روشن ہیں

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

سر عبدالقادر کے یہ الفاظ کیا خوب ہیں کہ بہار ہو یا خزاں قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر محروم کے دل کا کوئی نہ کوئی داغ تازہ ہوجاتا ہے۔

محروم صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ غم واندوہ کی مصوری کریں یا پند وموعظت کا رخ۔ بچوں کو "چڑیا کی زاری" یا "کولھو کا بیل" پیش کریں یا مناظرِ قدرت کی عکاسی، ان میں الفاظ کی ہیئت وساخت کی خوبی۔ بندش کی صفائی، نشست کا جمال اور تراکیب کی دلآویزی، اور برجستگی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ہر موضوع کے مطابق موزوں الفاظ کی قطاریں ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہیں اور ایک کے بعد دوسرا مصرعہ موزوں ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہومر کا خیال ہے کہ غم کی عکاسی ہی حقیقی شاعری ہے۔ شاعر قہقہے نہیں لگاتا۔ اس کی فطرت میں سنجیدگی اور متانت ہے۔ وہ ایک ایسا فرشتہ ہے جس کی تخلیق فطرت کی ناانصافیوں کی نوحہ خوانی کے لیے ہوئی ہو۔ اس اعتبار سے محروم ایک مکمل شاعر ہیں۔

شاعری میں جو چیز فرسودگی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے وہ تنگ دلی اور کوتاہ اندیشی ہے۔ محروم کی شاعری ان خامیوں سے پاک ہے۔ ان کے کلام کا طرۂ امتیاز خیال کی گہرائی اور فلسفیانہ اندازِ بیان ہے جس نے انھیں کلاسیکل شاعروں کی صف میں کھڑا کردیا ہے۔

مولانا عبدالحق نے بجا طور پر "گنجِ معانی" کو رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ قرار دیا ہے۔ اس گلدستے میں سوسن کے وہ نیلے خودرو پھول قدرے زیادہ دکھائی دیتے ہیں جن کی لطیف چھاؤں ہی اکثر شہر خموشاں کے کئی غریب اور بے کس مکینوں کے سکوں کدوں پر لوح کا کام دیا کرتی ہے۔

کلام کے چودہ ابواب میں ایک باب "جذباتِ فطرت" ہے۔ جو دیوان در دیوان ہے۔ شاید ہی کوئی دل پذیر موضوع ہوگا جس پر اس میں محروم صاحب نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ دنیا۔ بوئے گل، سبزۂ نو، انجامِ گل، یادِ ایام،

سرورِ قناعت، مہاتما بدھ، سپاہی کا خواب، انقلاب، بچے کی مسکراہٹ، دل سے دو دو باتیں، شاعر اور شاعری، اور ہر نظم دل میں اترنے والی ہے۔ "بلبل کی فریاد" کے یہ آخری الفاظ تحریکِ آزادی کے زمانہ میں شمالی ہندوستان کے اکثر باشندوں کی زبان پر تھے۔

کب ہو مجھے رہائی کب آشیاں میں پہنچوں　　　اپنے وطن کو جاؤں اپنے مکاں میں پہنچوں

پند و نصائح کے باب میں پندرہ شاہکار ہیں۔ جن میں محروم صاحب نے نوجوانانِ وطن کے حق میں ایک مشفق روحانی باپ اور اچھے استاد کا کام کیا ہے جو بلا شبہ لائقِ تحسین ہے۔ محروم صاحب قریب چالیس برس اسکولوں اور کالجوں کے معلم رہے ہیں لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اخلاقیات کے عام اصولوں کے تعلق میں وہ صرف درسگاہوں کے ہیڈ ماسٹر یا پروفیسر ہی نہیں بلکہ بقول مولانا عبدالمجید سالک ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک پوری نسل کے معلمِ اخلاق رہے ہیں۔

کتاب میں ایک باب "نکاتِ شیکسپیئر" کے لیے وقف ہے، جو شاعر کے مطالعہ کی وسعت کا آئینہ دار ہے ترجمے میں وہ پاکیزگی کی شوکت ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جب کہ اندازِ محبت میں زوال آتا ہے　　　طورِ اخلاص تکلف میں بدل جاتا ہے

زمین و آسماں میں ہیں ابھی تک بے شمار اشیا　　　تمہارے فلسفے نے خواب بھی جن کا نہیں دیکھا

جو بزدل ہیں وہ پہلے موت سے سو بار مرتے ہیں　　　دلاور ایک بار اس دہرِ فانی سے گذرتے ہیں

محروم غزل بھی خوب کہتے ہیں۔ گنجِ معانی میں قریب اسّی غزلیں ہیں جو زبان کے لوچ اور لطافت کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان کی رباعیات بھی قادر الکلامی اور کمالِ سخن کی آئینہ دار ہیں۔

پھر ساتھ عجب دھوم کے آیا ساون　　　آئی ہے گھٹا جھوم کے آیا ساون
اشکوں کی گھٹا نہ برس مہینے برسی　　　کب گھر میں نہ محروم کے آیا ساون

محروم کا لطفِ سخن اور موزونیٔ طبع خداداد ہیں۔ ان کی ہمہ گیر تخلیقی قوت نے رنگ رنگ کے پھولوں سے چمنِ سخن کی آرائش کی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک لاہوتی انداز کی تاثیر ہے۔ ملاحظہ ہو۔

محروم ہم کو عشق نے شاعر بنا دیا　　　بے ساختہ زباں سے نکلتی ہے دل کی بات
کرتے رہیں گے مولوی صاحب تمام عمر　　　مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلات

محروم صاحب کی شاعری میں دل سے نکلنے والی بات کی بے ساختگی اور اثر ہے۔ اپنا لہجہ ہے جو جذبات کی شدت اور اصلیت پر دلالت کرتا ہے۔ ان کے ہاں جذبات کا جوش، جذبات کی افراط یا نمائش کی صورت اختیار نہیں کرتا، بلکہ آشنائے راز کی غیر جانب داری کا روپ بھرتا ہے۔ وہ آسمان کے جگمگاتے ستاروں پر کمندیں نہیں ڈالتے۔ تصور ہی تصور میں مریخ اور ثریا کو نوچ لانے کے لیے سینۂ گردوں کی جانب انگلیاں نہیں بڑھاتے۔ وہ متقدمین کی مانند رگِ گل سے بلبل کے پَر باندھنے کے بھی عادی نہیں دکھائی دیتے۔ وہ صداقت کے پرستار ہیں۔ ان کی شاعری میں واقعیت اور اصلیت غالب ہے۔ یہ زندگی کا وہ پہلو ہے جو اکثر و بیشتر چشمِ بینا کے مشاہدے میں آتا ہے۔ اس لیے ان کا مقام ان شاعروں میں ہے جن کی تخلیق انسانی زندگی کی حقیقی عکاسی کے لئے ہوتی ہے۔

غزل

نہ وہ دل ہے نہ دل کے ولولوں میں جان باقی ہے
بہ حیرت ہوں کہ پھر بھی زیست کا امکان باقی ہے

ہماری زندگی کا کچھ نہ کچھ امکان باقی ہے
مذاقِ دردِ دل یعنی یہ ہر عنوان باقی ہے

رہے گا یہ ہمارا دور بھی ننگِ وطن جب تک
وطن کی سرزمین پر ایک بھی انسان باقی ہے

ہزاروں مشکلیں آساں ہوئیں لیکن مرے دل میں
جو مشکل ہو نہیں سکتی کبھی آسان، باقی ہے

خدا جانے ہماری زندگی احسان ہے کس کا
کہ جب تک زندگی موجود ہے احسان باقی ہے

بھلا ہے صاحبِ زر اور بُرا ہے مفلسِ بے زر
بھلے کی اور بُرے کی اب یہی پہچان باقی ہے

محروم

نازانصاری

جنگ آزادی میں اردو کا حصّہ

اردو پر ایک الزام مخالفین اردو کی جانب سے عام طور سے یہ لگایا جاتا ہے کہ اردو میں وطنیت نہیں ملتی خصوصاً اردو شاعری میں وہ اس بیسویں صدی میں بھی زلف، وکاکل اور کنگھی چوٹی کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے ـــــ اور یہ بات اردو شاعری اور اردو ادب سے ناواقفیت کا ایک کھلا ہوا اعتراف ہے یا پھر دیدہ ودانستہ اردو کو بدنام کرنے کی ایک ناپاک کوشش۔

اردو ادب یا اردو شاعری کا یہاں تفصیل کے ساتھ جائزہ لینے کا موقع نہیں ہے۔ یہ تو ایسا موضوع ہے کہ اس پر کئی ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ یہاں ہمیں اردو کے صرف ایک ہی شاعر کی زبان سے اس کا جواب دینا ہے ـــــ اور وہ ہیں پروفیسر تلوک چند محروم۔

اردو حلقوں میں یہ بات موجب دلچسپی ہوگی کہ محروم صاحب کی قومی نظموں کا مجموعہ کاروانِ وطن کے نام سے حال ہی میں شائع ہوگیا ہے۔ یہ محروم صاحب کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت نے اردو ادب کا سر قومی اور وطنی حلقوں میں فخر سے بلند کردیا ہے۔ مجموعے کی ضخامت بڑے سائز کے ۱۴۴ صفحات ہے۔ قیمت ساڑھے سات روپے ہے کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ 'فریادِ جرس' ہے۔ اس میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کی نظمیں شامل ہیں۔ دوسرے حصّہ کا نام "منزل" رکھا گیا ہے۔ اس میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک کی نظمیں ہیں۔ کتاب امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے نام منسوب کی گئی ہے۔ کتاب کا تعارف محروم صاحب کے لائق ونامور فرزند جناب جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے اور دیباچہ حضرت نیاز فتحپوری کا ہے۔

محروم صاحب کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے اور قارئین پیامِ مشرق تو ان کے کلام بلاغت نظام سے اکثر محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ خود اس مجموعے کی اشاعت سے قبل ازراہ عنایت کی بدولت کہ انھوں نے مجموعے کی اشاعت سے قبل ازراہ عنایت وادب نوازی ہمیں عطا فرمائیں۔ ہم نے نذر قارئین کیں۔ محروم صاحب ۱۹۰۶ء سے اردو شعر و ادب کے میدان میں موجود ہیں۔ اور اس طرح ان کی ادبی خدمات کی اب "ڈائمنڈ جوبلی" منائی جانی چاہیے۔ محروم صاحب کی

شاعری کے بارے میں حضرت نیاز فتحپوری نے لکھا ہے کہ "حالی کا سب سے زیادہ اثر محروم ہی نے قبول کیا۔ وہی سادگی بیان، وہی پرخلوص لہجہ، وہی صداقت جذبات اور وہی سب کچھ جو ایک مخلص دوست کہہ سکتا ہے۔ ان کے یہاں نہ مجاہدانہ جوش و خروش ہے نہ سرفروشانہ تبلیغ۔ لیکن صداقت اتنی زبردست پائی جاتی ہے کہ اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں ہے" ——— اور یہ ایک امر واقعہ اور حقیقت بیانی ہے۔ چند ہی الفاظ میں حضرت نیاز نے وہ بات کہہ دی ہے جسے ہزاروں صفحات میں پھیلا کر بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔

حضرت محروم صاحب طرز شاعر ہیں اور یہ طرز ایسا ہے کہ جسے اختیار کرنا نہ آسان ہے نہ یہ ہر شخص کے بس کی بات ہے سہل زبان، روزمرہ، اور انداز بیان میں سادگی، یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ جب ہم ان کو لے کر آج کی اردو شاعری اور شاعروں پر نظر ڈالتے ہیں تو محروم صاحب کی ذات واحد و یکتا منفرد و بے بدل نظر آتی ہے اور اس دور میں جب کہ اردو پر ہر طرف سے یورشیں ہو رہی ہیں اور اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار کا الزام دیا جاتا ہے۔ محروم صاحب کی شاعری الزام لگانے والوں کے منہ پر بھرپور چپت ہے۔

پہلے حصہ میں ۱۳۴ نظمیں ہیں اور دوسرے میں ۵۴ کل ۱۸۸ نظمیں ہیں۔ طباعت و کتابت بہت عمدہ ہے۔ لیکن کاغذ غالباً گرانی اور نایابی کے باعث اس سے بہتر استعمال نہ ہو سکا۔ اس صورت میں کتاب کی قیمت کم سے کم بارہ روپے ہو جاتی جو اردو کے قارئین کے لیے بار ہوتی۔ اکثر نظموں میں سنہ کا اندراج ہے۔ لیکن سب نظموں میں نہ ہونے کے باعث ایک ایسے طالب علم کو جو محروم صاحب کے شاعرانہ رجحانات اور جذبات واحساسات کا تاریخی مطالعہ کرنا چاہے بڑی مدد ملتی، اور اس کا کام آسان ہو جاتا، وہ ان کے ہم عصروں کے ساتھ اس کے دور کے مطابق بآسانی مطالعہ کر سکتا۔

آیئے اب محروم صاحب کے کلام کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ انھوں نے اپنے قلم سے جنگ آزادی میں کیا پارٹ ادا کیا ہے، اور اس نے اردو زبان وادب کو کس طرح سربلند کیا ہے۔

محروم صاحب نے کسی نیک ساعت میں بارگاہِ خداوندی میں دعا کی تھی۔

اے خداوندِ مہ و مہر دعا ہے تجھ سے   اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کر دے

آخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ان کی دعا قبول ہوئی۔ اور آج ہندوستان فی الواقع ہم اوجِ ثریا ہے۔ ہندوستان نے اندرون ملک جو ترقی کی ہے اور بین اقوامی دنیا میں جو عزت حاصل کی ہے اس نے اسے محروم کی زبان میں ہم اوجِ ثریا بنا دیا ہے۔ اس کے بعد وہ مادرِ وطن کے آنسوؤں کو دیکھ کر اپنے ہم وطنوں کو للکارتے ہیں کہ۔

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

ایک جگہ وہ ہندوستان کے ماضی و حال کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں اور پھر وہی سوال دوہراتے ہیں ؎

جس کے دنیا کے کرم سے کبھی دنیا تھی نہال — جس کی دولت سے ہوا ایک جہاں مالامال

سامنے غیر کے پھیلاتی ہے دامانِ سوال — آج کل گردشِ افلاک سے ہوکر پامال

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

اس کے بعد "لٹل جون" کے عنوان سے ان کے زمانۂ طالب علمی کی ایک نظم ہے لیکن وہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ "لٹل جون" کی زبان سے حساس "لٹل محروم" کیا محسوس کر رہا تھا۔ اس طالب علم کا یہ بھرپور طنز ؎

انگریز ان سے اچھے سارے جہاں سے اچھے
ہندوستانی آئے بن کر کہاں سے اچھے

ہندوستانی کیوں اس وطن پرور طالب علم کی نظر میں اچھے نہ تھے، اس کا جواب اسی سے سنیے ؎

ایجادِ فن کے قابل ان کے دماغ ہوتے — اچھے اگر یہ ہوتے کچھ با فراغ ہوتے

ہرگز نہ وار کرتے اک دوسرے پہ پیہم — اچھے اگر یہ ہوتے رکھتے ملاپ باہم

اچھے اگر یہ ہوتے آپس میں لڑ نہ مرتے
پستی سے کچھ ابھرنے کی جدوجہد کرتے

اس کے بعد سودیشی تحریک پر ایک نظم ہے اور پھر "جلوۂ امید" کے عنوان سے شاعرانہ تخیل کا وہ شاہکار ہے جو کبھی محروم کی پیشین گوئیوں اور نیک توقعات پر مبنی تھا، مگر آج حقیقت کا روپ دھارن کر چکا ہے۔ بہادر شاہ کے مشہور مصرعے "اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں" پر تضمین میں قوم کو غلامی سے نجات پانے کا درس دیا ہے اور یہ ۱۹۳۰ء کی نظم ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ محروم صاحب اس فضا سے پوری طرح متاثر اور ان کا دل ان جذبات سے لبریز تھا جو ہندوستان میں غلامی کا جُوا اتارنے کے بارے میں اس وقت پائے جاتے تھے۔ اس کے بعد بھارت جاگا، بڑھے چلو ہندوستان ہمارا، ایسی نظمیں ہیں جن میں محروم صاحب قوم کو پکارتے اور پیغام دیتے نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں، جہاں سے آزادی ان کو بالکل سامنے کی چیز نظر آتی ہے اور وہ کہتے ہیں ؎

ہے منزلِ آخر میں غلامی کی شبِ تار

اس دوران میں تحریک کے ہر موڑ پر محروم صاحب انتہائی مستعدی سے اپنے خیالات و مشاہدات کو شعر کا جامہ

پہناتے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ ہندو مسلم فسادات پر خون کے آنسو رو رہے ہیں تو کبھی قومی پستی پر متاسف نظر آتے ہیں اور کبھی تلک، گوکھلے، موتی لال اور سی۔ آر داس پر ماتم کناں ہیں۔ آزادی جس طرح پر آئی وہ سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اس کے نتیجہ میں لاکھوں انسانوں کو بے گھر ہونا پڑا اور محروم صاحب بھی اپنے وطن سے یہ کہتے ہوئے با دلِ ناخواستہ رخصت ہوئے ؂

آج اپنے وطن سے جا رہا ہے محروم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ امن پیشِ نظر نہ منزل معلوم

یہاں محروم صاحب کا دل الفاظ کے آئینہ میں صاف نظر آتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ انھیں اپنے وطن سے کس درجہ محبت تھی۔ وطن چھوٹ رہا ہے۔ بے سر و سامانی کے عالم میں اور اس طرح کہ کوئی منزل سامنے نہیں، کوئی مسکن و مامن نہیں لیکن پھر بھی اپنے وطن کے بارے میں اس آرزو اور جذبے کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں۔

ہم برا چاہیں ترا ممکن نہیں ممکن نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تیرے حق میں بددعا ممکن نہیں ممکن نہیں
یہ دعا مانگا کریں گے ہم خدائے پاک سے! ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ جوہرِ انسانیت چمکائے تری خاک سے
ناروا داری کا کانٹا تیرے گلشن میں نہ ہو ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اور تعصب کی نجاست تیرے دامن میں نہ ہو

خیر سے تجھ کو محبت اور شر سے عار ہو
تاکہ پاکستان کہلانے کا تو حقدار ہو

جس آزادی کی تمنائیں اور آرزوئیں کی تھیں اور جس کے لیے غلام ہندوستانیوں میں جذبہ پیدا کرنے کے لیے محروم نے زورِ قلم صرف کیا تھا۔ وہ آزادی آئی تو محروم کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا مگر وہ اس پر بھی مسرور نظر آتے ہیں مگر اہلِ وطن کو تنبیہہ کرنا پھر بھی نہیں بھولتے ؂

فضا کی آبرو ہے پرچمِ گردوں وقار اپنا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ہے اس دور کی آزاد قوموں میں شمار اپنا
غلامی اور ناکامی کا دورِ ابتلا گزرا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ مساعد بخت ہے اب اور حامی روزگار اپنا
چھٹے دامن سے اپنے داغ ہائے ننگِ محکومی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ وطن اپنا ہے، اپنی سلطنت ہے اقتدار اپنا
نہ گلچیں غیر ہے کوئی، نہ ہے صیاد کا کھٹکا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چمن اپنا ہے، اپنے باغباں، لطف بہار اپنا

اب اے اہلِ وطن اس کو بگاڑیں یا بنائیں ہم
مقدر پر ہے اپنے ہم کو حاصل اختیار اپنا

آزادی کے سورج نے طلوع ہو کر جو کچھ اس برصغیر میں دیکھا وہ محروم صاحب کے پیشِ نظر ہے۔ لیکن حالات سے

مایوس نہیں، خدا پر بھروسہ ہے کہتے ہیں ؎

جس نے نعمت ہمیں بخشی ہے یہ آزادی کی
اس کے الطافِ کریمانہ سے کب ہے یہ بعید

کہ رہِ راست پہ لے آئے وہ گمراہوں کو
ہیں جو بالطبع ابھی پیرِ کلیسا کے مرید

فرقہ داری پہ ہیں دل آج بھی ان کے مائل
یا جو کرتے ہیں تشدد کے عمل کی تائید

میکشوں کو وہ تہی جام رکھے گا کب تک
جس نے دی ہے درِ میخانۂ عشرت کی کلید

حصولِ آزادی کے بعد وہ اپنی صاف دلی کے تحت قوم کو بھی صاف دلی کی تلقین کرتے ہیں اور ماضی کو بھول جانے کا درس دیتے ہیں ؎

اس وقت کو یاد نہ کر ہمدم جب دُور ہماری منزل تھی
تاریک تھیں جب راہیں ساری بے نور ہماری منزل تھی

جب قافلۂ ابنائے وطن سو بار گھرا طوفانوں میں
پُرعزمِ صمیم سے اپنے وہ ہرگز نہ پھرا طوفانوں میں

دامانِ ابد سے وابستہ پُرپیچ غلامی کی وادی
تھے دُور تصور کی حد سے انوار فضائے آزادی

گو دار و رسن کے ہنگاموں کا گرم بہت بازار رہا
اور آقائی کے زور میں آقا مائل صد آزار رہا

اس وقت کو ہمدم یاد نہ کر، وہ دورِ غلامی بیت گیا
جب جور و ستم سب ہار گئے اور صبر ہمارا جیت گیا

لیکن اس بات کو بھول نہ جائے ساکنِ منزلِ آزادی
غفلت سے تری نذرِ طوفاں ہو جائے نہ ساحلِ آزادی

اس کے بعد وہ شاعر اور آزادی کے عنوان کے تحت عہدِ ماضی یعنی دورِ غلامی کا ایک جامع جائزہ لیتے ہیں اور آزادی کو بتاتے ہیں کہ ؎

مضطرب تھے کب سے اے جانِ جہاں تیرے لیے

پھر آزادی جواب دیتی ہے ؎

ٹھوکریں کھاتی بحالِ زار و مضطر آئی ہوں
کیا کہوں کن مشکلوں سے میں گزر کر آئی ہوں

برکتیں اپنی نہیں لائی ہوں اپنے ساتھ میں
اس لیے گویا نہ آنے کے برابر آئی ہوں

کیا یہی کم ہے کہ میں نے پالیا ہے پھر تمھیں
کیا یہ مبہم ہے کہ میں تم کو میسر آئی ہوں

دولتِ جاوید ہوں میں مجھ کو اپناؤ اگر
کب یہ کہتی ہوں کہ لے کر لعل و گوہر آئی ہوں

مالک و مختار اب اپنے مقدر کے ہو تم!
شکوہ کس کا ہے تمھیں، کس کا گلہ کرتے ہو تم

آزادی کے بعد جتنی نظمیں ہیں ان میں قدم قدم پر تعمیر نو کا پیام ہے، آزادی کے تحفظ کی تلقین ہے، اتحاد پر زور ہے اور باہمی رنجشوں کو مٹانے کے لیے کہا گیا ہے۔ گاندھی جی اتحاد کی جو کوششیں آزادی کے بعد دلی میں کر رہے تھے اور ان کی مخالفتیں ہو رہی تھیں ان پر محروم صاحب تنبیہہ کرتے ہیں ؎

اہلِ وطن خدا کے لیے غور تو کرو　　کیا کر رہے ہو دورِ غلامی گزار کے
منزل پہ لے کے آیا ہے جو رہنما تمھیں　　دم لوگے کیا تم اب اسی محسن کو مار کے

لیکن اس کو مار دیا اور محروم صاحب کی یہ تنبیہہ کام نہ آئی ؎

ہاتھ سے اپنے اس کو گنوا کر آخر ہم کیا پائیں گے
ہاتھ ملیں گے، روئیں گے، شرمائیں گے پچھتائیں گے

مختصر یہ ہے کہ محروم صاحب کا یہ مجموعۂ کلام اسم بامسمّٰی اور سچ مچ "کاروانِ وطن" ہے جس سے ہمیں اپنی آزادی کی ساٹھ سالہ جد و جہد کا حال اور قومی رہنماؤں کے اوصاف کے بارے میں ایک غیر مربوط تاریخ کتاب کی صورت میں ملتی ہے اور اس کے لیے اہلِ اردو ہمیشہ محروم صاحب کے ممنون رہیں گے۔

رباعیات

انساں نے درندوں کے چلن سیکھ لیے　　اطوارِ رضائے اہرمن سیکھ لئے
اپنے علم و ہنر پہ خوش ہے ناداں　　بربادیِ دوجہاں کے فن سیکھ لیے

اڑتے دیکھا جو طائرِ پرّاں کو　　اڑنے کی امنگ لے اڑی انساں کو
گولے برسا دیے زمین پر اس نے　　پرواز نصیب جب ہوئی ناداں کو

محروم

جیالال ساز

رباعیاتِ محروم

کتاب کے دیباچۂ طبع اول میں پروفیسر محمد اقبال نے اور دیباچۂ طبع ثانی میں علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی نے نہایت موزوں الفاظ میں جناب محروم کی ذات اور ان کے کلام پر رائے زنی کی ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں اردو نظم کی جتنی بھی درسی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں شاید ہی کوئی کتاب ہو جس میں محروم صاحب کا کلام شامل نہ کیا گیا ہو۔ یہ عزت افزائی جناب محروم کے کلام کی بلندی اور پختگی کی بیّن دلیل ہے۔ بقول علامہ کیفی آپ کی طبیعت ہمہ گیر اور آپ کا تخیل بلند و مستحکم اور بیان دلکش ہے۔ آپ کا شمار ان اساتذہ میں ہے جن کی غائر نظر حال اور مستقبل تک پہنچتی ہے۔

رباعی ایسی صنف ہے جو تخیل کی بلندی اور بیان کی پختگی چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے عموماً اس طرف کم توجہ دی جاتی ہے جوش ملیح آبادی کے الفاظ میں یہ وہ کمبخت صنف سخن ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کو سپر انداختہ کردیتی ہے اور یہ کافر صنف بڑے بڑوں کے بھی قابو میں اس وقت تک نہیں آتی جب تک کہ زمانے کی سرد و گرم ہوائیں، شاعر کی حساس و متفکر زندگی کے تقریباً چالیس پچاس ورق نہیں الٹ دیتی ہیں۔

جناب محروم کی ذات میں وہ تمام اوصاف ـــــ متوازن اعتدالِ جذبات، زندگی کا وسیع تجربہ، بلند نظری اور فلسفیانہ طرزِ بیان، بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جن کی رباعی کے لیے ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی رباعیاں، آپ کے دیگر کلام کی طرح انتہائی دلآویز اور مؤثر ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

دم اکثر پارسائی کا بھرتا ہے   حیراں ہوں کہ دل مرا کیا کرتا ہے
خوف اس کو گناہ سے نہیں ہے لیکن   الزام گناہ سے بہت ڈرتا ہے

انکارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں   تکرارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں
حاصل ہو ثوابِ مفت اس لالچ میں   اقرارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں

ظاہر میں قضا بڑا ستم ڈھاتی ہے
جاں سُن کے اجل کا نام ڈر جاتی ہے
لیکن ہر موت کا نتیجہ ہے حیات
ہر شام پیامِ صبحِ نو لاتی ہے

زندہ ہیں تری رضا پہ مرنے والے
یہ ڈوب کے ہیں پار اُترنے والے
بے خوف وہی ہیں جن کو ہے خوف ترا
کس سے ڈرتے ہیں تجھ سے ڈرنے والے

حاصل کتنا کمال انساں نے کیا
افلاک کو پائمال انساں نے کیا
یہ عقل مگر ابھی نہیں آئی کہ کیوں
انساں کو تباہ حال انساں نے کیا؟

دنیا تھی یہی صدق وصفا کی دنیا
رحم وکرم و مہر ووفا کی دنیا
انساں نے بنا دیا بالآخر اس کو
جور وستم وکذب وریا کی دنیا

کھلتا یہ راز علم وحکمت پہ نہیں
جب تک کرم خاص بصارت پہ نہیں
معلوم ہوا ہے بعدِ فکرِ بسیار
پردہ آنکھوں پہ ہے حقیقت پہ نہیں

جب کالی گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں!
ساون کا گیت کوئلیں گاتی ہیں
تب یاد ہیں گزری ہوئی برساتوں کی
آنکھیں مری سیلِ اشک برساتی ہیں

پھولوں کے ہار لے کے آئی ہے بہار
گلشن کا سنگار لے کے آئی ہے بہار
دلکش مانندِ زُلف ورخسارِ بتاں
کیا لیل ونہار لے کے آئی ہے بہار

مرغانِ بہار کی نواؤں کی قسم
امواجِ نسیم کی اداؤں کی قسم
مستی اپنی نہیں ہے ممنونِ شراب
ساون کی مدھ بھری ہواؤں کی قسم

ہر حلقۂ زلف عنبریں دھوکا ہے — ہر عشوۂ چشم سرمگیں دھوکا ہے
ہیں زشت و زبوں تمام دھوکے لیکن — کہتے ہیں جسے حسنِ حسین دھوکا ہے

کیا کہئے ہمیں کہاں کہاں کا غم ہے — جاں کاہ زمین و آسماں کا غم ہے
تسکیں دنیا سے ہے نہ عقبیٰ کی امید — اک دل ہے اور دو جہاں کا غم ہے

ہم کہتے ہیں کاش، غیر فانی ہوتے — بہرہ اندوز کامرانی ہوتے
فانی ہوتے نہ ہم اگر اے دلِ زار — غم ہائے نہاں بھی جاودانی ہوتے

تلخابۂ غم کے چکھنے والے کم ہیں — اپنی جرأت پرکھنے والے کم ہیں
پھولوں کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں سب — کانٹوں پہ پاؤں رکھنے والے کم ہیں

لب پر اکثر ثواب کی باتیں ہیں — فکرِ روزِ حساب کی باتیں ہیں
لیکن دل میں بغور دیکھا تو وہاں — اب تک لطفِ شباب کی باتیں ہیں

قائل ہم بھی ہیں دوزخ و جنت کے — معنی کے معتقد، نہیں صورت کے
دوزخ؛ تاریکیاں تری دوری کی — جنت؛ انوار ہیں تری قربت کے

ہماری رائے میں بعض حضرات کا یہ خیال کہ جناب محروم کی رباعیوں میں عشقیہ عنصر کا فقدان ہے، حقائق پر مبنی نہیں محروم کے یہاں عشقیہ جذبات کا اظہار بھی ان کے مخصوص فلسفۂ زندگی کے تابع ہے۔ لیکن اس کی دل کشی اور دلآویزی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ہاں یہ درست ہے کہ ان کے یہاں عریانی اور جذبات انگیزی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اور یہ روش جہاں قابلِ ستائش ہے۔ وہاں قابل تقلید بھی ہے، ہمارے خیال میں جناب محروم کا نام ہی اس امر کی ضمانت ہے کہ ان کے نئے مجموعۂ رباعیات کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

محمد اسحاق ایوبی

تلوک چند محروم کی سیاسی نظمیں

شاعری کی خواہ کوئی صنف ہو اس میں اس وقت تک جان نہیں پیدا ہوتی جب تک کہ وہ حسن بیان اور "از دل خیزد و بردل ریزد" کی کسوٹی پر پوری نہ اترے۔ آپ چاہے کسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں اور شعر و شاعری کے لازمی اجزائے ترکیبی آپ کی نظر میں چاہے کچھ ہی ہوں۔ لیکن ایک بات جس پر ادب میں افادیت، مقصدیت، روحانیت، مادیت اور رومان پرستی سبھوں کے پرستار متفق ہیں۔ وہ یہی اصول ہے جس کی بدولت ہر ملک، ہر زبان اور ہر دور کا ادب زندگی اور توانائی حاصل کرتا رہا ہے۔ غزل گوئی میں اگر واردات قلبی اور اچھوتا انداز بیان تغزل گردانا جاتا ہے تو نظم گوئی میں شعریت کی روح موضوع کے ساتھ خلوص اور انوکھے ڈھنگ کی ادائیگی۔ شاعر کسی مخصوص مکتب فکر سے خواہ ذہنی و نظریاتی طور پر وابستہ ہو، خواہ خاندانی و طبقاتی لحاظ سے، لیکن جب تک اس وابستگی میں خلوص اور طرز بیان میں حسن ادا کو دخل نہ ہوگا تب تک اس کی تخلیق قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔

اس کسوٹی پر ہر ملک، ہر عہد اور ہر زبان کے ادب کو پرکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ادب کی دنیا میں کھوٹے اور کھرے کو جانچنے کا اس سے بہتر معیار آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔ کھرے سکوں میں بھی دھات کا فرق ہوتا ہے جس کے اعتبار سے سکوں کی قدر و قیمت میں برابر امتیاز قائم رہتا ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ سکے کو جانچنے کے اور کئی معیار ہیں جس سے ہمیں بالفعل بحث نہیں۔

جب ہم تلوک چند محروم کے کلام کو اسی عالم گیر پیمانے سے "ناپ تول" کر دیکھتے ہیں تو ان کا سرمایۂ سخن قطعی طور پر "کھرا" قرار پاتا ہے۔ میں نے "ناپ تول" کا گھٹیا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ جس طرح کسی ملک کے مقابلۂ حسن میں امیدواروں کو باریک بینی سے جانچنے کے لیے مادی پیمائش ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح کسی بھی شاعر کے کلام کے حسن و قبح کو پرکھنے کے لیے بالآخر چند مادی پیمانے ہی برتنے پڑتے ہیں جن سے کسی حالت میں مفر نہیں چنانچہ اگر اسے گستاخی اور سوء ادب پر محمول نہ کیا جائے تو میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ محروم کے "جاندار" کلام میں بعض ایسے شاہکار بھی ہیں جو کسی مرحلے پر "مرحوم" نہیں ہو سکیں گے۔ کیوں کہ ان میں بے پناہ توانائی، بے حد خلوص اور

بے اندازہ جاذبیت ہے۔

تلوک چند محروم نے غزلیں، رباعیاں اور سیاسی نظمیں۔ غرض کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا سرمایۂ سخن مقدار کے لحاظ سے وسعت پذیر اور معیار کے اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ یہاں ہم صرف ان کے سیاسی منظومات کے مجموعے کا جائزہ لے رہے ہیں۔ جو "کاروان وطن" کے نام سے چھپا ہے۔ اسے دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ ایک تو "فریاد جرس" کے نام سے جس میں دور غلامی یعنی ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کا سیاسی نوعیت کا کلام ہے، دوسرے کا عنوان "منزل" ہے۔ جو آزادی کے دور یعنی اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کی نظموں پر مشتمل ہے۔

صفِ اول کے شاعر کی حیثیت سے تلوک چند محروم کے سیاسی منظومات میں بیک وقت کئی خوبیاں ہیں جن کا احاطہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ تاہم یہاں ہم ان کی چند امتیازی خصوصیات کا ذکر کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ مثال کے طور پر چند قطعے، نظمیں یا بند بھی نقل کرتے جائیں گے۔ تاکہ قارئین بذاتِ خود ان کی اچھائیوں کا اندازہ کرلیں۔

محروم کے کلام میں غضب کی پختگی ہے اور ابتدا سے انتہا تک استادانہ رنگ جھلکتا ہے بلکہ چھلکا پڑتا ہے۔ مگر یہ پختگی محض رعایت لفظی کا گورکھ دھندا نہیں ہے بلکہ شعریت اور معنویت دونوں لحاظ سے امتیازی شان رکھتی ہے۔

مثلاً ابوالکلام آزاد والی نظم کے یہ شعر ؎

بادِ سموم جس پہ اثر کچھ نہ کر سکی — اس نخلِ پر بہار کے سائے میں کیوں نہ آئیں
اسلامیان ہند کو کہتے ہیں۔ جو غلام — وہ اپنی مملکت میں اک آزاد تو دکھائیں

دیکھا آپ نے! غلام اور آزاد کی تکرار نہ صرف استادانہ رنگ کی آئینہ دار ہے بلکہ بہت گہرا نشتر بھی ہے جو منطق کی وزنی سے وزنی دلیل پر بھی بھاری ہے۔

جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسی پر جو نظم کہی ہے اس میں "رنگ کا کھیل" کھیلتے ہوئے ملان کی حکومت پر چھینٹے اڑاتے ہیں۔

چہرہ جو ہے سفید تو کیا دل سیاہ ہے — بیہودگی سے کم نہیں گورے کا نازِ رنگ
قائم نہ رہ سکے گی حکومت ملان کی — اک روز رنگ لائے گا یہ امتیازِ رنگ

یا

افسوس وطن کی سرزمین پر — نازل ہے عذاب آسمانی
پنجاب کی آبرو بہ پھیرا — آپس کی لڑائیوں نے پانی

یہ قطعہ راولپنڈی میں جنوری ۱۹۴۷ء میں کہا گیا تھا۔ اب اس تاریک دور کے بھیانک پس منظر کو یاد کر کے اہلِ پنجاب پر یقیناً گھڑوں پانی پڑ جائے گا۔

محروم کے کلام میں عربی و فارسی محاورات اور اشعار کے برمحل و مؤثر استعمال کی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے ان کے سخن میں نئی آب و تاب، سنجیدگی و متانت اور بزرگی و عظمت آجاتی ہے۔

"خیر مقدم" کے عنوان سے ایک نظم ہے جو پاکستان کے اخبار نویسوں کے خیر سگالی وفد کی آمد پر کہی گئی ہے۔ سنیئے آخر میں کہتے ہیں۔

ذرہ ذرہ ہے یہاں کا طالبِ مہرو وفا — گامزن ہیں راہ گاندھی پر ہمارے رہنما
معتقد یعنی اہنسا کے جوان و پیر ہیں — آیۂ لا تفسدوا فی الارض کی تفسیر ہیں

ایک اور قطعہ ہے جو تضمین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا عنوان "ہند اور ایران کا معاہدۂ دوستی" ہے۔ لکھتے ہیں ؎

سنا ہے کہ ہند اور ایران میں — ہے تجویز الفت کے پیمان کی
یقیناً یہ ہے مژدۂ جانفزا — نہیں جھوٹ، کہتے ہیں ایمان کی
اسی پر ہمارا بھی ہے اعتقاد — یہ تعلیم ہے شیخ ایران کی

"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند"

دیکھا آپ نے زمین کی "عظمت" اور بخشندۂ زمین کی "سعادت" کو کتنے مؤثر طور پر واضح کیا ہے۔ ایک اور نظم "گھر سے نکل کے دیکھو" میں کہتے ہیں ؎

چلنا اگر نہ آئے آبِ رواں سے سیکھو — آبِ رواں سے سیکھو، بادِ وزاں سے سیکھو
گردش اگر نہ آئے، کچھ آسماں سے سیکھو — اٹھنا اگر نہ آئے میری فغاں سے سیکھو

گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو

تلوک چند محروم زبان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں سادگیٔ زبان کی حلاوت، متانت و سنجیدگی کی توانائی اور سیدھے سادے انداز بیان کی سحر آفرینی کی بہتیری مثالیں مل جائیں گی۔ جس سے ان کی نظموں میں تغزل کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ سنیئے! ایک نظم کا عنوان ہے "صبر ہمارا جیت گیا" ؎

گو دار و رسن کے ہنگاموں کا گرم بہت بازار رہا — اور آقائی کے زور میں آقا مائل صد آزار رہا

پر ذوقِ ستم نے اس کے آخر خود اس کو بدنا م کیا بیکار گئی تدبیر اس کی، تقدیر نے اپنا کام کیا
اس وقت کو ہمدم یاد نہ کر وہ دورِ غلامی بیت گیا
جب جور و ستم سب ہار گئے اور صبر ہمارا جیت گیا

اور نظم "جے ہند" ہے جس میں لکھتے ہیں ؎

پیدا افقِ ہند سے ہیں صبح کے آثار ہے منزلِ آخر میں غلامی کی شبِ تار
آمد سحرِ نو کی مبارک ہو وطن کو
پامالِ محن کو

وہ سامنے آزادیٔ کامل کا نشاں ہے مقصود وہی ہے، وہی منزل کا نشاں ہے
درکار ہے ہمت کا سہارا کوئی دم اور
دو چار قدم اور

محروم کی ایک نظم "پنجاب ہمارا" ہے جو ۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن سے کچھ پہلے کہی گئی تھی۔ اس میں شروع سے آخر تک ترنم اور نغمہ ہے اور ابتدا سے انتہا تک خلوص کی تازگی و رعنائی اور حقیقت نگاری کا گہرا رنگ جھلکتا ہے ؎

ہوتا ہے وطن یوں تو ہر اک شخص کو پیارا لیکن حقیقت میں دل آویز و دل آرا
پنجاب ہمارا

دریائے رواں، سبزہ و گل وادی و کہسار ایسے ہی نظاروں سے ہے فردوس نظارا
پنجاب ہمارا

کھیتوں کی یہ وسعت، یہ کسانوں کی کمائی ان دونوں سے ہے ہند کے جینے کا سہارا
پنجاب ہمارا

"غم زدوں کی عید" میں عید کے دن قیدی بیٹے کی ماں کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ نظم ایام خلافت کی یادگار ہے۔ اس کے آخری شعر کی "شعریت" قابلِ داد ہے ؎

احکامِ قید و بند بہت سخت ہیں وہاں
تیری ہوئی نہ ہوگی وہاں تک رسائی عید

ایک پنجابی ہونے کے ناطے محروم نے فسادات، ہندو مسلم اتحاد اور پنجاب پر متعدد نظمیں لکھی ہیں جو ان کی

میانہ روی، انسان دوستی اور پاکیزگیٔ قلب وذہن کی آئینہ دار ہیں۔ چنانچہ جب فسادات کی آگ تیزی سے بھڑک اٹھی، اخلاقی قدریں پاش پاش ہو گئیں، انسانیت نے درندگی کا جامہ پہن کر نظریۂ ارتقار کو غلط ٹھہرانے کی کوشش کی آگ اور خون کا ڈرامہ سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں برسرِ عام کھیلا جانے لگا تو پھر بھلا انسانیت کے پرستار محروم کیوں کر خاموش رہ سکتے تھے۔ وہ چیخ اٹھے ؎

شوقِ عریانی میں یہ رقصِ جنوں اے فتنہ گر | آدمیت کے لباسِ برتری کو پھاڑ کر
خاک میں جن سے ملی توقیرِ انساں سربسر | تو نے اپنی بربریت کے دکھائے وہ ہنر
حیف اے پنجاب تجھ پر اور تری تہذیب پر | آسمانوں سے صدا آئے گی یہ شام وسحر

یہ نظم "بگڑے ہوئے پنجاب سے" خطاب کرتے ہوئے راولپنڈی میں مارچ ۱۹۴۷ء میں لکھی گئی تھی۔

ہر آدمی خواہ کتنا ہی سنجیدہ اور خشک کیوں نہ ہو کسی نہ کسی موقع پر مسکراتا اور ہنستا ضرور ہے۔ اسی طرح ہر شاعر کے کلام میں کہیں نہ کہیں مزاحیہ پہلو بھی سامنے آجاتا ہے۔ تلوک چند محروم بھی اس ذوق سے محروم نہیں ہیں۔ ایک قطعہ جو بہ عنوان "لارڈ مونٹ بیٹن کے دہلی سے جانے پر لکھا ہے۔ اس میں سو فی صدی اکبرالٰہ آبادی کا رنگ پیدا کر دیا ہے ؎

طوفانِ ابر و باد میں وہ ٹاٹ بھی گئے | سایہ فگن جو راہ نشینوں کے سر پہ تھے
اس انقلاب میں تو بڑے لاٹ بھی گئے | گھرگھاٹ، ٹاٹ کھاٹ کا محروم ذکر کیا

تلوک چند محروم نے آزادی سے پہلے سیاسی نظمیں چھپ چھپ کر کہیں لیکن "عشق و مشک" کی طرح ان کا کارنامہ بھی چھپا نہ رہ سکا۔ خوش قسمتی سے وہ مواخذے سے بال بال بچ گئے۔ محروم کی سیاسی نظمیں ادبی اور تاریخی اہمیت رکھتی ہیں جنھیں آنے والی نسلیں نظرِ استحسان سے دیکھیں گی۔

مہتہ امرناتھ موہن بی اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ

کچھ محروم کے متعلق

جب عزیز جگن ناتھ آزاد نے مجھے لکھا کہ ماہنامہ "پگڈنڈی" امرتسر محروم نمبر شائع کرنے کا اہتمام کر رہا ہے تو مجھے کچھ حیرانی سی ہوئی اور یہ حیرانی اس لیے تھی کہ اب جب کہ محروم کے نام اور شہرت کی عمر بھی اسی قدر ہے جس قدر کہ بیسویں صدی کی ہو چکی ہے، کیا ان کے متعلق ایسا نمبر نکالنے کی کوئی ضرورت واقعی باقی رہ گئی ہے۔ کیا محروم اور محروم کی شاعری کے بارے میں ابھی کچھ باقی رہ گیا ہے کہ جس خلا کو پورا کرنے کے لیے یہ اقدام ضروری سمجھا گیا ہے۔

محروم اس وقت ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں: انھوں نے گزشتہ باسٹھ سال کے عرصے میں بے شمار دل آویز، مؤثر، کارآمد اور قسم قسم کی نظموں کا ملک پر متواتر اس قدر مینہہ برسایا ہے کہ دنیائے شاعری کی ہر صبح و بن ہری بھری، باردر اور سدا بہار نظر آتی ہے۔

ایک انگریزی مقولہ میں کہا گیا ہے کہ شاعر بنائے نہیں جاتے بلکہ ماں کے پیٹ سے شاعر بن کر ولادت پاتے ہیں واقعی درست ہے۔ شاعری اکتسابی شے نہیں۔ بلکہ شاعر کی فطرت میں گوندھی جاتی ہے۔ اس مقولے کی صداقت محروم کے کلام کا، جو کئی جلدوں میں شائع ہو چکا ہے، لفظ لفظ ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ چوٹی کے شاعروں، مشہور و معروف نقادوں، سخن فہم عوام نے جو داد دی ہے اور دیباچہ نگاروں نے جو ان کے محاسنِ شاعری گن گن کر بتائے ہیں اگر ان کو مدنظر رکھا جائے تو خاص نمبر نکالنے کا کام محض رسمی سا رہ جاتا ہے جس کی محروم کے مداحوں اور عقیدت مندوں کو اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔ کیوں کہ یہ تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ میں نے نہ صرف محروم کی شعر و شاعری ہی کو دیکھا ہے بلکہ خود محروم کو۔ ان کی انسانیت کو ان کے ذاتی اوصاف کو۔ ان کے گہرے ایثار کو۔ ان کی بے لوث محبت کو۔ بے پناہ صبر و استقلال کو۔ نرم مزاجی کو ـــــ اور نہایت قریب سے دیکھا ہے۔ بطور دوست کے۔ بطور عقیدت مند کے اور بطور ان سے عمر میں بڑا ہونے کے۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ میں محروم کے متعلق وہ باتیں بیان کروں جو ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ان کی شعر و شاعری پر اس قدر تبصرے ہو چکے ہیں کہ اب کسی مزید تبصرے کی ضرورت نہیں رہی۔ عوام کو بڑے آدمیوں

کی باتیں سننے کا شوق ہوتا ہے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ میری باتیں دلچسپی کا موجب ہوں گی۔

آج سے قریباً پچاس برس پہلے محروم کی شہرت اخباری دنیا سے نکل کر عوام میں پھیلنے لگی۔ کلامِ محروم کا حصہ اوّل سال ۱۹۱۴ء کے قریب شائع ہوا جس کا دیباچہ میر کرامت اللہ امرتسری نے لکھا تھا۔ یہ مجموعہ کوئی بڑی ضخامت کا نہ تھا۔ اور اس میں زیادہ تر نظمیں ان کی وہی تھیں جو انھوں نے طالب علمی کے زمانہ میں لکھی تھیں[۱]۔

اس زمانے میں جو محروم کی شاعری کا پہلا دور تھا۔ انھوں نے کئی اچھی اچھی نظمیں لکھیں مگر سب سے زیادہ شہرت جس نظم کو ملی وہ ایک طالب ویر بھان کے متعلق تھی۔ جو سال ۱۹۱۱ء میں چیچک سے مرگیا۔ محروم کی طبیعت میں سوز و گداز تو تھا ہی اس وفات کو۔ جو ان کے اسکول کے ایک طالب علم کی تھی انھوں نے بُری طرح محسوس کیا۔

اسی زمانے میں انھوں نے ایک نظم موت پر لکھی جو غالباً ویر بھان کی موت سے متاثر ہوکر لکھی گئی۔ اس نظم "موت" کو اکبر الٰہ آبادی نے محروم کی بہترین نظموں میں شمار کیا ہے۔ اسکول سے نکل کر ان کی شاعری منظر عام پر آنے لگی۔ جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دئے۔ اگر کوئی محروم کے زمانۂ طالب علمی کی نظموں کا ان کے مابعد کی نظموں سے مقابلہ کرے تو اسکول والی نظموں میں بھی وہی جامعیت، پختگی۔ بلندی۔ روانی۔ محاورہ بندی پائے گا۔ جو ان کی زمانہ مابعد کی نظموں میں پائی جاتی ہے۔ یہ مذاق شاعروں کو عام طور پر چالیس سال یا اس سے زیادہ عمر میں حاصل ہوتی ہے۔ مقبرۂ نور جہاں کے بعد ان کی مقبول ترین نظم "دردناک منظر" ہے جس کے مطلع کا پہلا مصرع یوں ہے ع

جاگو اے اٹھالو سو کر اٹھی ہے ودّیا

اس نظم کو سن کر سنگ دل انسان بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میری ہندی کتاب "سن رے بھائی کسان" کی بھومکا لکھنے کے لیے کسی ایسے ودوان کی ضرورت تھی۔ جو ہندی کا چوٹی کا ادیب ہونے کے علاوہ یا تو خود شاعر بھی ہو یا شعر و سخن سمجھنے کا پورا ذوق و شوق رکھتا ہو۔ چنانچہ اس کے لیے شری بنارسی داس چترویدی ایم۔ پی سے درخواست کی گئی کہ برائے مہربانی کتاب مذکورہ کی بھومکا لکھ دیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ چترویدی جی ہندوستان کے نامور ترین ادیب ہونے کے علاوہ مہاتما گاندھی کے ساتھ بھی رہے ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ لکھنے سے پہلے انھوں نے مجھ سے اردو شاعروں پر کئی دفعہ

---

[۱] ان کی شاعری کی ابتدا پہلے پہل عیسیٰ خیل کے دیہاتی اسکول سے ہوئی۔ اس وقت میں دہلی سے ڈیڑھ سو میل کی دوری پر بیٹھا ہوں۔ اپنا کتب خانہ دہلی میں ہے۔ یہاں پر بیٹھا ہوا جو کچھ لکھ رہا ہوں محض یادداشت کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔

تبادلۂ خیالات کیا۔ محروم کا نام سن کر وہ اچھل پڑے اور مجھ سے کہنے لگے کہ ان کی ایک نظم "ودیا کی زاری" یعنی "دردناک منظر" میں نے سنی ہے اور میں ان کے کلام سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اور مجھے وہ نظم ابھی تک نہیں بھولی۔ عرصے سے میری خواہش ہے کہ میں ان سے ملوں۔ اچھا ہو کہ آپ کسی دن ان کے پاس مجھے لے چلیں تاکہ میں ان کے درشن کر آؤں وہ عمر میں بھی مجھ سے بڑے ہیں۔ محروم کی شاعری کی ہردل عزیزی اور شہرت عوام تک ہی نہیں بلکہ خواص تک بھی پہنچ چکی ہے۔ جس میں اردو یا ہندی پڑھے ہوؤں کا کوئی امتیاز نہیں۔

میں کہاں سے کہاں چلا گیا۔ میں ذکر کر رہا تھا کہ عام طور پر شاعر ذوق سلیم اور درست شعر کہنے کی صلاحیت چالیس سال کی عمر تک مشق کرتے کرتے حاصل کرتے ہیں۔ ابتدائی حصے کا کلام دیکھ کر اس میں یا تو کثرت سے ترمیم کرنی پڑتی ہے یا کئی حصے اس کے پھاڑ کر نئے لکھنے پڑتے ہیں۔ مگر محروم کے کلام کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے ابتدائی کلام اور ان کے آج کے کلام کا مقابلہ کرنے سے ان کی شعر و شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ محروم کے کلام کی سب سے پہلی جلد سال ۱۹۱۴-۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ویرہان، مقبرۂ نور جہاں، دردناک منظر یعنی ودیا کی زاری اور موت پر جو نظمیں ہیں ان کے مجموعۂ کلام میں جو حال ہی میں شائع ہوا ہے دیکھنے میں پتہ چل سکتا ہے کہ ان کو ابتدائی کلام میں کسی قسم کی مابعد کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی اور یہ وہ خوبی ہے جس پر محروم جتنا فخر کریں بجا ہے۔

جب اقبال نے "مقبرۂ نور جہاں" والی نظم پڑھی تو وہ کہنے لگے کہ اس سے بہتر نظم اس موضوع پر لکھنا ممکن نہیں۔ اس ضمن میں مجھے ایک ذاتی بات یاد آگئی جس کا یہاں ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ غالباً سال ۱۹۲۵ء ہوگا میں لا کالج لاہور کا طالب علم تھا اور شاہ عالمی دروازے کے باہر ایک ہوسٹل میں قیام پذیر تھا۔ میں اس وقت قومی نظمیں مختلف اخباروں میں لکھا کرتا تھا۔ اور یہ بات ہوسٹل میں رہنے والوں کو معلوم تھی۔ گویا میں قانونی کالج کا طالب علم ہونے کے علاوہ شاعر بھی مشہور تھا۔ ایک شام اس ہوسٹل کا منیجر میرے پاس آیا۔ اس نے خود یا اس کے کسی رشتہ دار یا دوست نے سینما کھولا ہوا تھا جس میں نور جہاں کے متعلق کسی پروگرام کی اشاعت فلم کے ذریعے سے ہونی مقصود تھی۔ اس کی فرمائش تھی کہ میں اسے نور جہاں کے متعلق چند شعر لکھدوں جن کی نمائش بجلی کے جلی حروف میں کی جانی مطلوب تھی۔ اس زمانے کی فلمیں خاموش فلمیں تھیں، جن میں تحریروں یا اشاروں سے کام لیا جاتا تھا۔ ٹاکیز نہ تھیں میں نے معذرت کی۔ مگر اس کے اصرار پر محروم کا ایک شعر جو کہ ان کی نظم "مقبرۂ نور جہاں" کا مطلع ہے لکھ کر دے دیا اور وہ شعر یوں ہے ؎

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہِ نور جہاں ہے

اور ساتھ ہی میں نے اس سے یہ کہہ دیا کہ یہ ایک شعر ہی ان کا سارا مقصد پورا کر جائے گا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی نمائش ہوئی۔ میں بھی سینما ہال میں موجود تھا۔ ایک بورڈ پر لکھا ہوا اور بجلی کے جلی حروف میں لہراتا ہوا یہ شعر پبلک کے سامنے آیا جس کے آتے ہی سینما ہال تالیوں سے گونج گیا اور یہ کیفیت کئی لمحوں تک جاری رہی۔

ابھی تو میں محروم کی ابتدائی دور کی شاعری کا موازنہ ان کے آخری کلام کے دور سے کر رہا تھا۔ خیالوں کی رو مجھے بہاکر کہاں سے کہاں لے گئی۔ اور سال ۱۹۱۱ء سے اٹھا کر مجھے سال ۱۹۳۵ء میں لا پھینکا۔ بہرحال ان کی شاعری کے سارے دور شاندار ہیں۔

محروم کی شاعری کے اولین دور میں اخبار تو تھے مگر بہت کم۔ ایک دو اخبار کو چھوڑ کر سب ہفتہ وار یا ماہانہ شائع ہوتے تھے۔ اس لیے شاعروں کا کلام عموماً مقامی حدود ہی میں رہتا تھا۔ شاعروں کے لیے دو ہی ادبی رسالے تھے "زمانہ" کانپور جس کے ایڈیٹر دیا نرائن نگم تھے۔ اور "مخزن" لاہور جو سر عبدالقادر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ ان دونوں رسالوں میں جب محروم کی نظمیں شائع ہونے لگیں تو ان کی شہرت اسکول سے نکل کر ادبی دنیا میں پھیلنی شروع ہوگئی اور تھوڑے ہی عرصے میں ان کی شاعری کی ملک میں دھوم مچ گئی۔ کیوں کہ یہ دونوں رسالے ادبی معیار کے لحاظ سے ملک بھر میں بلند ترین سمجھے جاتے تھے۔ ان رسالوں نے محروم کا نام ملک کے کونے کونے میں پہنچایا۔ حالی کی نظموں کے ساتھ ساتھ جو ان کے قریبی پیش رو تھے محروم نے بھی پنجاب پر نظموں کا متواتر مینہہ برسا دیا تھا۔ حالی کی نظموں کے ساتھ ساتھ محروم کی نظمیں محکمۂ تعلیم کے نصاب میں داخل ہوگئیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ محروم کی شاعری دوسرے دور میں داخل ہوئی۔ یہ ۱۲-۱۹۱۱ء کے بعد کا زمانہ ہے۔ کانپور کے رسالۂ "زمانہ" نے ایک بار اردو زبان کے شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں بلند ترین شاعر تسلیم کیا اور رسالہ مذکور میں ان کے سوانح حیات کی اشاعت بھی شروع کردی تھی۔ یہ اعزاز پنجاب کے دوسرے شاعروں کو نصیب نہ ہوا جو محروم کے ہم عصر تھے۔

محروم کی دوسرے اور تیسرے دور کی شاعری کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں۔ اس وجہ سے کہ ۱۲-۱۹۱۱ء کے بعد بھی محروم کی نظر کسی خاص موضوع کی شاعری پر نہیں رہی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں محروم کی شاعری پر تبصرہ کرنا میرا کام نہیں نہ اس مضمون کا محروم کے کلام پر تنقید سے کوئی تعلق ہے۔ میں یہ تمام باتیں محروم کی سوانح حیات کے ان گوشوں کو نمایاں کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں جو اس وقت تک گوشۂ گمنامی میں ہیں۔ محروم جب سے جملہ کلام کو شائع کرنے لگے تو مجموعے میں غزلوں کی شمولیت کے بارے میں شش و پنج میں تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں غزلوں کو اپنے مجموعے میں

جگہ دوں یا نہ دوں۔ میں نے کہا غزلوں کو نظر انداز کر دینا مناسب بات نہ ہوگی۔ ان کی بھی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی دوسری نظموں کی۔ غزل کے معنی ہیں محبت کی باتیں، اور محبت انسانی سرشت میں گوندھی ہوئی ہے۔ آپ کی غزل پاکیزگی کا آئینہ ہے۔ جس کی تصویر ہر شریف انسان اپنے دل میں دیکھتا ہے۔ ایسے پاکیزہ جذبات کے اظہار کو منظر عام پر کیوں نہ لایا جائے۔ اسے سوقیانہ شاعری سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے انگریزی کے مشہور شاعروں والٹر سکاٹ ورڈز ورتھ، کیٹس، شیلے اور بائرن کی (LOVE) یعنی محبت یا عشق کے متعلقہ نظموں کا حوالہ دیا۔ جس پر وہ میری دلیل کے قائل ہو گئے مرحوم کیا ہے پاکیزگی کا ایک سمندر ہے۔ اور اس پاکیزہ سمندر سے جو لہریں اٹھتی ہیں وہ ان کے شعر ہیں۔

شاعر عام طور پر شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں، اور اکثر اپنے اور اپنے کلام کے متعلق مبالغہ آمیزی سے کام لیتے رہتے ہیں۔ مبالغہ بھی فن شاعری کا ایک جزو ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنی ذات، اپنے کلام کی تعریف میں نہ ہو اور غلو کی حد تک نہ پہنچے۔ ورنہ "چوں زن پستانِ خود مالد" والا معاملہ ہی ہو گا۔ اور کسی طرح بہ نظر استحسان نہ دیکھا جائے گا۔ یہ عیب زمانۂ حال کے شاعروں میں خاص طور پر فروغ پا رہا ہے۔ قدماء کے کلام میں (انشاؔ اور مصحفیؔ کی شعری جنگ کو چھوڑ کر) بہت کم پایا جاتا ہے۔ ذوقؔ کا ایک شعر ہے ؎

ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا — نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

اسی طرح مرحوم کی ایک رباعی کا شعر ملاحظہ کریں ؎

جب دادِ سخن جنابِ اکبرؔ سے ملی — آیا مجھ کو یقیں کہ شاعر ہوں میں

دیکھیے دونوں شاعروں کی طبیعتوں میں کیسا انکسار ہے۔ زمانۂ حال کے شاعروں کا کلام بھی پڑھیے۔ اس نوعیت کی منکسر المزاجی کا نشان خال خال ہی نظر آئے گا۔ اس رباعی میں وہ فرماتے ہیں کہ میں تو اپنے آپ کو شاعر خیال نہ کرتا تھا جب اکبرالہ آبادی نے مجھے دادِ سخن دی تو اس وقت سے میں اپنے آپ کو شاعر سمجھنے لگ گیا۔ جس مرحوم کو سارا زمانہ شاعر تسلیم کر چکا ہے وہ خود کو اس وقت تک شاعر نہیں سمجھتا جب تک کوئی دوسرا شاعر اس کو شاعر ہونے کا رتبہ نہ دے۔

استادی شاگردی کے متعلق بھی ان کا زاویۂ نگاہ مختلف ہے۔ اور میری رائے میں زمانۂ حال کے رجحانِ شاگردی و استادی کو مدنظر رکھتے ہوئے دانشمندانہ بھی ہے۔ آج کل کئی شاعر عموماً نئے نئے شاگردوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ان کی شاعرانہ استعداد کا اندازہ شاگردوں کی تعداد سے لگایا جاتا ہے۔ اس تگ و دو میں ایک استاد، خواہ وہ شاعر ہو یا متشاعر، دوسرے استاد کے شاگردوں کو پھسلانے ہی میں اپنی شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ رونما ہو رہا ہے کہ استادوں میں بھی باہم تلخی پیدا ہو رہی ہے۔ مشاعروں کی کامیابی کا انحصار بھی شاگردوں کی

واہ واہ پر لگایا جارہا ہے۔ ایک طے شدہ پلان ہوتا ہے۔ جس کے تحت ایک طبقہ دوسرے طبقے کے شاعروں کو برسرِ مشاعرہ ہلڑ بازی کر کے ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آوازے کسے جاتے ہیں اور شور مچایا جاتا ہے۔ مگر جب ان کے دھڑے کا کوئی لونڈا شعر پڑھنے کے لیے اسٹیج پر آئے تو قبل اس کے کہ کوئی لفظ اس کے منہ سے نکلے واہ واہ خوب کہا خوب کہا کے نعرے بلند ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ مکرر سہ کرر کی آوازوں سے پنڈال گونج اٹھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اچھے شاعر مشاعروں میں حصہ لینے سے گریز کر رہے ہیں۔

محرومؔ اپنی شاگردی میں کسی شخص کو قبول نہیں کرتے اور صاف کہہ دیتے ہیں کہ میں استادی کے قابل نہیں۔ کسی اور شاعر کو اپنا استاد بناؤ۔ میں نے یہاں لفظ عموماً استعمال کیا ہے جو کہ اتفاقیہ نہیں بلکہ دیدہ ودانستہ ہے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ زمانۂ حال کا ہر ایک استاد شاگردوں کی تعداد کو اس لئے بڑھاتا ہے کہ وہ مشاعروں میں استاد متعلقہ کی ہوا باندھ سکیں اس میں قابل قدر مستثنیات بھی شامل ہیں جیسے کہ تاجور سخن پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی۔ میرے خیال میں اس کی تین وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ تو ان کے انکسار کی ہے جس کی بنا پر وہ استاد کہلانا نہیں چاہتے۔ دوسری بات غالباً یہ ہے کہ وہ استادی شاگردی میں پڑ کر کسی کھینچا تانی میں پڑنا نہیں چاہتے۔ آج کل کے شاگردوں پر یہ اعتبار کرنا کہ وہ ایک ہی استاد کے بن کر رہیں گے ممکن نہیں۔ ایک غزل وہ کئی استادوں سے درست کراتے ہیں۔ اور چونکہ طریق اصلاح کا معیار ہر شاعر کا اپنا اپنا اور جداگانہ استعداد پر مبنی ہے۔ اسی لیے شاگرد عام طور پر استادوں میں باہم رنجش پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں تیسری وجہ غالباً یہ ہے کہ محرومؔ کسی دھڑے کے استاد بن کر نہیں جاتے بلکہ سب کے سانجھے بن کر جاتے ہیں جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ ان کا یہ فیصلہ دانشمندانہ ہے۔ کئی شاعروں کی نسبت مجھے ذاتی علم ہے کہ وہ خود تو اچھے شاعر نہیں مگر شاگردوں کی جوڑ توڑ میں خوب ماہر ہیں۔ محرومؔ کے اس انکسار کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

میں پہلے پہل کئی اور صاحبوں کی طرح اس خیال میں رہا کہ محرومؔ لکھنوی ہیں یا دہلوی۔ پنجابی نہیں ہو سکتے۔ یہ خیال تھا جو یقین کی طرح بہت مدت تک دل میں جاگزیں رہا۔ میری زبردست خواہش تھی کہ ان سے ملوں۔ مگر ان سے ملاقات کرنا محال نظر آتا تھا کہ شاعر عام طور پر رعونت پسند ہوتے ہیں۔ اول تو ان کے پاس جانا ہی کارے دارد والا معاملہ ہے اور اگر خدانخواستہ کسی کی رسائی ان تک ہو بھی جائے تو کیا معلوم وہ کس طرح پیش آئیں۔ چنانچہ اس شش و پنج میں کئی سال گزر گئے۔ غالباً سال ۱۹۱۱ء میں میں نے ایڈیٹر پرتاپ کو اس بارے میں خط لکھا مگر ایڈیٹر نے جو جواب دیا اسے پڑھ کر میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے لکھا کہ محرومؔ عیسیٰ خیل کے رہنے والے ہیں اور مقامی اسکول میں ٹیچر ہیں۔ عیسیٰ خیل سرحدی علاقہ ہے جہاں دن دہاڑے قبائلیوں کے مسلح گروہ ڈاکہ زنی کرتے رہتے ہیں۔ جہاں قتل اور اغوا کی

وارداتیں روزمرہ کا دستور ہے۔ اور کسی کا جان و مال محفوظ نہیں۔ ایسے وحشت خیز علاقے میں ایسے بے مثال شاعر کا پیدا ہونا بھی قدرت کی متلون مزاجی ہے ورنہ محروم کی شخصیت کہاں اور عیسیٰ خیل جیسا مردم کش اور انسانیت سوز علاقہ کہاں؟ ان دنوں میں لائل پور کے علاقے میں ایک سرکاری ملازم تھا۔ اتفاق سے جنگ اول کے دوران میں میرے بڑے بھائی جو تحصیلدار تھے۔ خاص عیسیٰ خیل میں تعینات ہوئے، میں نے اس موقع کو محروم سے ملاقات کرنے کے لیے نیک فال سمجھا چنانچہ میں نے محروم کو خط لکھا جس کا جواب آنے پر میں ماہ مارچ ۱۹۱۹ء کے شروع ہی میں عازم عیسیٰ خیل ہو گیا۔ یہ وہ سال تھا کہ جب کہ ملک بھر میں رولٹ ایکٹ کے برخلاف انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ میں نے دریائے سندھ کو سٹیمر کے ذریعے سے عبور کیا۔ ساحل پر کالا باغ کا قصبہ تھا یہاں سے چھوٹی پٹڑی کی ریلوے عیسیٰ خیل کو جاتی تھی اس میں سوار ہو کر منزل مقصود پر جا پہنچا۔ دوسرے دن محروم سے ان کے مکان پر ملا۔ وہ نہایت خوش اخلاقی، خندہ پیشانی اور تواضع سے پیش آئے گویا کہ وہ میرے دیرینہ دوست تھے۔ اس آدَ بھگت منکسر المزاجی، سادگی اور اظہار رفاقت کو دیکھ کر مجھے اس مقولے کی یاد بار بار آتی رہی کہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" پہلے میں ان کی شاعری کا گرویدہ تھا۔ اب ان کے حسن انسانیت کا بھی گرویدہ ہو گیا۔ ملاقاتوں میں انھوں نے اقبال سے گہری عقیدت کا اظہار کیا۔ منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی کے شیدا تھے۔ ان سے خط و کتابت کا ذکر کیا اور ان کے کلام کی بے حد تعریف کی۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان کے میز پر صرف ایک لغت میں نے دیکھی جو غالباً کریم اللغات تھی یا لغات کشوری اور اس پر کپڑے کی جلد تھی۔ دوران گفتگو میں ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ شعر و شاعری کے قاعدوں کے متعلق آپ کو کونسی کتاب پسند ہے۔ تو جواب میں کہا کہ "چہار گلزار" اس کے بعد انھوں نے مجھے دو چار نظمیں سنائیں۔ مگر میں نے "دیر بھان" اور "ودیا کی زاری" کے متعلق جو نظمیں ہیں، انھیں سنانے کے لیے عمداً درخواست نہ کی تاکہ محروم کی فطرت میں سوز و گداز کا جو بارود خانہ ہے وہ یک دم کہیں مشتعل نہ ہو جائے۔ ایک دن وہ سر شام مجھے سیر کے لیے باہر لے گئے۔ راستہ میں مارکیٹ بھی تھی جس میں مسلح پولیس کا پہرہ ہر وقت لگا رہتا تھا۔ میرے بھائی نے مجھے پہلے ہی سے خبردار کر دیا تھا کہ مارکیٹ میں میری آمد سے ایک دو دن پہلے مسلح ڈاکوؤں کا حملہ سر شام ہی ہو چکا ہے اور گھر میں باہر نہ جاؤں۔ مگر محروم مجھے اسی طرف لے گئے اور دور تک چلے گئے۔ میں خوف سے ہلکان ہو رہا تھا۔ مگر محروم سے اس خوف کو چھپائے رکھا۔ سورج ڈوبنے کو تھا مگر محروم یہی کہتے رہے کہ خطرے کا کوئی مقام نہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قبائلی جو ڈاکہ ڈالتے ہیں وہ سر شام ہی ڈالا کرتے ہیں تاکہ انھیں مال غنیمت اور اغوا شدہ شخصوں کو لے جانے میں دقت نہ ہو اور وہ آسانی سے اپنی پناہ گاہوں میں جو نزدیک کے پہاڑوں میں ہیں اور کافی دور

ہیں وقت پر پہنچ سکیں۔ واپسی پر راستے سے کچھ دور پرے ایک درخت کیکڑ کا نظر آیا جس پر ایک کوا بیٹھا ہوا تھا اور درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر بیٹھا تھا اس کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے کہ کیا آپ کو ذوق کا وہ شعر یاد ہے۔ مگر میں نے ان کا مطلب نہ سمجھا اور سوچنے لگ گیا اس پر خود ہی کہنے لگے ؎

اونچی ہے آشیانۂ زاغ وزغن کی شاخ

ایک دن صبح ہی انھوں نے مجھے دریائے کُرم اور ارد گرد کی ملحقہ پہاڑیوں کی سیر کرائی۔ کُرم دریائے سندھ کا معاون ہے جس کا ذکر مرحوم نے اپنی سندھ والی نظم میں کیا ہے۔ دریائے کُرم کے نواح کی پہاڑیوں پر جو کچھ زیادہ اونچی نہیں قلعے بنے ہوئے ہیں جن میں متعین سرکاری افسروں کو مسلح ڈاکوؤں کی نقل وحرکت کی خبریں موصول ہوتی رہتی ہیں۔ جو زمین دوز آلات کے ذریعے سے بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ غرضیکہ عیسیٰ خیل کا تمام گردونواح بلکہ جھاڑی جھاڑی تک وحشت ناک اور ڈراؤنی معلوم دیتی ہے۔ واپسی پر میں نے مرحوم سے دریافت کیا کہ کیا ایسے خوفناک ماحول میں جہاں ہر دم قضائے مبرم کا سامنا ہے آپ کو رہنے میں کوئی خطرہ محسوس تو نہیں ہوتا۔ جواب میں کہنے لگے کہ ان کو یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ اورکہ مقامی پٹھان جاگیر دار اور خان لوگ، ان کے مداح اور دوست ہیں۔ ان کی وفاداری اور اخلاص پرور دوستی ان کی حفاظت کی ضامن ہے۔ اس ملاقات نے ہمیں ایک دوسرے کے بہت نزدیک کردیا اور یہ نزدیکی بڑھتے بڑھتے ایک ایسی دوستی کی شکل اختیار کر چکی ہے جو اٹوٹ ہے۔

کسی شاعر کی عزت افزائی کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ شاعر متعلقہ کے بارے میں خاص نمبر نکالے جائیں۔ ان کی نظموں پر حوصلہ افزا مضمون لکھے جائیں موقع بہ موقع اس کی تصویریں شائع کی جائیں اور مشاعروں میں اسے خراجِ تحسین ادا کیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہر سال اس کی سالگرہ دھوم دھام سے منائی جائے جس میں خواص وعوام بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

اس تقریب کے متعلق اخباروں میں خبریں شائع کرائی جائیں۔ بڑے بڑے پوسٹر چھپوا کر عام گزرگاہوں پر لگائے جائیں اور جہاں شاعر صاحبان اس تقریب میں شامل ہو کر مرحوم کے متعلق نظمیں سنائیں وہاں خواص وعوام بھی اس تقریب کو کامیاب بنانے میں حصہ لیں، اور اس عظیم الشان شاعر کی قدر افزائی کرتے ہوئے دوسرے شاعروں کی بھی حوصلہ افزائی کا موجب ہوں کہ وہ مرحوم کے نقشِ قدم پر چلیں۔ اس تقریب کے ختم ہونے سے پہلے مرحوم کی درازیٔ عمر کے متعلق دعائیں کی جائیں۔

میرے خیال میں اگلا سال اس سلسلے کی پہلی کڑی ہونی چاہیئے۔ جس وقت یہ کام شروع ہوگا ہم سمجھیں گے کہ

قوم نے بیدار ہو کر اپنے ہیروز کی حقیقی عزت افزائی کا کام شروع کر دیا ہے۔

رباعیات

کب دردِ حیات کی دوا ملتی ہے ہاں تلخیٔ جرعۂ فنا ملتی ہے
جینا شاید ہے جرم سنگیں جس پر ہر شخص کو موت کی سزا ملتی ہے

پاداشِ عمل کی ہے یہ منزل اے دوست قدرت کا ہے انتظام کامل اے دوست
اعمالِ بد اپنے بھول جاتے ہیں ہم قدرت ان سے نہیں ہے غافل اے دوست

حیران ہوں میں حُسن کی عریانی پر ہنستا ہے حُسن میری حیرانی پر
اس دور میں شکوہ بے حجابی کا ہے محجوب بہت ہوں اپنی نادانی پر

تہذیب کی بے پردہ ادا سے نہ لڑو تخریب کی پروردۂ بلا سے نہ لڑو
دیوانہ کہیں گے اِس زمانے کے لوگ محروم زمانے کی ہوا سے نہ لڑو

محروم

طالب چکوالی

لالۂ صحرا

محروم صاحب سے میرے تعلقات کافی پرانے اور قریبی ہیں۔ مجھے انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا ہے، اس لیے میں یہ بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ محروم صاحب ایک شریف النفس، بے ریا، مخلص، صلح جو، پرہیزگار انسان ہیں۔ بطور شاعر وہ ایک مانے ہوئے استاد ہیں۔ ان کے علم و کمال کا شہرہ ہند اور پاکستان کے گوشے گوشے میں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کون اردو داں یا ادب دوست ہے جو ان کے ہمہ گیر کلام کے کسی نہ کسی حصہ سے محظوظ یا متاثر نہ ہوا ہو۔ نظم، غزل، قطعہ، رباعی انھوں نے کیا نہیں کہا، اور ان کے متعلق کیا نہیں لکھا گیا۔ مشاہیر ادبا، شعرا اور نقادوں میں سے ایسی کون سی مقتدر ہستی ہے جس نے انھیں خراج تحسین ادا نہیں کیا، میں اس ضمن میں مزید کچھ کہنا تحصیل لاحاصل سمجھتا ہوں کیوں کہ یہ فرسودہ راہ کو اور پامال کرنا ہوگا۔

غالباً ۱۹۱۲ء میں کلامِ محروم حصہ اول شائع ہوا۔ کلام محروم سے میری روشناسی تب سے ہے۔

۱۹۳۴ء میں میں اور چودھری ذکار اللہ بسمل ایم۔ اے۔ ایل، ایل، بی۔ ایک مشاعرہ میں گوجرخاں گئے۔ رعنا جگی سے بھی پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ مشاعرہ کے بعد ہم لوگ حضرت محروم سے ملنے کے لئے راولپنڈی چلے گئے۔ ان دنوں حضرت محروم کنٹونمنٹ بورڈ اسکول لال کرتی راولپنڈی میں معلّم تھے۔ میری پہلی ملاقات ان سے راولپنڈی میں ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ میں ان دنوں چکوال میں وکالت کرتا تھا۔ اس ملاقات سے بہت پہلے ۱۹۲۸ء میں میں نے ایک نظم "لالۂ صحرا" کہی تھی، جس میں حضرت محروم سے خطاب ہے۔ اس نظم کے دو چار اشعار پیش کرتا ہوں۔

لالۂ صحرا

ہے بجا تجھ کو اگر میں لالۂ صحرا کہوں　　　ریت کے برباد ٹیلوں میں جو ہے جلوہ نما

اس پہ بھی لطفِ زباں ہے جو ترے اشعار میں　　　جس پہ ہوں اہلِ زباں بھی جس قدر نازاں بجا

یاد آجاتی ہے قدرت، دیکھ کر بے اختیار　　　یہ زباں، ماحول یہ اشعار، یہ ذہن رسا

ہے دماغ ذوق پہ بڑھ کر کہیں احساں ترا ہے مشامِ خلق پہ احسان خوشبوئے ختن
لالۂ صحرا ہے تو طالب ہیں تیرے بے شمار
تو ہے شمع محفل علم و ادب محفل میں آ

تیرہ سال وکیل رہنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں میں نے وکالت چھوڑ دی۔ کاروبار کے سلسلے میں راولپنڈی آ گیا اور اپنا ہیڈ آفس وہاں قائم کیا۔ ایک ہی شہر میں رہنے کی وجہ سے ملاقات اور ایک دوسرے کو جاننے کے زیادہ مواقع ملنے لگے۔ کنٹونمنٹ بورڈ اسکول کی ملازمت سے ریٹائر ہونے پر حضرت محروم گارڈن کالج راولپنڈی میں پروفیسر مقرر ہوئے میں ان دنوں کالج کے نزدیک رہا کرتا تھا۔ محروم صاحب نے بھی کالج کے نزدیک مکان کرائے پر لے لیا، اور ہم ایک ہی محلہ میں رہنے لگے۔ قیام پاکستان تک ہم راولپنڈی میں رہے۔ اس کے بعد دہلی میں آ کر مقیم ہو گئے۔ یہاں بھی ان کی محبت اور شفقت بدستور قائم رہی۔ اور امید ہے تا زیست رہے گی۔ انھوں نے اپنے کمال و شہرت کو بھی ملنساری اور دوستی کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔

حضرت محروم کا کلام بیسویں صدی کے پہلے نصف کی "تاریخ" ہے۔ ایک مدرس کی حیثیت سے ان کا کلام پند و نصائح کا مرقع ہونا چاہیے اور ہے۔ ان کی نظموں میں حب وطن کا رنگ جھلکتا ہے۔ ملازمت کی مجبوریوں کا اثر بھی نمایاں ہے "ترانۂ جیل" اور دوسری پولیٹکل نظمیں بغیر نام کے شائع ہوئیں اور حالات کا تقاضا تھا کہ ایسا ہی ہو۔

محروم صاحب کے کلام میں اگرچہ غزلوں کا ذخیرہ بھی کافی ہے۔ لیکن اس میں عشق "رسمی" ہے۔ جو ہر اردو شاعر کا "پیدائشی حق" ہے۔ حقیقت کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ محروم نے عشق کیا ہے تو اپنے وطن سے، اپنے فرض سے، علم و ادب اور شاعری سے۔

"طوفانِ غم" میں وہ چند نظمیں یکجا کی گئی ہیں جو انھوں نے اپنی پیاری بیوی کی بے وقت وفات پر لکھی ہیں۔ عین عالم شباب میں وہ ایک شیر خوار بچی (ودیا) اور اپنے عزیز غم شوہر کو روتا چھوڑ کر سورگ سدھار گئی۔

ان نظموں میں اس قدر سوز، اس قدر درد ہے کہ میں نے جب بھی انھیں پڑھا بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے کوئی بھی دردِ دل رکھنے والا انھیں پڑھ کر دل کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ فی الحقیقت محروم مصورِ غم ہے۔ "طوفانِ غم" سے زیادہ پُر سوز، پُر اثر، اور جگر دوز کلام اردو ادب میں مشکل سے ملے گا۔ میں اس مضمون پر یہ ان کا شاہکار سمجھتا ہوں۔ ایک ایک لفظ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ بے ساختگی کہہ رہی ہے کہ دل میں طوفانِ غم ہے جو سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ فی الواقعہ "غم" محروم کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ اس کو وہ کسی وقت بھی بھلا نہیں سکے۔ ۱۹۴۰ء میں اپنے نور نظر جگن ناتھ آزاد کی شادی کے

موقع پر سہرے کی فرمائش کے ساتھ یہ رباعی رقم فرمائی۔

وہ دور گزر گیا کہ جب تھا　　محروم رہین نامرادی
غمہائے کہن ہوئے پس پشت　　درپیش ہے اب جگن کی شادی

۱۹۴۶ء میں میں دہلی آگیا۔ آزاد مجھ سے پہلے یہاں پہنچ چکے تھے۔ محروم صاحب ابھی راولپنڈی ہی میں تھے۔ انھوں نے مجھے لکھا ؎

یہاں رہنا بہت مشکل، یہ پاکستان ہے ساقی　　یہاں وہ کفر ہوگا جو ترا ایمان ہے ساقی

میں نے ان کو جواب میں لکھا ؎

جسے مشکل سمجھتے تھے وہی آسان ہے ساقی　　جو کل ہندوستاں تھا آج پاکستان ہے ساقی
یہاں رہنا بھی مشکل ہے وہاں جانا بھی مشکل ہے　　نہ یہ آسان ہے ساقی نہ وہ آسان ہے ساقی

کچھ عرصہ بعد محروم صاحب مجبوراً پاکستان چھوڑ کر دہلی میں آگئے۔ اخبار "تیج" دہلی کے حصۂ نظم کے مدیر کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج میں اردو فارسی کے پروفیسر ہوگئے۔ دو تین سال ہوگئے وہاں سے بھی ریٹائر ہوچکے ہیں۔ اب تو بس تصنیف و تالیف کا شغل ہے۔

خدا کرے حضرت محروم تادیر اردو کی خدمت کرتے رہیں اور اردو ادب کے سر پر ان کا بزرگانہ سایۂ شفقت قائم رہے۔

رباعیات

الفت کا چمن اجڑ گیا ہے یارب!　　رنگِ گل پھیکا پڑ گیا ہے یارب!
گلشن میں چلی ہوائے نخوت ایسی　　ہر غنچے کا منہ بگڑ گیا ہے یارب

دنیا کتنی حسین نظر آتی تھی　　رنگین، حسن آفریں نظر آتی تھی
اب یاس کی تیرگی ہے غالب ہر سو　　پہلے جو کہیں کہیں نظر آتی تھی

محروم

تاراچند باغیؔ دہلوی ادیب فاضل

مصوّرِ غم

گلشن ادب میں جس پودے کا بیج حالیؔ اور آزادؔ نے بویا اس کو پروان چڑھانے کے لیے جہاں اقبالؔ، چکبستؔ اور سرورؔ جہاں آبادی نے اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی وہاں محروم صاحب نے بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مولانا حالیؔ آج زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کا لگایا ہوا پودا کس قدر رنگا رنگ پھولوں سے گلشن کو مہکا رہا ہے۔ جس اردو شاعری پر الزام لگایا جاتا تھا کہ اس میں گل و بلبل، زلف و رخ، شیریں و فرہاد، گلچین و گلشن اور لیلا مجنوں کے قصوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں، آج وہی اردو شاعری ان ہی شاعروں کی بدولت ان قصہ ہائے پارینہ کو چھوڑ کر نئے راستے پر گامزن ہے۔

محروم صاحب نے ہر موضوعِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور طبع سے گلشنِ اردو کو خوب نکھارا اور حسین تر بنایا ہے۔ کبھی آپ نے وطن پرستی کا احساس دلایا ہے۔ باہمی رفاقت، محبت، اخوت اور خلوص و ایثار کے درس دیے ہیں تو کبھی عارفانہ رموز کو اعلیٰ پایہ سے نظم کیا ہے۔ کبھی کبھی مناظرِ فطرت کو حسین پیرائے میں پیش کیا ہے۔ غرض حیاتِ انسانی کے کسی پہلو کو نہیں چھوڑا اور جن موضوعاتِ سخن پر قلم اٹھایا ہے ان میں حق موضوع خوب سے خوب تر ادا کیا ہے۔

چوں کہ آج کی گفتگو کا عنوان "مصوّرِ غم" ہے اس لیے کوئی دوسرا موضوع زیرِ بحث لانا مناسب نہیں۔

زندگی کو تضاد ازل سے بخشا گیا ہے۔ بادِ نسیم کا چلنا بادِ سموم کی نشاندہی ہے۔ شادی و مرگ، انبساط و غم، دن و رات، غم اور خوشی غرض ہر شے اپنے اپنے وقت پر اپنی جداگانہ حیثیت کے ساتھ رونما ہوتی ہے۔

کلامِ محروم کا نظرِ بلیغ سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات قارئین کے ذہن میں بلاشبہ آجاتی ہے کہ محروم صاحب کے پیشِ نظر "پھول" اور "کانٹے" دونوں تھے۔ مگر ان کی طبیعت کو پھول ایک آنکھ نہ بھائے۔ اس لیے کہ "ناپائیدار رشتے" کی اہمیت محروم صاحب کے سامنے ہیچ ہے۔ چنانچہ انھوں نے باغِ جہاں سے بخوشی خار چنے اور خار بھی خاردار جھاڑیوں کے۔ شاید اس لیے بھی کہ ہماری زندگی کے حسین نغمات وہی تو ہیں۔ جو ہمیں درد و کرب کی عمیق وادیوں میں لے جاتے ہیں۔

آئیے پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ وہ کون سے ایسے حادثات اور واقعات ہیں جنھوں نے ان کے احساس میں

دردوکرب کی شدت پیدا کی۔ انھیں کس طرح کسا اور جھنجھوڑا اور آخر قدرت کیوں ان سے نوحہ خوانی کا کام لینے پر آمادہ ہوئی۔

محروم صاحب کی زندگی ایک مسلسل داستانِ غم ہے ۱۸۸۶ء آپ کا سن ولادت ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے عیسیٰ خیل کی تحصیل میں گاجراں والا نامی گاؤں میں آنکھیں کھولیں۔ ساون بھادوں میں سارا گاؤں زیرآب ہو جاتا، تمام مکان پانی کی نذر ہو جاتے۔ محروم صاحب کے والد ایک فقیر طبع انسان تھے ـــــ والد کی موت ـــــ ۱۹۱۵ء میں اہلیہ محترمہ کی دائمی مفارقت ـــــ ایک سالہ بچی ودیا کا تاریک مستقبل ـــــ ودیا کی خودکشی ـــــ عمر بھر تعلیم و تدریس ـــــ اور پھر جب مدرس اعلیٰ ہوئے تو بھڑوں کے چھتے کو ہاتھ لگا لیا۔

بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

وطن کی غلامی کا قلق ـــــ ہندو مسلم فسادات کی شدید ضربیں تقسیمِ وطن اور وطن سے ہجرت۔ غرض یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم زبانِ محروم سے لفظ "واہ" کی بجائے "آہ" ہی سن سکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں درد و غم کی فراوانی ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا غمِ جاناں غمِ دوراں ہو کر رہ گیا ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ محروم صاحب کے کلام میں سوز و گداز کے عنصر ۱۹۱۵ء میں رفیقۂ حیات کی دائمی مفارقت کے بعد آئے۔ کلامِ محروم اس بات کا شاہد ہے کہ ان کے کلام میں اس سانحۂ عظیم سے پہلے بھی ایسی بہت سی نظمیں اور غزلیں موجود ہیں جو رنج و غم میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محروم صاحب شروع سے ہی غم شناس رہے ہیں ذیل کے کلام سے قارئین پر یہ بات واضح ہو جائے گی۔ ۱۹۰۱ء (جب کہ آپ ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے) میں آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کا نوحہ لکھا ؎

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں گل گریباں چاک ہیں ــ نوجوانانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

بلبل کی نوحہ خوانی سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں ؎

بے رحم کے ستم کی کڑیاں اٹھا رہا ہوں ــ بیداد سہہ رہا ہوں دکھ درد پا رہا ہوں
مجھ بے زباں کی بولی کوئی نہیں سمجھتا ــ ہر چند چیخ کر میں دکھڑا سنا رہا ہوں
قسمت کو رو رہا ہوں میں، اور یہ ستمگر ــ دل میں سمجھ رہا ہے، خوش ہو کے گا رہا ہوں
اک آگ سی لگی ہے یادِ وطن کی دل میں ــ رو رو کے آنسوؤں سے اس کو بجھا رہا ہوں

سب ہمصفیر میرے خوشیاں منا رہے ہیں
تن تن کے اڑ رہے ہیں اڑ اڑ کے گا رہے ہیں (بلبل کی فریاد)

اب آپ ان اشعار سے اندازہ لگائیں کہ شاعر کا دل ازل سے ہی غم زدہ ہے کہ نہیں۔ بلبل کے خیالات کی کس طرح سے ترجمانی کر رہے ہیں۔ اسی نظم کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ۔

یہ تیلیاں قفس کی اے کاش پھونک ڈالوں
اتنا اثر تو یارب، ہو آہِ آتشیں میں

ایک بند "شمعِ سحر" کا ملاحظہ ہو ۔

اے شمع تیری رونقِ بازار کیا ہوئی — گرمیٔ ذوق و شوقِ خریدار کیا ہوئی
وہ آب و تابِ جلوۂ رخسار کیا ہوئی — وہ شب کدھر؟ وہ بزمِ پُر انوار کیا ہوئی
کیا ہو گئے وہ ناز، وہ انداز کیا ہوئے
وہ ننھے ننھے عاشقِ جاں باز کیا ہوئے

اسی نظم کو دیکھئے کہ شاعرانہ کمال کس قدر بامِ عروج تک پہنچا ہوا ہے۔ "وہ ننھے ننھے عاشقِ جاں باز کیا ہوئے" اس مصرعہ کا جواب نہیں۔

مولانا حالی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ شعر وہی ہے جو دل پر اثر کرے، اور جذبات و احساسات کو اس طرح جھنجھوڑ دے کہ سننے والے کے دل و دماغ میں قوتِ عمل کا جذبہ پیدا ہو۔ محروم صاحب کے کلام میں بھی یہ خوبی پائی جاتی ہے۔ "چڑیا کی زاری" اس بات کا بدیع ثبوت ہے۔ آپ کے ایک دوست تھے جنھیں شکار کھیلنے کا ازحد شوق تھا۔ محروم صاحب نے یہ سوچا کہ اگر نصیحت سیدھی کی گئی تو اتنا اثر نہ ہوگا جتنا کہ رمز و کنایہ سے کہی ہوئی بات کا۔ یہ نظم جب اس دوست کو سنائی گئی تو اس نے شکار کھیلنا بند کر دیا۔ محروم صاحب اس سے بڑھ کر حالی کے خیالات کی ترجمانی کیا کرتے؟ نمونے کے طور پر اس نظم کا پہلا بند ملاحظہ ہو۔

اے بد نہاد لڑکے! اے نابکار لڑکے — یہ کیا کیا؟ خدا کی تجھ پر ہو مار لڑکے
نازل غضب خدا کا تجھ پر اسی گھڑی ہو — اور موت لے کے خنجر سر پر ترے کھڑی ہو
ظالم! خدا کرے تو بچپن میں جان کھوئے — میری طرح سے تیری ماں زار زار روئے
بے رحم کیا بگاڑا ان بے پروں نے تیرا — نقصان کیا کیا تھا؟ ان بے گھروں نے تیرا

موجِ فنا میں ان کو تو نے بہا دیا کیوں؟
ان کا نشانِ ہستی ظالم! مٹا دیا کیوں؟ (چڑیا کی زاری)

زمانۂ قدیم سے یہ روایت چلی آر ہی ہے کہ استاد شاگرد کا رشتہ باپ بیٹے کا رشتہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ مرحوم صاحب کا تعلق تعلیم وتدریس سے رہا ہے اور اسی لیے آپ کے دل میں طلباء کے لیے جو محبت ہے وہ شاید کسی باپ کو اپنی اولاد سے بھی نہ ہو۔ جہاں آپ نے اپنی اولاد کے بے وقت انتقال پر آنسو بہائے ہیں وہاں آپ نے اپنے طالب علموں کے بے وقت انتقال پر بھی آنسو بہائے ہیں۔ آپ کا ایک ہونہار طالب علم چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور وہ امتحان کے روز جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ آپ کے دل پر صدموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور آپ آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔ نمونہ کے طور پر اس "نوحہ" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں۔

وہ بھولی بھالی شکل ہے آنکھوں کے روبرو — کمرے میں پھر رہی ہے وہ تصویر ہو بہو
ابھرا ہوا وہ ماتھا، وہ آنکھیں غزال سی — اور ان پہ ابروؤں کی سجاوٹ ہلال سی
آیا ہوا لبوں پہ تبسم ذرا ذرا! — وہ توتلی زباں کا تکلم ذرا ذرا
بچپن کی شوخیاں وہ ادب سے رُکی ہوئیں — ہر وقت وہ کتاب پر آنکھیں جھکی ہوئیں
اے وائے! تیری ظاہر و باطن کی خوبیاں — پچتے نہیں وہ، ہوتی ہیں یہ جن کی خوبیاں

ہونا ہی تھا جدا، کہ ہمیں تجھ سے پیار تھا
مرنا ہی تھا تجھے کہ بہت ہونہار تھا

آپ اس بند سے اندازہ لگائیے کہ اس طالب علم کی یاد ان کے رگ و پے میں کس قدر سمائی ہوئی ہوگی اور اس کی بھولی بھالی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہوگی۔ علاوہ ازیں تشبیہات و استعارات کا استعمال کس ندرت سے کیا ہے۔ "اور ان پہ ابروؤں کی سجاوٹ ہلال سی" ابروؤں کی سجاوٹ کو ہلال سے تشبیہہ دینا کس قدر جاذب و نادر تشبیہہ ہے۔

اسی قبیل کی ایک اور نظم "خوابِ جہانگیر" میں آنسو بہاتے ہوئے کہتے ہیں ؎

جاگ اے شاہِ جہاں گیر جہاں بخشِ جہاں — اے شہِ ملک سخا طبل و نشاں بخشِ جہاں
جاگ اے جانِ جہاں! روحِ رواں بخشِ جہاں — کہ ترا جلوۂ دیدار ہے جاں بخشِ جہاں

ایک عالم پئے دیدار چلا آتا ہے
درِ دولت پہ جہاں تیرے کھچا آتا ہے

تختِ شاہانہ پہ وہ جلوہ نمائی تیری ہائے او ظلِ الٰہی! تھی خدائی تیری
چل بسی ساتھ ترے عدل روائی تیری مل گئی خاک میں زنجیرِ طلائی تیری
عدل و انصاف کا تیرے ہے فسانہ باقی
تو ہی باقی ہے نہ اب تیرا زمانہ باقی

خزاں ہو کہ بہار قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر محروم صاحب کے دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو ہی جاتا ہے۔ مثلاً آپ راوی کے کنارے پر بیٹھے ہوئے محو نظارہ ہیں ۔ قدرت اپنے گوناگوں نظاروں سے لوگوں کو لطف اندوز کر رہی ہے لیکن آپ اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

میکدوں میں چراغ روشن ہیں لوزِمے سے ایاغ روشن ہیں
کرمکِ شب چراغ روشن ہیں یا مرے دل کے داغ روشن ہیں
شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

دلِ وحشی کا مدعا غم ہے ابتدا غم ہے انتہا غم ہے
یوں تو دل پر مرے سدا غم ہے غمِ مرگِ پدر نیا غم ہے
شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

محروم صاحب خود اعتراف کرتے ہیں کہ ؏
یوں تو دل پر مرے سدا غم ہے

"نور جہاں کا مزار" پر بیشتر شعرا حضرات نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن محروم صاحب کی یہ نظم حرف آخر ہے۔ اس نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

اے حسنِ جہاں سوز کہاں ہیں وہ شرارے کس باغ کے گل ہو گئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے
یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے

جو پیکرِ ہستی کے لیے روحِ رواں تھے ۔۔۔ رہنے کے لیے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے
تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے ۔۔۔ محبوبِ دلِ خلق تھے جاں بخشِ جہاں تھے
جو کچھ تھے، کبھی تھے، مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجرے پڑے زیرِ زمیں ہیں

دیکھیے ان اشعار میں حسرت دیاس کس شدت سے جاری وساری ہے۔ اس کے علاوہ پہلا بند جہاں سوز کے لیے شرارے، باغ کے لیے گل، عرش کے لیے تارے، کرمک شب تاب کے لیے چمکنے کا برجستہ استعمال کرنا آپ کی فن کارانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ اور دوسرے بند میں بھی وہی تشبیہات کا برموقع استعمال انگشتری میں نگینے کا کام دے رہا ہے اور یہ نظم منظر کشی کا دل کش نمونہ ہے۔ میرے خیال ناقص میں اگر محروم صاحب اس نظم کے بعد کچھ بھی نہ کہتے تو بھی یہ نظم ان کی دوامی شہرت کے لیے کافی تھی۔ جہاں شاہ نصیر ایسے استاد کا ایک مصرعہ گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر" ہمارے دل و دماغ پہ چھایا ہوا ہے وہاں محروم صاحب کی کئی نظمیں ایسی ہیں جو ہمارے دل و دماغ میں اپنا نقش دائمی بٹھائے ہوئے ہیں۔

ان چند اشعار سے قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ محروم صاحب کا وہ کلام جو ۱۹۱۵ء سے پہلے کا لکھا ہوا ہے کس قدر درد انگیز اور پُرتاثیر ہے۔ اب ۱۹۱۵ء کے بعد کا کلام ملاحظہ ہو۔

ہے بے طرح مترشح نظر سے بیزاری ۔۔۔ یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری
کہ بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری ۔۔۔ کہاں ہے آج تمہاری وہ طرز غمخواری
یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی؟
چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی! (اشکِ حسرت)

اب دیکھیے ٹیپ کا شعر کس قدر رقت انگیز ہے۔ اس بند میں ہندو مائی تھالوجی کو کس طرح بیان کیا ہے۔

کیوں برخلاف عادت رو کر اٹھی ہے ودیا ۔۔۔ جاگو! اے اٹھالو، سو کر اٹھی ہے ودیا
صبر و قرار شاید کھو کر اٹھی ہے ودیا ۔۔۔ بیتاب اس طرح کیوں ہو کر اٹھی ہے ودیا
اس کو بھی غائبانہ معلوم ہو گیا ہے
خوابِ عدم میں تم ہو یا بخت سو گیا ہے

پتھر میں موم کی تو تاثیر ڈھونڈھتی ہے ۔۔۔ ان سرد چھاتیوں میں کیا شیر ڈھونڈھتی ہے
کیسے شکار ہائے! تقدیر ڈھونڈھتی ہے ۔۔۔ اب شمعِ کشتہ میں کیا تنویر ڈھونڈھتی ہے

مر دے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہے

مجھ سخت جاں پہ یارب! یہ کیا گزر رہی ہے (دردناک منظر)

یہ نظم کس قدر نفسیاتی پہلو لئے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ سرد چھاتیوں میں تیر ڈھونڈھنا، پتھر میں موم کی تاثیر ڈھونڈھنا اور شمع کشتہ کے لیے تنویر کا لانا، ایسے اعلیٰ و عمدہ اندازِ بیان کی ہم محروم صاحب سے ہی توقع کر سکتے تھے۔ اور پہلے بند کے ٹیپ کے مصرع میں اس کو بھی غائبانہ معلوم ہو گیا ہے "کس خوبی اور محاکاتی طور پر کہا ہے۔

ایک قطعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جا کے شمشان میں وہ تن پھک جائے — جو ہو نازک سوا گُلِ تر سے
آتشِ گل سے ہو جسے آسیب — داغ کھائے ہجومِ اخگر سے
اور معصوم ایک سال کی جان — گر کے آغوشِ مہرِ مادر سے
خاک پر لوٹ لوٹ کر روئے — ہوں رواں اشکِ نابِ گوہر سے

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

موت گھر میں ہو، اور یوں میری — جانِ بیزار موت کو ترسے
آہ! سیلاب میں رہوں پیاسا — اور ہو سَیل کا گزر سر سے

ان اشعار سے کس قدر حسرت ٹپک رہی ہے۔ اسی قطعہ کے آخری تین اشعار ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں۔

ہو گا احساں جو فیصلہ کر دے — پیشتر ساعتِ مقرر سے
بخشتا ہوں تجھے حیات کے دن — کچھ ہیں باقی اگر مقدر سے
شکوہ روزِ جزا ترا ہرگز — نہ کروں گا جنابِ داور سے

نظم "ناپائدار رشتے" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن — رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں
یہ مادر و پدر زن و فرزند و اقربا — شب بھر کے میہماں ہیں مسافر سرا کے ہیں
محروم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم — جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں

کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی
اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

اگر اس نظم کے پسِ پشت محروم صاحب کی رفیقۂ حیات کا ذکر نہ بھی ہو تو بھی یہ ایک ایسی نظم ہے جو دنیا کی بے ثباتی کا ایسا ثبوت ہے جو حقیقت کی بے ثباتی پر پوری اترے گی۔

ایک غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں۔

محروم فصلِ گل کا ہمیں انتظار کیا
زندہ کرے گی مردوں کو یادِ بہار کیا

آپ نے ایک نظم موت کے عنوان سے بھی کہی ہے ؎

مارا کسی غریب کو تو نے وطن سے دور — ماں باپ سے بہت پرے بھائی بہن سے دور
لاشہ کوئی پڑا ہے مزار و کفن سے دور — دست صدائے شیون و شورِ محن سے دور
پھولوں کی آہ ناز بھری انجمن سے دور — گھونٹا گلا ہزار کا صحنِ چمن سے دور

موت کی وادی کی کیا ہی پُرحسرت تصویر ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے نوحۂ وفاتِ سرور۔ غم نادر۔ ماتم طالب نوحۂ چکبست۔ ماتم گرامی۔ یادِ تلک۔ نوحہ سی۔ آر۔ داس۔ آہ موتی لال اور مہاتما گاندھی کی یاد میں جو نظمیں کہی ہیں ان کے مطالعہ سے ایسا احساس ہوتا ہے کہ ان کی ذاتِ گرامی کو ان کی وفات پر شدید قلق ہوا ہے۔

آخر میں قبلہ محروم کے اس شعر پر اکتفا کرتا ہوں ؎

مسرت نام ہے کس چیز کا، محروم کیا جانوں
جہاں ماتم کدہ ہے اور مصروفِ فغاں میں ہوں

رباعی

شاعر ہوں، شاعری میں استاد نہیں — گو نقدِ سخن ہے پاس، نقاد نہیں
سودا کب سے ہے، شاعری کا مجھ کو — مدت اتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں

محروم

ورِیندر پرشاد سکسینہ بدایونی

محروم کا مرتبہ اردو ادب میں

اردو کے ممتاز اصناف سخن میں غزل قصیدہ اور مثنوی رہی ہے، انیس و دبیر نے مرثیہ خوب لکھا اور مسدس کو آسمان پر پہنچا دیا۔ سودا نے غزل بھی خوب لکھی اور قصیدہ بھی۔ مگر یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ انداز بیان اس کا دونوں میں ایک سا ہے۔ یعنی مختصراً نہایت شاندار اور پر شکوہ۔ کچھ زمانے کے بعد قصیدہ اور مرثیہ بالکل متروک ہو گیا اور اس کے بجائے نیچرل شاعری کا اضافہ ہوا۔ جو نہایت وسیع میدان ہے۔ اردو شاعری کے مروجہ اصناف میں غزل کی مقبولیت سب سے زیادہ ہے۔ اور اس کو سب سے اونچا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس سے شاعر کے مرتبہ کا اندازہ اور یقین ہوتا ہے ہزاروں شاعر غزل کہنے والے ہوئے ہیں۔ لیکن صف اول کے چند ہی ہیں۔ مثنوی کی صنف بھی کچھ فراموش سی رہی ہے۔ گنی چنی مثنویاں اس میں ہوئی ہیں۔ جن میں اب تک "سحر البیان" "گلزار نسیم" "زہر عشق" اور "پیام ساوتری" ہی سب سے اونچی سمجھی جاتی رہی ہیں۔ رواں، اناوی، محروم، جگر بریلوی، امجد حیدر آبادی، یگانہ، جوشش اور فراق نے رباعی کو بھی صف اول میں لاکر رکھ دیا۔ اردو کی مقبول اور مروجہ اصناف سخن کے ساتھ ساتھ نیچرل شاعری کا بھی رواج عام ہو چلا۔ اس نے صحیفۂ فطرت سے موضوعات شاعری لئے اور ان کا میدان لامحدود کر دیا۔ غزل کی صنف تو اس سے بچی ہوئی ہے۔ ورنہ تمام اصناف مسدس، مخمس، مربع، مثلث، ترجیع بند، ترکیب بند، قطعہ، رباعی، مثنوی سب میں اس کا سکہ رواں ہو گیا۔ اس انقلابی زمانے میں غزل میں عظیم تغیر پیدا ہوا۔ یعنی پُرانا رنگ جو انفرادیت اور خارجیت پر مبنی تھا متروک ہوا اور داخلیت اور آفاقیت کا جدید دَور شروع ہوا۔ محروم صاحب اسی دور کے شاعر ہیں۔ محروم صاحب نے تمام خاص مروجہ اصناف یعنی غزل، مثنوی اور رباعی کے موضوعات کے تحت بہت لکھا ہے۔ اور نیچرل نظمیں بھی کافی کہی ہیں۔ ہم سب سے پہلے محروم صاحب کی غزل کا جائزہ لیتے ہیں کہ اردو شاعری میں یہی خاص صنف مانی گئی ہے۔ جناب محروم کا شمار ہندوستان کے صف اوّل کے شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ غزل، رباعی اور نظم تینوں میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ آپ کی غزلوں میں بڑی پختگی شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ آپ کی غزلیں اس عریانیت سے بچی ہوئیں ہیں جن کی وجہ سے داغ اور جگر مراد آبادی کی شاعری بدنام ہے۔ انداز بیان کی ندرت و شوخی کے علاوہ

حلاوت اور شیرینی بھی محروم صاحب کی غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ محروم صاحب کی تمام کی تمام غزلیں صاف و سادہ اور دل کش ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

اب قفس ہی کو آشیاں کہیے — راحتِ آشیاں ملے نہ ملے

دامِ غمِ حیات میں الجھا گئی امید — ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی
انجامِ حسنِ گل پہ نظر تھی دگر نہ کیوں — گلشن سے آہ بھر کے نسیمِ سحر گئی

سرورِ عاشقی بعدِ فنا بھی مونسِ جاں ہے — کہ صحرا کے بگولوں میں غبارِ قیس رقصاں ہے
خیالِ رنج و راحت میں عبث اے دل پریشاں ہے — نہ یہ قائم نہ وہ دائم یہ پرّاں وہ شتاباں ہے
چراغِ زندگی روشن سرِ راہِ بیاباں ہے — ہوائے دہر کا ہر ایک جھونکا دشمنِ جاں ہے

وہیں تک ضبطِ وحشت میں دلِ بیتاب کوشاں تھا — ترے کوچے سے ہم نکلے تو پھر کوسوں بیاباں تھا

کھل سکے اُن پہ کس طرح واقفِ سوز و ساز ہوں — چاہیے اب کہ شمع ساں میں بھی زباں دراز ہوں

رباعی بہت مشکل صنفِ سخن ہے کیونکہ اس کا وزن بھی محدود اور مصرعے بھی محدود اس لیے شعراء اس وقت تک رباعیاں نہ کہتے تھے جب تک وہ شاعری کے تمام منازل طے نہ کر چکے ہوں۔ پرانے اساتذہ کی رباعیاں صرف پند و نصائح یا معارف و حقائق کے لیے ہی مخصوص تھیں۔ لیکن رواںؔ، محرومؔ، جوشؔ، فراقؔ، امجدؔ، یگانہؔ، اور جگرؔ بریلوی نے متداول رنگ سے ہٹ کر رباعیاں لکھنا شروع کی ہیں۔ رباعی چونکہ زندگی کے پھولوں کا عطر ہے اس لیے اردو میں اب تک صفِ اوّل کے رباعی گو شعرا میں محرومؔ، فراقؔ، جگرؔ بریلوی، امجدؔ حیدرآبادی اور جوشؔ ملیح آبادی کی رباعیات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جناب محروم کی رباعیاں اپنی خوبیوں کی آپ ہی ضمانت ہیں۔ جن پر کسی طول طویل تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ اچھا کلام کسی تمہید کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ لوگ ضرور ان رباعیوں کی قدر نہیں کر سکتے جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اردو میں جو کچھ ہے وہ صرف چند نفوس پر ختم ہے۔ وہ لوگ جو علم و فن کو خدا کی ایسی نعمتیں سمجھتے ہیں جو اپنی وسعتوں اور خصوصیتوں میں لامحدود ہیں انھیں ضرور ان رباعیوں میں حقیقی سرورِ ادب کے سرچشمے نظر آئیں گے۔ ان رباعیوں میں

انسانی زندگی اور حقائق و معارف کے بڑے بڑے نازک اور باریک مسائل حل کیے گئے ہیں جو اہل نظر کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ چند رباعیاں ملاحظہ فرمایئے ؎

زندہ ہیں تری رضا پہ مرنے والے — یہ ڈوب کے ہیں پار اترنے والے
بے خوف وہی ہیں جن کو ہے خوف ترا — کس سے ڈرتے ہیں تجھ سے ڈرنے والے

حاصل کتنا کمال انسان نے کیا — افلاک کو پائمال انساں نے کیا
یہ عقل مگر ابھی نہیں آئی کہ کیوں — انساں کو تباہ حال انساں نے کیا

کھلتا یہ رازِ علم و حکمت پہ نہیں! — جب تک کرمِ خاص بصارت پہ نہیں
معلوم ہوا ہے بعدِ فکرِ بسیار — پردہ آنکھوں پہ ہے حقیقت پہ نہیں

مختار تھا، کر گیا جو دل کو بھایا — ہو کر مجبور پھل بھی اس کا پایا
یوں جبر سے اختیار مغلوب ہوا — یوں عالمِ اختیار میں جبر آیا

دروازہ نجات کا بیاباں میں نہیں — دل کا آرام قصر و ایواں میں نہیں
تسکین جنت میں بھی نہیں مل سکتی — جب تک موجود قلبِ انساں میں نہیں

دُنیا نے عجب رنگ جما رکھا ہے! — ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے — اس عالمِ آب و گِل میں کیا رکھا ہے

ادبار کا گھر کہ جائے اقبال ہے دہر — جیسا نظر آتا ہے بہر حال ہے دہر
کیوں زشتیٔ دہر پر ہے برہم اتنا — ناداں ترا آئینۂ اعمال ہے دہر

کب کوئی جہاں میں پھوٹتا ہے غم سے　　　دل آخر کار ٹوٹتا ہے غم سے
صدمات سے کھلتی ہیں بشر کی آنکھیں　　　پھوڑا غفلت کا پھوٹتا ہے غم سے

جناب مرحوم نے مختلف عنوانوں پر نظمیں لکھی ہیں ان نظموں میں روانی اور سادگی عجب بہار دکھاتی ہے۔ ان کی اکثر نظمیں اقبال کی نظموں سے کہیں زیادہ بلند ہیں۔ ان کی نظموں کی زبان کوثر میں دُھلی ہوئی زبان ہے۔ روانی سیری اور صفائی ہم کو آبِ حیات کی نہروں کا مزہ دیتی ہے مسٹر محمد سلیم الہ آباد یونیورسٹی کے اردو ایسوسی ایشن میگزین بابت ۲۹-۱۹۲۸ء کے صفحہ ۲ پر جناب مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں۔

"آپ اقلیمِ اردو کے شہسوار، فطرت کے پجاری ہیں۔ آپ کی تخیئل نے چمنِ اردو میں جو گلکاریاں کیں اس میں کوئی آپ کا شریک نہ سہیم۔ آپ مذاقِ شاعری کے مصلح، قندیلِ خیال کے عرشِ اعظم سے مادر روشن کرنے والے اردو کے مہر نیم روز نیم ماہ دہلی و لکھنؤ کے محاورات پر یہ عبور، روزمرہ پر یہ قدرت، پھر اپنی محرومی پر اشک بہانا کیا۔ جو بے ادب ہیں وہی بدنصیب ہوتے ہیں۔ آپ کی سعادت اس سے ظاہر ہے کہ ملک وملت کی زبان اردو پر جب مصیبت آئی تو اس دورِ مصائب و آلام میں جب پاؤں تلے کی چیونٹی جان کی لاگو تھی۔ جب کوئی اسے یک چشم کوئی لنگڑا، کوئی اپاہج کہتا اور دل کے جلے پھپھولے پھوڑتا تھا۔ جب لوگ اسے غیر ملکی اور غدار قرار دے کر ملک بدر کرنے کے درپے تھے تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور سدا سہاگن کے روئے زیبا سے نقاب الٹ دی۔ اس کی دل نواز شکل وصورت کو چشموں اور کوتاہ بینوں کو دکھادی۔ پھر میدان صحافت میں اسے یوں محشر خرامی پر تیار کیا کہ اصنافِ سخن کا کوئی گوشہ اس کے قدموں تلے آنے سے نہ بچا۔ مرحوم کی قلم کی بوقلمونیوں نے چمنِ اردو میں بہار کو نوید بہار دی اور نونہالان چمن میں تازہ روح دوڑائی۔ سادہ کاری اور سہل نگاری کے دریا بہادیئے۔ جس نے چمن کو نئے برگ و بار دیئے اور نئے رنگ وروپ سے ان کا تعارف کرایا۔ اردو اپنی نئی اضافتوں سے یاد کی جانے لگی ان علمی جواہر ریزوں نے ان کی ناداری کو ہمہ داری سے بدل دیا۔ تلوک چند محروم کا کلام مضامینِ رنگا رنگ سے بھرا ہوا ہے۔ لوگ وحشت کے اثر سے ویرانہ گردی کرتے ہیں۔ لیکن شاعر کی نظر رازِ حقیقت سے آشنا ہوتی ہے۔ ان کی معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز پر خاص انداز سے نظر ڈالتا ہے۔ چنانچہ اس دشت نوردی کی وجہ نہیں جو عموماً خیال کی جاتی ہے۔"

لے کے ہر روز جو ویرانہ میں جاتا ہے تجھے
مرحلہ راہِ حقیقت کا دکھاتا ہے تجھے

بلبلہ کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ ذرا ندرتِ خیال ملاحظہ ہو ؎

اف کس قدر غرور بھرا بلبلے میں ہے　　فرعون کوئی آکے چھپا بلبلے میں ہے؟
فوراً نہاں نظر سے جو ہوتا ہے بلبلہ　　مجھ کو یقیں ہے بیضۂ عنقا ہے بلبلہ؟

عرصۂ حیات یقیناً اس قدر تنگ اور محدود ہے جتنا کہ بلبلہ ؎

یہ بلبلہ ہے یا کہ طلسمِ حیات ہے
پیدا ابھی ہوا ابھی نذرِ ممات ہے

کتنے ہی مجنوںوں کے ساتھ شعراء نے جنگل کی خاک چھانی لیکن اس مخفی کشش کو نہ سمجھ سکے جو صحرا نوردی پر مجبور کرتی ہے۔ آیئے اس کو محروم کی زبانی سنئے ؎

دم تخیئل کا نہیں گھٹتا یہاں　　ہے زمیں پھیلی ہوئی دُور آسماں
ہے یہاں وسعت خیالوں کے لیے　　ہے یہ میداں فکر والوں کے لیے

"مارِ آستیں" کو کیا خوب باندھا ہے ؎

کون بتلائے سرنگاں دارا کون تھے
کھول مارِ آستیں کچھ فتح اسکندر کا راز

محروم صاحب کی زیادہ نظموں کی ابتدا جس بے باکانہ و برجستہ طرزِ ادا کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی "خطا کس کی ہے" اس کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔ طبیعت مسرور ہو جائے گی ؎

غنچہ و گُل میں ذرا دیکھ ادا کس کی ہے؛　　سبزۂ تر میں لہک کس کی؛ فضا کس کی ہے؛
سرو و ریحاں میں بھلا نشو و نما کس کی ہے؛　　گہری سبزی جو ہے پتوں میں بتا کس کی ہے
جلوہ فرمائی یہ سب اس کے سوا کس کی ہے؛
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل یہ خطا کس کی ہے؛

"بلبلے" کے اس بند کی شان بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

پھولا ہوا ہے کس لیے کیا بلبلے میں ہے　　اللہ! کون سی یہ ہوا بلبلے میں ہے
اُف کس قدر غرور بھرا بلبلے میں ہے　　فرعون کوئی آکے چھپا بلبلے میں ہے
کتنا اُبھار کتنی اکڑ کیسی شان ہے
پانی کی ایک بوند میں کیا آن بان ہے

"آندھی" پر مرحوم صاحب نے ایک شاہکار نظم کہی ہے یہ نظم اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کیا جائے دو بند ملاحظہ ہوں۔ فرمائیے ؎

وہ گرد کا پہاڑ اٹھا پھر شمال سے　　بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ یہ باہر مثال سے　　آتی ہے فوجِ دیو نظر چال ڈھال سے
رُو پوش اس کے خوف سے کوہِ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رُخِ آسماں ہوا

جڑ سے اکھڑ کے نخلِ تناور کہیں گرا　　ٹہنا کسی غریب کے سر پر کہیں گرا
چھجا اڑا کہیں سے تو چھپر کہیں گرا　　دیوار سے اکھڑ کے کوئی در کہیں گرا
جو چیز صحن میں تھی وہ صحرا میں جا پڑی
اہلِ زمیں پہ کیسی یہ اُفتاد آ پڑی

"گنگا جی" کا پہلا بند ملاحظہ فرمائیے۔ چوتھے مصرع میں ثریا کو قطرات کے ساتھ کس عمدہ طریقے سے تشبیہہ دی گئی ہے ؎

جوش زن رحمت یزداں ہوئی دریا ہو کر　　بہ چلی عالمِ اجسام میں گنگا ہو کر
آئی ہے راہروِ عالمِ بالا ہو کر　　رہ گئے کچھ ترے قطرات ثریا ہو کر
عرش اور فرش ہوئے تجھ سے منور گنگا
مظہر نورِ ازل ہے تو سراسر گنگا

بانسری کی کوک کا جو سماں شاعر نے دکھایا ہے وہ کس قدر موثر ہے۔

لعلِ معجز نما سے بنسی　　اے لو! وہ شام نے لگا دی
ہر اک ترانہ دل رُبا ہے　　جنگل نغموں سے گونج اٹھا ہے
عالم طاری ہے بے خودی کا　　نغمہ ساری ہے بانسری کا
مرغ تصویر ہر پرندہ　　پا در زنجیر ہر چرندہ
سکتے میں کھڑے ہوئے ہیں آہو　　گویا کوئی کر گیا ہے جادو
اک جذبۂ بے خودی میں آ کے　　لہراتے ہیں سانپ پھن اُٹھا کے

محروم صاحب نے اپنی رفیقہ حیات کی دائمی مفارقت سے متاثر ہو کر جو نظمیں لکھی ہیں وہ دردمندوں کو بے چین کرنے کے لیے کافی ہیں۔ "اشکِ حسرت" کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی؟
چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی؟

اردو کا نوحہ ان کے دردمند دل کی پکار ہے۔ کس حسرت کے ساتھ کہتے ہیں ؎

دل شاہدِ اردو سے بہلتا تھا ہمارا	شادی و مسرت میں غم و رنج و محن میں
جب ہم کو مقدر نے دیا دیس نکالا	دم ہم نے لیا آن کے اردو کے وطن میں
ہم آئے تو اردو کی یہ حالت ہوئی جیسے	بن میں گُلِ پژمردہ ہو یا چاند گہن میں

پھر ایک دوسری جگہ اردو کی زبان سے فرماتے ہیں ؎

پا سکے انگریز پر قابو نہ مسلم لیگ پر
لے رہے ہیں مجھ سے تقسیمِ وطن کا انتقام

محروم صاحب نے بچوں اور لڑکوں کے لیے کافی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کا مجموعہ "بہارِ طفلی"، جونیئر ہائی اسکول کے مدرسوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ محروم صاحب کا یہ مجموعہ ہندی رسم الخط میں شائع ہونا چاہیے۔ محروم صاحب پہلے اردو کے شاعر ہیں جو بچوں کی نفسیات کے ماہر ہیں۔ نظم "ہمارا دیش" کے دو بند سنیے ؎

اونچے اونچے پربت اس کے	لہراتے ہیں جن پر جنگل
مور پپیہے اور کوئل سے	جنگل میں ہوتا ہے منگل

کیا خوب نظارا ہے
بھارت دیش ہمارا ہے

اس کی خاک سے ہو کر پیدا	ہم نے سُدھ بُدھ پائی ہے
کیوں نہ کریں گے اس کی سیوا	اپنی اس میں بھلائی ہے

اس کے سوا کیا چارہ ہے
بھارت دیش ہمارا ہے

محروم قوم و وطن کی محبت میں سرور جہاں آبادی اور چکبست کی طرح سرشار ہیں۔ ان کی قومی اور سیاسی نظموں میں

حب الوطنی کے صحیح جذبات کا جلوہ نظر آتا ہے۔ سرور جہاں آبادی اور چکبست کے بعد محروم پہلے قومی شاعر ہیں جن کے ایک ایک لفظ سے وطن پرستی کی جھلک نظر آتی ہے۔ "ہندوستان ہمارا" ملاحظہ فرمایئے ؎

گلشن اجڑ چلا ہے اے باغباں ہمارا — ہونے کو تنکے تنکے ہے آشیاں ہمارا
کس دشت میں الٰہی اب خاک چھانتے ہیں — بادِ بہار اپنی، آبِ رواں ہمارا
مت چھیڑ دل جلوں کو ایسا نہ ہو کہ تجھ کو — اے چرخ پھونک ڈالے سوزِ نہاں ہمارا
وہ دن بھی تھے کہ ہم تھے اور دھاک تھی ہماری — تھے بحر و بر ہمارے، تھا آسماں ہمارا
سر رفعتِ فلک کا جھکتا تھا اپنے آگے — نہ چرخ سے بھی اونچا تھا آستاں ہمارا
اب حال یہ ہوا ہے ہم نیم جاں پڑے ہیں — وہ اوجِ برتری میں رتبہ کہاں ہمارا
سالار تو اگر ہو اے اتفاق قومی — پائے کہیں تو رستہ یہ کارواں ہمارا
گو زیر دست ہیں ہم لیکن نہ پست ہیں ہم — اتنے کہ مٹ چکا ہو نام و نشاں ہمارا

ہندو ہیں یا مسلماں ہم اہلِ ہند ہیں سب
محروم مشترک ہے سود و زیاں ہمارا

نوحہ

دل شاہدِ اُردو سے بہلتا تھا ہمارا — شادی و مسرت میں غم و رنج و محن میں
جب ہم کو مقدر نے دیا دیس نکالا — دم ہم نے لیا آن کے اُردو کے وطن میں
محرومیٔ قسمت کوئی دیکھے تو ہماری — اک اور اضافہ ہوا صدماتِ کہن میں

ہم آئے تو اُردو کی یہ حالت ہوئی جیسے
بن میں گلِ پژمردہ ہو یا چاند گہن میں

پریم پال اشک

محروم کی شاعری میں طنز کا پہلو

طنز دنیائے ادب کی لطیف ترین صنف ہے۔ اس کی نزاکت میں دور رسی اور نکتہ سنجی کو دخل ہے۔ مزاح کی آڑ میں سماج کے رستے ہوئے ناسور پر نشتر زنی ایک طنز نگار ہی کرسکتا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ ظرافت کے پہلو میں بڑی سے بڑی اور خدا لگتی بات کہہ دینا طنز گو ہی کا شیوہ ہے۔ ناصح کی نصیحتیں جب کارگر نہیں ہوتیں تو طنز نگار کی کمان سے چھوٹا ہوا ایک تیر ہی جادو کا سا اثر کر جاتا ہے۔

اردو شاعری میں طنزیہ عناصر کا فقدان نہیں ہے۔ میر جعفر زٹلی سے اکبر تک اردو شاعری طنز گوئی سے بھرپور ہے۔ لیکن اس کے پہلو جدا گانہ رہے ہیں۔ میر جعفر زٹلی کے طنز میں مطلب براری کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ کسی نے کچھ دے دیا تو قصیدہ خوانی کر دی اور اگر انگوٹھا دکھایا تو ہجو۔ پھر ہجو بھی ایسی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

سودا نے اپنے طنز کے دامن کو اس طرح داغدار تو نہیں کیا لیکن اس میں ذاتیات کو دخل رہا ہے۔ اکبر کے طنز میں سیاسی شعبدے بازی ضرور تھی، مگر پختگی نے ان کے طنز کو بھرپور کر دیا۔ اقبال نے بھی طنزیہ شاعری کی۔ لیکن آٹے میں نمک کے برابر۔

پنجاب کی دھرتی نے جن سپوتوں کو جنم دیا ان میں منشی تلوک چند محروم بھی ہیں۔ اقبال کے بعد محروم ہی ایسے شاعر ہیں جنھیں پنجاب کی آبرو کہا جاسکتا ہے۔ ان کے ہاں بھی طنز کی پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں۔ اور یہی پھلجھڑیاں ان کے ادب ہی پر نہیں بلکہ پورے اردو سماج پر باغ و بہار کی سی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔

طنز نگار کا تیر اس وقت زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے کہ جب وہ اوروں کے ساتھ ساتھ خود پر بھی طنز کرتا چلا جائے اس طرح خود گریبان میں منہ ڈال لینے کے بعد اوروں کو آئینہ دکھانا آسان ہوجاتا ہے۔ طنز کا وار بھی مخفی نمبر پورا ہو سکتا ہے کہ جب طنز گو اپنے طنز سے خود کو بھی نہ بچا سکے۔ دیکھیے محروم اپنے بارے میں کیا فرماتے ہیں ؎

طفلی تھی وقف ناز و نعمت کے لیے
تھا عہدِ شباب خوابِ غفلت کے لیے

پیری ہوئی نذرِ ضعفِ پیری افسوس
رکھا تھا جسے میں نے ریاضت کے لیے

کچھ اشعار شاعر اور شاعری کے بھی سنئے۔

شاعر

شکوہ سنجی آج کرتے ہیں بھری محفل میں ہم
گرچہ ہیں دلدادہ تیرے نام کے اے شاعری

جب سنبھالا ہوش تو پایا اسے تیرا اسیر
دل پہ سو پھندے ہیں تیرے دام کے اے شاعری

تیری الفت نے ہمیں آخر نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے اے شاعری

تیری نسبت سے ہوئے ناکارہ ہم آوارہ ہم
ہو گئے مورد ہر اک الزام کے اے شاعری

شاعر

شکوہ تیرا بھی سنا، لیکن مجھے جو تجھ سے ہے
وہ شکایت ایک مطلع میں سنا دیتی ہوں میں

کیا مری زلفوں کے پھندوں میں الجھ کر رہ گیا
دل ترا دنیا کے دھندوں میں الجھ کر رہ گیا

اپنے بارے میں محروم مزید فرماتے ہیں۔ دیکھئے کیسی خود لگتی بات کہی ہے ؎

تعریفِ زلفِ یار میں کہتے ہیں ہم غزل
چوٹی کے شاعروں میں ہمارا شمار ہے

"چوٹی" کی لطافت محسوس کی آپ نے، یہی طنز دل و جگر کے پار ہو رہا ہے۔

طنز کا دوسرا اہم پہلو خلوص ہے۔ طنز نگار کے ہاں جب تک خلوص نہ ہوگا وہ اپنی بات پُر اثر طریقے سے کہہ ہی نہیں سکتا۔ دیکھئے محروم کے ہاں خلوص کا جذبہ کس طرح ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ آپ جو بات کہتے ہیں اس میں ٹیپ ٹاپ بناؤ سنگار بالکل نہیں ہوتا۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں سادگی اور پرکاری سے کہتے ہیں ؎

حاصل کتنا کمال انسان نے کیا
افلاک کو پائمال انساں نے کیا

یہ عقل ابھی نہیں آئی کہ کیوں
انساں کو تباہ حال انساں نے کیا

یزداں نے کئے، کبھی نہ شیطاں نے کئے
انساں نے کئے ہیں جو ستم انساں پر

اس مغربی تہذیب نے انساں کو کیسے نگلا ہے۔ محروم کی پر خلوص رباعیات کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے ؎

انساں نے درندوں کے چلن سیکھ لئے
اطوار رضائے اہرمن سیکھ لیے

اپنے علم و ہنر پر خوش ہے ناداں
بربادی دو جہاں کے فن سیکھ لیے

اڑتے دیکھا جو طائرِ پرّاں کو　　اڑنے کی امنگ لے اڑی انساں کو
گو لے برسا دئے زمیں پر اس نے　　پرواز نصیب جب ہوئی ناداں کو

یوں تو ظاہراً سبھی پرُخلوص ہوتے ہیں۔ لیکن ناصح کی جومٹی پلید ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کیوں کہ اس کے ہاں خلوص ظاہری ہے۔ باطنی نہیں۔ طنز نگار کے پاس مزاح کا تیر ایسا ہے، جو کبھی خطا نہیں جاتا۔ اسی مزاح کے پہلو میں وہ بڑی سے بڑی بات بے دریغ کہہ دیتا ہے ؎

ہر ایک ادا ہے حسن کی مصنوعی　　مصنوعی عتاب اور ہنسی مصنوعی
مصنوعی دوائیں جب مسیحا بھیجیں　　کیوں کر نہ ہو دردِ عاشقی مصنوعی

طنز گو کی سب سے اہم خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ آنکھ اور کان دونوں ہی کھول کر چلتا ہے۔ مطالعہ اور مشاہدہ دونوں ہی کرتا رہتا ہے۔ وہ دنیا کی زبوں حالی پر قہقہے نہیں لگاتا بلکہ ہلکی اور تیکھی سی ہنسی ہنس کر چل دیتا ہے ؎

لاہور میں لوگ آرٹ فرماتے ہیں　　دوشیزہ کو رقصِ ناز سکھلاتے ہیں
یہ آرٹ وہ ہے کہ جس پہ شرم و حیا　　غیرت سے زمین میں گڑے جاتے ہیں

جو آرٹ کے سرپرست کہلاتے ہیں　　ناموسِ وطن پہ کیوں غضب ڈھاتے ہیں
ہے کون رذیل ان کو گر کہئے شریف　　محفل میں جو لڑکیوں کو نچواتے ہیں

طنز نگار ادب برائے ادب کا کبھی قائل نہیں ہوتا۔ اس کا مسلک ادب برائے زندگی ہے وہ اسی کے لیے جیتا ہے اور اسی کے لیے مرتا ہے۔ مرحوم کا بھی یہی نصب العین ہے۔ ہر قوم پر وہ علم و عمل کا پیغام دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اربابِ خرد نے بات یہ مانی ہے　　غارت گرِ ہوش حسنِ نسوانی ہے
کیا گزرے گی تجھ پہ جب وہ ہو مائلِ رقص　　صورت جس کی سکوں میں طوفانی ہے

کل سرِ شام تھی ایک دوشیزہ　　سنما حال کی جانب را ہی
راہ میں ایک سہیلی جو ملی　　اس کو دینے لگی یوں آگاہی

نئی پکچر ہے نہایت دلکش　　قابلِ دید ہے، میرا ماہی
مرثیہ شرم وحیا کا تھا یہ　　یا مری فہم کی ہے کوتاہی

طنز نگار کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ نعرے بازی کا لبادہ اوڑھے۔ ڈھول پیٹے، خانے بنائے یا اور کسی قسم کے ہتھکنڈے اپنائے۔ اس کا شیوہ تو خدمتِ قوم اور سماج کی سیوا ہے۔ محروم بھی اس نظریے کے قائل ہیں۔

یہ ملک تھا پاک آتماؤں کا وطن　　یا دیویوں اور دیوتاؤں کا وطن
مغرب کی پیروی سے رفتہ رفتہ　　بنتا گیا خوبرو بلاؤں کا وطن

ہے دشمنِ پردہ دہر کی نیرنگی　　کیوں اہلِ ادب میں ہے یہ خانہ جنگی
سوسائٹی آمادۂ عریانی ہے　　کیا شکوہ جو تصویر بھی اترے ننگی

طنز نگار کے ہاں شعور کی کمی نہیں ہوتی۔ شعور ہی اس کا مولد و مسکن ہے۔ اور اس شعور کے سہارے اپنے طنز کا تیر چلاتے ہیں۔ ان کا سیاسی شعور بلا کا ہے۔ دیکھئے کس خوبی سے اپنے سیاسی شعور کا اظہار کرتے ہیں۔

قحط بنگال

(۱۹۴۳ء)

یہ قحط نہیں، قہر خدا ہے کوئی　　نیرنگِ مظالمِ قضا ہے کوئی
سرسبز ہیں کھیت منڈیاں بھرپور　　یہ قحط نہیں اور بلا ہے کوئی

اس طرح ایک اور طویل نظم "لٹل جون" محروم کے سیاسی شعور کی بہترین پیداوار ہے۔ اب اس سلسلے میں محروم کی نظم "امن کی دیوی" کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

امن کی دیوی کہتی ہے۔

بیوگی مجھ سے یتیمی مجھ سے ہے　　میرے سر لاکھوں جوانوں کا ہے خوں
مجھ سے ہے منسوب قتلِ ناروا　　مجھ سے ہے اقوامِ عالم کا جنوں

یہی نہیں بلکہ ایک اور نظم "ببیں تفاوتِ رہ" کے کچھ اشعار بھی اسی مسلک کے آئینہ دار ہیں۔

جو لوگ ہند میں آتے ہیں غیر ملکوں سے　　اور اس کو اپنا بناتے ہیں اُن کو ماوا

وطن سے اپنے وہ آئے ہیں گو پھٹے حالوں | بدل ہی جاتا ہے دو چار دن میں حال ان کا
وہ اپنے ملک میں ہر چند کفش دوز بھی ہوں | اڑاتے دلیلوں کا قیمچوں سے ہیں چمڑا
مگر جو ہند سے جاتے ہیں غیر ملکوں میں | برستے رہتے ہیں ان پر ہمیشہ تیرِ بلا

کہیں ہے داخلہ ہوٹل میں بند ہندی کا
کہ نام اس کا فرنگی نے رکھ دیا کالا

ایک اور نظم "پھر بھی لڑتے ہیں" کے دو بند ملاحظہ ہوں۔ یہ نظم جہاں محروم کے سیاسی شعور کو واضح کرتی ہے وہاں ان کے سماجی شعور کی بھی غمازی کرتی ہے۔

ایماں کا جزو امن ہے یہ جانتے بھی ہیں | ممنوع ہے فساد ابھی مانتے بھی ہیں
امن و اماں کی قدر کو پہچانتے بھی ہیں | یہ بات اپنے دل میں کبھی ٹھانتے بھی ہیں

اب "صلح مدعا" ہے مگر پھر بھی لڑتے ہیں

گتے نہیں کہ کوئی لڑائے تو ہم لڑیں | لاشیں ہماری کوچہ و بازار میں سڑیں
لڑنے سے باز آئیں جو نہی جوتیاں پڑیں | کچھ شرم ہو تو خاکِ حمیت میں ہم گڑیں

سب کچھ سمجھ لیا ہے مگر پھر بھی لڑتے ہیں

شیخ سعدی اور اوڈائر کا مناظرہ بھی قابل غور ہے۔ یہ بھی محروم کے سیاسی شعور کی ایک عمدہ مثال ہے۔ دیکھئے اوڈائر شیخ سعدی سے کیا کہتا ہے۔

تجھ کو پاتا کاش قیدِ جسم میں | پھر نصیحت کا چکھا دیتا مزا
خیر تجھ سے بھی سمجھ لوں گا کبھی | عالمِ ارواح میں جب آؤں گا
جو ہُوا پنجاب والوں سے سلوک | مستحق اس کے ہی تھے
ڈالتے تھے نیند میں میری خلل | کر کے جلسوں میں بہت آہ و بکا
رہنا بیدار کرتے تھے اُنھیں | چاہتا تھا میں کہ سو جائیں ذرا
ان کے ہی آرام کا طالب تھا میں | خواب بیداری سے ہے راحت فزا
حق طلب کرتے تھے یہ سرکار سے | چھاپ کر اخبار "حق" میں نے دیا
جنگ یورپ میں جو تھے جا کر لڑے | ان کو اسنادِ طلائی کیں عطا

اس طرح محروم کی ایک اور نظم "تصویر غلامی" بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ایک مثنوی ہے۔ نظم طویل ہے۔ لیکن محروم کے سیاسی شعور کی ایک زندہ و پائندہ مثال ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نشتر ہے جو فقط پیوست ہونا ہی جانتا ہے نکلنا نہیں۔ اور اب "بزرگانِ سلف اور ہم" میں فرماتے ہیں ؎

ہر چند اب نہ مے ہے نہ ساقی نہ جام ہے
سر میں بھرا مگر وہی سودائے خام ہے

محروم کا سیاسی شعور تو آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ اب ذرا چلتے چلتے سماجی شعور کی جھلک بھی دیکھئے۔ اس ضمن میں صرف ایک قابلِ رشک ہی نہیں بلکہ قابلِ فخر نظم "ضمیر" کے چند اشعار پر اکتفا کروں گا۔ کیوں کہ اس سے پہلے تمام اشعار محروم کے سماجی شعور پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

ضمیر

(مزاحیہ انداز میں)

بے شک یہ چیز ہے خطرناک — کر دیتی ہے دل کے حوصلے خاک
چوری جو کرو تو ~~سسکتی~~ کہتی ہے — جھوٹی قسموں پہ ٹوکتی ہے
ہمسائے سے آنکھ جب لڑائی — آنکھیں یہ وہیں دکھاتی آئی
شرما جانا اسی کا ہے کام — لیتی نہیں پہلو میں یہ آرام
ساتھ اس کے چلے تو کوئی کیونکر — ہے روکتی سنگِ راہ بن کر

سیاسی اور سماجی شعور کے ساتھ ساتھ ایک طنز گو میں بیباکی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ محروم کے ہاں یہ بے باکی بدرجہ اتم موجود ہے۔ "کمیونل ایوارڈ" نظم جو اس بے باکی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ ایک بند دیکھئے ؎

علم و کمال کا نہ لیاقت کا نام لے — محنت سے کام لے نہ صداقت سے کام لے
ذلت اٹھائے وہ جو شرافت کا نام لے — مطلوب نوکری ہے تو ملت کا نام لے

ہے دور دورہ آج کمیونل ایوارڈ کا
اس ملک میں ہے راج کمیونل ایوارڈ کا

سنگٹھن اور تنظیم کا عمل اور ردعمل دونوں ہی ملاحظہ فرمائیے۔ محروم نے کس بھولے بھالے انداز سے خدا لگتی بات کہی ہے ؎

سنگھٹن اُدھر سے ہو رہا ہے   تنظیم اِدھر سے ہو رہی ہے
بھارت ماتا غریب بے کس   اپنی قسمت کو رو رہی ہے

اس طرح کی ایک نہیں بلکہ انیک مثالیں آپ کو محروم کے ہاں ملیں گی۔ اور طنز کا ہر پہلو آپ کو اپنے اصلی روپ میں نظر آئے گا۔ محروم کی شاعری حرکت وحیات اور علم وعمل کی پیامبر ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی شاعری دراصل جاگنے اور جگانے کی شاعری ہے۔ سونے اور سلانے یا لذت اٹھانے کی نہیں۔

غزل

گو اس سے اضطراب میں ہے جانِ زندگی   پھر بھی یہ دردِ عشق سے ہے شایانِ زندگی
اچھا ہوا کہ موت نے مجھ کو مٹا دیا   میں داغِ ننگ تھا سرِ دامانِ زندگی
نغمے سمجھ رہا ہے انھیں ناسخن شناس   مجموعہ مرثیوں کا ہے دیوانِ زندگی
آہوئے تشنہ اور فریبِ سرابِ دشت   انسان اور عیش گریزانِ زندگی
پایا کہیں نہ گوہرِ مقصود کا نشاں   چھانی بہت ہے خاکِ بیابانِ زندگی
تسکینِ دل یہ جز غمِ الفت کہیں نہیں   ثابت ہوا کہ درد ہے درمانِ زندگی

محروم کس کے نوکِ قلم کا ہے شاہکار
افسانۂ فراق بہ عنوانِ زندگی

محروم

دلیپ بادل

محروم ——— ایک مبلّغ

"پنج آب" کو اس حقیقت پر بجا طور پر ناز ہے کہ اس نے ادب بھی دیا اور ادیب بھی، فن کار بھی۔ موضوع اور معیار بھی۔ اسی دھرتی کے مایۂ ناز شاعروں میں گاجراں والا کا ایک لالہ صحرائی بھی ہے، جو محروم کے نام سے گلزارِ اردو ادب کی زینت ہی نہیں بلکہ اس کا حسن لافانی اور وقار ابدی بھی ہے۔

زندگی ایک خطِ مستقیم نہیں بلکہ پہلو در پہلو اور پیچ در پیچ ایک گزرگاہ ہے۔ جہاں انسان قدم قدم پر حادثوں سے دوچار ہوتا ہے۔ حیات انسانی کی رنگا رنگیوں اور دنیا کی نیرنگیوں پر دسترس حاصل کرنے کے لیے وسیع تجربے اور انسانی نفسیات کے عمیق مشاہدے اور فنی صلاحیت کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ انسان کی زندگی ایک ساکت و جامد حالت اور کیفیت کے تابع نہیں۔ بلکہ ہر لحظہ و لمحہ مختلف حالات و رجحانات کے تحت بدلتی رہتی ہے۔ جس میں شادی و غم حسرت و یاس، وفاداری و بے مروتی، اپنوں کی محبتیں، دشمنوں کی گھاتیں، عزیزوں کی ہمدردیاں، احباب کی رخنہ اندازیاں نیک لوگوں کی صحبتیں، مفسدوں اور حاسدوں کی حماقتیں، حوصلہ اور شکست، افسردگی و کامرانی وغیرہ پیوست ہیں۔ بقول محروم ؎

منزلِ پیچ و تاب ہے دنیا

اردو شاعری کا دامن زیادہ تر "حسن و عشق" کی جولانیوں، ہجر و وصال کی قلبی وارداتوں اور جذباتی و جنسی معاملات سے لبریز ہے۔ البتہ اردو ادب میں طوفانوں کی تیزی اور بے مہری۔ تباہی اور غارت گری اور زرخیزی اور زندگی، حالی کے بعد آئی۔ نئے موضوعات کی شاہراہیں کھلیں۔ زندگی کی تلخیوں اور حقیقتوں کا احساس ہوا، شاعری کے رخ کو مفید اطراف میں موڑنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ چنانچہ آزاد نے غزل گوئی کے مختلف عنوانات پر نظم گوئی کی بنیاد ڈالی۔ جس میں حالی ان کے دست راست تھے۔ اسی اسکول اور نئے رجحانات نے اقبال سے نیا شوالہ، ترانہ، اکبر سے تغیر عظیم، اور غم ملت، سرور سے بھونرے کی بے قراری جیسی بلند پایہ نظمیں لکھوائیں اور اس طرح وطن کی محبت، مناظر فطرت، ماحول کی عکاسی، قومی اور سیاسی بیداری ایسے مضامین پر فکر سخن کی ابتدا ہوئی۔ اسی اسکول سے وابستہ محروم کی ذات گرامی ہے، چونکہ انسانی

زندگی پر ماحول اور تربیت کا گہرا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ اور محروم ابتدا ہی سے ایسے والدین کے زیر تربیت اور ایسے ماحول سے منسلک رہے جہاں "حسن وجمال" کی رعنائیوں کو قطعاً دخل نہ تھا بلکہ شاعری کے اعلیٰ ترین زاویوں اور گوشوں کو اپنانا ہی عینی و قلبی منصب تھا۔ اور یہی عنصر ان کی شاعری میں ان کو دوسرے شعراء سے ممیز کرتا ہے۔

محروم مبلغ ہی کیوں ہے؟ یہ ساغر و مینا، گل و بلبل، فراقِ یار، زلف کے پیچ و خم، ناز و انداز ایسے فرسودہ مضامین میں الجھ کر کیوں نہ رہ گیا۔ حسرت وغم، پند و نصائح، پاکیزگیٔ نفس، حب الوطنی، دین و دنیا، آدابِ معاشرت، نیک و بد کی تمیز ایسے مضامین ہی محروم کی شاعری میں کیوں رچ بس گئے؟ ان کے کلام کی آخر وہ کون سی خوبی ہے جس سے وہ اپنے قارئین سے خراجِ تحسین وصول کرتا ہے۔ محروم نے شاعری کے پردے میں دل کی بات مؤثر پیرایہ سے کیسے کہہ دی۔ یہ سب کچھ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم لمحہ بھر کے لیے محروم کی زندگی کا جائزہ لیں۔

۱۸۸۶ء میں محروم نے ایک عام دیہاتی گھرانے میں ایک فقیر طبع انسان کے ہاں جنم لیا۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ گاؤں سے گزرتی تھی جو ساون بھادوں میں گاؤں کو اپنی آغوش میں لے لیتی تھی اور گاؤں والوں کے لیے یہ حادثہ قدرتی امر ہو جاتا تھا۔ زندگی کا تمام تر حصہ تعلیم و تدریس میں گزرا۔ ملازمت اکثر پریشانیوں کا باعث رہی۔ خصوصاً ہیڈ ماسٹری کا نٹوں کا بستر — کلور کوٹ اسکول — منشی احمد سعید کا ایثار و خلوص — کانگریس کی تحریک آزادی — کلور کوٹ سے راولپنڈی کو ہجرت — کلیم، فطرت، مینا، اظہر حضرات کی صحبت — ۱۹۱۵ء میں اہلیہ محترمہ کی وفات ناگہانی — شکنتلا کی مفارقتِ دائمی — ۱۹۳۵ء میں ودیا کی خودکشی — چکبست اقبال، سرور جیسے رہنماؤں کی جدائی کا شدید قلق، بڑھاپے میں وطن مالوف کی تقسیم (۱۹۴۷ء) کا غم مستقل — انسانیت کا ننگا ناچ۔ غرض ان حادثات نے محروم کے دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالا کہ ان تاثرات کے گہرے اور نمایاں نقوش اخترِ ہند کو ہم اوج ثریا کر دے، بزم نو، لٹل جون، اشکِ خون، پھر بھی لڑتے ہیں، گھر سے نکل کے دیکھو، ترانۂ نو روز، ہندوستان ہمارا جلوۂ امید۔ یہ کس کے جلوے ہیں سارے، زمزمۂ توحید، خطا کس کی ہے؟، ترانۂ وحدت، بلبل کی فریاد، دل سے دو دو باتیں شمعِ سحر، نور جہاں کا مزار، کسی کے پھول، ناپائدار رشتے، سارس کا جوڑا، نومبر کی ایک صبح، وغیرہ میں اجاگر ہوتے ہیں۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محروم ایک مبلغ ہے اور اس کی شاعری میں وہ تمام خصوصیات نیر منور کی طرح جلوہ گر ہیں جو ایک مبلغ میں ہونی لازم ہیں۔ آئیے ہم ان عناصر کا جائزہ لیں جن میں محروم کی شخصیت ایک مبلغ کے روپ میں نظر آتی ہے۔

طنز تبلیغ کا ایک اہم جزو ہے۔ جب تک مبلغ کے ہاں تیر و نشتر نہ ہوں گے وہ ایک کامیاب مبلغ ہو ہی نہیں

سکتا. محروم کے ہاں یہ عنصر دیکھئے کس فراوانی سے موجود ہے. نمونہ کے طور پر ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے ؎

حاصل کتنا کمال انساں نے کیا ۔۔۔ افلاک کو پائمال انساں نے کیا
یہ عقل مگر ابھی نہیں آئی کہ کیوں ۔۔۔ انساں کو تباہ حال انساں نے کیا

تبلیغ کا ایک یہ بھی جزو ہے کہ مبلغ صاف گو اور بے باک ہو. وہ اپنی بات بلا خوفِ تردید و رو رعایت کے کہدے. محروم کے ہاں صاف گوئی اور بے باکی کے جذبات بدرجۂ اتم موجود ہیں. اس کا ثبوت "پھر بھی لڑتے ہیں" کے ایک بند میں دیکھئے.

کہتے نہیں کہ کوئی لڑائے تو ہم لڑیں ۔۔۔ لاشیں ہماری کوچہ و بازار میں سڑیں
لڑنے سے باز آئیں جو نہی جوتیاں پڑیں ۔۔۔ کچھ عزم ہو تو خاکِ محبت میں ہم گڑیں
سب کچھ سمجھ لیا ہے مگر پھر بھی لڑتے ہیں

محروم کے ہاں خلوص کا جذبہ ایسا پرکشش اور جاذب روح ہے جو اپنی بات کو پوری کامیابی کے ساتھ ادا کر دیتا ہے 'سالِ نو مبارک' کی نظم ملاحظہ فرمائیے ؎

مبارک سال نو اے نونہالانِ وطن تم کو ۔۔۔ خدا دل کی امنگوں میں کرے ذوقِ عمل پیدا
پڑھیں پروان ننھے ننھے پودے آرزؤں کے ۔۔۔ ہوں ان میں نیکیوں کے خوبصورت پھول پھل پیدا
مبارک اے عزیزانِ وطن ہو سال نو تم کو ۔۔۔ تمہارے واسطے یہ سال فرخ فال ہو جائے
جو کرنا ہے وہ کر دیکھے ارادے باندھ کر دل میں ۔۔۔ کہ حسرت رہ نہ جائے ختم جب یہ سال ہو جائے

ایک مبلغ مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوتا. اس کے ہاں نا امیدی میں بھی امید کی کرن چمکتی دکھتی نظر آتی ہے. محروم بھی اس ہندوستان اور ہندوستانی قوم کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں. اس کا اظہار ۲۶ جنوری میں یوں کرتے ہیں ؎

آزاد ہو گیا جب ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ ہے سود کے برابر ہر اک زیاں ہمارا
منزل پہ آن پہنچا جب کارواں ہمارا ۔۔۔ کیوں ہو غبارِ منزل خاطر نشاں ہمارا

ایوانِ خسروی کی تعمیرِ نو مبارک ۔۔۔ آئینِ زندگی کی تدبیرِ نو مبارک
ہر ذرۂ وطن کو تنویرِ نو مبارک ۔۔۔ بھارت کے ہر بشر کو توقیرِ نو مبارک

مبلغ کے ہاں ایک عام انسان کی طرح جذبۂ غم بھی ہوتا ہے۔ یہ جذبہ کبھی تو غمِ جاناں کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور کبھی غمِ دوراں کی صورت میں۔ لیکن یہ دونوں جذبات فن کار کے دل سے نکل کر جونہی صفحۂ قرطاس پر بکھرتے ہیں تو قاری کا دل بھی بے اختیارانہ طور پر اُمڈ پڑتا ہے۔ محروم کے ہاں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ جس کا اثر ان کی تبلیغی شاعری پر بے پناہ پڑتا ہے۔

غمِ جاناں کا اظہار کس موثر انداز سے کیا ہے۔ آیئے "تمنائے محروم" کے چند اشعار میں ملاحظہ فرمایئے۔

کاش مل جائیں کہیں اور میں دکھاؤں چیر کر — سینہ اپنا جس میں طوفاں حسرت و ارماں کے ہیں
داغ گن گن کر دکھاؤں پھر دلِ بے تاب کے — یعنی وہ سارے نشاں جو صدمۂ ہجراں کے ہیں
دے اگر توفیق ہمت وہ بھی کر دوں آشکار — آہ! جگر کے دل پہ جو تیغِ غمِ پنہاں کے ہیں
پھر کروں میں گوہرِ اشکِ رواں ان پر نثار — جس قدر باقی صدف میں دیدۂ گریاں کے ہیں

غمِ دوراں کا کس شدت سے اظہار "بھارت ماتا کیوں روتی ہے" میں کیا گیا ہے۔

نہ رہی اپنوں میں کچھ بوئے حمیت باقی — نہ پرایوں میں ہیں آثارِ مروت باقی
نہ ہے دولت نہ ہے شوکت نہ ہے عزت باقی — رہ گئی دہر میں اک خواری و ذلت باقی

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا

مبلغ کا دل آئینہ کی طرح ہوتا ہے۔ اس کا ظاہر و باطن دونوں یکساں ہوتے ہیں۔ اگر دل میں نفرت ہو تو اُس کا اظہار بھی نفرت سے ہوگا اور اگر دل میں کسی کے تئیں محبت ہے تو وہ بھی پاکیزہ ہوگی۔ محروم اسی پاکیزگیٔ نفس کے قائل ہیں ان کا دل بھی آئینہ کی طرح صاف ہے۔ اس کی مثال "جھوٹ بڑا پاپ ہے" میں ملاحظہ فرمایئے۔

جھوٹ نہ بولو کبھی — جب بھی کہو سچ کہو
سچ سے محبت کرو — جھوٹ سے بچتے رہو

جھوٹ بڑا پاپ ہے۔

سچ ہے اجالا اگر — جھوٹ اندھیرا ہے گھپ
سچ نہ اگر کہہ سکو — جھوٹ سے اچھی ہے چپ

جھوٹ بڑا پاپ ہے

قوتِ علم و عمل تبلیغی شاعری کی روح ہے۔ محروم کے ہاں اس جذبے کا قطعاً فقدان نہیں بلکہ یہ قوت ان کے

کلام میں پورے طور سے جاری و ساری ہے۔ اس ضمن میں ذیل کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

راحت آزار تن ہے محنت کے بغیر — تن روح پہ بار ہے طہارت کے بغیر
تسکین نہیں روح کی عبادت کے بغیر — اک وہم عبادت ہے ریاضت کے بغیر

اس مختصر سے جائزے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محروم کی شاعری فقط خشک تبلیغی شاعری ہی نہیں بلکہ علم و عمل اور صحت مند رجحانات کے ساتھ ساتھ اپنے اندر بے پناہ شعریت اور تاثیر بھی رکھتی ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جو محروم کو ان کے ہم عصر شاعروں میں ممتاز کر دیتی ہے۔

رباعیات

ہر راہ میں ہے راہ نما نام ترا — ہر آہ میں ہے عقدہ کشا نام ترا
تسکین میں ترا خیال تسکیں افروز — اندوہ میں اندوہ ربا نام ترا

دارائے زمیں ہو یا فلک رس انساں — غرق عصیاں ہو یا مقدس انساں
محوِ غفلت ہو یا چو کس انساں — تقدیر کے سامنے ہے بے بس انساں

سب جانتے ہیں کہ بے بقا ہے دنیا — سب مانتے ہیں کہ بے وفا ہے دنیا
ترک دنیا کے مدعیوں میں بھی — اکثر ہیں کہ جن کا مدعا ہے دنیا

محروم

مسز ریاست خانم

کاروانِ وطن

تلوک چند محروم کی قومی اور وطنی نظموں کا مجموعہ "کاروان وطن" مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں محروم کی تقریباً دو سو نظمیں شامل ہیں جو کم و بیش چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ محروم نے اپنی شاعری کے اس مجموعہ کا انتساب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے نام کیا ہے۔ اس سے قبل محروم کے کلام کے دو اور مجموعے "گنجِ معانی" اور "رباعیات محروم" شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعۂ کلام دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ کا عنوان "فریادِ جرس" ہے۔ جس میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کی نظمیں شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں جس کا عنوان "منزل" ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کا کلام ہے

تلوک چند محروم اردو کے بہت پرانے اور جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا آغاز انیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہندوستان کی قومی تحریک کا سورج طلوع ہو چکا تھا اور اس کی روشنی ہندوستان کے پڑھے لکھے باشعور لوگوں کے دلوں میں تمازت و حرارت پیدا کر رہی تھی۔ حالی اور آزاد نے اردو شاعری کو جس نئی وسعت و پہنائی سے روشناس کیا تھا اس کی بدولت گویا نئے لکھنے والوں اور نئے شاعروں کو ایک نیا گنجِ مضامین و معانی ہاتھ لگ گیا تھا۔ حب وطن کے جذبات سے سرشار ہو کر انیسویں صدی کے ربع اول میں جن نو وارد شاعروں نے اردو شعر و ادب میں ایک نئی اور کشادہ شاہراہ نکالی تلوک چند محروم کا شمار بلاشبہ اس شاہراہ کے رہروانِ اول میں کیا جاتا ہے۔

ان کے کلام کو پڑھ کر جو گلزارِ شاعری کے رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ ہے کون کہہ سکتا ہے کہ منشی تلوک چند محروم ایک ایسے مقام کے رہنے والے ہیں جسے اہل پنجاب بھی ایک گوشۂ دور افتادہ سمجھتے ہیں۔ ان کو زبان پر ایسی قدرت اور ان کے بیان میں ایسی صفائی ہے کہ مدعیانِ زبان میں سے بھی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ کلام محروم کا مطالعہ

...ں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ محروم نے کیا کیا لکھا ہے بلکہ یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس نے کیا نہیں رہ گیا جس پر طبع آزمائی نہیں کی گئی۔ کاروان وطن کی نظموں کی طویل فہرست پر نظر ڈالئے تو ایسا ...ستان کی پچھلی پچاس ساٹھ سال کی سیاسی اور قومی زندگی کے سارے اہم عنوانات ایک

ایک کرکے ہماری نگاہوں کے سامنے نمودار ہو رہے ہیں۔

محروم کی شاعری میں نہ عشق و محبت کی داستان ہیں نہ فلسفہ و فکر کی موشگافیاں۔ ان کا حساس دل قوم و وطن کے دُکھ درد سے معمور ہے۔ اور ان کی تمام نظمیں اسی سوز و دردمندی کے بے تکلف و بے ساختہ اظہار کے متحرک مرقعے ہیں اگر ہندوستان کی پچھلے پچاس سال کی قومی اور سیاسی تاریخ ناپید ہو جائے اور محروم کا کلام باقی رہ جائے تو بلاشبہ ایک ہوشیار مورخ اسی کلام کی روشنی میں ہندوستان کی نصف صدی کے ذہنی، سماجی اور سیاسی نشو و نما کی تاریخ مرتب کر سکتا ہے۔

"کاروان وطن" میں آزادیٔ ہند کے قافلے کا ہر نقشِ قدم اتنا واضح اور نمایاں ہے کہ اس کے توسط سے ہم اپنی جنگ آزادی کے ہر موڑ اور ہر مرحلہ کا سراغ آسانی کے ساتھ چلا سکتے ہیں۔

محروم کی شاعری میں آپ کو نہ تو قدیم اردو شاعری کا کلاسیکی رچاؤ ملے گا نہ جدید اردو نظم کا گمبھیر بانکپن۔ اس کے باوجود محروم کی نظمیں اپنی سادگی اور خلوص مقصد کے اعتبار سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی تلوک چند محروم ایک پرگو اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق محروم کا رنگِ سخن اپنے ہم عصر شعراء میں سب سے مختلف ہے۔ اقبال، اکبر، اسمٰعیل میرٹھی اور چکبست کے ساتھ ساتھ محروم کی آواز بھی ہندوستان کی فضاؤں میں گونجی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ آواز دوسری سب آوازوں سے الگ پہچانی جانے لگی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حالیؔ کے راستہ پر چلنے میں سب سے زیادہ کامیابی محروم نے ہی حاصل کی۔ لیکن محروم کے ہاں مرثیہ و ماتم کا انداز نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری میں اتحاد و امید کی روشنی ہے اور مستقبل کا ایک تابناک تصور محروم کے کلام کا رقبہ بہت بڑا ہے وہ قومیت اور وطنیت کی حدوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں اور بین الاقوامیت اور عالمگیر انسانی برادری کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔

محروم کی شاعری میں فکر و اظہار کی فن کارانہ جمال آفرینیاں کم ہیں۔ لیکن ان کی سادگی ان کا خلوص اور مقصد سچائی نے ان کے کلام کو جواہر نگار بنا دیا ہے۔ ان کی شاعری زنجیر غلامی کے حلقوں کو توڑنے والی اور ابروئے ہند کے تاج کی حفاظت کرنے والی شاعری ہے۔ "کاروان وطن" کے دوسرے حصہ کی نظموں میں جو آزادی کے بعد سے آج تک کے مختلف واقعات اور تعمیر و ترقی کے مختلف عنوانات پر لکھی گئی ہیں وہ جوش و خروش اور تندی و گرمی نہیں ہے جو اس مجموعہ کے پہلے حصہ کی نظموں میں پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھانسی کی رسیتوں اور جلاد کی نگاہوں سے برسر پیکار مسافر اپنے کٹھن اور صبر آزما سفر کو کامیابی کے ساتھ طے کر کے اپنی منزل سے ہم کنار ہو گیا ہے۔

اور اب اس کے دل میں آسودگی کے ساتھ ساتھ تھکاوٹ کا بھی بڑا شدید احساس ہے۔

عبارت مختصر! تلوک چند محروم کی قومی اور سیاسی نظموں کا یہ مجموعہ سال رواں کا ایک ایسا قیمتی ادبی تحفہ ہے جس پر اردو زبان جتنا فخر کرے کم ہے۔

غزلیات

سرورِ عاشقی بعد فنا بھی مونسِ جاں ہے — کہ صحرا کے بگولوں میں غبارِ قیس رقصاں ہے

یہ حیرت خانہ دنیا طلسم حسن پنہاں ہے — وہی کچھ مطمئن اس میں نظر آیا جو حیراں ہے

چراغِ زندگی روشن سرِ راہ بیاباں ہے — ہوائے دہر کا ہر اک جھونکا دشمنِ جاں ہے

چمن اندر چمن حسن جہاں افروز ہے تیرا

مری منزل مرے آگے بیاباں در بیاباں ہے

زلف تو نہیں، دل ہے، یہ اگر پریشاں ہے — کیوں کسی کی نظروں میں، دل لگی کا ساماں ہے

بزمِ زندگی میں ہے دل بھی ایک افسانہ — پاس خاتمہ جس کا، شوق جس کا عنواں ہے

درد بھی ہے جیتے جی، آرزوئے درماں بھی — دیکھنا کہ بعد اس کے، درد ہے نہ درماں ہے

اہلِ دیں تجھے کافر مانتے ہیں اے محروم

بت پرست کہتے ہیں، یہ کوئی مسلماں ہے

محروم

جگن ناتھ آزاد

میرے والد کا مزاحیہ کلام

"نقوش" کے شخصیات نمبر میں والد محترم کے متعلق مقالہ لکھتے وقت میں نے ان کی فی البدیہہ شاعری کا ذکر کیا تھا اس سلسلے میں ان کا مندرجہ ذیل مزاحیہ قطعہ بھی درج کیا گیا تھا۔

دفتر جو بالاخانے[1] پہ دیکھا حفیظ کا　　　محروم سچ تو یہ ہے کہ دل شاد ہو گیا
رونق ہوئی انار کلی کی چہار چند　　　بازار سوز و ساز سے آباد ہو گیا
جن منزلوں سے حسن کبھی جلوہ ریز تھا
اب عشق ان میں مائلِ فریاد ہو گیا

لیکن ان کی شاعری کے اس پہلو کا بالتفصیل ذکر اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ اس مقالے میں موضوع کے پیشِ نظر شاعری کے ذکر کی خواہ وہ سنجیدہ ہو خواہ مزاحیہ، گنجائش کم تھی۔

حفیظ صاحب کے بارے میں والد نے مزاحیہ انداز میں اور بھی تھوڑا بہت کہا ہے۔ جب سردار عبدالرب نشتر مرحوم پنجاب کے گورنر مقرر ہوئے تو آپ نے یہ رباعی کہی۔

حسب حالات برتری دینی تھی!　　　نشتر صاحب کو سرجری دینی تھی
پنجاب میں تھا حفیظ کا حق فائق　　　شاعر کو اگر گورنری دینی تھی

انجمن حمایت اسلام راولپنڈی کے ایک جلسے میں جو غالباً ۱۹۳۵ء میں منعقد ہوا تھا حفیظ صاحب نے نظم پڑھنے کے بعد جب چندے کی اپیل کی تو والد نے یہ شعر پڑھا۔

حفیظ کہتے تھے احباب جس کو بندہ نواز
بنا ہے گردشِ دوراں سے اب وہ چندہ نواز

---

[1] آخری شعر میں اس زمانے کی طرف اشارہ ہے جب انار کلی بازار کے بالاخانے طوائفوں کے ڈیرے تھے۔

حفیظ جالندھری کے علاوہ جوش ملیح آبادی کا ذکر آپ کے مزاحیہ کلام میں اکثر آیا ہے۔ جوش صاحب ابھی دہلی ہی میں تھے کہ دہلی میں اور ہندوستان کے بعض دوسرے حصوں میں بندشِ شراب کے احکام پر سختی سے عمل شروع ہو گیا۔ آپ نے اس زمانے میں "پیش گوئی" کے عنوان سے مندرجہ ذیل قطعہ کہا۔ جو مدت تک دہلی کی ادبی محفلوں میں دلچسپی کا باعث بنا رہا۔

ہاتھ آئے گی نہ گھر میں اور نہ ہوٹل میں شراب — جب نہ مے خانہ کوئی بازار میں رہ جائے گا
ذکرِ مے بھی رہ نہ جائے گا کسی محفل میں پھر — رہ گیا تو جوش کے اشعار میں رہ جائے گا

بعد اس کے جوش کے اشعار کی تاویل بھی — اس طرح ہو گی یہ ہے ذکرِ شرابِ معرفت
جوش کہلائے گا صوفی اور ہر دیوانِ جوش — صوفیوں کی بزم میں ہو گا کتابِ معرفت

ایک دفعہ دہلی کے قریب سونی پت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ دہلی کے بعض شعرا جن میں حضرت جوش اور والد بھی شریک تھے۔ شرکت مشاعرہ کے لیے سونی پت پہنچے۔ سونی پت میں شراب نوشی ممنوع تھی۔ جب مشاعرے میں والد کے کلام پڑھنے کی باری آئی تو انھوں نے ایک فی البدیہہ رباعی کہی

جب آئے جناب جوش سونی پت میں — برپا ہوا اک خروش سونی پت میں
سن کر اڑے ان کے ہوش سونی پت میں — ممنوع ہے نائے و نوش سونی پت میں

لیکن اس امتناعِ شراب نوشی کے باوجود جوش صاحب کو کہیں سے شراب حاصل ہو گئی تھی اور وہ شغل نائے و نوش فرما کر ہی مشاعرے میں آئے تھے۔ والد کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت جوش نے برجستہ کہا۔

کیوں کر اڑیں ان کے ہوش سونی پت میں
کرتے ہوں جو نائے و نوش سونی پت میں

شراب کے موضوع پر ایک اور رباعی بھی سن لیجیے۔

ہم کب سے ہیں تشنہ کامی ساقی — کب تک دورِ بد انتظامی ساقی
یہ بخل حرام چیز دینے میں نہیں — تو بھی ہے کوئی بڑا حرامی ساقی

جوش صاحب کا خدا کی ہستی کے متعلق جو نظریہ ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ جوش صاحب اس موضوع پر گھنٹوں بحث کرتے ہیں اور طرح طرح کی دلیلوں سے خدا کے نہ ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ والد نے

جوش صاحب کے "انکار" کو اس قطعے میں نظم کیا ہے۔

کہا جوش صاحب سے اک روز میں نے | مدلل جواب اس کا دیجے خدارا
خدا سے تمہیں اس قدر بیر کیوں ہے | کہا مسکرا کر "خدا واسطے کا"

اپریل ۱۹۵۵ء میں جوش صاحب کے زیر انتظام آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بوڑھے شعراء کا مشاعرہ نشر ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں ساٹھ سال سے اوپر کے شعراء مدعو کئے گئے تھے۔ والد بھی ان شعرا میں شامل تھے۔ انھوں نے جوش صاحب سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

ہم کو بوڑھے شاعروں میں جس نے شامل کر دیا | اے خدا اس پر بڑھاپا کل کا آتا آج آئے
دیکھتے ہی وہ اسے تعظیم دے، بابا کہے | جب کسی ناظورہ ناز آفریں کے پاس جائے

زمانہ ہوا جوش صاحب نے کشمیر جاکر یہ رباعی کہی

ممنوع طرب سے لطفِ پیہم لینے | عصیاں کے شجر کی چھاؤں میں دم لینے
آواز دو کاشمیر آ پہنچا جوش | اللہ سے انتقامِ آدم لینے

والد نے اس کے جواب میں یہ کہا تھا۔

عصیاں کے شجر سے کام لینے والے | کشمیر میں لطف جام لینے والے
اللہ کی لاٹھی میں نہیں ہے آواز | اللہ سے انتقام لینے والے

ایک مدت تک حضرت جوش اور جناب گوپی ناتھ امن کے تعلقات بہت دوستانہ رہے۔ لیکن بعد میں کسی بات پر شکر رنجی پیدا ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں حضرات کو ایک دوسرے کے خلاف اخبارات میں مضامین لکھنے پڑے۔ یہ مضامین جب والد کی نظر سے گزرے تو انھوں نے یہ قطعہ موزوں کیا۔

امن سے طبعِ مردِ امن پسند | کوئی بتلائے بھڑ گئی کیوں کر
جوش صاحب تھے امن کے عاشق | امن سے ان کی پھر گئی کیوں کر

۱۹۵۵ء کے آخر میں جوش صاحب ہندوستان کو خیر باد کہہ کے پاکستان میں اقامت گزیں ہوئے۔ ان کے ترکِ وطن پر طرح طرح کی تبصرہ آرائیاں ہوئیں۔ مخالف بھی موافق بھی۔ جو جس نے چاہا لکھا، جو جس نے چاہا کہا۔ والد نے اس انتقال مکانی پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا۔

جوش صاحب بھی ہوئے آج سے پاکستانی | اب وہ لاہور و کراچی میں غزل خواں ہوں گے

ان کے جانے پہ ہیں مغموم اِدھر کے احباب — اس طرف کے جو ادب دوست ہیں شاداں ہوں گے
سکتہ ہو جائے گا گنگ اور جمن پر طاری — راوی و سندھ میں برپا کئی طوفاں ہوں گے
عقل و دانش پہ انھیں ناز رہا ہے اب تک — اس نئے مرحلے پر صاحبِ ایماں ہوں گے
کفر و الحاد کے دعوے نہ رہیں گے باقی — مائلِ پیروئ سنت، و قرآں ہوں گے
محفلِ وعظ ملے گی عوضِ مے خانہ — صوم و سجادہ و تسبیح کے ساماں ہوں گے
مقطعِ مومنِ مرحوم بہ تحریف خفیف — ہم سنائیں گے انھیں اور وہ خنداں ہوں گے

عمر ساری، تو کٹی عشقِ بتاں میں حضرت
"آخری دَور میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

حضرت نوح ناروی نے ایک رباعی میں "الٹی جمنا بہانے آیا ہوں میں" یا اسی قبیل کا کوئی مصرع کہا تھا۔ اس پر یہ رباعی ہوئی۔

طوفانِ سخن اٹھانے والا آیا — اعجاز نیا دکھانے والا آیا
دلّی والو چلو تماشا دیکھیں — الٹی جمنا بہانے والا آیا

تقسیمِ ہند کے بعد والد راوی سے دہلی آ گئے، تو انھیں حاجی لق لق کا ایک خط موصول ہوا۔ اس خط کے جواب میں آپ نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی۔

کیا لینا اب وطن سے اور کیا دینا — یاد اس کی ہے اپنے دل کو تڑپا دینا
لاہور سے جب تم اے کلنگو گزرو — لق لق کو مرا سلام پہنچا دینا

حاجی لق لق نے "زمیندار" کے مزاحیہ کالموں میں ہندو شعراء کی ہجرت پر "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے کچھ شعر لکھے، جس میں والد کا اور میرا نام بھی تھا۔ اس پر یہ قطعہ لق لق صاحب کو بھیجا گیا جو زمیندار میں لق لق صاحب کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔

لقلقا خوش رکھے خدا تجھ کو — پاک لوگوں کے درمیاں ہی سہی
شکر ہے یاد تو کیا ہم کو — از رہِ یادِ رفتگاں ہی سہی

(لق لق صاحب کا نوٹ یہ تھا۔
"پاک لوگوں کے درمیاں" خوب کہی ع

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر)

تقسیمِ ہند کے بعد جب ہم لوگ... دہلی آئے تو لاکھوں مہاجرین کی طرح ہمارا عالم بھی بڑا کس مپرسی کا تھا۔ نہ مکان تھا نہ سامان۔ ایک کرم فرما کی عنایت سے ذرا سی جگہ سر چھپانے کو مل گئی تھی۔ اس حالت میں لکھنے پڑھنے کے لیے فراغت اور اطمینان کہاں سے ملتا۔ آپ سے ایک رسالے کے لیے نظم کی فرمائش کی گئی یہ تین شعر لکھ کر آپ نے بھیج دیے۔

پڑھنے کو کتابیں ہیں نہ لکھنے کا ہے ساماں　　کرسی ہے نہ ہے میز نہ کاغذ نہ قلم داں

ڈیوڑھی میں پڑے رہتے ہیں ہم صورت درباں　　یا جیسے کوئی گاؤں سے آیا ہوا مہماں

پرواز سے معذور ہے طبعِ سخن آرا

جیسے کوئی پر بستہ پرندہ ہو بچارا

اسی زمانے میں ہندوستان کے آخری انگریز گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان سے رخصت ہوئے۔ آپ نے ان کا الوداعی ذکر ان الفاظ میں کیا۔

سایہ فگن جو راہ نشینوں کے سر پہ تھے　　طوفانِ ابر و باد میں وہ ٹاٹ بھی گئے

گھر گھاٹ، ٹاٹ کھاٹ کا مرحوم ذکر کیا　　اس انقلاب میں تو بڑے لاٹ بھی گئے

تقسیم ہند، سیاست سے قطع نظر، ہندوستان اور پاکستان کے شہریوں کے لیے نئے نئے مسائل لائی۔ اہل دہلی کو بھی ان مسائل میں سے اکثر کا سامنا کرنا پڑا۔ اہلِ پنجاب اور اہلِ دہلی کے میل جول سے جو نئی زبان پیدا ہوئی اس کی طرف اس قطعے میں اشارہ کیا ہے۔

بو کلورین کی ہے پانی میں　　دودھ خالص یہاں نہ گھی خالص

دلی نازاں تھی خالص اردو پر　　وہ بھی لیکن نہ رہ سکی خالص

ڈاکٹر متھرا داس لاہور کے ماہر امراضِ چشم تھے۔ آج کل آپ دہلی میں ہیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ فن طبیب میں ماہر ہونے کے علاوہ آپ مریضوں سے جس خوش اسلوبی سے پیش آتے ہیں وہ بھی زباں زدِ خاص و عام ہے۔ اپنے مرضِ چشم کے سلسلے میں والد کچھ مدت ان کے زیر علاج رہے۔ علاج کے بعد یہ قطعہ ان کی نذر کیا۔

اپنی آنکھوں پر بٹھاتے ہیں وہ متھرا داس کو　　ہند میں جتنے علاجِ چشم کے ماہر ہیں آج

ہند کیا سارا جہاں ہے ان کے فن کا معترف　　یورپ و امریکہ سے پایا ہے تحسیں کا خراج

دیکھئے ان کی مروت۔ لوگ انھیں آنکھیں دکھائیں

اور یہ دل سے کریں ان کے عوارض کا علاج

ایک زمانے میں پنجاب میں زمیندار اور غیر زمیندار کا جھگڑا پیدا ہوا تھا۔ وہ اخبارات جو زمیندار کی حمایت میں لکھتے تھے، بالعموم "زمیندار" کو "بے چارا زمیندار" لکھتے تھے۔ اس موضوع پر والد نے ایک نظم کہی جس کا ایک بند یہ ہے۔

کرتے ہیں زمیندار سے جب اس کا اظہار — بے چارہ اسے لکھتے ہیں پنجاب کے اخبار

جلسہ ہو کہ بازار ہو، دفتر ہو کہ دربار — تحریر میں تقریر میں بے چارہ کی تکرار

موجود مویشی بھی ہیں چارے کے بھی انبار

پھر بھی یہ زمیندار ہے بے چارہ زمیندار

ایک رباعی "پیری اور عبادت" کے عنوان سے سنئے۔

جو نشۂ شباب میں چڑھا کرتے ہیں — تا آخرِ عمر وہ رہا کرتے ہیں

خدشہ ہے بتوں کا دل میں اب تک باقی — پیری میں جو ہم خدا خدا کرتے ہیں

پنڈت ٹھاکر دت شرما موجد "امرت دھارا" کے نام سے قارئین بخوبی واقف ہوں گے۔ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل ریلوے روڈ لاہور پر آپ کا کارخانہ تھا، اور ان کی ایجاد کی مناسبت سے ان کی بلڈنگ کا نام امرت دھارا بلڈنگ، سڑک کا نام امرت دھارا اسٹریٹ اور پریس کا نام امرت دھارا پریس تھا۔ اس بلڈنگ میں جو ڈاک خانہ تھا وہ امرت دھارا بلڈنگ ڈاک خانہ کہلاتا تھا۔ امرت دھارا کی بدولت پنڈت ٹھاکر دت نے بہت نام اور بہت روپیہ پیدا کیا اس مشہور عالم دوا کے علاوہ بھی آپ نے کئی دوائیں ایجاد کیں۔ ان میں ایک دوا "اکسیر" کہلاتی تھی۔ ہر سال ۱۲ مارچ کو یہ تمام ادویہ رعایتی نرخ پر ملتی تھیں۔ اسی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے والد نے مذکورہ دوا "اکسیر" منگوائی۔ ڈبیہ کھولی تو دوا میں کیڑے چلتے پھرتے نظر آئے۔ آپ نے مندرجہ ذیل اشعار میں پنڈت ٹھاکر دت کو دوا کی رسید بھیجی۔

نازشِ روزگار ٹھاکر دت! — ملک بھر میں ہیں صاحبِ توقیر

خوب دھارا بہائی امرت کی — جانتے ہیں اسے صغیر و کبیر

بارھویں مارچ کی رعایت پر — میں نے منگوائی ان سے اک اکسیر

کھولی ڈبیا تو تھے دوائی میں — ناچتے پھرتے کرمہائے کثیر
میری حیرت کی انتہا نہ رہی — بن گیا مثلِ پیکرِ تصویر
میرے اک دوست نے جو یہ دیکھا — ہو گیا یوں وہ مائلِ تقریر
اتنی حیرت جناب کو کیوں ہے — کارخانے کی اس میں کیا تقصیر
معجزہ ہے بشر کی حکمت کا — تا بہ تقدیر پہنچی ہے تدبیر

کیوں نہ جاندار اس میں ہو پیدا
خالقِ زندگی ہے یہ اکسیر

غزل

اسیرِ حلقۂ گیسوئے خوباں ہو نہیں سکتا — وہ دل، تُو جس کو تسکیں دے پریشاں ہو نہیں سکتا
تری قدرت سے ہوتا ہے، تری حکمت سے ہوتا ہے — کوئی پتھر کہیں لعلِ بدخشاں ہو نہیں سکتا
مصیبت ہی سے قدرِ عافیت ہوتی ہے دنیا میں — نہ پیش آیا ہو جس کو غم وہ شاداں ہو نہیں سکتا
وطن کوئی ہو عزت جوہرِ قابل سے بڑھتی ہے — گُلِ صحرا کا ہمسر خارِ بُستاں ہو نہیں سکتا
اسی سے اختیارِ جبر کا مفہوم کُھلتا ہے — جو ہونا چاہتا ہے کوئی انساں ہو نہیں سکتا

مٹایا تُو نے اے محرومؔ ہر اک نقشِ باطل کو
جُدا دل سے ترے کیوں داغِ حرماں ہو نہیں سکتا

محرومؔ

منظومات

بسمل سعیدی

نذرِ محروم

ذرّاتِ رہِ فکر مہ و مہر و نُجوم
تخیل کی پرواز سرِ عرشِ علوم
معراج ہے اَوروں کی ترے زیرِ قدم
رأس الشعراء شاعرِ یکتا، محرومؔ

اعلیٰ ہے مقامِ نُکتہ دانی تیرا
ہر لفظ ہے اک گنجِ معانی تیرا
تاریخ کی دُنیا میں رہے گا محرومؔ
ہر لمحۂ عمر، جاودانی تیرا

مَسلک میں ترے وید بھی قرآں بھی عظیم
ہندو بھی عظیم ہے، مُسلماں بھی عظیم
شاید ہی کوئی ہو شاعروں میں تُجھ سا
شاعر بھی عظیم اور انساں بھی عظیم

اے شاعرِ یکتا و یگانہ محرومؔ
اے صاحبِ فکرِ عارفانہ محرومؔ
محروم تری قدر سے رکھ کر تجھ کو
عظمت سے تری رہا زمانہ مرحوم

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

شاعرِ قوم پروفیسر تلوک چند محروم سے

سرحد کی پٹھانی اُردو میں دُنیائے فصاحت کے مالک	الفاظ کے شیریں دریا میں امواج بلاغت کے مالک
تو اپنے تخلص کی ضِد ہے کس شے کی تجھے محرومی ہے	کتنے زروگوہر والوں نے برسوں تری چوکھٹ چومی ہے
کتنا کردار ہے راست ترا اس کی تری قامت شاہد ہے	باطن میں ترے رنگینی ہے اے کافر گو تو زاہد ہے
میں پڑھ پڑھ کر نظمیں تیری بچپن میں شاداں ہوتا تھا	تیرے اشعار کی نُدرت سے اُس وقت بھی حیراں ہوتا تھا
چڑیا کی زاری کا عالم بے تاب مجھے بھی کرتا تھا	میں تیرے حسنِ تخیل پر نا سمجھی میں بھی مرتا تھا
درجہ تھا گرامی تیرا بھی اقبال کا تو ہم پایہ تھا	سرمایہ تیرا خود تیرا پیدا کردہ سرمایہ تھا
تھا مسکن عیسیٰ خیل ترا دیتا تھا داد مسیحائی	پنجاب کے دور اوّل میں تو نے کتنی شہرت پائی
ہر نظم میں حُسنِ فصاحت سے اک دودھ کی ندی بہتی تھی	پاکیزہ تخیل کا گنگا موّاج ہمیشہ رہتی تھی
اے نور جہاں کے دلدادہ ظاہر ہے تیری جہانگیری	فن پاکر اور ہے فکر جواں بے پیری ہے پیری تیری
نظمِ آزاد کے میداں میں رکھا تھا قدم برسوں پہلے	تمہید باب سوجودہ کردی تھی رقم برسوں پہلے
عبدالقادر کے مخزن کا تو بھی تابندہ گوہر ہے	اوراقِ زمانہ سے کیا کیا آئینہ تیرا جوہر ہے
شہکار ترا وہ گرتے پر ماضی کی یاد دلاتا ہے	ودیا کی ماں کا وہ ماتم دل کی بنیاد ہلاتا ہے
آغاز ہی سے مجھ میں تجھ میں اک روحانی سی قربت ہے	ہر صاحب دل پر مرتا ہوں کچھ ایسی میری فراست ہے

کھنچتا ہوں کھنچنے والوں سے ملتا ہوں ملنے والوں سے ہوں خستہ حالی کا پتلا نبھتی ہے خستہ حالوں سے
گو لفظ قصیدہ گوئی کا میرے دفتر میں درج نہیں وصف ایک بزرگ مشفق کا لکھنے میں کوئی ہرج نہیں
یوں تو ہے صدق دلی اچھی یوں تو اخلاص کا قائل ہوں میں رشتہ باہم رکھنے میں اک جذبۂ خاص کا قائل ہوں
وہ جذبۂ خاص ترے دل میں آتا ہے صاف نظر مجھ کو اک جوہر سادگی خاطر ہے رشک لعل و گہر مجھ کو
ہوتا ہے اگر شکوہ بھی کوئی تو میل نہیں رکھتا دل میں کہتا ہے کدورت جس کو جہاں داخل ہی نہیں آب وگل میں
محروم! سخن سنجی سے تری پنجاب کو عظمت حاصل ہے تیرے صدقے میں کیا میں کہوں کس کس کو فضیلت حاصل ہے
جی چاہتا ہے اے مشفقِ من اُردو کا تجھ کو پوپ کہوں حد تعریف یہیں تک ہے' لازم ہے کہ اب خاموش رہوں
لیکن ترے گوہر یکتا کو میں کیسے نظر انداز کروں کرتا ہوں اسے میں پیار بہت کیسے افشائے راز کروں
آزاد تجھے اُس عظمت سے محروم نہ ہونے دے گا کبھی یہ نقش تجھے اس دنیا سے معدوم نہ ہونے دے گا کبھی
جتنا پروان چڑھے گا خود تیرا اعزاز بڑھائے گا محفوظ رہے چشم بد سے مشہورِ جہاں ہوجائے گا
پنجاب کی بربادی نے تجھے آوارہ وطن گو کر ڈالا پت جھڑ کے موسم نے آکر پامال چمن گو کر ڈالا
لیکن یہ تیری بربادی بھی تعمیرِ نو کی ضامن ہے تو یوں ہی پریشاں حال رہے یہ بات ذرا ناممکن ہے
پاتا ہے راحت بالآخر کچھ روز دُکھ انساں سہتا ہے
پیش آئے بدی سے لاکھ کوئی' جو نیک ہے نیک ہی رہتا ہے

شمیم کرہانی

حضرتِ تلوک چند محروم

ترے کلام میں الفاظِ خوش نما ہی نہیں
خلوصِ دل بھی ہے، عشقِ جنوں شعار بھی ہے

نشاطِ محفلِ اربابِ رنگ و بُو ہی نہیں
بلا کشانِ غمِ دہر کی پکار بھی ہے

حدیثِ لالہ رُخان و سمن براں ہی نہیں
حکایتِ چمن و دشت و کوہسار بھی ہے

شراب و شاہد و مینا کی گفتگو ہی نہیں
بیانِ کاہشِ غم ہائے روزگار بھی ہے

فسانۂ گُل و نسریں و نسترن ہی نہیں
جگر کے خون سے سینچی ہوئی بہار بھی ہے

فریبِ چشمِ حسینانِ خود نگر ہی نہیں
بصیرتِ دلِ دانائے روزگار بھی ہے

نظر فریبیِ رنگینیِ بیاں ہی نہیں
خیال و فکر کا دریائے بے کنار بھی ہے

فقط سکندر و دارا کی داستاں ہی نہیں
خلوصِ گوتم و چشتی کی رُوحِ کار بھی ہے

نفاقِ ملّتِ مشرق کا تذکرہ ہی نہیں
صفا و صلح کا ارمانِ بے قرار بھی ہے

شکست خوردہ محبت کی شرحِ غم ہی نہیں
وطن کا درد بھی ہے زندگی کا پیار بھی ہے

جمالِ ماضیِ زرّیں کی آرزو ہی نہیں
کسی حسین سے فردا کا انتظار بھی ہے

دلاور فگار

شخصیتِ محروم

ایک انساں، ذی شعور و ذی وقار و ذی ہنر
ایک شاعر، خوش مذاق و خوش خیال و خوش نظر

ایک عالِم جس کے اقوالِ نظر افروز میں
ہوش و دانائی سراسر، عقل و حکمت سربسر

یاس کی تاریکیوں میں اک کرن اُمید کی
جادۂ تاریکِ غم میں اک چراغِ رہ گزر

اک علَم بردارِ فن، اس انحطاطی دَور میں
ایک نکتہ سنج ناقد، اک ادیبِ نامور

منزلِ شعر و ادب میں ایک مردِ راہ داں
کاروانِ علم و فن میں ایک کامل راہبر

اک شرافت کا نمونہ اک محبت کی مثال
آدمی کی ایک تعریفِ صحیح و معتبر

اک انیسِ درد منداں، ایک ہمدردِ عوام
اک مسیحائے زماں، سارے جہاں کا چارہ گر

ایک موجِ نور، پیغامِ شکستِ تیرگی
اک ستارہ، نقیبِ آمدِ وقتِ سحر

اک مصلح، دشمنِ تفریقِ شیخ و برہمن
ایک ناصح، فتنۂ دیر و حرم سے دُور تر

ایک دریا اپنی گہرائی سے خود ناآشنا
''اک ہمالہ آپ اپنی رفعتوں سے بے خبر''

ایسا اک فن کار بھی ہے آج تیری گود میں
ناز کر محرومؔ پر، اے ارضِ مشرق، ناز کر

علامہ انور صابری

ہدیۂ عقیدت

قطعہ

ادب و شعر کی رُوحِ ہمہ دانی تُو ہے
فکر و تحقیق کے دریا کی روانی تُو ہے

حال و ماضی کی جو قدروں کو مِلا دیتی ہے
دورِ نو کی وہی با ربط کہانی تُو ہے

جس کا ہر لفظ اک گوہرِ نایاب حیات
عصر حاضر کا وہی گنجِ معانی تُو ہے

ہے وہ کیا گوشۂ فن جو تجھے معلوم نہیں
تو تخلص کے حقائق میں بھی محروم نہیں

نظم

خامۂ محروم اے گل ریزِ دُنیائے سخن
ہے تری ممنونِ احساس عظمتِ باغِ وطن

زرفشاں گنجِ معانی ہے ترے آغوش میں
رُوحِ سعدی و قاآنی ہے ترے آغوش میں

فکرِ تُلسی تیری تقلیدِ تخیل پر نثار
حافظِ شیراز کا گلشن ہے تجھ سے پُر بہار

تیری تشبیہات میں ہندوستان کا رنگ ہے
فخرِ دُنیا خطۂ جنّت نشاں کا رنگ ہے

تیرے احساسات کا پہلو حیات افروز ہے
تیرا سوزِ ذوقِ ہستی کائنات افروز ہے

ہر تخیل کو ترے رُوحِ خوش اقبالی ملی
بہرِ اظہارِ بیاں بولی بھی ٹکسالی ملی

تیرا ہر مصرع ہے اک پُر سوز تکمیلِ خیال
داد دیتے ہیں غزل میں تجھ کو اربابِ کمال

نفس کی پاکیزگی سے دُور ہوسکتا نہیں
اس بلندی پر بھی تو مغرور ہوسکتا نہیں

کیا خبر تو زندگی کے کون سے عالم میں ہے
''پرتوِ صبحِ مسرت تیری شامِ غم میں ہے''

تیرے ساغر میں وہ کیفِ بادۂ سرجوش ہے
''مے کشوں کے جمگھٹے میں شورِ نوشانوش ہے''

غیر فانی تیرا غم ہے غیر فانی ہے کلام
تیری قسمت میں ازل کے دن سے ہے عمرِ دوام

رعنا جگّی

کلامِ محروم

اللہ ری محروم کی رنگین بیانی
ہر لفظ ہے گلدستۂ گلزارِ معانی

ٹھہرے ہوئے لہجے میں ہے گنگا کی روانی
الفاظ کی بندش میں ہے جمنا کی جوانی

ہر ایک رُباعی سے عیاں ایک حقیقت
ہر ایک غزل ایک محبت کی کہانی

ہر نظم میں اک ربط ہے اک ضبط ہے ایسا
جیسے ہو کسی بحر میں موجوں کی روانی

جذبات میں کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسّم
افکار میں ڈھلتی ہوئی کرنوں کی جوانی

اشعار کی آمد کا وہ عالَم ہے کہ جیسے
ساون کے مہینے میں برستا ہوا پانی

تاثیر میں ڈوبا ہوا ہر مصرعۂ رنگیں
اک نغمۂ الہام ہے یا کرشن کی بانی

اک لوچ زباں میں ہے تو اک حُسنِ بیاں میں
ہے فکر کہ اک خوابِ شبستانِ جوانی

ہر لفظ میں آباد ہے دُنیائے حقیقت
ہر نقطے میں پوشیدہ ہے اک گنجِ معانی

ہے ذکرِ نصیحت میں بھی اک شانِ تغزل
پیری کی حکایت ہے بہ اندازِ جوانی

اشعار میں کھینچتی ہے وہ جذبات کی تصویر
ششدر رہے جو بہزاؔد تو حیران ہے مانیؔ

بے مثل رُباعی ہے حسیں نظم و غزل ہے
محرؔوم کا دیوان ہے یا تاج محل ہے

جیمنی سرشار

حضرتِ محرومؔ کے نام

دل میں ہر اہلِ نظر کے ہے ترا گھر محرومؔ
فخر ہے سرحد و پنجاب کو تجھ پر محرومؔ

خالقِ پاک نے انسان بنایا تجھ کو
اور انسان بھی ذی شان بنایا تجھ کو

چار سو ملک میں پھیلی ہے جو شہرت تیری
مستحق اس سے زیادہ کی ہے عظمت تیری

قابلِ رشک ہے اے صاحبِ اعجازِ سخن
تیرا اسلوبِ نگارش ، ترا اندازِ سخن

اوجِ تخیل پہ بھی سادگیِ طرزِ بیاں
ہر سخن سنج کی تقدیر میں یہ بات کہاں

دولتِ علم جو حاصل ہے تو ثروت بھی ہے
کم سہی ، ساتھ مگر اس کے قناعت بھی ہے

وطن و قوم کے ناموس کا ہے پاس تجھے
اُن کی رُسوائی و تذلیل کا احساس تجھے

درد ہے دل میں ترے اشک رواں آنکھوں میں
ایک مجروح سا احساس نہاں آنکھوں میں

بہرہ اندوز مسرّت سے ہوا ، غم بھی ملا
خوں چکاں زخم ملے زخموں کا مرہم بھی مِلا

عیش و آرام کے ساماں ہیں مہیا گھر میں
حکم شاہوں کی طرح چلتا ہے تیرا گھر میں

تیرے بچوں کے چلن پر ہے اثر خاص ترا
مشعلِ راہ ہے اُن کے لیے اخلاص ترا

نقش ہر دل پہ محبت کا نظر آتا ہے
راج ہر سمت مسرّت کا نظر آتا ہے

صاحبِ علم ہے ذی شان ہے فرزند ترا
تیرے اوصاف کا حامل ہے جگر بند ترا

خادمِ ملک بھی ہے قوم کا غم خوار بھی ہے
اس کی کھوئی ہوئی عظمت کا پرستار بھی ہے

ایک فن کار سخن گو ہے سخنداں ہے وہ
مختصر یہ کہ تری شان کے شایاں ہے وہ

عادتیں نیک ہیں اطوار پسندیدہ ترے
یہی باعث ہے کہ احباب گرویدہ ترے

ملک میں کتنے ہی مشہور ہوئے تیرے عزیز
اہلِ ذوق ، اہلِ زباں ، اہلِ سخن ، اہلِ تمیز

کسی نعمت سے زمانے کی تو محروم نہیں
کیوں ہے یہ تیرا تخلص مجھے معلوم نہیں

صابر ابوہری، ایم۔اے

محروم

خراجِ عقیدت

یہ قطعات جشنِ محروم کے موقعہ پر پڑھے گئے تھے جو بزمِ سخن موتی باغ کی طرف سے زیرِ صدارت جناب مہر چند کھنہ وزیرِ حکومت ہند منایا گیا تھا

تیری دُعا کے فیض سے تاریکیاں چھٹیں — اہلِ وطن کو صبح کا پیغام آگیا
آزادیٔ وطن کا چھڑا تذکرہ جہاں — بے ساختہ زباں پہ ترا نام آگیا

~~~~~~~~~~~~~~~~

دانستہ تونے رکھا ہے محروم اپنا نام — تیری نظر میں ہیچ ہیں القاب و سیم وزر
محروم! تیرا نام کوئی لے گا جب کبھی — جھک جائیں گے نیاز سے اہلِ وطن کے سر

~~~~~~~~~~~~~~~~

لُٹتے تھے بات بات پہ لعل و گہر یہاں — مدح و ثنائے غیر نہ آئی تجھے مگر
ہر روز' روزِ عید تھا آغوشِ غیر میں — زندانیوں کی عید نہ بھائی تجھے مگر

~~~~~~~~~~~~~~~~

تفریق مذاہب کی ہر اک دل سے مِٹائی — انسان کو انسان کی تعظیم سکھائی
لڑتے تھے شب و روز جو ہر بات پہ محروم! — مِل جُل کے اُنھیں رہنے کی تدبیر بتائی

~~~~~~~~~~~~~~~~

چھوڑ کر عیش و طرب تو رنج میں جیتا رہا — ہند کا چاکِ گریباں عمر بھر سیتا رہا
حکمراں کے مَن و سلویٰ کو سمجھتا تھا حرام — نانِ جو کھاتا رہا تلخابِ جو پیتا رہا

~~~~~~~~~~~~~~~~

عظمتِ ہندوستاں کا تونے اک دیکھا تھا خواب — جس کی خاطر عمر بھر پیتا رہا خونِ جگر
اخترِ ہندوستاں ہم اوجِ پرویں ہوگیا — یہ ترے ہی خواب کی تعبیر آتی ہے نظر

~~~~~~~~~~~~~~~~

ہیرالال فلک دہلوی

نذرِ عقیدت

علمِ پرور ہو تو قدرِ علمِ داں جاتی نہیں
دل پہ ہو تحریر تو پھر داستاں جاتی نہیں
یہ فروغِ عظمتِ محروم صاحب سے کھلا
دہر میں محنت کسی کی رائیگاں جاتی نہیں

~~~~~~~~~~~~~~~~

راہِ پروازِ بلندی بھی دکھا سکتی ہے
ایک ذرّے کو یہ خورشید بنا سکتی ہے
محوِ افکار جو فن کار رہے تو بہتر
کوئی تحریر مقدر بھی جگا سکتی ہے

~~~~~~~~~~~~~~~~

رام کشن مضطر

تلوک چند محروم

نیک صورت نیک سیرت نیک دل
سر بَسر پاکیزگی کی شان ہیں
جن پہ آتا ہے فرشتوں کو بھی رشک
حضرتِ محرومؔ وہ انسان ہیں

~~~~~~~~~~~~~~~~

یہ تَسلسل اور یہ آہنگِ نظم
جس طرح ہو نُور کا دریا رواں
کِس قدر سنجیدہ و پاکیزہ ہے
حضرتِ محرومؔ کا حُسنِ بیاں

~~~~~~~~~~~~~~~~

وقار خلیل

نذرِ محروم

ہر اک لفظ میں زندگی موج زن ہے
ہر اک شعر میں عظمتِ جان و تن ہے

ہر اک سانس تعبیرِ خوابِ وطن ہے
تری ذات جیسے خود اک انجمن ہے

شعاعِ مہ و مہر تیرا سخن ہے
جلو میں ترے موجِ گنگ و جمن ہے

نسیمِ بہاراں میں جو بانکپن ہے
تری چشمِ بینا میں پَرتَو فگن ہے

سرِ شاخِ سُنبل سخن کا لہکنا
بہاروں نے سیکھا ہے تجھ سے مہکنا

ترے فن میں ہندوستاں بولتا ہے
ترقی کی راہوں پہ پَر تولتا ہے

حقائق کی تصویر ''گنجِ معانی''
ترے غم میں شامل غمِ جاودانی

بعنوانِ اُردو دیئے ماہ پارے
پروئے نوکِ قلم سے ستارے

کوئی تجھ سا اب مردِ دانا کہاں ہے
تو پیرانہ سالی میں بھی نوجواں ہے

تری ذات مہرِ کمالِ سخن ہے
زمانے میں تو نازشِ علم و فن ہے

ترے فرق پہ تاجِ عظمت سجا ہے
شہہِ علم تجھ کو جو کہیے بجا ہے

وقار خلیل

"بہارِ طفلی" کا شاعر

قطعات

اخلاق کے پھولوں کی ہے اس میں مہکار — محرومؔ کی عظمت کا ہے سب کو اقرار
بچوں کی گلستاں ہے "بہارِ طفلی" — یا دیس کے تاروں کا چمکتا سنسار

~~~~~~~~~~~~~~~~

اطفال کے اخلاق کی گل کاری ہے — آئینہ و ادب کی زرکاری ہے
محرومِ سخنور کی "بہارِ طفلی" — گُل رنگ شعاعوں کی گُہر باری ہے

~~~~~~~~~~~~~~~~

گر دیس کے تاروں کو جگانا چاہو — اسلاف کی راہوں پہ چلانا چاہو
ہے تحفۂ محروم "بہارِ طفلی" — پھولوں کو جو گلزار بنانا چاہو

~~~~~~~~~~~~~~~~

گنجینۂ گُل

قطعات

ہر فکر کا انداز ہے سادہ معلوم — گُل رنگ سویرا ہے خیالِ منظوم
پھولوں کے لیے ایک خزانہ ہے وقار — اس دَور میں دراصل کلامِ محروم

~~~~~~~~~~~~~~~~

خونِ دل دے کے چراغوں کو جلایا تو نے — فکرِ عالی کو جہاں تاب بنایا تو نے
واقفِ رمزِ سحر، مردمِ حق ہیں محروم — بزمِ خوابیدہ کو اک بار جگایا تو نے

~~~~~~~~~~~~~~~~

زبان و شعر کے بے مثل خادم و مخدوم — ترا کلام ہے تابندہ جیسے ماہ و نجوم
جنابِ اکبرؔ و حالیؔ کی آبرو تُو ہے — حیات اور عمل ہے تخیلِ محروم

~~~~~~~~~~~~~~~~

گوہر سیلانی

حضرتِ محروم

مادرِ ہند کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تنویر سے روشن ہے جہانِ اُردو

جس کے افکار نے مہکائے خیالوں کے چمن
جس کے اشعار ہیں تفسیرِ زبانِ اُردو

جس کا ہر حرف کسی شوخ کے عارض کا جمال
جس کا ہر مصرعۂ تر اک گُلِ تر ہے گویا

جس کی ہر بیت محبت کی حسیں دوشیزہ
جس کی ہر نظم شبِ غم کی سحر ہے گویا

جس کی ہر بات جگر میں یوں اُتر جاتی ہے
جس طرح دل میں اُترتی ہے محبت کی نظر

جس طرح پھول میں خوشبو کی کوئی نرم سی رَو
جس طرح بزمِ تصور میں کوئی مہ پیکر

عظمتِ ہند کا احساس دلا کر جس نے
دَورِ گردش میں کیا رُوح کو سرگرمِ عمل

جس نے تخیل کو الفاظ کا جامہ دے کر
شعر و نغمہ کے تراشے ہیں کئی تاج محل

جس سے اک عہد کی تاریخ مُرتب ہوگی
اپنی عظمت جسے آج آپ بھی معلوم نہیں

جس نے اک نسل کو بخشی ہے نگاہِ خود بیں
فیض سے جس کے کوئی فرد بھی محروم نہیں

خاں غازی کابلی

محروم کیوں کہیں؟

شاداں گُنِ حیات کو مغموم کیوں کہیں؟
تقصیرِ دستِ کاتبِ مقسوم کیوں کہیں؟
شعر و ادب کا فخر مقامِ بلند علم
سب کچھ جنھیں مِلا، انھیں محروم کیوں کہیں؟

دانِش وفن کے امام

دانش وفن کے امام اے بے نیازِ تخت و تاج
صاحبِ فقرِ غیور و شاعرِ افغاں مزاج
ہے ترے فکرِ رسا میں زندگی کی کائنات ارتقا کے علم کا عنوان ہے تیری حیات
شعر کے دریا کی پاکیزہ روانی تجھ میں ہے حُسنِ قدرت کا حسین ''گنجِ معانی'' تجھ میں ہے
تُو ''عُمرِ خیام'' کا آئینۂ تخیل ہے ''حافظِ شیراز'' کے عنوان کی تفصیل ہے
''جائسی'' کا تجھ میں رس ہے، تجھ میں خسروؔ کا گداز
تو ہے ''تلسی داس'' کے احساس کا دانائے راز
ذوقِ فطرت جب سوئے تکمیلِ حُسنِ فن گیا پتھروں میں تُو ''میانوالی'' کے موتی بن گیا
برہمن زادوں میں اک بُت خانۂ جانِ ادب حلقۂ اہلِ حرم میں رُوحِ ایمانِ ادب
غیر فانی تیری ہستی جاوداں تیرا کلام
فرض ہے ''غازیؔ'' پہ اے محرومؔ تیرا احترام

پروفیسر بخشی اختر امرتسری
یادگارِ رونق دہلوی

نذرِ عقیدت

بخدمت جناب پروفیسر محروم صاحب

بھارت کا تو فرزند ہے دمساز ہے تُو
بھارت ہے اگر ساز تو آواز ہے تُو
بھارت ہے تری ذات پہ نازاں محرومؔ
بھارت کے لیے مایۂ صد ناز ہے تُو

~~~~~~~~~~~~~~~~

تصنیف تری ''گنجِ معانی'' دیکھی
ہر بحر میں طوفاں کی روانی دیکھی
اشعارِ غزل میں ہیں افسانے دل کے
ہر نظم دل آویز کہانی دیکھی

~~~~~~~~~~~~~~~~

بچوں کے لیے لکھی ''بہارِ طفلی''
اے راہبر راہ گزارِ طفلی
کیا سرخی گلگونہ شعریت سے
گل رنگ کیے تو نے عذارِ طفلی

~~~~~~~~~~~~~~~~

تصنیف جو ہے ''رُباعیاتِ محروم''
کرتی ہے عیاں کمالِ ذاتِ محرومؔ
ہاں صنفِ رُباعی کے لیے اے اخترؔ
بے شبہ غنیمت ہے حیاتِ محرومؔ

~~~~~~~~~~~~~~~~

سچ ہے کہ سخن پر تجھے قدرت ہے تمام
لونڈی ہے زباں تو روز مرّہ ہے غلام
استعمالِ محاورہ بر موقعہ
ہے پاک ترا حشو و زواید سے کلام

~~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~~

فاضل ہے فضیلت سے تو محروم نہیں ہے علم کوئی جو تجھے معلوم نہیں
تو واقفِ اسرارِ حقیقت بھی ہے تجھ پر تو کوئی راز بھی مکتوم نہیں

~~~~~~~~~~~~~~~~

اے ناظمِ بانام تری عُمر دراز اے شاعرِ خوش کام تری عُمر دراز
دنیائے ادب سے یہ صدا آتی ہے اے عظمتِ ایّام تری عُمر دراز

~~~~~~~~~~~~~~~~

بچپن ہی سے پڑھتا ہوں کلامِ محروم گویا کہ ہوں مستِ مئے جامِ محروم
سجدے کو یہ جھک جاتا ہے سر آپ سے آپ آتا ہے زباں پہ جب کہ نامِ محروم

~~~~~~~~~~~~~~~~

ہاں دیدۂ بینائے سخن ہیں محروم سرمایۂ صد فخرِ وطن ہیں محروم
تعظیم بجا لاتی ہے دنیائے ادب واللہ کہ مخدومِ زمن ہیں محروم

~~~~~~~~~~~~~~~~

دُنیائے ادب میں ہے بڑا نام اُن کا دنیائے ادب میں ہے بڑا کام اُن کا
وہ قابلِ تحریم و ادب ہیں محروم لیتا ہے جہاں نام بہر گام اُن کا

~~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~~

مغموم دہلوی

نذرِ عقیدت

(رُباعیات)

محرومؔ تجھے کس لیے محروم کہیں
واجب ہے کہ ہم مرشد و مخدوم کہیں
یہ ذاتِ گرامی تری اور علم و ہُنر
لازم ہے اُنھیں لازم و ملزوم کہیں

~~~~~~~~~~~~~~~~

خوش پیکرِ مانیؔ ہے کلامِ محروم
پیغامِ جوانی ہے کلامِ محروم
سرمایۂ دوشیزۂ اُردو کی قسم
ہاں ! گنجِ معانی ہے کلامِ محروم

~~~~~~~~~~~~~~~~

پھیلی ہے تری ذات کی عظمت ہر سو
ہوتی ہے ترے نام کی عزت ہر سو
سچ ہے کہ تو شہرت کا نہیں متلاشی
خود ڈھونڈ رہی ہے تجھے شہرت ہر سو

~~~~~~~~~~~~~~~~

ہر لب پہ ہے تعریف تری اے محروم
ہر اک طرف تیری لیاقت کی ہے دُھوم
واللہ فضلیت کا تری کیا کہنا
خدامِ ادب ہم ہیں تو تُو ہے مخدوم

~~~~~~~~~~~~~~~~

ہاں صوبۂ سرحد کا وہ فرزند ہے تُو
ہاں صوبۂ سرحد کا وہ دلبند ہے تُو
سوجان سے قربان ہے سرحد تجھ پر
وہ پسرِ خردمند و ہنر مند ہے تُو

~~~~~~~~~~~~~~~~

جب کانوں میں محرومؔ کا نام آتا ہے
سر فرطِ ادب سے مرا جھک جاتا ہے
سجدہ میں نظر آتی ہے صورت اُن کی
دل قرب و زیارت کا مزا پاتا ہے

~~~~~~~~~~~~~~~~

تاراچند باغی دہلوی

محروم

اُوستادوں کا خضرِ رہ تُو ہے
اُوستادِ اساتذہ تُو ہے

آسمانِ سخن پہ اے محرومؔ
سب ستارے ہیں ایک مہ تُو ہے

تیرے ہر شعر میں فصاحت ہے
فکر و تخیل میں بلاغت ہے

روزمرّہ کی چاشنی واللہ
شہد ہے شہد سی حلاوت ہے

نظم نظم ایک داستانِ جمال
ہر غزل عشق کا ہے افسانہ

حُسن اور عشق ہیں بہم ' جیسے
پہلوئے کعبہ میں ہو بُت خانہ

تیری تصنیف ''کا روانِ وطن''
مظہرِ حُبِّ دوستانِ وطن

اُلفتِ مُلک و قوم اُس کا پیام
منتظر جس کا ہر جوانِ وطن

بُلبلِ خوش مقال زندہ باد
طوطیِ بے مثال زندہ باد

اہلِ بزمِ ادب کی ہے یہ دُعا
شاعرِ خوش خصال زندہ باد

برہمانند شرما حقیر ایم۔اے۔ایم۔او۔ایل

پروفیسر تلوک چند صاحب محروم کے اعزاز میں منعقد کی گئی تقریب کے موقعہ پر پیش کردہ

خراجِ عقیدت

اے گلستانِ آداب کے باغباں
رہبرِ کاروانانِ اُردو زباں

اے بہارِ گلستانِ شعر و سخن
باغبانِ ادب پاسبانِ زباں

تجھ سے روشن ہے گویا چراغِ سخن
تجھ سے سیراب ہے شعر کا بوستاں

تیری ہستی کے قائل سب اہلِ ادب
تیری ہستی پہ نازاں سب اہلِ زباں

تیرا ممنون ہو کیوں نہ اُردو ادب
تو نے بخشی اِسے زیست جاوداں

تیری ذاتِ مقدس کے قائل بشر
معتقد تیری ہستی کے کروبیاں

فیض پاتے ہی رہتے ہیں ہر طور سے
تیری ذاتِ ستودہ سے خورد و کلاں

تیرے چہرے سے اُلفت کا ظاہر نشاں
تیرے دل میں محبت کا سوزِ نہاں

تو ہمیشہ ہی اربابِ فن کا رہا
ہم سفر، ہمدم و ہم نوا، ہم زباں

تجھ کو زیبا ہے کہدیں گر اہلِ سخن
عمرِ خیامؔ شعرائے ہندوستاں

ہے منور ترے دم سے بزمِ سخن
تجھ سے آباد اُردو ادب کا جہاں

تیرے دم سے ہی ہیں رونقیں، زینتیں
انجمن، انجمن، گلستاں، گلستاں

اللہ اللہ وہ پاکیزگیِ سخن جیسے گنگ و جمن کی ہوں موجیں رواں

جانِ علم و ادب ' رُوحِ شعر وسخن تیری طرز ادا 'تیرا حُسنِ بیاں

تیری تعریف ہے مختصر سی یہی نکتہ بیں' نکتہ گو' نکتہ رس' نکتہ داں

ہو مبارک فروغِ زباں کے لیے تجھ کو پیرانہ سالی میں عزمِ جواں

ہے انصاف کہدیں تجھے ہم اگر آفتابِ سخن ماہتابِ زباں

تیرے دل میں ہے حبِ وطن کی تڑپ تیرا دردِ جگر دردِ ہندوستاں

پیش کرنے خراجِ عقیدت تجھے آج حاضر یہاں ہیں سب اہلِ زباں

جب تلک جلوۂ ماہ و خورشید ہے قائم ہیں جب تلک یہ زمیں آسماں

قائم ہے جب تلک بزمِ شعر وسخن جب تلک جاودانی ہے اُردو زباں

ہاں رہے گا یقیناً یہ فیضِ سخن جب تلک جاودانی ہے اُردو زباں

تجھ پہ رحمت خدا کی برستی رہے مانگتے ہیں دُعا سب یہ خورد و کلاں

تو سلامت رہے از ازل تا ابد
اے محبِ وطن' شاعرِ خوش بیاں

مکتوبات

مکتوبات

(۱)

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی

صدقِ جدید

دریاباد ضلع بارہ بنکی

یو۔ پی

یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء

کلامِ محروم کے وسیع، مکمل مطالعہ سے تو اب تک محروم ہی رہا ہوں، پھر بھی اس کا اچھا خاصہ حصّہ پڑھ لیا ہے۔ کہیں رسالوں میں، کہیں خود اُن کے کسی مجموعۂ کلام میں اور اُن کے نامِ نامی سے تو اپنے بچپن ہی سے روشناس ہوں۔

اتنی بات تو ہانک پکار کر کہہ سکتا ہوں کہ جن لوگوں نے اردو کو مسلمانوں کی ساتھ مخصوص سمجھ رکھا ہے اُن کے اس سو فی صدی غلط دعوے کے جواب میں جن مُسلّم اور معروف و متعارف اکابر اردو کو بے تکلّف پیش کیا جا سکتا ہے۔ اُن میں، سرشار، چکبست، ''نسیم لکھنوی، جوالا پرشاد، برق، تربھون ناتھ ہجر، فراق گورکھپوری، امرناتھ ساحر، شاد حیدرآبادی، بشن نرائن

ابرؔ منور لکھنوی' کے ساتھ ایک نام محروم کا بھی یقیناً ہوگا۔۔۔حیرت ہوتی ہے کہ ایک پنجاب اور وہ بھی پنجاب کے دیہات میں پیدا ہونے والے نے دہلی اور لکھنؤ کی معیاری زبان پر عبور کیسے حاصل کیا؟۔ پھر یہ قدرتِ زبان کسی ایک صنفِ سخن کے ساتھ مخصوص و محدود نہیں۔ کیا غزل اور کیا قطعہ، کیا مثنوی اور کیا رباعی' ہر جگہ:

ہے قلم اُن کا ابرِ گوہر بار

ہے زباں اُن کی تیغِ جوہر دار

یہ تو ہوئی اُن کے کلام کی ادبی' لفظی' لطافت و ملاحت۔ وہی معنویت' تو اُن کے زمزمۂ توحید اور نغمۂ معرفت کو سُن کر دھوکا بار بار کلامِ اقبال کا ہوتا ہے اور گمان یہ گزرنے لگتا ہے کہ یہ کوئی نیا اور البیلا شارح و ترجمان کلام رومیؔ و سعدی کا نکل آیا ہے؟۔۔اور شرافت تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کلام کی جان اور جوہر ہی ہے۔

اس مادّیت' سطحیت' اخلاق بیزاری اور سفلہ پروری کے دور میں جس کسی نے محرومؔ کی یادگار منانا چاہی' وہ خود لائق صد احترام اور مستحق صد ستائش ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ روحانیت کے' اخلاص کے' شرافت کے' صحیح و لطیف ذوق شعر و ادب کے ماننے والوں سے' قدر دانوں سے' احترام کرنے والوں سے ملک اب بھی خالی نہیں ہے۔

(۲)

ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی

نکودر۔ ضلع جالندھر

۱۹۔ مارچ ۱۹۶۲ء

عزیزی صابر ابوہری زاد لطفہ'

میں محروم صاحب کی اس ادبی عزّت افزائی پر جو ایوارڈ کی شکل میں پنجاب گورنمنٹ نے اس سال اُن کے لیے تجویز کی۔ دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ وہ بلاشبہ اس عزت افزائی کے مستحق ہیں۔

(جوش ملسیانی)

(۳)

حضرت فراق گورکھپوری

نئی دہلی

۱۹؍مارچ ۱۹۶۲ء

حضرت تلوک چند محروم اُن اِنے گنے افراد میں ہیں جن سے گزشتہ نصف صدی میں ہندوستان و پاکستان کے بیسیوں لاکھ افراد نے بہت کچھ پایا ہے۔ بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ بہت کچھ سیکھا ہے۔ اور جن کی مدد سے بیسیوں لاکھ آدمی بہت کچھ بنے ہیں۔ اردو زبان و ادب کو اچھی طرح سیکھنا قومی زندگی کو سلیقہ اور قرینہ سے بسر کرنے کا راز سیکھنا ہے۔ اس اہم تعمیری کام میں حضرت محروم کی تحریریں اور تصنیفیں ایک کارگر معلم کا کام کرتی رہی ہیں اور کرتی رہیں گی۔ لکھو کھہا افراد کے شعور کو ایک خاص سطح پر لانا اور اس شعور میں وہ صلاحیتیں پیدا کر دینا جو ہمیں مہذب ہندوستانی بنائیں بہت بڑی خدمت ہے۔ ہم جب مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر بڑے بڑے قومی رہنماؤں کے کارناموں کا تصور کرتے ہیں تو ہمیں اس وقت علم و ادب اور زبان کے ان رہنماؤں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جن کی خدمات کے بغیر سیاسی رہنماؤں کی خدمات بارآور ہو ہی نہیں سکتیں۔ زبان اور علم و ادب کے ذریعے سے جن لوگوں نے ہماری قومی زندگی کی تعمیر بیسویں صدی میں کی ہے ان میں حضرت محروم کا نام غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس وقت ہم انتشاری اور عبوری بلکہ بحرانی دور سے گزر رہے ہیں۔ جب یہ دور ختم ہوگا اور ہم اس عمل کا جائزہ لیں گے کہ بیسویں صدی میں اردو ادب کے ذریعے کن لوگوں نے اہم بنیادی اور تعمیری کام کیا ہے اس وقت ہم حضرت محروم کے کارناموں کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔

(فراقؔ)

(۴)

ابوالاثر جناب حفیظ جالندھری

کراچی

۶؍اگست ۱۹۶۱ء

جگن ناتھ جی! ۹؍جون ۱۹۶۱ء کا آپ کا خط اور کتابوں کا پارسل مجھے آج دکھائے گئے ہیں۔ میں شاید آپ کو اطلاع نہیں ملی، مئی ۶۱ء کے آغاز سے کراچی میں دماغی شکست کے زیرِ اثر فریش ہی چلا آ رہا ہوں۔ ڈاکٹروں نے آج مجھے

بمشکل چند خطوط کا احتیاط سے جواب دینے کی اجازت بصد بمشکل دی ہے۔ دوارکا داس جی دیوان بریندر جی اور آپ کو آج سارے دن میں چند سطور لکھ رہا ہوں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ محروم صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے مجھے کسی حد تک تو دماغی تکلیف سے یا قید سے رہائی کی ضرورت ہے۔ میری مصروفیات مجھے معذور نہیں رکھ سکتیں۔ محروم صاحب کے شاعرانہ کمال سے میرے لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے میں بھی تعلقات موجود ہیں۔ جب آپ ابھی طفلِ مکتب تھے۔ بھیرے میں جو پہلی ملاقات محروم صاحب سے ہوئی اس کے بعد سے اس وقت تک میری نیاز مندی کا حال آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تاہم محروم کے کلام پر کچھ لکھنے کے لیے ضبط احساسات و خیالات کی ضرورت ہے۔ ان کی سادگی و پُرکاری کو بیان کرنا مجھ ایسے کے لیے سادگی نہ سہی پرکاری کا ضرور طالب ہے۔ محروم ایک ایسے شاعر ہیں۔ ایسے ناظم ہیں جن کا کلام شریف طبع انسانوں کے لیے ہے۔ موجودہ دور میں شعر نے جو رنگ اختیار کیا، محروم اس سے محروم ہیں اور محروم ہی رہنا ان کے لیے مناسب ہے۔ اُن کے شایانِ شان فاش یا ''فاحش'' گوئی نہ کبھی پہلے تھی اور نہ اب ہے۔ لہذا ان کے کلام پر کچھ رائے زنی کرنا (اس دور میں) میرے لیے بصد احتیاط بھی مشکل نظر آتا ہے۔ مجھے معاندین سے خطرہ نہیں خود اپنی پراگندگی سے خطرہ ہے کہ اگر اس علالت دماغی کے دنوں میں محض جگن ناتھ جی کے شکوہ شکایت سے بچ نکلنے کے لیے کچھ لکھ دیا تو یہ محروم کے حق میں بے انصافی ہوگی۔ میں بہت زیادہ محتاط ہوں شعر کے فن میں۔ شاید اس لیے کہ ساتویں جماعت سے بھاگا ہوا طالب علم ہوں۔ مجھے استادوں کے سامنے بات کرتے ہوئے استادی کے طور طریقے سیکھنے اور ان کو برتنے کے لیے بڑی محنت درکار ہوتی ہے یہ ہے میرا عذر۔ اگر جگن ناتھ تم اس کو فی الحال قبول کرو۔

(حفیظ)

(۵)

جناب مالک رام

قاہرہ

۲۱ر ستمبر ۱۹۵۹ء

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی

وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

کتاب کا شکریہ۔ میں تو نا اُمید ہو چکا تھا۔

حسب ارشاد کتاب سے متعلق چند سطریں لکھتا ہوں۔ یہ مجموعہ ان ۲۴ مضامین کا جو مختلف اہلِ قلم نے اُردو کہ کہنہ

مشق استاد جناب تلوک چند محروم اور اُن کے کلام سے متعلق گزشتہ ۲۵۔۳۰ برس میں قلم بند کیے۔ ان میں سے بیشتر ملک کے سربرآوردہ رسائل و جرائد میں طبع ہو کے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ لکھنے والوں میں شیخ عبدالقادر، جوش ملسیانی، دیا نرائن نگم جیسے صاحبِ فکر و نظر اصحاب شامل ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ استادِ فن، بلکہ ''انجمن'' رہا ہے۔ جب یہ لوگ محروم کے کلام کی تعریف کریں تو قابلِ تعریف ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔

محروم گزشتہ نصف صدی سے دامنِ اُردو کو مالا مال کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ غرض انھوں نے سب کچھ لکھا ہے اور وہ ہر جگہ کامیاب رہے ہیں۔ مختلف اوقات میں اُن کے کلام کے جو مجموعے شائع ہوئے اُن پر اساتذۂ فن نے جو رائے دی اس سے ثابت ہو گیا کہ کلام کی خوبی اور نغز گوئی کسی خطے کو اجارہ نہیں نہ کسی استاد کی رہینِ منّت ہے۔ یہ خدا کی دین ہے۔ اس کی بخشش عام ہے وہ جسے چاہے دے۔

بہت اچھا ہوا کہ یہ منتشر مضامین جمع کر دیے گئے۔ ان سے نہ صرف کلامِ محروم کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی بلکہ ان سے خود شاعر کی زندگی اور کردار کے بعض گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

آپ نے ایک جگہ لکھا ہے:

اپنا بھی دل ہے پردہ کشائے ازل، جو وہ

حُسنِ ازل کا رُخ پہ ہیں پردا لیے ہوئے

یہ شعر سمجھ میں نہیں آیا۔ اس سے اگلا شعر ہے:

تنہا انھیں نہ دیکھ سکا میں کہ آئے وہ

پردا لیے ہوئے، کبھی جلوا لیے ہوئے

دوسرے مصرعے میں جس طرح ''پردہ لیے ہوئے'' جلوہ لیے ہوئے'' جملے استعمال ہوئے ہیں کیا یہ محاورہ اور روزمرّہ کے لحاظ سے درست ہیں۔

قبلہ محروم صاحب کی خدمت میں میرا آداب پہنچائیے۔ گھر میں نمستے کہیے۔ بچوں کو بہت بہت پیار۔

(خاکسار۔ مالک رام)

(۶)

سید محی الدین قادری زور

ایوانِ اُردو خیریت آباد

۱۲رفروری ۶۲ء

حضرت محروم اُردو کے قابلِ فخر اور قدیم شاعروں اور استادوں میں سے ہیں۔ اُن کی پوری زندگی اس زبان کی خدمت اور محبت میں گزری ۔ وہ اس قومی اتحاد اور یگانگت کا مکمل نمونہ ہیں جس کی عہدِ حاضر کے ہندوستان کو بے حد ضرورت ہے۔ اور جس کے لیے عہدِ حاضر میں بطور خاص جدو جہد کی جا رہی ہے۔

حضرت محروم ایک اعلیٰ پایہ کے استادِ سخن ہونے کے علاوہ ایک بہت بزرگ انسان بھی ہیں ۔ مجھے خوش قسمتی سے اُن کو قریب سے دیکھنے اور اُن کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے مواقع بھی ملے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے کمالِ فن کے ساتھ ساتھ کمالِ اخلاق کا بھی دل سے معترف اور معتقد ہوں۔

ماہنامہ پگڈنڈی قابلِ مبارک باد ہے کہ ایک ایسی بزرگ اور محترم ہستی کے اعتراف خدمات کے طور پر اپنا خاص شمارہ شائع کر رہا ہے۔

(سید محی الدین قادری زورؔ)

(۷)

عالمِ بے بدل جناب بنارسی داس چترویدی

۹۹ نارتھ ایونیو

نئی دہلی

۹رمارچ ۶۲ء

پریہ آزاد جی!

وندے! آپ کے پوجیہ پتاجی کا میں ۳۰۔۴۰ برس سے مداح رہا ہوں اور اُن کی انیک کوتاؤں نے میرے ہردیہ کو (متاثر) سپرش کیا ہے۔ وشال بھارت میں اُن پر ایک لیکھ بھی میں نے چھاپا تھا۔

میں اُردو تھوڑی تھوڑی ہی پڑھ پاتا ہوں۔ یہ میرے لیے دربھاگیہ کی بات ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر پوجیہ پتا جی کا سارا کلام دیوناگری لپی میں چھاپ دیا جائے۔ راج پال اینڈ سنز سے کرپا کر کے بات تو کیجیے۔ ہاں مشکل الفاظ کے معنی نیچے دینے پڑیں گے۔ موتیا بند کے کارن میں کم ہی پڑھ پاتا ہوں۔ چھپی ہوئی اردو کتابیں تو کچھ کچھ پڑھ لیتا ہوں۔ چٹھیاں مشکل سے پڑھی جاتی ہیں۔ پتا جی کو میرا بہت بہت پرنام۔

(بنارسی داس چترویدی)

(۸)

ڈاکٹر غلام یزدانی

سماجی گوڑا۔ حیدر آباد دکن

۱۷/اگست ۱۹۶۱ء

میرے نہایت عزیز دوست! سلام و بندگی۔

آپ بھی دل میں کہتے ہوں گے کہ عجیب ناشکرا شخص ہے کہ نہ خط کا جواب دیا اور نہ کتابوں کا شکریہ ادا کیا۔ غالب نے اپنی معذوری کا اظہار ستر بہتر کہہ کر کیا تھا۔ میں خدا کے فضل سے ۷۵ برس کا ہو گیا ہوں۔ اس لیے جو آداب آپ خط نویسی میں جوان لوگوں سے پیشِ نظر رکھتے ہیں' اُن سے مجھ کو معاف رکھیے۔ بینائی کی کمزوری نے ناکارہ کر دیا ہے۔ داہنی آنکھ بنوائی تھی۔ وہ جاتی رہی۔ بائیں میں بھی پانی اُتر آیا ہے۔ اُسے بنواتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ وہ بھی کہیں جاتی نہ رہے "بہارِ طفلی" اور "تلوک چند محروم" کو میں نے اپنے نواسے اور پوتی کے لیے رکھ لیا ہے۔ کیوں کہ جو نظمیں اس میں درج ہیں اُن کو پڑھ کر میں کافی لطف اٹھا چکا ہوں۔ اور "کاروانِ وطن" کو میں نے رکھ لیا ہے کیوں کہ اُس کی بعض نظمیں اب بھی دل کو پاش پاش کر دیتی ہیں' مثلاً "ڈائر اور نادر" آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ محروم نمبر امرتسر سے شائع ہونے والا ہے اس کے لیے میں بھی کچھ لکھوں۔ بڑھاپے نے میرے اعصاب پر ایسا اثر کیا ہے کہ دماغ میں وہ شے لطیف مضمون سمجھانے والی باقی نہیں رہی۔ اس لیے اس تقصیر کو معاف فرمائیں۔ پنجاب نے بہت سے محبِ وطن اور صاحبِ قلم پیدا کیے ہیں جن کا نام ابتدائی زمانے میں تلوک چند محروم سے روشن ہوا اور اس زمانے میں خود آپ نے راجندر سنگھ بیدی اور مالک رام نے اس سلسلے کو نئی آب و تاب دی۔

دعا گو

غلام یزدانی

(۹)

ڈاکٹر جیلانی برق ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی۔

کیمبل پور

۳رجنوری ۶۲ء

محروم صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء میں ہوئی تھی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی میں کوئی ادبی محفل تھی۔ اُس میں محروم صاحب بھی شریک ہوئے۔ گورا رنگ' لانبا قد' پتلا جسم گھنی مونچھیں' جاذب شخصیت اور ہنس مکھ۔ اسی محفل میں کسی مسئلے پر بحث چل پڑی۔ جناب محروم اور ایک شریک محفل میں ٹھن گئی۔ ایک موقعہ پر ایک نہایت وزنی اور مُسکت دلیل پیش کرنے کے بعد مخاطب کرنے کو کہنے لگے "یہ تھی میری تحقیق" اب:

"تم اپنے خیلِ معنی کو نکالو"

حاضرین اِس فیالتن مصرع سے بڑے محظوظ ہوئے۔ زور کا ایک قہقہہ گونجا اور اُن کے مخاطب ٹھس ہو کر بیٹھ گئے۔

حضرت محروم سے آٹھ دس ملاقاتیں بعد میں بھی ہوئیں۔ سرِ راہے یا بے گاہے۔ کہیں جم کر بیٹھنے کا موقعہ بہت کم نصیب ہوا۔ تاہم یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ محروم صاحب بحیثیت انسان بڑے پاکیزہ سیرت' بلند نگاہ اور محبّت کیش تھے۔ اُن کے احباب میں ہر مذہب و مسلک کے لوگ شامل تھے۔ اور ہر شخص اُن سے محبت کرتا تھا۔

بحیثیت شاعر وہ شبلی' حالی اور شیخ عبدالقادر کے دور کی یادگار ہیں۔ انھوں نے عموماً فطرت کو موضوعِ شعر بنایا شب تاریک میں ستاروں سے باتیں کیں۔ اور دن کے وقت اُجالوں سے ہم سخن ہوئے۔

بحیثیت فلسفی وہ مذاہب و مسالک کی پستیوں سے نکل کر انسانیت کے مقامِ بلند پر پہنچے۔ اور دنیا کو صلح و آشتی کا درس دیا۔

اگر آج دنیا زیادہ حسین ہے تو یقین مانیے کہ اس میں محروم صاحب کا بھی حصّہ ہے۔ دعا ہے کہ وہ خدمتِ ملک و ادب کے لیے دیر تک زندہ رہیں۔

(برقؔ)

(۱۰)

جناب حبیب الرحمٰن صدر انجمن ترقی اُردو حیدر آباد

انجمن ترقی اُردو حمایت نگر

۲۳ر جنوری ۱۹۶۲ء

یوں تو مدّت سے حضرت تلوک چند محروم کا نام سنتا اور ان کا کلام پڑھتا تھا' لیکن اُن کو دیکھنے کا موقعہ پہلی مرتبہ فروری ۱۹۵۸ میں ملا۔ جب میں کل ہند اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی گیا تھا۔ اُس وقت بھی صرف دور ہی سے مشاعرے میں موصوف کے درشن نصیب ہوئے تھے۔ لیکن ابھی کوئی سال بھر کی بات ہے کہ یہیں اُردو ہال میں حضرت محروم سے حصولِ نیاز کا شرف حاصل ہوا شرافت' وضعداری' اخلاق و انکساری کا مجسمہ جس کے نمونے اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تادیر آپ کا سایہ سلامت رکھے۔

(حبیب الرحمٰن)

(۱۱)

فاضلِ اجل جناب ڈاکٹر منوہر سہائے انوؔر

پٹیل نگر ایسٹ نئی دہلی

۳ر مارچ ۶۲ء

حکومت پنجاب نے محروم صاحب کی طویل ادبی خدمات کی قدر کر کے خود اپنے اعزاز میں اضافہ کیا ہے۔ محروم صاحب مُدّت مدید سے اُردو کے بہترین شعراء میں شمار ہوتے آئے ہیں۔ اور کثیر التصانیف ہونے کے لحاظ سے تو وہ فردِ فرید کہے جاسکتے ہیں۔ مجھے محروم صاحب کی اعزاز یابی پر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اُن کی جو قدر حکومتِ پنجاب نے اب کی ہے وہ کئی سال پہلے بھی کی جاسکتی تھی۔

(منوہر سہائے انوؔر)

(۱۳)

جناب رشید حسن خاں

بارو زئی دوم

شاہجہاں پور

۹/اکتوبر ۵۷ء

مکرمی جناب جگن ناتھ صاحب آزاد۔ سلام نیاز!

محترمی محروم صاحب (زادمجدہ) کا مجموعۂ کلام ''گنجِ معانی'' مرسلۂ جناب نظر نواز ہوا تھا۔ لیکن سوئے اتفاق یہ کہ میں اس دوران میں سخت بیمار رہا۔ مسلسل بخار نے ذہن سے فکر کی ساری صلاحیتیں چھین لیں۔ اس مجبوری کے واسطے سے کتاب کی رسید میں اس قدر تاخیر ہوئی جس کے لیے نہایت شرمساری کے ساتھ معذرت طلب ہوں۔ اور توقع کرتا ہوں کہ آپ اس اضطراری امر کو نظر انداز فرمائیں گے۔

میں نے محروم صاحب کا کلام پڑھا اور میں بیان نہیں کرسکتا کہ کس قدر محظوظ ہوا۔ پرانے دور کے شعراء کے متعلق ایک الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اُن کے یہاں فکر و خیال کے لیے صرف غزل کے سانچے کار فرما رہتے ہیں۔ یہ اشاروں کنایوں کی زبان سے اس قدر مانوس ہوجاتے ہیں کہ کھل کر بات کہنا پسند نہیں کرتے۔ اُن کے ذہن پر جو فرسودہ و پامال تصورات کی ایسی تہیں چڑھ جاتی ہیں کہ پھر نئے افکار و عنوانات کی تابناکیاں دُور کی آواز ہوکر رہ جاتی ہیں۔ لیکن محروم صاحب کے یہاں نظم کی مختلف اصناف اس خوبی و شاعرانہ قدرتِ بیان کے ساتھ دعوتِ نظر دیتے ہیں کہ یہ اعتراض غلط سا معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس دورِ جہاد میں جب کہ نئے شاعرانہ نظریات نے اچھے اچھے کوہ صفت افراد کو مرتعش کردیا ہے اور وہ سستی شہرت اور جماعتی وابستگیوں سے مرعوب ہوکر بے ہنگم سُروں میں الاپنا بُرا نہیں سمجھتے۔ یہ دیکھ کر مسرّت ہوتی ہے کہ ابھی کچھ ہستیاں ایسی ہیں جن کی بلندی کے سامنے یہ ہنگامی حادثے روبہ خاک رہتے ہیں۔ غرض اس مجموعے میں شاعرانہ قدرت، تنوع، جذبات و واردات کا سادہ لیکن پُر خلوص بیان اور ان سب کے ساتھ شاعرانہ لہجہ یہ چیزیں اسی تناسب و توافق کے ساتھ موجود ہیں کہ جس قدر داد دی جائے کم ہے۔

محروم صاحب اس دور کی یادگار ہیں جب غزل حاصلِ کُل تھی۔ لیکن موصوف نے کبھی زمانے کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ غزلیں کہیں، نظمیں کہیں، رباعیاں کہیں اور ہر ایک میں ایک انداز خاص قایم رکھا۔ خصوصاً رباعیات میں تو

ایک خاص مرتبہ پیدا کرلیا ہے۔

میں اس لطفِ خاص کے لیے صدقِ دل سے متشکر ہوں کہ موصوف نے یہ مجموعہ مرحمت فرمایا' اور آپ کا بہ طور خاص سپاس گزار ہوں کہ آپ کے واسطے سے یہ ارمغانِ گراں بہا میسّر ہوا۔ اس ذیل میں جس خدمت کی ضرورت ہو میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ موصوف کی خدمت میں سلام نیاز پہنچا دیجیے۔

غالباً مزاجِ گرامی بہ خیر ہوگا۔ کارِ لائقہ سے یاد فرماتے رہیے۔

(طالبِ خیریت رشید حسن)

(۱۳)

جناب شوکت تھانوی

۱۱ر مارچ ۱۹۶۲ء

میرے دوست جگن ناتھ آزاد نہایت متعصب قسم کے ہندو ہیں۔ یہ تعصب کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ اپنے والد پنڈت تلوک چند محروم مدظلہٗ کی قدم بوسی سے مجھ کو ہمیشہ محروم رکھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ محروم صاحب قبلہ میری سعادت مندی سے متاثر ہوکر خود ان کو گویا عاق کر دیں گے۔ وہ اپنے سے بہتر محروم صاحب مدظلہٗ کا کوئی خورد دیکھنا ہی نہیں چاہتے اور میری طرف سے تو وہ بہت ہی ہوشیار رہتے ہیں۔ اس لیے کہ اُن کو معلوم ہے کہ میں محروم صاحب کو اپنے لیے کس قدر واجب التعظیم سمجھتا ہوں اور کس قدر دعا گو رہتا ہوں کہ خداوند کریم اُن کا سایہ اُردو کے سر پر دیر تک قائم رکھے۔ انجمن بزم سخن اُن کا یوم منا رہی ہے۔ خدا کرے یہ یوم محروم صاحب کے سایۂ شفقت سے کبھی محروم نہ ہو۔ آمین

(شوکت تھانوی)

(۱۴)

جناب مخدوم محی الدین

حیدر آباد

۳ر مارچ ۶۲ء

بھائی جگن ناتھ آزاد، آداب!

الیکشن کی مصروفیت کی وجہ سے تمھارے خطوں کے جواب نہیں دے سکا۔ معافی چاہتا ہوں۔

مجھے اس بات سے دلی مسرت ہوئی کہ پگڈنڈی کا محروم نمبر نکل رہا ہے۔ میں محروم کی نظموں کا بچپن ہی سے دل دادہ رہا ہوں۔ مبارک باد قبول کرو کہ تم ایک بہت ضروری اور اچھا کام کر رہے ہو' نیک تمناؤں کے ساتھ۔

(تمھارا مخدوم)

(۱۵)

جناب جاں نثار اختر

جناب قبلہ محروم صاحب کی شاعری ہمارا ایک گراں بہا ادبی سرمایہ ہے جس سے ہم بہ آسانی زبان و بیان کی روایتیں سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوجاتی۔ اُن کے کلام میں ہمیں اپنی معاشرت کی جھلکیاں اپنی تاریخ کا عکس، اپنی تہذیب کا رچاؤ' اپنے وطن سے عشق اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا احترام ملتا ہے۔ محروم صاحب اُن بزرگ ادیبوں میں سے ہیں جن سے نئی نسلیں بہت کچھ سیکھتی ہیں مجھے بڑی خوشی ہے کہ رسالہ پگڈنڈی ایک خاص نمبر اُن کی زندگی اور شاعری کے بارے میں شائع کر رہا ہے۔ یہ بجائے خود ایک ادبی خدمت ہے جن کے لیے میں ادارہ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

(جان نثار اختر)

(۱۶)

جناب سید محمد جعفری

نئی دہلی

۱۹ر مارچ ۱۹۶۲ء

بچپن میں ایک کتاب جس کا نام "دو آتشہ" ہے میرے ہاتھ آ گئی۔ اس میں بعض نظمیں مجھے پسند آئیں۔ معلوم ہوا کہ یہ انگریزی نظموں کے ترجمے اردو نظم میں ہیں۔ یقین نہیں آیا۔ لیکن وہ ترجمے محترمی تلوک چند محروم صاحب نے کیے تھے۔ اُسی دن سے میں محروم صاحب کا معتقد ہوں۔ چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی میرا عقیدہ اُن کے فن کے بارے

میں وہی ہے کہ وہ مسلّم الثبوت اور قادر الکلام استادِ فن ہیں۔

(سیّد محمد جعفری)

(۱۷)

جناب عرش ملسیانی مدیر ''آج کل'' دہلی

۹۔ بی۔
تیمار پور۔ دلّی

۲۳/مارچ ۶۳ء

قبلہ محروم صاحب کی شاعری کی عمر ہم لوگوں کی عمر سے بھی زیادہ ہے اُن کی شاعری پر ہمارا اظہارِ رائے کرنا سوءِ ادب ہے۔ مقامِ مسّرت ہے کہ ''پگڈنڈی'' کا محروم نمبر شائع ہو رہا ہے۔ اس موقع پر صرف اتنا عرض کروں گا کہ اس خاص شمارے سے اُردو حلقے محروم سے متعارف تر ہو جائیں گے۔ اس وقت ملک کے گوشے گوشے میں موصوف کے عقیدت مند موجود ہیں۔ ابھی حال ہی میں حکومتِ پنجاب نے محروم صاحب کی عزت افزائی فرمائی ہے۔ دیر آید درست آید۔ محروم صاحب اس سے بھی زیادہ عزّت افزائی کے مستحق ہیں۔ حالّی و آزاد کے بعد جدید شاعری کے علم برداروں میں محروم صاحب پیش پیش ہیں۔ اُن کی تصنیفات کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اہلِ زبان نہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے زبانِ اُردو کی خدمت اہلِ زبان حضرات سے بڑھ کر کی ہے۔ نصف صدی سے زیادہ مدّت سے لوگ ان کی دلآویز نظموں کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے قوم و وطن کے لیے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور اس زمانے میں لکھا ہے جب قوم و وطن کا نام لینا بھی جرم تھا۔ اللہ اُن کو تادیر سلامت رکھے اور اربابِ ذوق اور اربابِ سیاست کو اس کی توفیق دے کہ ان کی صحیح اور مزید قدر اُن کی زندگی میں ہو۔

(عرش ملسیانی)

(۱۸)

جناب قتیل شفائی

۱۹۔ مارچ ۶۲ء

مجھے تخلص کے معنی معلوم نہیں تھے۔ میں نے زندگی میں سب سے پہلے تلوک چند محروم کا نام سنا تو میں نے دوستوں سے سوال کیا کہ تلوک چند تو ایک آدمی کا نام ہو سکتا ہے کیا محروم بھی اس نام کا حصہ ہے؟ دوستوں نے بتایا کہ نہیں محروم ایک تخلص ہے۔ میں نے پوچھا تخلص کسے کہتے ہیں، دوستوں نے کہا کہ شاعروں کا بھی ایک نام ہوتا ہے لیکن جس نام سے وہ شاعری کرتے ہیں اُسے تخلص کہتے ہیں۔ یہ پہلا دن تھا جب میں تخلص کے معنی سمجھا۔ اور اس کے کئی برس بعد میں نے شاعری شروع کی۔ اب مجھے ایک دُنیا جانتی ہے۔ لیکن میں جتنا حضرت محروم کو جانتا ہوا، اتنا کسی اور کو نہیں جانتا۔

(قتیل شفائی)

(۱۹)

جناب محمد طفیل مدیر ''نقوش''

۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۱ء

میں محروم محترم کی نظمیں بچپن سے پڑھتا چلا آرہا ہوں۔ بچپن میں وہ سب مجھے بڑی عزیز تھیں۔ یہ تو آپ کو علم ہی ہوگا کہ بچپن کے فیصلے بڑھاپے میں بھی جا کر بدلا نہیں کرتے۔ میں نے اُن کے ہاں صاف ستھرا ذہن' سیدھی سادی زبان' لہجے میں خلوص' انداز میں دلکشی پائی ہے۔

محمد طفیل
(ایک خط کا اقتباس)

(۲۰)

جناب رامانند ساگر

مدراس

۱۶ر جون ۶۲ء

بچپن سے میں نے اپنے اُستادوں کو منشی تلوک چند محروم کا نام اسی عزت اور احترام سے لیتے سنا ہے کہ اُن کا نام آتے ہی غیر شعوری طور پر سر ادب سے جھک جاتا ہے۔ اور دل میں ایک عقیدت کی لہری اُمنڈ آتی ہے۔

پھر جب تھوڑا ادبی شعور پیدا ہوا تو اساتذۂ ادب سے یہ سنا کہ محروم کا کلام اپنی سند آپ ہے۔ چناں چہ پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ پڑھا تو یہ احساس ہوا کہ پڑھے بغیر دورِ حاضر کے اُردو ادب کا مطالعہ مکمل نہیں سمجھا جاسکتا۔

محض ایک بار لاہور میں ''اُردو منزل'' کی ایک محفل میں اُن کے دیدار کا شرف حاصل ہوا ہے۔ جہاں اُنھوں نے بیوی کی موت پر لکھی ہوئی اپنی نظم کے چند قطعات سنائے تھے' اور وہ آنسو اب تک یاد ہیں جو اس وقت ان کے دل میں اد حاضرین کی آنکھوں میں دیکھے تھے۔

(رامانند ساگر)

(۲۱)

جناب بسمل سعیدی ٹونکی

دہلی

۱۶ر فروری ۱۹۶۲ء

محبِ مکرم آزاد صاحب! سلام محبت۔

وہ جو لوگ کہتے ہیں، کسی کے لیے کوئی کام کرے تو اُس کے شایانِ شان کرے اور جو ایسا نہ ہو سکے تو اپنے لائق تو ضرور ہی کرے۔ ورنہ نہ کردن یک عیب و کردن صد عیب والی بات ہو جاتی ہے، تو یہ سچ ہی ہے۔

میں کچھ دن سے سُن رہا ہوں کہ پگڈنڈی کا محروم نمبر شائع ہو رہا ہے۔ معتقدین و مرتبہ دانِ محروم حق بہ حق دار رسانیدن کے فرض سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں' میں یہ سب کچھ سُن رہا ہوں اور گم صم ہوں، نہ سہی مرتبہ داں، معتقدین میں تو میں بھی ضرور ہوں۔ پھر کیوں گم صُم ہوں۔ کیوں سُنی اَن سُنی کر رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں۔ آپ ضرور جانتے ہیں۔ آپ میری دردناک اندوہ ناک زندگی سے خوب واقف ہیں۔ پھر اس عالمِ نزع روح میں حالات کے اس ضیق النفس میں کچھ لکھا جاسکتا ہے؟ لکھنا بھی ایک مہتم بالشان موضوع پر۔ محترم محروم صاحب کے ایسے عظیم شاعر پر، اس اتھاہ محیط شاعری پر جس کی امواجِ سطح میں افکار کے عمیق سمندروں کی گہرائیاں غرق ہیں۔ تو بھائی!

نہ ہر جا کہ مرکب تواں تاختن

کہ جاہاں سپر باید انداختن

محترم محروم صاحب نے جس قدر مفید اہم اور مقصدی معلومات پر شعر کہے ہیں اتنے موضوعات کا تصوّر بھی دوسرے شعراء کے ذہنوں کو میسّر نہ ہوگا' ان رجحانات نے محترم کو نہ صرف شعر و ادب کا محسن عظیم بلکہ زندگیوں کا مصلحِ اعظم بنادیا ہے۔ قطع نظر نظموں سے' جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے' بہ ظاہر کوئی کہنے کو کہہ دے کہ محروم صاحب معصوم فرشتہ صفت انسان انھیں غزل سے کیا ربط' لیکن سچ یہ ہے کہ ایک دو چار دس نہیں غزلوں میں بھی اتنے اور ایسے شعر ہیں جتنے اور جیسے شعر کسی بہتر سے بہتر مانے ہوئے متغزل شاعر کے ہاں بھی بہ مشکل نکل سکیں گے۔ اور اس قادر الکلام بزرگِ محترم کی رباعیاں تو اُس معراجِ فکر و فن پر پہنچی ہوئی ہیں جہاں پہنچتے پہنچتے یگانہ چنگیزی بھی ٹھہر جائیں اور کہیں۔

اگر ایک سرِ مُوئے بر تر پَرم

فروغِ تجلّی بہ سوزد پَرم

تو آزاد صاحب! اِدھر تو زبونی صحت و نامُساعدت حالات اُدھر احساس اہمیت موضوع پھر میں چپ نہ سادھتا تو کیا کرتا۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے دل کی جانب سے ملامت بڑھتی گئی۔ اور اپنی طرف سے عقیدت کے اظہار نہ کرنے کی محرومی کا احساس کابُوس بن کر گلا دباتا رہا۔ اور یکا یک جب خیال ہوا کہ:

بندہ ہماں بہ کہ زتقصیرِ خویش عذر بہ درگاہِ خدا آورَد

ورنہ سزاوار خداوندیش کس نہ تواند کہ بجا آورَد

تو یہ چار رباعیاں موزوں ہوگئیں۔' خدا کرے موزوں ہوگئی ہوں۔ آپ انھیں دیکھ لینا۔ جہاں جو ضرورت ہو ترمیم تنسیخ کرلینا۔ مجھے اپنا کوئی اعتبار نہیں رہا ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ پگڈنڈی کا محروم نمبر خاطر خواہ شائع ہو سکے اور اس کے بعد کوئی کام محروم صاحب محترم کی خدمات و احسانات کے شایانِ شان ہو سکے۔ برا ہو اس پبلسٹی و پروپیگنڈے کا' جسے میّسر آجائے وہ کچھ نہ ہو کر بھی سب کچھ ہو جائے۔ جسے میسّر نہ آئے وہ سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہ ہو سکے۔

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

آپ کا ممنون محبت بسمل سعیدی

(۲۳)

جناب سلام مچھلی شہری

سروجنی نگر۔ نئی دہلی

۸؍ مارچ ۶۲ء

مُربّی محترم! پائندہ باد!

مزاجِ گرامی۔ عید مبارک۔ ساتھ ہی پنجاب گورنمنٹ کی جانب سے دیے گئے ادبی اعزاز کے لیے بھی دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔

ہر چند آپ ایسے عظیم المرتبت ادیب، شاعر اور ماہر تعلیم کے لیے اعزاز و انعامات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ پھر بھی میں اِسے نئی نسل کے اہلِ قلم اور فن کاروں کے لیے صوبائی حکومتوں کی جانب سے ایک حوصلہ افزا اور مبارک قدم سمجھتا ہوں۔ آپ کے اَن گنت شاگردوں کو اس نیک خبر سے ضرور خوشی ہوئی ہوگی۔ میں بھی غیر رسمی طور پر ان ہی میں سے ایک ہوں۔

خدا سے دُعا ہے کہ وہ آپ کو شاد کام و صحت مند رکھے۔ اور آپ ہمارے جاگے ہوئے ملک کے عوام کو اپنی نظموں سے ہمیشہ جگاتے رہیں۔ آج ہمیں آپ کی بخشی ہوئی روشنی کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ جے ہند۔ آزاد کو سلام کہیے۔

آپ کا پرانا خادم

(سلام مچھلی شہری)

(۲۳)

جناب یحییٰ اعظمی

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

۶؍ اپریل ۶۲ء

ملک کے نامور اور کہنہ مشق شاعر جناب تلوک چند محروم اُن اساتذۂ فن میں ہیں جن پر اُردو زبان بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ آپ کو تمام اصنافِ سخن پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ بالخصوص آپ کے قطعات و رباعیات حقائق و معانی کا دفتر

ہیں۔آپ نے اپنی بلند پایہ منظومات سے اُردو زبان کو جس طرح مالا مال فرمایا ہے۔ ہماری زبان اس کے شکریہ سے کبھی عہدہ برآنہیں ہوسکتی۔

اس دور میں جب کہ ہماری بزمِ سخن اساتذۂ فن سے خالی ہوتی جارہی ہے۔آپ کا وجودِ گرامی بسا غنیمت ہے اور موصوف کی اس پچھترویں سال گرہ کے موقع پر اُن کی درازیٔ عمر کی دعا ہر محبِّ اُردو کا قومی اور ادبی فرض ہے۔

(یحییٰ اعظمی)

(۲۴)

جناب غلام احمد فرقت

پہاڑی بھوجلہ دلّی

یکم اپریل ۱۹۶۲ء

۱۲ بجے شب

صاحب! میں علامہ محروم صاحب کے مقابلہ میں اس دَور کے تمام شعراء کو براہِ راست مرحوم سمجھتا ہوں۔مرحوم ان معنوں میں کہ اُردو شاعری کی تمام اصناف پر جو قدرت محروم صاحب کو ہے وہ موجود شعرا میں مفقود ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ شعراء کو نہ تو وہ اخلاقی' ادبی اور معاشی راشن حاصل ہے جو محروم صاحب کو حاصل رہا ہے اور اُن کو وہ حیاتیاتی راشن ہی میسر ہے جو انسان کو اپنے دل میں اتنی صلاحیتیں پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے جتنی کہ محروم صاحب میں ہیں۔ عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے جب موجودہ دور کے شعراء کی اولادیں خوردبین سے بھی بمشکل دکھائی دیں گی۔اور جب کوئی شاعر اپنی اولاد کو لے کر کسی بزمِ سخن میں جائے گا اور اگر بچّہ کا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چُھٹ جائے گا تو اُسے شرکائے بزم سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہنا پڑے گا کہ حضور: گستاخی معاف! میں اپنے بچّہ کو اپنے ہمراہ مشاعرہ میں لایا تھا مگر وہ کہیں چھوٹ کر گم ہوگیا ہے۔لہٰذا جب آپ واپس جانے لگیں تو ازراہِ کرم اپنے اپنے جوتوں کو اچھی طرح جھاڑ لیں تاکہ اگر وہ کسی صاحب کے جوتے کی سیون میں دبک رہا ہو تو نکل آئے۔اسی مناسبت سے ان کی ادبی صلاحیتیں ہوں گی۔ میں نے اب تک سیکڑوں مضامین محروم صاحب کے بارے میں پڑھے اور ان مضامین کے لکھنے والوں میں ایک نمایاں اور مشترک خصوصیت یہ دیکھی کہ ہر شخص محروم صاحب کے متعلق یہ لکھتا ہے کہ ''میں محروم صاحب کا کلام اپنے بچپن میں پڑھا تھا'' چناں چہ جب میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جن کی عمر اس وقت ساٹھ پینسٹھ سال سے کم نہیں' کے قلم کا لکھا ہوا یہ فقرہ دیکھا تو جل کر اپنے دل میں کہنا شروع کردیا کہ میں نے اپنی ادھیڑ عمر میں محروم صاحب کو بچہ دیکھا ہے اور اُن کے کلام تک کو اُن

سے معمر پایا ہے۔ اور وہ یوں کہ محروم صاحب بچوں کے لیے جو نظمیں لکھتے ہیں اُن میں اتنی صداقت اتنی سچائی اور معصومیت ہوتی ہے وہ فنی اعتبار سے بچوں کی ہم عمر ہوتی ہیں۔ مگر مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ محروم صاحب کو میں حقیقتاً ہندوستان کا بزرگ ترین شاعر مانتا ہوں۔ عمر کے لحاظ سے بھی اور فن کی پختگی کے اعتبار سے بھی۔ لہٰذا اگر انھیں اس دور کا بزرگ تریں نوجوان شاعر نہ کہا جائے تو اُن کے ساتھ بڑی بے ادبی ہوگی۔ بزرگ ان معنوں میں کہ وہ واقعی بزرگ ہیں اور نوجوان یوں کہ وہ اس عمر میں بھی اُردو ادب کی وہ خدمت کر رہے ہیں جن پر ہزاروں نوجوان شعراء کی جوانیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مخلص

غلام احمد فرقت کاکوروی

(۲۵)

حمیدہ سلطان احمد

مجھے محروم صاحب کی نظم ''نور جہاں'' نے اوائل عمری میں متاثر کیا اس کے بعد اکثر معیاری رسائل میں محروم صاحب کی نظمیں میں نے دیکھیں مگر ان سے شرفِ نیاز ۱۹۴۸ء کے بعد حاصل ہوا۔ جب تقسیمِ ملک کی وجہ سے وہ اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر دتی میں آ بسے۔

محروم صاحب ہر حیثیت سے بلند و بالا انسان ہیں۔ سرو قد ہونے کے ساتھ بلند صفات کے اونچے شاعر بھی ہیں۔ قدرت نے بڑی فیاضی سے کام لے کر اُن کو وجاہت و پاکیزگی اور شعر کہنے کی پوری قدرت بخشی ہے۔

یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ جیسا کسی انسان کا اخلاق ہوتا ہے اس کا اثر اس کے فن پر ہوتا ہے۔ اخلاقی طور پر ہمارے شعراء کافی بدنام ہیں۔ لیکن محروم صاحب کا بلند کردار اِن تمام خامیوں سے جو ان کے ہم مشرب لوگوں میں ہیں پاک ہے۔ ڈر ہو عابد بن جانا تو آسان ہے' مگر مے خانے میں اس طرح رہنا کہ دامن آلودہ نہ ہو' بہت بڑے کردار کی بات ہے۔ محروم صاحب تمام عمر بے پئے جھومتے رہے۔ اردو شاعری کو ان پر یوں بھی فخر ہے کہ وہ ملائک صفت انسان ہیں۔ ان کی انسان دوستی' ان کی فراخ دلی۔ ان کی نیک اور سادہ طبیعت اور شریفانہ اطوار چند مرتبہ ملنے پر ہی ہر انسان کو موہ لیتے

ہیں۔ وہ پیشہ ورانہ حسد محروم صاحب میں بالکل نہیں ہے جو اُردو کے شاعروں کی عادت میں داخل ہے۔ وہ اپنے ساتھی سے محبت کرتے ہیں۔ بزرگوں کا احترام چھوٹوں پر شفقت فرماتے ہیں۔

محروم صاحب نے اپنی ادبی خدمات پر کبھی فخر نہیں کیا۔ یہ معصوم صفت برگزیدہ شاعر ادبی حلقوں میں اپنی پاکیزہ طینت اور بلند کردار ہونے کے سبب واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ دلّی شاخ کے پانچ سال سے وہ نائب صدر ہیں اس طرح مجھے ان کے قدموں میں بیٹھنے کا زیادہ موقع ملا ہے۔

محروم صاحب کی شاعری اور ادبی کاموں کے متعلق میرا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے۔ اور پڑھے لکھے لوگ اس کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ میں تو ان کو اپنا ایک شفیق بزرگ اور اُردو کا ایک مخلص کام کرنے والا سمجھتی ہوں اور ان کی شاعری سے زیادہ اُن کے پاکیزہ صفات کی مداح ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ ہمارے نوجوان شعراء محروم صاحب کے نقشِ قدم پر چلیں اور دیکھیں کہ اگر انسان بذاتِ خود اچھا ہو' خصوصاً بڑا شاعر یا ادیب تو اپنے اچھے اخلاق کے اثر سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ شاعر اور ادیب قوم کی آبرو ہیں۔ جس زبان کے شاعر و ادیب بد اخلاق ہوں گے اُس کے بولنے والے اخلاقی خوبیوں سے محروم ہو جائیں گے۔ میرا یہ خیال ہے کہ صالح انسان ہی اچھا ادب پیدا کرسکتا ہے اور اعلیٰ اقدار کو پھیلا سکتا ہے۔ جو انسان اخلاقی طور پر گرا ہوا ہوگا خواہ کتنے ہی اونچے درجے کا شاعر و ادیب ہو اس کی اخلاقی گراوٹ اس کے دامن پر بدنما داغ بن کر رہ جائے گا۔

خداوند کریم محروم صاحب کو نئی نسل کی اپنے کاموں اور کردار سے رہنمائی کرنے کے لیے سلامت رکھے۔ بقول غالبؔ:

وہ سلامت رہیں ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۲۶)

جناب عالم فتح پوری

آگرہ

۱۷/ مارچ ۶۲ء

محترم المقام حضرت محروم صاحب زاد لطفہٗ

آج قریب دس دن کے بعد مشاعرے سے واپس آگرہ آیا ہوں۔ سفر کے دوران میں یہ جاں فزا خبر کسی اخبار میں پڑھ کر خوشی کی حد نہ رہی کہ حکومتِ پنجاب نے آپ کی دیرینہ اور ممتاز ادبی خدمت کو نواز کر اپنی منصف مزاجی اور حق پرستی کا ثبوت دیا۔ درحقیقت نہ صرف پنجاب کی حکومت بلکہ حکومتِ ہند آپ کی ادبی بے لوث خدمات اور آپ کی عظیم فن کارانہ کاوشوں کی جتنی بھی قدر کرے کم ہے۔ میرے لیے یہ ایک انبساط فراواں اور مسرت دائمی کا موقع ہے کہ میرے ممدوح کا حکومتِ پنجاب نے سرکاری سطح پر احترام کر کے ہندوستان کے سینکڑوں اُن ادیب اور فن کاروں کے قلب کو مسرت عطا کی جو ''محروم'' کو نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کی علمی اور ادبی محفل کی ایک قندیل روشن تصور کرتے رہے ہیں۔

محترم میری دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

نیاز کیش

عالم فتح پوری

(۴۷)

جناب سرشار سیلانی

بمبئی

۱۳ر فروری ۶۲ء

برادرِ محترم آزاد صاحب۔ تسلیم!

یاد فرمائی کا شکریہ اور اس نوازش کے لیے مزید شکریہ کہ آپ نے میری مصروفیات کا احساس فرما کر پگڈنڈی کے محروم نمبر کے لیے مجھ سے کسی خاص تحریر یا مقالے کا مطالبہ نہیں فرمایا بلکہ صرف پیغام طلبی پر اکتفا کیا۔ اور اس طرح میری بے بضاعتی یا نااہلی کو رسوا ہونے سے بچالیا۔ حق یہ ہے کہ عظیم شخصیتوں پر قلم اُٹھانے کا حق کچھ عظیم شخصیتیں ہی ادا کرسکتی ہیں اور پھر محروم صاحب تو اِس لحاظ سے عظیم تر ہیں کہ اُردو کے دنیائے ادب میں اتنے انقلاب رونما ہونے کے باوجود اُن کے نام و کلام کی وقعت و عظمت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا بلکہ اس میں کچھ خوش گوار اضافے ہوئے ہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

محروم صاحب کی شاعری کی عمر اب نصف صدی سے بھی دس پانچ سال اوپر ہوچکی ہے۔ گویا اُن کی شاعری کا ابتدائی دور اُس وقت کے مجددِ فن مولانا حالی (مرحوم) کی زندگی اور شاعری دونوں کا آخری دور تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طویل
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

مدّت میں کتنے چراغ جلے۔ کتنے ماند پڑے کتنے ماضی کی دُھندلی یادگار یا چراغِ مزار بن کر رہ گئے۔ مگر جن چراغوں کی تابانی کو انقلابِ زمانہ کی کوئی آندھی یا طوفان متاثر نہیں کر سکی اُن کی تعداد پانچ سات سے زیادہ نہیں۔ اور یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر دبستانِ سخن کے ایک ہزار طلبا سے اُن پانچ سات کی فہرست دینے کو کہا جائے تو اختلافِ ذوق ونظر کے باوجود سب کی فہرست میں حضرت محروم کے اسمِ گرامی کا ہونا یقینی ہے اور اگر سرِ فہرست بھی نظر آجائے تو چونکنے کا محل نہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

اس میں شک نہیں کہ تاریخِ ادب کے مذکورہ دور میں جناب محروم کے مقبول ومشہور ہم عصروں یا ہم سفروں میں کچھ ایسے بزرگانِ فن بھی موجود ہیں، جن کے ہاں اربابِ نظر کو یقیناً کچھ غیر فانی نقوشِ فن مل جائیں گے۔ مگر مجموعی طور پر محروم صاحب کے سوا شاید ہی کوئی ایسی مثال مل سکے جس پر ادبی دنیا کے کسی گوشے سے انگشتِ اعتراض نہ اُٹھے۔ سخن فہمی کے مدعیوں کا ایک گروہ اگر کسی سخن ور کے اثاثہ سخن کو سرمایۂ حیات قرار دیتا ہے تو دوسرے گروہ کو وہی ''سرمایۂ حیات'' رجعت پسندی یا شدید مذہب پرستی کا مظہر دکھائی دیتا ہے۔ کہیں کسی کی مسلّم الثبوت اُستادی کے اقرار کے ساتھ سخن کی دل پذیری سے انکار ہے کہیں کلام کی افادیت کے باوجود بے کیفی کا شکوہ ہے۔ کوئی کسی کے ترنم کی فریادی ہے۔ غرض کسی نہ کسی پہلو سے ہر کسی پر کچھ نہ کچھ اعتراض پائے جاتے ہیں۔ اگر چہ صورتِ حال کے اس پہلو سے متعلقہ شخصیتوں کی مسلمہ عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر یہ حقیقت ضرور سامنے آجاتی ہے۔ کہ مداحوں کے مقابلے میں معترضین کی تعداد ہزار قلیل سہی مگر اُن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ جسے کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن محروم صاحب کی عظمتِ سخن کا یہ عالم ہے کہ ہر مکتبِ خیال کے لوگ اُس کے معترف ہیں رجعت پسند ہو یا ترقی پسند۔ پرانی نسل کا نمائندہ ہو یا نئی نسل کا ترجمان۔ حُسنِ زبان کا دیوانہ ہو یا اسلوبِ بیان کا دل دادہ۔ کلامِ محروم کی اہمیت اور دل آویزی سے انکار نہیں کر سکتا۔ انکار تو درکنار یہاں تو ''ہر کہ شک آرد کافر گردد'' والا معاملہ ہے۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

جسٹس سر عبدالقادر (مرحوم) نے آپ کے متعلق یہ فرما کر اظہارِ حقیقت کیا ہے کہ:

''جناب تلوک چند محروم اپنے تخلص کی مناسبت سے دنیا کی بعض اور نعمتوں سے محروم رہے ہوں تو اور بات ہے۔ مگر خدا داد لطفِ سخن اور موزونیٔ طبع سے اُنھیں حصّہ وافر ملا ہے۔''

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

محروم صاحب کی شاعری گلہائے رنگ کا ایک ایسا سدا بہار چمن ہے جس کی خوبی و لطافت کا قصیدہ وہ صیادانِ فن بھی پڑھتے ہیں جنھوں نے بڑے بڑوں کو اپنے خدنگ اختلاف کا نشانہ بنایا۔ اس مقام پر مجھے بے اختیار سید عبدالحمید عدم کی یاد آگئی۔ مگر صیاد کی حیثیت سے نہیں ایک دیانت دار نقاد کی حیثیت سے "تقسیمِ ہند" سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے' ایک ادبی گفتگو میں اُنھوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ

"میں نے تلوک چند محروم" سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا (غالباً وہی مضمون جو بعد میں محروم صاحب کے متعلق مجموعہ مُضامین میں شائع ہوا) مگر حق یہ ہے کہ حق ادا نہیں کر سکا۔ میں نے اُس میں یہ لکھا کہ محروم ایک بڑا شاعر ہے۔ دراصل میں یہ لکھنا چاہتا تھا کہ محروم اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر ہے مگر لکھ نہ سکا" شاید اس لیے ؎

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی

خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

~~~~~~~~~~~~~~~~~~

شاعری سے قطع نظر محروم صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو بھی کتنا تابناک ہے کہ اتنی قدر و منزلت کے باوجود طبیعت میں غرور کا شائبہ تک نہیں۔ بلکہ سراپا انکسار ہیں۔

غالباً سن ۳۲ یا ۳۳ یعنی میری نوعمری کے زمانے کا ذکر ہے۔ روزنامہ پرتاپ لاہور میں "چمن چمن کے پھول" کے زیرِ عنوان ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس میں اُس دور کے ممتاز اور نامور شعراء شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک بار جناب محروم کے نام کے ساتھ مدیر پرتاپ لالہ نانک چند ناز نے "خدائے سخن" کے الفاظ چھاپ دیے اور اسی اشاعت میں دوسرے ہفتے کے لیے یہ مصرع طرح بھی دیا:

خدا بھلا کرے آزادی دینے والوں کا

چناں چہ محروم صاحب نے اپنی مطروحہ غزل میں ایک شعر یہ بھی لکھا:

جنابِ نازؔ نہ لکھیں مجھے خدائے سخن!

غلامِ خاک نشیں ہوں میں باکمالوں کا

اُسی اشاعت میں اُن کا یہ قطعہ بھی شائع ہوا تھا:
~~~~~~~~~~~~~~~~~~

لطف و کرم سے اپنے خدائے کریم نے
پیدا کیا اگرچہ برائے سخن مجھے
ناچیز ہوں میں بندۂ درگاہِ شاعری
لکھا کریں نہ آپ خدائے سخن مجھے

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

اربابِ ''پگ ڈنڈی'' بلا شبہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جو اس عظیم شاعر سے اظہارِ عقیدت کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ خدائے کریم محرومؔ صاحب کو تندرستی اور خوش حالی کے ساتھ سلامت رکھے۔

(سرشار سیلانی)

(۲۸)

جناب سرشار سیلانی

جگشیوری بمبئی

۱۴ر فروری ۱۹۶۲ء

آزاد بھائی! تسلیم و نیاز۔

اُمید ہے کہ میرا پہلا عریضہ باریاب ہو چکا ہوگا۔ بعد میں محسوس ہوا کہ اُس میں ایک آدھ جگہ فروگذاشت رہ گئی۔ اس لیے دوسرا خط لکھ رہا ہوں۔

میں نے اُس مضمون نما خط یا خط نما مضمون میں قبلہ محروم صاحب کے متعلق سید عبدالحمید عدمؔ کی رائے لکھی ہے۔ لکھنے اور خط پوسٹ کرنے کے بعد خیال آیا کہ عدمؔ صاحب نے کسی مصلحت سے اصل مضمون میں جو بات اپنے نام سے نہیں لکھی تو اب مجھے بھی اخلاقاً اُن کا نام ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس لیے آپ بعد عدم صاحب کے نام کی جگہ ''پاکستان کے ایک بہت بڑے غزل گو'' لکھ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں مجھ سے لکھتے وقت ایک بھول اور ہوگئی۔ عدم صاحب کا مفہوم دراصل یہ تھا کہ ''محروم صاحب ہندوستان کے سب سے بڑے نظم نگار شاعر ہیں۔'' اُمید ہے کہ آپ تصحیح فرمالیں گے۔ اگر آپ مضمون کے اس ''ٹکڑے'' کی بجائے عدم صاحب کے اظہار کا ماحصل یوں درج کرلیں۔ تو میرے خیال میں عدم صاحب
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

کا نام لکھنے میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ آخر حق بات ہی تو کہی تھی انھوں نے۔ عدم صاحب کا مفہوم دراصل یہ تھا۔

''یوں تو غزل میں بھی جناب محروم کی انفرادیت کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر جہاں تک نظم کا تعلق ہے اس میدان میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میں نے (عدم) اُن کے متعلق ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ محروم اپنے دور کا بہت بڑا نظم نگار شاعر ہے دراصل میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ محروم اپنے دور کا سب سے بڑا نظم نگار ہے۔ مگر کہہ نہ سکا'' شاید اس لیے:

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی

خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اوپر کی تحریر میں آپ بلا تامّل عدم صاحب کا نام لکھ سکتے ہیں۔ فقط زیادہ نیاز۔

آپ کا

سرشار

(۲۹)

جناب عبدالعزیز فطرت

راول پنڈی

۲۳؍ مارچ ۱۹۶۲ء

قبلہ محروم صاحب کی جو عزت افزائی چنڈی گڑھ میں ہوئی وہ درحقیقت اُردو ہی کی عزت افزائی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ خلعت دینے والوں اور نذر پیش کرنے والوں کا اعزاز ہے۔ بہر حال یہ بات بہت ہی اچھی ہوئی۔ میری طرف سے ناچیز ہدیۂ مبارک باد پیش کریں۔ کاش یہ قسمت ہوتی کہ اس تقریب میں خود بھی موجود ہوتا۔

(ایک خط کا اقتباس)

عبدالعزیز فطرت

(۳۰)

جناب ضیا محمد ضیا

پسرور

۲۸/جنوری ۵۸ء

گرامی منزلت ۔تسلیماتِ نیاز مندانہ

آپ کا ہدیہ موصول ہوا' اور جواہر معانی کا وہ بیش بہا گنجینہ جس کے لیے میں پچھلے تین برس سے سراپا انتظار اور ہمہ تن شوق بنا ہوا تھا بالآخر مجھے مل گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی اس نوازش کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں اور اپنے جذباتِ سپاس کے لیے زبانِ اظہار کہاں سے لاؤں۔ یعنی:

چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں اس پر
لیکن الفاظ ہی نہیں ملتے

میرے خیال میں ایک شاعر بخوبی اس کا تصور کرسکتا ہے کہ جب میں نے آپ کا رجسٹرڈ پیکٹ وصول کیا ہوگا اور نامہ دلدار جاں نذرِ دل فریبی عنوان کیے ہوئے' کھولا ہوگا تو اس وقت میرے دل کی کیفیات کیا ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ''گنجِ معانی'' ہم کشتگانِ ذوقِ قدیم کے لیے ایک بے بدل تحفہ ہے۔ اور ہم اس مجموعۂ اشعار پر جدید شاعری کے بیشتر مجموعوں کو قربان کرسکتے ہیں۔ ماڈرن شاعری میں اور سب کچھ سہی مگر وہ چیز کہیں نظر نہیں آتی' جس کو بقول حالیؔ جادو کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا' اور جو درحقیقت شاعری کی جان ہے۔ ہمیں اس میں وہ وجدانی کیفیت نہیں ملتی جو دل و دماغ کو بیک وقت مسحور و مخمور کرتی اور سرورِ مے کی طرح رگ و پے میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ ہمارے فارسی شاعر نے غالباً اس چیز کی طرف اشارہ کیا تھا:

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ز یک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں خمارِ چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اور شاید یہ اسی ''چیزِ دگر'' کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ ہماری موجودہ شاعری دماغوں کو متاثر کرے تو کرے مگر دلوں کو

کیف بخشے، روحوں کو پیاس بجھانے اور طبیعتوں میں درد اور سوز و گداز پیدا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتی، اور اس کی بنیادی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ یہ شاعری گوناگوں سیاسی تصورات اور سماجی نظریات کا پرچار تو کرتی ہے مگر اخلاقی اور روحانی اقدار کا ذکر اپنی زبان پر لانا پسند نہیں کرتی۔ اور اگر کوئی فن کار ادب و شعر میں مذہب و اخلاق کی بنیادی حقیقتوں اور عالم گیر سچائیوں کا اظہار کرتا ہے یا اعلیٰ انسانیت کے تقاضوں کو اپنا موضوع بناتا ہے تو عصرِ حاضر کا ''فن پرست'' نقاد اسے واعظ مذہبی مبلغ اور دھرم اُپدیشک کہہ کر اُس کی شاعرانہ عظمت کا استخفاف شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے شاعر بھی اپنی ناصحانہ شاعری کا کفارہ ادا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ (آپ کی ذاتِ گرامی پر تنقید میرا مقصود ہرگز نہیں، بلکہ ایک عام حقیقت کا اظہار مطلوب ہے۔ خدارا اس سخن گسترانہ کو گستاخی پر محمول نہ فرمایئے گا)

اس پس منظر میں گنجِ معانی اور رباعیاتِ محروم جیسی کتابوں کو جو اہمیت اور قدر و قیمت ہماری نظروں میں ہوگی محتاجِ بیان نہیں۔

میرے نزدیک آپ کی شاعری کا یہ اخلاقی اور اصلاحی رنگ بالکل نیچرل اور فطری ہے اس رنگ کو اگر ایک طرف آپ کی فطرتِ صالحہ نے نکھارا ہے تو دوسری طرف آپ کے Profes eir نے بھی اسے شوخ اور گہرا کرنے میں مدد دی ہے۔ آپ کی پوری عمر تعلیم و تدریس کے اس مقدس کام میں گزری ہے جس کو پیغمبروں اور رشیوں کا پیشہ کہا جاتا ہے۔ معلّمانہ ذہن سے ایسے ہی پاکیزہ افکار کی توقع کی جا سکتی تھی۔ خوش قسمتی سے ہم بھی اپنی علمی بے مائگی اور عملی تہی دامنی کے باوجود اس پیشے میں داخل ہیں۔ اور آپ کی شاعری کے بعض پہلوؤں سے صحیح طور پر محظوظ اور مستفید ہونے کا موقع قدرت نے ہمیں دے رکھا ہے۔ مدرسہ کی یاد، علم، استاد، بچوں کا ہفتہ، مدحتِ علم، شام جدائی، دیر بھان کا نوحہ تو بالکل ہماری اپنی دنیا کی چیزیں ہیں جن کو ہم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ پھر معلمینِ اُردو کا تو آپ کے ساتھ اور بھی گہرا تعلق ہے۔ تو ہی تو ہے، زمزمۂ توحید، نور جہاں کا مزار، جگانے کی گھڑی، آندھی، سپاہی کا خواب، اپنا گھر، یہ کس کے جلوے ہیں سارے، یہ وہ نظمیں ہیں جو ہماری کتب نصاب میں شروع ہی سے داخل چلی آتی ہیں اور ہم مدّت ہائے دراز سے انھیں مختلف درجوں میں پڑھاتے چلے آرہے ہیں۔ اور اب تو یہ ہمیں حفظ بھی ہو چکی ہیں۔ غیر معلمین اِن منظومات سے ہماری طرح یقیناً لطف اندوز نہیں ہوسکتے۔

گنجِ معانی میں سب سے زیادہ Touching وہ باب ہے جو آپ کی اہلیہ کے مرثیوں پر مشتمل ہے۔ ان درد انگیز نوحوں کو پڑھ کر کوئی بھی صاحبِ دل آب دیدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں خود کئی بار اس طوفانِ غم میں ڈوب کر رہ گیا ہوں۔ ان مرثیوں کو پڑھ کر میں نے بارہا ارادہ کیا کہ آپ سے اس وِدیارتی کا حال بھی دریافت کروں جسے بے رحم موت نے شیر خوارگی ہی میں آغوشِ مادر سے محروم کر دیا تھا۔ مگر مجلّہ نقوش لاہور کے شخصیات نمبر میں آپ کے فرزندِ نامور نے آپ پر جو فیچر لکھا ہے اس میں موصوفہ کی خودکشی کی لرزہ خیز روداد نظروں سے گزری۔ جوان بیٹی کے جل کر لقمۂ اجل ہو جانے پر

آپ نے جو نوحے قطعات کی صورت میں لکھے ہیں اُن کو پڑھ کر آپ کی رفیقۂ حیات کے حادثۂ مرگ کی یاد تازہ ہو گئی اور طبیعت دیر تک اس واقعۂ دل گداز سے متاثر و مغموم رہی۔ یہ قطعہ نہایت دردناک ہے۔

کینِ فلک اے وائے کہ داغِ جگرم داد

فریاد بر آوردم و داغِ دگرم داد

آں داغِ جگر پارۂ خونِ جگرم سوخت

دیں داغِ دگر آہ کہ سرتا بہ سرم سوخت

شکنتلا کا مرثیہ بھی کچھ کم رقّت انگیز نہیں۔ تیسری صبح کا آخری شعر پڑھنے والے پر حسرت واندوہ کی ایک عجیب کیفیت طاری کر دیتا ہے۔

صدمہ نہ تا کہ ہو تری معصوم روح کو

ہوتا ہے ساز اب مری فریاد کا خموش

مگر حیرت ہے کہ آپ نے (مندرجہ بالا قطعہ کے سوا) ان منظومات کو گنجِ معانی میں شامل نہیں کیا۔ میری رائے میں لیڈی ہارڈنگ والی نظم کا نئے ایڈیشن سے حذف کر دینا جتنا ضروری تھا، اپنی بچیوں کے ان مرثیوں کا شاملِ کتاب کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری تھا تا کہ ان کی یادگار بھی ہمیشہ محفوظ ہو جاتی۔

بہر حال گنجِ معانی میرے لیے آپ کی ایک ایسی مبارک اور قابلِ فخر یادگار ہے جسے میں ہمیشہ حرزِ جان بنا کر اور سینے سے لگا کر رکھوں گا۔ آپ نے اپنے ایک مشتاقِ نادیدہ پر جو نوازش فرمائی ہے اور ایک اجنبی کے ساتھ ایفائے عہد کی جو پاکیزہ مثال قائم کی ہے فی زمانہ بڑی نادر اور شاذ ہے۔ اور میں اس سے بے حد متاثر ہوں۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش وخرم اور سلامت رکھے۔ اب میرے دل میں ایک آرزو باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ خدا زندگی میں ایک بار آپ کے دیدار کی سعادت سے بہرہ ور کر دے اور میں اپنی آنکھوں سے اگلی شرافت کے اس جیتے جاگتے نمونے کو دیکھ لوں جو ہماری اُردو شاعری کے رنگِ قدیم کا شاید یہ آخری نمائندہ ہے۔

لختِ ہائے دل بود پیچیدہ در مکتوبِ من

از شکستِ نامہ خواہی یافت مضمونِ مرا

جنابِ آزاد کو ایک بندۂ حقیر کا سلام پہنچے۔ نیاز کیش۔ ضیا محمد ضیاء پسرور (سیالکوٹ)

(۳۱)

جناب محمد صدیق طاہر شاذانی

گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور

۲۳/ اکتوبر ۱۹۵۷ء

حکایتِ قدِ آں یارِ دل نواز کنم
بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم

مکرم ومحترم جناب محروم صاحب!

آداب وتسلیمات! مزاجِ گرامی! ۱۹۴۷ء کے انقلابِ آزادی میں یوں تو حادثات کے بڑے بڑے کاری زخم اس دل پہ لگے لیکن ہمارا محروم جیسے شاعرِ بے بدل سے محروم ہوجانا ملک وقوم کی بہت بڑی محرومی تھی۔ ایسی محرومی جس کی تلافی آئندہ کبھی نہ ہوسکے گی۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ یوپی کا علاقہ بے شک اُردو کی جنم بھومی ہے۔ اس لحاظ سے یہ سرزمین بڑے سے بڑا شاعر پیدا کرسکتی ہے لیکن اقبال' محروم' اور حفیظ ایسے شاعر ہرگز پیدا نہیں کرسکتی۔ افسوس:

ایک دولت تھی ہماری سو اُسے کھو بیٹھے

محروم صاحب! آپ کا مجموعۂ کلام ''گنجِ معانی'' زیرِ مطالعہ رہتا ہے اس طرح آپ کے خیالات اور آپ کی علمی صحبت سے فیض یاب ہونے کا شرف تو عام طور پر گھر بیٹھے ہی حاصل ہوجاتا ہے۔ لیکن:

اس نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں

گنجِ معانی کے مصنف سے ملاقات کی خواہش دل کو ہمیشہ بے قرار رکھتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اُڑ کے ہندوستان پہنچوں اور محروم کے قدموں پر سر رکھ کر اس کی شاعرانہ عظمت کے حضور میں خراجِ عقیدت پیش کروں۔ لیکن شاید میری یہ آرزو پوری نہ ہوسکے گی۔ پچھلے دنوں ایک شعری اجتماع کے موقع پر پاکستان میں آپ کی آمد کا اعلان ہوا تو آپ کا یہ غائبانہ نیازمند اپنے تمام دھندے چھوڑ چھاڑ صرف آپ کے دیدار کی تمنا دل میں لیے ہوئے لاہور پہنچا لیکن آپ تشریف نہ لائے اور دل کی دل ہی میں رہ گئی:

از درِ دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

وہ عندلیبِ خوش نوا جس نے اپنے پُر کیف ترانوں سے مدّتوں اہلِ پنجاب کو گرمایا۔ وہ شاعر جس کے نغموں کا گداز دلوں کو درد کی دولتِ لازوال عطا کرتا رہا۔ آج ایک ایسے مقام پر جابسا ہے جو ہماری دسترس سے بہت دُور ہے۔

قبلہ محروم صاحب! سوزِ محبت اور درد کا جو خلوص مجھے آپ کی شاعری میں ملا۔ اس کے دور کے بڑے بڑے شاعروں کا کلام اُس سے خالی نظر آتا ہے۔ زندگی کے المیہ پہلوؤں کو نظم کرنے کا جو ملکہ قدرت نے آپ کو ودیعت کر رکھا ہے اُس میں آپ کا ایک منفرد مقام ہے۔ آپ کے المیہ شاہ پاروں میں یوں تو ہر ایک نظم اپنے موضوع کی گیرائی' گہرائی اور زبان و بیان کے اعتبار سے کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن "نومبر کی ایک صبح" اور "اشکِ حسرت" کے مطالعہ سے تو میں اس قدر متاثر ہوتا ہوں کہ میرے لئے آنسوؤں کا ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

"نومبر کی ایک صبح" میں شاعر نے ابتدا میں "مناظرِ شبانہ" کی ایک دل کش اور نظر فریب کیفیت بیان کی ہے۔ اُس روپہلی اور مستانہ رات کی پُر سکون فضاؤں میں جب کہ عالم میں ہر طرف انوار کی بارش ہو رہی ہے۔ خود شاعر کے دل پر غم کا مہیب اندھیرا مسلّط ہے۔ زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں کا یہ تقابل کتنا دردناک ہے۔ "ہر منظرِ شبانہ پہ آرام کی جھلک۔ لیکن شاعر کے غم کدے پر موت کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ اس کی رفیقۂ حیات زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اپنی دنیا برباد ہوتے دیکھ کر اُس کے دل پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں اور اس کا نالۂ شب گیر شعر کے پیرائے میں ڈھل کر نظم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

چاروں طرف ہوا کی خموشی سکوں افزا

یک رنگئ فضا کی خموشی سکوں فزا

ماحول کی یہ پُر سکون کیفیت بیان کرنے کے بعد شاعر جب اچانک یہ کہہ دیتا ہے:

آدھی سے کچھ سوا شبِ ماتم تھی ڈھل چکی

تو معاً قاری کے دل پر غم کی ایسی چوٹ پڑتی ہے کہ یہ تمام کائنات اُس کے لیے جنازہ بردوش ہو کے رہ جاتی ہے۔ اُس کا دل جبر مشیت سے لرز جاتا ہے اور وہ اس ماتم خانۂ برنا و پیر کی بے ثباتی کا جاں گداز منظر دیکھ کر ایک بے کراں غم میں ڈوب جاتا ہے۔

شاعر کی رفیقۂ حیات پر نزع کا عالم طاری ہے۔ وہ اپنا قصرِ آرزو اپنی آنکھوں کے سامنے نہایت بے بسی کے عالم میں برباد ہوتے دیکھ رہا ہے۔ وفا شعار بیوی کی نگاہِ واپسیں اس سے دیکھی نہیں جاتی۔ موت کی ہچکیوں میں اُس پیکرِ عصمت کا ہاتھ جوڑ کر اپنے سرتاج سے معافی طلب کرنا تو اُس پر اور بھی قیامت ڈھا رہا ہے۔ اس موقع پر شاعر کا غم نقطۂ عروج پر ہے۔ اس مقام پر ایک مشرقی خاتون کا جذبۂ وفا بھی قاری کو بے حد متاثر کرتا ہے۔

حالت نگاہِ باز پسیں کی نظر میں ہے

اک تیر تھا کہ آہ ابھی تک جگر میں ہے

حسرت بھری نگاہ کا پھرنا مری طرف

ہاتھوں کا آہ جُڑ کے وہ گرنا مری طرف

حیرت میں آج تک ہوں کہ کیوں زندہ رہ گیا

کس درجہ سخت جاں تھا کہ یہ صدمہ سہہ گیا

اور پھر شبِ مہتاب کی جلوہ باریوں میں جب کہ دُنیا والے میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ شاعر کی شمعِ وفا کا شمعِ سحر سے پہلے ہی گل ہو جانا اور اُس کے اپنے چاند کا غروبِ قمر سے پہلے ہی ڈوب جانا غم و حسرت کے اتنے پہلو اپنے اندر رکھتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں درد کا ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے اور وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ شاعر کا غم اُس کا اپنا غم ہے۔

''شاعر کی وفا کا چاند غروب ہو جانے کے بعد قیامتِ ہجرِ دوام کے آفتاب کا طلوع ہونا۔'' چاند ڈوب جانے کے بعد سورج کا نکلنا کتنا نیچرل مضمون ہے۔ نظم کا آخری بند پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر فرطِ غم سے دیوانہ ہو چکا ہے اور اُسے اب صرف موت کی آغوش ہی میں سکون مل سکتا ہے:

گودم میں اپنے کثرتِ شیون سے دم نہ تھا

غم خانہ میرا عرصۂ محشر سے کم نہ تھا

مارا ہوا ہوں ایک نومبر کی صبح کا

ہے انتظار اب مجھے محشر کی صبح کا

محترم! میں یہاں تنگئ وقت کے باعث صرف ایک نظم کا مختصر جائزہ ہی پیش کرسکا ہوں۔ ورنہ گنجِ معانی میں تو اس قسم کے بیسیوں شعری جواہر پارے موجود ہیں جو شیفتگانِ اُردو کو رہتی دنیا تک انسانیت' اخلاق، نوعِ انسان کی سچی محبت اور سوز و گداز کی دولت سے مالا مال کرتے رہیں گے۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

جی چاہتا ہے کہ حسنِ دوست کی یہ دل آویز داستان اسی طرح جاری رہے۔ لیکن طولِ کلام کا احساس قلم کو روک روک لیتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تا دیر سلامت رکھے کیوں کہ ہندوستان میں اُردو کی نشاۃ ثانیہ کا دار و مدار صرف آپ ایسے چند بزرگوں کی ذات پر ہے۔

اگر آپ کا کوئی نیا مجموعۂ کلام منظر عام پر آنے والا ہو تو واپسی مطلع کر کے ممنون فرمائیں۔ اس نیاز نامے کا جواب واپسی رقم فرمایئے اور اپنے ایک دور افتادہ نیاز مند کو سراپا امتنان بنایئے۔ والسلام مع الاکرام :

قاصد سپردہ ایم بدستِ تو نامہ را
ایں خطِ بندگی ست مبادا کہ گم شود

آپ کا غائبانہ نیاز مند

(محمد صدیق طاہر شادانی)

(۳۲)

جناب ضیا محمد ضیاؔ

پسرور ضلع سیالکوٹ

۱۹/ستمبر ۱۹۶۲ء

برادرم! تسلیمات۔

آپ کے نامۂ گرامی سے محبت و اخلاص کے اس جذبے کو بڑی قوت ملی۔ جو آپ کے لیے مدت سے میرے دل میں ہے۔ اس جذبے کی خالق دو چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کو میرے مخدوم بزرگوار حضرت محروم مدظلہٗ سے نسبت فرزندگی

حاصل ہے اور دوسری یہ کہ آپ شاعری میں میرے ہم مسلک ہیں اور انھی افکار و خیالات کے نمائندے اور ترجمان ہیں جن کو میں عزیز رکھتا ہوں۔ آپ کی بعض منظومات کا میرے دل پر بڑا گہرا اثر ہے۔ بھارت کے مسلمان'' تو دیر تک میرے دماغ میں گونجتی رہی۔ بعض اور چیزیں بھی وقتاً فوقتاً وجہ اشتراک ہوتی ہیں۔ مولانا آزاد اور مولانا سالک کی نوحہ خوانی میں آپ اور میں برابر کے شریک تھے۔ لاہور کے جس ماہنامے میں سالک صاحب کی وفات پر خوشتر گرامی کے نام آپ کا طویل خط چھپا اور جس میں قبلہ محروم صاحب کی تین رباعیات بھی شائع ہوئیں۔ اس میں میری فارسی نظم اور قطعہ تاریخ بھی شامل تھا۔ نقوش کے شخصیات نمبر میں اپنے والدِ محترم کی شخصیت پر آپ نے جو کچھ لکھا اور مذکورہ خط میں اپنے جو احوال و کوائف تحریر فرمائے اور پھر آپ کی جو دوسری متعدد شعری تخلیقات میری نظر سے گزریں۔ ان سب نے ایک خاص تعلقِ خاطر آپ سے پیدا کیا۔ شاعری میں اپنے والدِ محترم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اخلاقی روایات کو آپ نے جس انداز سے آگے بڑھایا ہے۔ اس سے میرے دل میں آپ کی ایک خصوصی قدر و منزلت ہے۔ کلاس میں بھی جنابِ محروم کا کلام پڑھاتا ہوں اور ان کے نظریۂ شعر کا تعارف کراتا ہوں آپ کا ذکر ضرور اس میں شامل ہوتا ہے۔ اپنے خطوط میں باقاعدہ ہدیۂ سلام آپ کو بھیجتا رہا ہوں۔

تمہید مضمون سے بھی زیادہ طولانی ہوگئی۔ معافی چاہتا ہوں اور برسرِ مطلب آتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ پگڈنڈی کے محروم نمبر کے لیے مقالہ لکھنے کی دعوت دے کر آپ نے مجھے بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ ہر چند کہ میرے لیے یہ ایک خدا ساز بات ہے۔ اور مجھے اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ مگر اپنی علمی استعداد اور قلمی صلاحیت کا جائزہ لیتا ہوں۔ تو معاملہ آسان نظر نہیں آتا' کہاں ایک شاعرِ عظیم کے وسیع و عمیق جذبات و افکار اور کہاں مجھ درماندۂ سخن کے بے مغز و بے معنی گفتار' پھر ساتھ ہی ساتھ تقاضا' اس عقیدت و ارادت کا ہے جو میں حضرت محروم سے اپنے دل میں رکھتا ہوں اور پاس اس شیوۂ اخلاص کا ہے جس کی بناء پر آپ نے مجھے لکھنے کی دعوت دی' نہ لکھوں گا تو گنہگار ہوتا ہوں۔ لکھتا ہوں تو اپنی بے بضاعتی کا پول کھلتا ہے۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ بہرِ کیف میں کوشش ضرور کروں گا کہ جیسے بھی ہو اور جیسا کچھ بھی ہلکے پھلکے انداز میں ان کی شاعری کے اخلاقی پہلوؤں پر لکھنے کی سعادت حاصل کروں۔ میرے جس خط کا آپ نے حوالہ دیا ہے اُس کی نقل احتیاطاً میں نے اپنے پاس رکھ لی تھی' اب جو دیکھا تو اس میں میرے زیرِ تجویز موضوع پر کچھ مواد موجود ہے۔ میں انھی اشارات کو اپنے مضمون میں شامل کرلوں گا۔ اگر بالفرض کسی غیر اختیاری صورتِ حال کے باعث میں خدمت بجا لانے سے قاصر رہا تو پھر آپ میری طرف سے اسی خط کو شاملِ اشاعت فرمائیں۔ طاہر صاحب کا مضمون پہلے سے تیار ہے۔ وہ لازماً آپ کو بھجوائیں گے۔ بعض گھریلو اور منصبی مصروفیات کے علاوہ میری ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ طبیعت کا زیادہ تر میلان شعر کی طرف ہے۔ نثر کا معاملہ محض فرمائشی ہے۔ دو چار اردو مقالات اور چند ایک فارسی مضامین مختلف کتب و رسائل میں ضرور شائع ہوئے۔ مگر اس میں جولانی طبع سے زیادہ دخل امتثالِ امر کا تھا۔

یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ میرے مخدوم مکرّم کی صحت اچھی ہے میں کئی دن سے احوال پُرسی کا خط لکھنے کا خیال کر رہا تھا۔ آپ کے نوازش نامے نے فوری موقع پیدا کر دیا۔ میری طرف سے نہایت مودّبانہ اور عقیدت مندانہ سلام اُن کی خدمت میں پیش کیجیے اور ساتھ ہی یہ شعر بھی کہ:

می نویسم نامہ و مشتاقِ دیدارِ توام

بستہ ام نرگس صفت برخامہ چشم خویش را

اپنے آخری خط میں انھوں نے مجھے شاہِ ایران کے خیر مقدم والی فارسی نظم بھیجی تھی (میری درخواست پر) ان کی یہ دستخطی تحریر ہمیشہ میرے پاس محفوظ رہے گی۔ خود میں نے بھی پچھلے دنوں شاہ کی خدمت میں ولی عہد کی ولادت پر قطعۂ تہنیت بھیجا تھا۔ جو ایک اطلاع کے مطابق وہاں کے پریس میں آچکا ہے۔ میں یہ قطعہ انھیں دکھانا چاہتا تھا۔ اپنی سالک اور آزاد والی نظمیں بھی، مگر بخوفِ طوالت فی الحال ملتوی کر رہا ہوں۔ پھر کسی وقت سہی۔

امید ہے کہ آپ مع جمیع وابستگان ہر لحاظ سے بخیر و جمعیت ہوں گے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش و خرم اور سلامت رکھے۔

نیاز مند

(ضیا محمد ضیا گورنمنٹ ہائی اسکول، پسرور)

(۴۳)

جناب رتن پنڈوروی

سری ہرگوبند پور

۶ر مارچ ۶۲ء

صحافت نصاب فضائل انتساب مخدوم الانامی قبلہ حضرت محروم صاحب دام ظلکم آداب خاکسارانہ۔ یہ سن کر انتہائی مسرت ہوئی کہ اُردو ادب کا خلعت و انعام اس دفعہ حضور کے حصہ میں آیا ہے مبارک باد قبول فرمائیں۔ دعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر روز افزوں ارتقا و صحت و حشمت و دولت و عزت کی ارزانیاں فرمائے۔ آمین

امید ہے کہ اب جناب کی صحت درست ہوگی اور خاکسار کی عرض داشت کے حسب حال دیباچہ رقم فرما رہے ہوں گے۔

کوئی خدمت

آپ کا ناچیز خادم رتن پنڈوروی

(۳۴)

جناب سورج کنول سرور

جالندھر

۵/ مارچ ۶۲ء

گرامی منزلت! سلام و نیاز

پنجاب سرکار کے محکمۂ السنہ کی طرف سے آپ کی عزت افزائی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ بجا طور پر اس اعزاز کے مستحق تھے۔ حقیقتاً نگاہِ انتخاب سب سے پہلے آپ پر پڑنا چاہیے تھی۔

آپ کا

سورج کنول سرور

(۳۵)

جناب شباب للت

نگروٹہ بگوان (کانگڑہ)

۶/ مارچ ۱۹۶۲ء

مشفقی محروم صاحب! آداب نیاز مندانہ۔

گزشتہ روز کے اخبار پرتاپ میں حکومتِ پنجاب کی جانب سے حضور کی عزت افزائی اور انعام و اکرام کی بخشش کی خبر پڑھ کر طبیعت کھل اٹھی۔ خدا کرے ایسے مبارک دن آپ کی زندگی میں بار بار آئیں اور آپ کی مشعل راہ شخصیت تا دیر

متاخرین کو راستہ دکھاتی رہے۔ اگر حفیظ صاحب کا ایک شعر یہاں تصرف کے ساتھ پیش کروں تو بے جا نہ ہوگا۔ تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی آپ کا حصّہ ہے نصف صدی کا قصّہ ہے۔ دو چار برس کی بات نہیں۔

''مضراب'' کی رسیدگی کی اطلاع آپ کی جانب سے مل گئی تھی۔ حصّہ ''نذرِ جاناں'' سے آپ متاثر ہوئے ہیں۔ شکریہ۔ واردات قلب کا بیان ہے۔ اس لیے اس میں تاثر کا آجانا قدرتی بات تھی۔ ''گنجِ معانی'' میں ''طوفانِ غم'' کا باب بغور پڑھ چکا ہوں۔ ''گنجِ معانی'' میں نے اسکول کی لائبریری سے نکلوا کر ۱۹۴۸ء میں پڑھی تھی جب میں جین ہائی اسکول پانی پت میں درجہ دہم کا طالب علم تھا۔ برسوں کی بات ہے لیکن دماغ پر اس ادبی شاہکار کا اثر اب تک طاری ہے۔ اس سے پیشتر بھی نصاب کی کتابوں میں آپ کے گُہر پارے امتحانی نکتہ نگاہ سے پڑھ چکا تھا۔ مجھے اس لحاظ سے بھی آپ کی ذاتِ بابرکات پر فخر ہے۔ کہ آپ بھی اُسی کیفِ ادب سے خالی ریگستان کی بھومی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں خود میں نے جنم لیا۔ میں آپ کے نزدیک کے ضلع مظفر گڑھ کے ایک اروڑہ خاندان کا فرد ہوں۔ اور ہمارا کنبہ کوروکھشیتر میں آباد ہے۔

باوا کرشن گوپال مغموّم جو میرے جگری دوست ہیں جب بھی میرے ہاں قیام پذیر ہوتے ہیں یا جب بھی اُن کے پاس چنڈی گڑھ جاتا ہوں گھنٹوں آپ کا ذکر کرتے ہیں۔ اب کے جموں کے آل انڈیا مشاعرہ میں شرکت کی تو عرش صہبائی کے ہاں اکثر و بیشتر حضور کا ذکرِ خیر رہا۔

احترام کے ساتھ خاک پا شباب للت ایم اے بی ٹی

(۳۶)

جناب بخشی اختر امرتسری

سبزی منڈی دہلی

۱۲؍مارچ ۶۲ء

مبارک۔۔۔۔ صد مبارک

بزرگوار جناب محروم صاحب۔

مجھے یہ پڑھ کر دلی مسرت حاصل ہوئی کہ گورنمنٹ پنجاب نے چنڈی گڑھ میں جناب کی عزت افزائی کی ہے۔ آپ ابھی اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔ بہر حال ہر چہ از دوست رسد نیکو است۔ خدا آپ کو اس سے بھی بلند مرتبہ عطا فرمائے۔ اور آپ کی مبارک ہستی کو ہمارے پوجنے کے لیے عمر خضر بخشے۔ بھارت کو آپ کی ہستی پر ناز ہے۔ بہت مبارک

ہو۔ اگر مناسب خیال فرمائیں (مناسب کیا بلکہ ضروری طور پر) اپنے ناچیز خادم کو تفصیلات سے آگاہ فرما کر احسان فرمائیں کہ کیا کچھ مبارک چرنوں میں بھینٹ کیا گیا تا کہ دوست و احباب کو بتا کر مفتخر ہو سکوں۔ فارسی غزل کا انتظار ہے۔ زیادہ آداب و شوق قدم بوسی۔

خاک پائے محروم

بخشی اختر امرتسری

~~~~~~~~~~~~~~~~~~

دُنیا میں کس طرح رہنا چاہیے؟

(سنسکرت سے ترجمہ)

اُس پرندے کی طرح دُنیا میں رہنا چاہیے
چہچہاتا ہے خوشی سے جو کہ نازک شاخ پر
جھولتی ہے شاخ، لیکن خوف کچھ اُس کو نہیں
گر نہیں سکتا کہ ہیں موجود اُڑ جانے کو پَر

(محرومؔ)
~~~~~~~~~~~~~~~~~~

تضمینات

بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی

تضمین

بر غزل

فرمودہ پروفیسر تلوک چند محرومؔ بی۔اے

عمر، ساری عمر، وقفِ گریہ و زاری رہی
ساتھ چھوڑا آگہی نے، بے ہشی طاری رہی
خون کے اشکوں کی بارش روز و شب جاری رہی
مہرباں تھے وہ مگر بے سود غمخواری رہی
دل رہا پہلو میں جب تک، دل کی بیماری رہی''

بن گئی زلفوں کا خم پیچیدگی آزار کی
خالِ رُخ پر رہ گئی جم کر نظر بیمار کی
رہزنِ ہوش و خرد اک اک ادا تھی پیار کی
کس کو فرصت تھی خالِ لذت دیدار کی
سامنے جب تک رہے وہ بے خودی طاری رہی''

دشت کا عنوان وہی گلشن کا بھی عنوان وہی
سر وہی ہے سر میں وحشت کے سروساماں وہی
چاک دامانی وہی ہے جذبۂ عُریاں وہی
''ہم وہی ہیں آمدورفت کوے جاناں وہی
لاکھ رسوائی رہی، ذلّت رہی، خواری رہی''

حصّۂ کہسار و دریا تھی وہی بے رونقی
قسمتِ گلزار و صحرا تھی وہی بے رونقی
گرد ایوانِ تمنا تھی وہی بے رونقی
''شاملِ تعمیر دنیا تھی وہی بے رونقی
عشق کے دم سے مگر کچھ گرم بازاری رہی''

خاک ہو آئینۂ جذبِ دروں عکاسِ غم
کام کرتا ہی نہیں اب نام کو مقیاسِ غم
عظمتِ غم ہی جو عنقا ہو تو کیا ہو پاسِ غم
''کثرتِ غم نے مٹادی کاوشِ احساسِ غم
ہم نشیں اب ہم سے مشقِ گریہ وزاری رہی''

دی نہ دعوت خواہشِ خیل و خدم کو عمر بھر خود سے رکھا دور ہی جاہ وحشم کو عمر بھر
رائیگاں سمجھا کیے طبل و علم کو عمر بھر ”خود نمائی سے رہا پرہیز ہم کو عمر بھر
خود فراموشی اب آئی، پہلے خودداری رہی“

عشق کی مے پینے والوں کے کلیجے خشک ہیں آج ہی سے کچھ نہیں ۔ روزِازل سے خشک ہیں
خاک اُڑا کرتی ہے ان میں اب یہ اتنے خشک ہیں المدد اے دردِ دل آنکھوں کے چشمے خشک ہیں
وہ بھی دن تھے جب یہیں سے نہر سی جاری رہی“

کیا بتائیں ہے یہ کس کا جلوۂ رعنا بہار اپنی نظروں میں تو ہے رشکِ دمِ عیسیٰ بہار
سر کی نسبت سے بنی سرمایۂ سودا بہار ”فیض قاتل نے دکھائی ہم کو بھی کیا کیا بہار
پھول زخموں کے رہے داغوں کی گلکاری رہی“

کوئی مجھ سے بڑھ کر دنیا میں نہیں تیرہ فال شاملِ یک لحہ تھے گویا ہزاروں ماہ وسال
مانگتا تھا موت میں، اس درجہ تھا جینا وبال ”ہجر کی شب اور تو کوئی نہ تھا پرسانِ حال
شاملِ سوز و گداز اک شمع بے چاری رہی“

تھا تجلی ریز تجھ سا سروبالا باغ پر حلقہ زن تھا یا مہ گردوں کا ہالا باغ پر
تھا اندھیرے میں اُجالا سا اُجالا باغ پر تیرے چشم و رُخ نے پرتو جب سے ڈالا باغ پر
چاک داماں گل رہا، نرگس کو بیداری رہی“

میری جانب سے پھری کس کی نگاہِ دل نواز ہوگیا خامش منوّر جذبہ وحشت طراز
اک صدا بھی دے نہیں سکتا تمناؤں کا ساز ”کردیا یاس دوامی نے ہر اک سے بے نیاز
اب کہاں محرومؔ تابِ ناز برداری رہی“

~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~

عالم فتح پوری

تضمین بر غزل محروم

مرے اشکِ تر ہیں سکھانے کے قابل
مرا دل ہے دل سے لگانے کے قابل
کہاں تیر پر تیر کھانے کے قابل
''مرا حالِ غم ہے سُنانے کے قابل
نہیں پر ابھی تم رلانے کے قابل''

شگوفوں کو شبنم نے ہنسنا سکھایا
مسّرت کو غم نے مسّرت بنادیا
سکوں دل نے دردِ محبت سے پایا
''مزاغم میں کچھ بوالہوس کو نہ آیا
یہی ایک نعمت تھی کھانے کے قابل''

رموز و کنایات و اغماز تیرے
کرشمے کرامات اعجاز تیرے
یہ عشوے، یہ غمزے، یہ انداز تیرے
''اُٹھانے کے قابل ہیں سب ناز تیرے
مگر ہم کہاں ناز اُٹھانے کے قابل''

رہا نام تک بھی نہ حرص و ہوا کا
نشاں تک بھی جب مٹ گیا مدّعا کا
رہا دخل باقی نہ جب ماسوا کا
''سمجھ لو کہ دل ہوگیا گھر خدا کا
ہوا جو بتوں کے بسانے کے قابل''

نگاہوں میں تیغِ تغافل کو تو لے
کچلتے ہوئے میرے دل کے پھپھولے
چلے آئے خنجر بکف، زلف کھولے
''مجھے دیکھ کر آج مقتل میں بولے
یہ عاشق بھی ہے آزمانے کے قابل''

ہے خاموش شمعِ سخن ہی یہاں تو
اندھیرا ہے جس سمت بھی جا کے دیکھو
سخنداں کوئی ہو قدرِ سخن ہو
''سُنے کوئی سرحد میں محرومؔ ان کو
ترے شعر ہیں داد پانے کے قابل''

عالم فتح پوری

تضمین بر غزلِ محروم

الفت کے ساتھ جذبۂ ایثار بھی تو ہو
کب تک فریبِ حُسن کے صدمے سہا کریں
یوسف بہت ہیں مصر کا بازار بھی تو ہو
کیوں کر دلِ فریب زدہ کی دوا کریں
اُتنا حسیں مذاقِ خریدار بھی تو ہو
اے دوست کیسے تجھ پہ یقینِ وفا کریں
''لاکھوں ہیں دلربا کوئی دلدار بھی تو ہو
''قسمیں نہ بار بار دلائیں تو کیا کریں
غم دے چکے بہت کوئی غمخوار بھی تو ہو''
اقرار سا کوئی ترا اقرار بھی تو ہو

اظہارِ غم کی ختم تو ہوجائیں بندشیں
گُل میں رواں ہیں گریۂ شبنم میں موجِ خوں
حالِ دل تباہ مرے اشک تر کہیں
ظلمت نہ ہو تو ہے شبِ مہتاب بھی فسوں
آہوں سے میری چاند ستارے پگھل گئے
ہوش و خرد کے پاس ہی موجود ہے جنوں
''فریاد میں تو میں ۔ مرے زخمِ جگر کریں
''افسوس ہے کہ ساتھ تمھارے نہ میں رہوں
اُس بزم میں اجازتِ گفتار بھی تو ہو''
موجود گُل جہاں ہے وہاں خار بھی تو ہو

نخچیر ہو کوئی 'تو ہیں ترکش میں لاکھ تیر
طوق و رسن ہیں آج بھی' ہو تو کوئی اسیر
منصور بھی تو ہو کوئی جاری ہے داروگیر
''محروم لاجواب ہے یہ مصرعۂ امیر
عیسیٰ ہیں سینکڑوں کوئی بیمار بھی تو ہو''

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشآء

تضمین بر غزل حضرت محرومؔ

کرشمہ کاریِ لیل و نہار کیا جانے
یہ کیا فسوں ہے کوئی ہوشیار کیا جانے
فریب رنگ کوئی گلعذار کیا جانے
''زوالِ حُسن کو حُسنِ نگار کیا جانے
خزاں قدم بقدم ہے بہار کیا جانے''

یہ اضطراب جسے کہیے زیست کا اک نام
اسی کے دم سے ہے قائم جہانِ دل کا نظام
ہو اس کو آٹھ پہر کیوں نہ اضطراب سے کام
''لکھا ہے اس کے مقدر میں اضطرابِ دوام
قرار کیا ہے دلِ بے قرار کیا جانے''

نگاہِ یار ہی مینا وجام ہو جس کو
عطا مسرّت لطفِ کلام ہو جس کو
حضورِ دوست مہیاً مدام ہو جس کو
''نصیب راحتِ قرب دوام ہو جس کو
وہ لذّتِ خلشِ انتظار کیا جانے''

ہیں اہل علم و خبر یوں تو بے شمار یہاں
''شعور وفہم کے لاکھوں ہیں دعویدار یہاں
نہیں کسی کو بھی علمِ مالِ کار یہاں
سمجھ رہے ہیں جسے سب گناہ گار یہاں
اُسی پہ ہو کرم کردگار کیا جانے''

ہو کارِ خیر کہ ہو کاروبارِ شر آخر
ہر ایک کام کا ملتا ہے یاں ثمر آخر
یہی ہزار ہُنر کا ہے اک ہنر آخر
''کیے پہ اپنے ہو خود منفعل بشر آخر
یہی ہو جبر، یہی اختیار کیا جانے''

ہوا ہے جن کو میسر شعورِ فکر و نظر　　　وہ اپنے آپ کا لیتے ہیں جائزہ اکثر
خود احتسابی سے بہتر نہیں جہاں میں ہنر　　　''تڑپ رہا ہوں میں اپنے گناہ گن گن کر
اسی کا نام ہو روزِ شمار کیا جانے''

الم نصیبوں سے منشاء چھٹا جو صحنِ چمن　　　ہوا ہے اور ہی کچھ ان کی زندگی کا چلن
کہا ہے حضرت محروم نے بجا یہ سخن　　　''کہاں یہ شامِ غریباں کہاں وہ صبحِ وطن
یہ فرق گردشِ لیل و نہار کیا جانے''

شاہجہاں بانو دہلوی

تضمین

زمانے میں اپنا بنا ہر کسی کو　　مگر آزماتا بھی جا ہر کسی کو
نہیں ضبط کا حوصلہ ہر کسی کو　　"سمجھ کر رہین وفا ہر کسی کو
ستم گر نہ اتنا ستا ہر کسی کو"

اشاروں پہ تیرے اجل ناچتی ہے　　تری دوستی واقعی دشمنی ہے
ترے ظلم کی انتہا ہو چلی ہے　　"بتِ بے وفا تجھ کو معلوم بھی ہے
کہ ہونا ہے پیشِ خدا ہر کسی کو"

مٹا کوئی بن کر بنا کوئی مٹ کر　　بھلا کس کے بس میں ہے کس کا مقدر
ہر اک شے ہے فانی گہر ہو کہ پتھر　　"نہ بھولے کوئی بے بقا زندگی پر
کہ لینی ہے راہِ وفا ہر کسی کو"

جدھر دیکھیے ہے اُدھر غم کا سایہ　　کوئی دوسروں کے لیے مسکرایا
کوئی اپنی خاطر زمانے میں آیا　　"کسی کو ہے اپنی کسی کو پرایا
کیا دل نے درد آشنا ہر کسی کو"

گوارا تھا سب کو جُدائی کا صدمہ　　نہ کرتا کوئی زندگی سے کنارہ
مگر جب سُنا اُن کا ادنیٰ کرشمہ　　وہ کرتے ہیں مُردوں کو ٹھوکر سے زندہ
یہ سُن سُن کے مرنا پڑا ہر کسی کو

تری بزم قاتل ترا شہر ظالم — تری مُسکراہٹ میں ہے زہر ظالم
ترا حسن بے فیض بے مہر ظالم — ''مرے حق میں ہونے لگا قہر ظالم
ترا پیار سے دیکھنا ہر کسی کو''

ہمیں تک رہے تیرا غم زندگی بھر — نہ ہو ذکر تیرا رقیبوں کے لب پر
اسی واسطے احتیاطاً ہم اکثر — ''بلا تیری زلفِ معنبر کو کہہ کر
ڈراتے ہیں اے مہ لقا ہر کسی کو''

بیاں کرنے والے حقیقت بیاں کر — کسی روز تمیز سوُد و زیاں کر
نہ گھبرا ہمارا یقیں بے گماں کر — ''کبھی اپنے شیداؤں کا امتحاں کر
نہ پائے گا محروم سا ہر کسی کو

تقریبات

تقریبات

ممتاز شاعر تلوک چند محرومؔ کو حکومت پنجاب کا اعزاز

نئی دہلی ۲ر مارچ حکومت پنجاب نے فیصلہ کیا ہے کہ ۳ر مارچ ۱۹۶۱ء کو چنڈی گڑھ کے مقام پر منعقد کیے جانے والے سالانہ ادبی اجتماع میں اُردو کے مشہور و معروف شاعر شری تلوک چند محروم کو اعزاز دیا جائے۔ اس موقع پر اُنھیں ایک ''ابھینیون پتر'' اور خلعت کے ساتھ ساتھ ایک ہزار ایک سو روپے کی رقم بھی پیش کی جائے گی۔ گورنر راجستھان شری گور مکھ نہال سنگھ مذکورہ تقریب کی صدارت کریں گے۔

شری تلوک چند محروم اُردو کے صفِ اوّل کے شاعر ہیں۔ اُن کے کلام کے کئی مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ موصوف ۱۸۸۷ء میں مغربی پاکستان کے ایک قصبہ عیسیٰ خیل میں پیدا ہوئے۔ آپ ۱۹۴۷ء تک گورڈن کالج واقع راولپنڈی میں اُردو اور فارسی کے لکچرار رہے۔ تقسیم کے بعد محروم صاحب دہلی آگئے۔ یہاں وہ اردو کے لکچرار کی حیثیت سے کیمپ کالج (پنجاب یونی ورسٹی) سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۸ء میں موصوف کیمپ کالج سے ریٹائر ہو گئے۔

شری محروم کا شمار اُردو کے گنے چُنے شعراء و ادبا میں ہوتا ہے۔ جنھیں فارسی ادب پر اتھارٹی مانا جاتا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام ''گنجِ معانی'' اور ''رُباعیاتِ محروم'' میں فارسی شاعری کا قابلِ لحاظ حصّہ موجود ہیں۔ سیاست حیدر آباد ۳ر مارچ ۶۲ء

اُردو کے شاعر تلوک چند محروم کو حکومت پنجاب کا اعزاز
تقریب میں علامہ اقبال کا ترانہ بھی گایا گیا

چنڈی گڑھ ۲۰ / مارچ۔ حکومتِ پنجاب کی طرف سے وارشک ساہتیہ سماروہ کی تقریب کے موقع پر اُردو، ہندی اور پنجابی ادیبوں اور شاعروں کی عزت افزائی کی گئی۔

پروفیسر تلوک چند محروم، پروفیسر ستیہ ورت اور شری کرتار کو گیارہ گیارہ سو روپے کی تھیلی، خلعت اور سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

اس تقریب کا آغاز بندے ماترم سے ہوا۔ اور اختتام جن گن من پر۔ سب سے پہلے اعزاز پنجابی کے افسانہ نگار شری کرتار سنگھ دوگل کو دیا گیا۔ اس کے بعد ہندی ادیب پروفیسر ستیہ ودت کو اور آخر میں اُردو شاعر پروفیسر تلوک چند محروم کو۔ محروم صاحب کو خلعت، ایڈریس اور تھیلی دینے سے قبل محکمۂ لسانیات حکومت پنجاب کے زیرِ اہتمام علامہ اقبال مرحوم کا ترانہ:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

پیش کیا گیا۔ ترانہ اس قدر عمدہ اور موثر انداز سے گایا گیا کہ ساری محفل جھوم اُٹھی۔ اس کے بعد محکمۂ لسانیات کے ڈائرکٹر جنرل سردار لال سنگھ نے جناب محروم کو سپاسنامہ پیش کیا۔

سپاس نامہ کے بعد وزیر اعلی سردار پرتاپ سنگھ کیروں نے حسبِ دستور انھیں خلعت اور تھیلی پیش کی۔

مسٹر تلوک چند محروم نے اپنی تقریر میں حکومت پنجاب کے محکمۂ لسانیات کے کام کی نمائش کرتے ہوئے کہا کہ پنجابی زبان کو فروغ دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُردو اور ہندی کے ادب العالیہ کو پنجابی میں منتقل کرنے کا انتظام کیا جائے۔ آپ نے اُمید ظاہر کی کہ پنجاب کا محکمہ لسانیات اُردو کے معیاری شعراء اور نثر نگاروں کو پنجابی زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع کر دے گا۔

اس موقعہ پر حکومتِ پنجاب نے اُردو ہندی اور پنجابی کے تین شعرا کو ''راج کوی'' کے خطاب سے نوازا۔ اُردو میں پنڈت میلا رام وفا ہندی میں دیوراج ونیش اور پنجابی کے شری اندرجیت تلسی راج کوی مقرر ہوئے۔ ان تینوں شعراء نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ و مستفید کیا۔

آخر میں سردار پرتاپ سنگھ کیروں وزیرِ اعلی پنجاب نے اعزاز پانے والے شعراء کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ

شعراء اور ادیبوں کو چاہیے کہ وہ فروعی مسائل سے بلند ہو کر زبان، ادب اور ملک کی خدمت کے کام کو جاری رکھیں۔

گورنر پنجاب شری این، وی گیڈگل نے اپنی تقریر میں اس بات کی اُمید ظاہر کی کہ جس طرح زرعی صنعتی کام میں پنجاب اس وقت تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے اسی طرح عنقریب علم و ادب کی ترقی کے سلسلے میں بھی پنجاب بہت جلد ایک امتیازی مقام حاصل کر لے گا۔

قومی آواز لکھنؤ، ۲۱ / مارچ ۱۹۶۲ء

تلوک چند محروم کے اعزاز میں جشن

نئی دہلی۔ بزمِ سخن موتی باغ کی طرف سے جناب تلوک چند محروم کی اعزاز یابی کی خوشی میں ۲۷ / مارچ کو جشن محروم منایا گیا۔ جناب مہر چند کھنہ وزیرِ حکومت ہند نے صدارت فرمائی۔ محروم صاحب کی نظم "ہمارا دیش" سے تقریب کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد بزمِ سخن اور گورنمنٹ ایمپلائز ایسوسی ایشن کی طرف سے آپ کو سپاس نامے پیش کیے گئے۔

تقریب کے صدر شری مہر چند کھنہ نے محروم صاحب کو خوش آمدید کہا اور اپنی طرف سے مبارک باد پیش کی۔ آپ نے فرمایا" مجھے یہ سن کر از حد خوشی ہوئی ہے کہ حکومتِ پنجاب نے آپ کی عزت افزائی کی ہے۔ محروم صاحب نے اُردو ادب کی اور وطن کی بڑی خدمت انجام دی ہے، جس پر ہندوستان بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

اس کے بعد بزمِ سخن کے سکریٹری شری صابر ابوہری نے موصول شدہ پیغامات حاضرین کو پڑھ کر سنائے جن میں پنڈت جواہر لال نہرو، سردار گورمکھ نہال سنگھ، ڈاکٹر ذاکر حسین، لالہ بھیم سین سچر اور سردار سورن سنگھ کے پیغام بھی شامل تھے۔

آخر میں ایک مختصر سی بزمِ مشاعرہ منعقد ہوئی۔ جس میں مقامی شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

ہماری زبان علی گڑھ، ۸/ اپریل ۶۲ء

انجمن ترقی اُردو کے جلسہ میں محروم صاحب کو خراجِ عقیدت

دلّی۔ انجمن ترقی اُردو شاخِ دلّی کے زیرِ اہتمام ۸/ اپریل کی شام کو عالی جناب احمد محی الدین صاحب ڈپٹی منسٹر سول ایسوسی ایشن کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں پروفیسر تلوک چند محروم صاحب کی ادبی خدمات پر جو حکومت پنجاب نے اعزاز دیا ہے اس پر اظہارِ مسرت کیا گیا۔ صدر شاخ دہلی پنڈت سندر لال صاحب نے جلسہ کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ میں محروم صاحب کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ وہ صاف دل وسیع النظر اور پاکیزہ فطرت انسان ہیں۔ جن پر ہندوستان فخر کر سکتا ہے۔ وہ ہماری شاخ کے نائب صدر ہیں اس لیے ہم گورنمنٹ پنجاب کے ممنون ہیں کہ محروم صاحب کی

گراں قدر خدمات کی قدر دانی کر کے گورنمنٹ پنجاب نے انجمن ترقی اُردو کو ممنون کیا۔ محروم صاحب نے تمام عمر اُردو کی خدمت اور قومی اتحاد کے لیے کام کرنے میں گزاری ہے۔ ان کے کام اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی تعریف تھوڑے لفظوں میں کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اُن کے ساتھ کام کر کے ہماری عزّت و وقعت زیادہ ہوتی ہے۔ اس وقت وہ یہاں تشریف لائے اور اپنی شرکت سے ہمیں عزت بخشی۔ یہ ان کا بہت بڑا کمال ہے۔ پنجاب گورنمنٹ نے بھی اُن کی خدمات کی قدر کر کے اپنے وقار کو بڑھایا ہے۔

غلام احمد فرقت صاحب اور رشید حسن صاحب نے مقالے پڑھے۔ حمیدہ سلطانہ نے محروم صاحب کے پاکیزہ کردار اور اعلیٰ انسانیت پر مختصر سی تقریر پیش کی۔ ہیرا لال فلک نے دو قطعات پیش کیے۔ روش صدیقی صاحب نے محروم صاحب کے شاعرانہ بلند کردار اور انسانی دوستی پر ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا' اور صدرِ محترم نے صدارتی تقریر میں فرمایا۔

محروم صاحب کے ادبی کاموں کے متعلق تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ لیکن میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب میں علی گڑھ کالج میں میٹرک کا طالب علم تھا انقلاب کی نظمیں میں اور میرے ساتھی ڈھونڈ ھ نکالتے تو ان نظموں میں کافی نظمیں محروم صاحب کی ہوتی تھیں۔ ہم لوگ ان نظموں کو پڑھ کر نیا ولولہ پاتے تھے اور قومی کام کرنے کی ہمّت ہم میں زیادہ ہوتی تھی۔ محروم صاحب نے نوجوانوں سے لے کر اُس وقت تک ہر عالم میں اُردو کی خدمت کی۔ ان کی تصانیف میں بوڑھے جوان اور بچے یکساں استفادہ کر سکتے ہیں۔ میرے لیے یہ باعثِ مسّرت و اعزاز ہے کہ مجھے اس جلسہ کا صدر بنا کر عزّت بخشی گئی۔ اس طرح مجھے اظہارِ مسّرت کا اس مبارک تقریب پر موقعہ مل گیا:

آخر میں محروم صاحب نے اپنا کلام سُنایا۔

الجمعیۃ دہلی، مورخہ ۱۱ر اپریل ۱۹۶۲ء

محروم کو قادر الکلامی کے ساتھ وہ شعور بھی حاصل ہے
جو سیاسی مسائل پیش کرنے کے لیے ضروری ہے

(احتشام صاحب)

محروم کی شاعری سے اُن کی وطن پرستی اور انسان دوستی کا درس ملتا ہے۔

(ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)

دہلی، یکم اپریل۔ انجمن تعمیر اُردو دہلی کے زیرِ اہتمام یکم اپریل کو ارونا آصف علی ہال جامع مسجد دہلی جناب مولانا

امتیاز علی صاحب عرشی، پروفیسر تلوک چند محروم اور پروفیسر خلیق انجم کو سپاسنامے و مبارکباد پیش کیے گئے۔ حاضرین میں دہلی کے سرکردہ ادباء و شعراء اور ادب دوست حضرات بھاری تعداد میں شریک تھے۔ ابتداء میں جناب گلزار دہلوی نے انجمن تعمیر اُردو کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف سے مولانا امتیاز علی عرشی، پنجاب حکومت کی طرف سے محروم صاحب اور مظہر جان جاناں پر خلیق انجم صاحب کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری پر اراکین انجمن اور دہلی کے تمام ادباء و شعراء کرام کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میر مشتاق صاحب صدر انجمن تعمیر اُردو نے جناب محروم کو خراجِ عقیدت پیش کیے۔ انجمن اُردو تعمیر کے سرگرم ممبر جناب گلزار دہلوی۔ عزیز وارثی، بہار برنی، عشرت کرتپوری، اسلم پرویز اور ریاض صدیقی نے محروم صاحب کو استقبالیہ ہار پہنائے۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب ظہیر صدیقی، ظفر پیامی، رشید حسن خاں، قمر فرشوری، غلام احمد فرقت، سلام مچھلی شہری، خان غازی کابلی نے تقریریں فرمائیں۔ علامہ انور صابری، بسمل سعیدی، منور لکھنوی، در ہیرا لال فلک نے نظمیں و قطعات پڑھے۔ آخر میں محروم صاحب نے شکریہ ادا کیا اور صدر جلسہ جناب روش صدیقی صاحب نے بھی انعام یافتہ حضرات کو خراجِ پیش کیا۔

سویرا۔ دہلی، ۳۰؍ مارچ ۱۹۶۱ء

پروفیسر تلوک چند محروم کو الوداعی دعوت

اُردو کے نامور شاعر پروفیسر تلوک چند محروم کو پنجاب یونی ورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی کی ملازمت سے ریٹائر ہونے پر کل شام کالج میں ایک الوداعی پارٹی دی گئی۔ جس میں طلباء کے علاوہ ڈاکٹر منوہر سہائے انور ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر واقف مراد آبادی اور پرشوتم لال ضیا بھی شامل ہوئے۔ طلبا نے تقاریر فوٹو ایڈریس اور نظموں کے ذریعہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ واقف صاحب اور ضیا صاحب کے مختصر تقریروں میں محروم صاحب کی خدمات اور ذات کو سراہا۔ آخر میں محروم صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد محفل برخواست ہوئی۔

محروم یہی ہے عمرِ فانی کا نظام
پیری دیتی ہے سب کو عزلت کا پیام
پیرانِ کہن سال کی محفل میں چلو
کالج کو وداع نوجوانوں کو سلام

اس سے ایک دِن قبل، ایم اے فارسی کے طلباء نے محروم صاحب کو الوداعی پارٹی دی۔

روزانہ ہند کلکتہ، ۱۱؍ جولائی ۱۹۵۸ء

حضرت تلوک چند محروم کے اعزاز میں انجمن تعمیرِ اُردو دہلی کا جلسہٗ استقبالیہ

(یکم اپریل ۱۹۶۲ء)

تقاریر کے اقتباسات

میر مشتاق احمد

یہ میرا خوش گوار فرض ہے کہ منشی تلوک چند محروم کا انجمن تعمیر اُردو کی طرف سے خیر مقدم کروں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا خیر مقدم کرنے میں ہماری انجمن کی غرض کچھ زیادہ ہے۔ اس لیے کہ ایک ایسے ادیب، شاعر اور مفکر کا استقبال کر کے ہم خود اپنی عزت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ شاید اس وقت جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ اُن کی شان اور رُتبے کے مطابق نہ ہوتا۔ تاہم یہ اظہار پورے خلوص سے کیا جا رہا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ اس معمولی سے استقبال کو قبول فرمائیں گے۔

پروفیسر سید احتشام حسین

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج دہلی میں ہوں اور ایک ایسے جلسے میں شرکت کر رہا ہوں جس میں منشی تلوک چند محروم کا استقبال کیا جا رہا ہے۔ مجھے اس بات پر مسرّت ہے کہ میں محروم صاحب کے درِ دولت پر حاضری بھی دے سکا اور زبانی مبارک باد بھی دے سکا۔

جب سے ہم لوگوں نے ہوش سنبھالا ہے اُس وقت سے ہم محروم صاحب کی نظمیں پڑھتے آئے ہیں...... ان کی شاعری نے ہماری تعلیمی، اخلاقی، فلسفیانہ اور قومی جستجوؤں کو جو ہمارے دل میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی محروم نہیں کیا۔ اُن کی اُستادانہ مہارت اور شاعری کی عمر کی نسبت سے اُن کے مرتبہ کا بلند ہو جانا قدرتی بات ہے، لیکن انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف کو کمال خوبی سے اپنے اشعار میں اسیر کر رکھا ہے۔ اُن کی شاعری نے زندگی کے سبھی شعبوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ اُنھوں نے زندگی کی ہر سطح پر شاعری کی۔

محروم صاحب کا کلام جن حضرات نے دیکھا ہے وہ اس کی تائید کریں گے۔ ان کی بچوں کی نظموں میں خیالوں کی

گہرائی وصفائی کے ساتھ ساتھ بچّے کا ذہن بھی جلوہ گر ہے۔ اُس کا حیرت و استعجاب و مسّرت اس میں موجود ہے۔ اُن کی قومی نظموں میں بھی ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ جیسے سیاسی تحریک کی رفتار تیز ہوتی گئی ویسے ہی اُن کی شاعری بھی تیز تر ہوتی گئی۔ محروم صاحب کو قادر الکلامی کے ساتھ وہ شعور بھی حاصل ہے جو سیاسی مسائل پیش کرنے کے لیے ضروری ہے۔

محروم صاحب کے بارے میں غور کرتے ہوئے ہمیں اپنی شاعری کے پچاس برسوں کو مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ یہ ایک طوفانی دور رہا ہے۔ محروم صاحب نے ہمیں ایسی چیزیں دی ہیں جو ہمارے جذبات سے ہم آہنگ ہیں......

''گنجِ معانی'' میں ایک حصہ بہت ہی ذاتی وشخصی ہے جس میں عزیزوں کی موت و جدائی وغیرہ پر شخصی تاثرات کا اظہار ہے۔ لیکن جو آواز دل سے نکلتی ہے اور سچائی اور خلوص پر مبنی ہوتی ہے وہ دوسروں کو متاثر کرتی ہے۔ ذاتی غم کی بنیاد پر لکھی ہوئی نظمیں ہم سب کے لیے غم والم کا مرقع بن جاتی ہیں۔ یہ باتیں صرف قدرتِ بیان سے نہیں بلکہ شاعر کی فطرت سے حاصل ہوتی ہیں۔ محروم صاحب کو اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ اُن کی قدر ان کی زندگی میں ہورہی ہے اور اس بے قدری کے عہد میں لوگ آہستہ آہستہ اُن کی قدر کو پہچان رہے ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے' کی تفسیر محروم صاحب کی زندگی پیش کرتی ہے۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی اُردو کی خدمت میں کھپادی ہے۔ وہ اُردو شاعری کی جملہ اصناف پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی رُباعی گوئی کا لوہا تو اکبر الہ آبادی بھی مان چکے ہیں۔

پچھلی نصف صدی میں ہمارا ہندوستان جس طرح سے مختلف راہوں سے گزرا ہے اُس کی تصویر محروم صاحب کی شاعری میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اُنھوں نے وطنیت کا نہایت صالح اور جامع تصور پیش کیا۔ وہ وطن کا بُت بناتے ہیں لیکن اُن کی وطنیت جارحانہ نہیں۔ انھوں نے اخلاقی قدروں کو بڑی شگفتگی و دل نشینی سے پیش کیا ہے۔ لیکن وہ کہیں بھی ناصح نہیں بنے بلکہ ناصح مشفق ہیں۔ اچھی اخلاقی و روحانی قدروں کے بغیر ہماری زندگی ادھوری ہے۔ محروم صاحب نے خدمتِ خلق، صداقت، عدل، انسان دوستی وغیرہ پر زور دیا ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ یہ نہ دیکھو کہ کون کہتا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہتا ہے۔ اس بات کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ''اثر صرف بات کا نہیں بات کہنے والے کی ذات کا بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محروم صاحب کا اخلاقی کلام بھی کیف و اثر سے خالی نہیں۔

ظفر پیامی

محروم کی شخصیت اُردو کی ہمہ گیری کی عکاس ہے۔ زندہ شخصیتوں میں اُن کے ساتھ محض دو چار شخصیتیں ہی ایسی

ملیں گی۔ اُنھوں نے اُردو زبان کو نکھارا اور سنوارا۔ جب بھی اُردو کو بنانے والوں کا نام آئے گا۔ خاص کر اہلِ پنجاب میں محروم کا نام سرِ فہرست رہے گا۔ ہم محروم صاحب کے لیے آئندہ اس سے بھی بڑے اعزاز کی توقع رکھتے ہیں۔

روش صدیقی

محروم صاحب نے ایک جملہ اپنے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ اسے جامع نہیں کہا جا سکتا۔ من آنم کہ من دانم۔ حقیقت یہ ہے کہ نصف صدی سے زیادہ مدّت کا دائرہ ہے جسے ان کی علمی وادبی خدمات نے مکمل کیا ہے۔ لیکن اُنھوں نے خود کو گوشۂ تنہائی میں رکھا جو ہر برگزیدہ انسان کا خاصہ ہے۔

محروم صاحب صحیح معنوں میں ہمارے میخانۂ شعر و ادب کے عظیم و پُر وقار ساقی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ حکومت پنجاب نے اتنی گراں مایہ شخصیت کو اعزاز دے کر خود عزّت حاصل کی ہے۔

منشی پریم چند اور محروم' دونوں نے حبّ الوطنی اور جذبۂ آزادی کی وہ شمع روشن کی جس نے ہزاروں دلوں میں شعلہ آزادی کو تیز تر کر دیا۔ بہت بڑی بات تھی اس زمانے میں کچھ لکھنا کیوں کہ یہ ہزاروں مشکلوں کو دعوت دینا تھا۔ کون ایسا آدمی ہے جس کے دل میں حضرت کی عقیدت و محبت کا چراغ نہ جل رہا ہو۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

رباعیان

اُٹھتی ہی نہیں نظر، جھکی جاتی ہے
نادم ہے، خاک پر جھکی جاتی ہے
سر پر ہے عمر بھر کا بارِ عصیاں!
پیری میں جو یوں کمر جھکی جاتی

تسکین ممکن نہیں قناعت کے بغیر
پھر بھی مشکل ہے زیست دولت کے بغیر
محنت سے جو ہاتھ آئے دولت ہے وہی
ہے مالِ حرام، اگر ہے محنت کے بغیر

(محرومؔ)
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

اقتباسات

اقتباسات

(۱)

اُردو کے نامور شاعر پروفیسر تلوک چند محرؔوم حال ہی میں پنجاب یونی ورسٹی کیمپ کالج کی پروفیسری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ آج آپ کی عمر بہتر (۷۲) برس کی ہے۔ عمر بھر شعر و سخن ان کا مشغلہ اور سلسلۂ درس و تدریس ان کا ذریعۂ معاش رہا ہے۔ پروفیسر تلوک چند محروم کی شاعرانہ عظمت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے کہ آج کئی برس پہلے جب کالج سے آپ کے ریٹائر منٹ کا سوال پیدا ہوا تو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کو ایک خط لکھا کہ تلوک چند محروم کی موجودگی کیمپ کالج کے لیے باعثِ فخر ہے۔ انھیں عمر کی بنا پر ریٹائر ہونے کی قید سے مستثنیٰ اقرار دے دیا جائے۔ چناں چہ مولانا مرحوم کے ارشادِ گرامی ہی کا نتیجہ تھا کہ ریٹائر ہونے کی عمر سے آٹھ دس برس بعد تک کالج محرؔوم صاحب کے علم و فضل سے مستفید ہوتا رہا۔ ہندوستان اور پاکستان کے وہ طلبا یقیناً خوش نصیب ہیں جنھیں تلوک چند محروم سے اُردو اور فارسی پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ مولانا عبدالمجید سالکؔ کی اس رائے سے کہ ''ہندوؤں اور مسلمانوں کی پوری ایک نسل محرؔوم صاحب کی مرہونِ منت ہے'' ہم پوری طرف متفق ہیں۔

محرؔوم صاحب کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں آج دو رائیں مشکل سے ملیں گی۔ ابوالاثر حفیظؔ جالندھری بیان کرتے ہیں کہ ان کے استاد مولانا عبدالقادر گرامی اکثر کہا کرتے تھے کہ اکبرالہ آبادی کے بعد شمالی ہند نے دو شاعر پیدا کیے ہیں۔ اقبال اور محروم'' یہی رائے آج سے کوئی تیس برس پہلے ''ایشیاٹک ریویو لندن'' نے ظاہر کی تھی'' محرؔوم صاحب کا کلام ہندوستان کے اسکولوں کے نصاب میں شامل ہے۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ ان کا کلام دوسری اور تیسری جماعت کے نصاب سے لے کر یونی ورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ ہندو پاک میں شاید ہی کوئی اُردو پڑھا لکھا ہو جس نے ایام طالب علمی میں محرؔوم صاحب کی نظمیں اپنی درسی کتب میں نہ پڑھی ہوں۔ اُردو کا کوئی علمی یا ادبی تذکرہ خواہ لکھنؤ سے شائع ہو یا لاہور سے۔ حیدرآباد سے چھپا ہو یا کراچی سے محرؔوم صاحب کے ذکر سے خالی نہیں۔ اب حال ہی میں ان کی مشہور

تصنیف ''گنجِ معانی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لاہور کے معیاری ادبی ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' نے لکھا ہے::۔

''تلوک چند محرومؔ ہمارے ان شاعروں میں سے ہیں جن کا نام ہر جگہ عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور جن کی تخلیقات پر مختلف مکاتب فکر کا فکری اختلاف کچھ اثر نہیں ڈال سکا ہم میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں اس بزرگ شاعر کی کوئی نہ کوئی نظم نہ پڑھی ہو۔ تلوک چند محرومؔ کی بہت سی ایسی نظمیں بھی ہیں جو آج سے بیس پچیس سال پیشتر پڑھی گئی تھیں۔ مگر آج بھی جب یہ ہمارے سامنے آتی ہیں تو وہی ذوق وشوق زندہ ہو جاتا ہے جو پہلی بار انھیں نصاب کی کتابوں میں دیکھ کر ہمارے دلوں میں پیدا ہوا تھا۔ وقت کے سمندر میں کئی ادبی تحریکوں کے طوفان آئے اور ختم ہو گئے۔ مگر ہمارے یہ بزرگ شاعر چپ چاپ روشنی کا مینار بنے کھڑے ہیں اور برابر روشنی دیتے جا رہے ہیں۔

(ادبِ لطیف جولائی ۱۹۵۷ء)

ڈاکٹر ذاکر حسین اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

''میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے حضرت محروم کا کلام پڑھتا رہا ہوں کئی بار بیاضیں بھی بنائیں اور اُن میں محروم صاحب کی نظمیں نقل کیں ۔۔۔ اب بھی کہیں ان کی نظم دیکھ لیتا ہوں تو اُسے پرانے ذوق سے پڑھتا ہوں۔''

اس کے علاوہ اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال تک نے اُن کے کلام کو سراہا ہے۔ اکبر الہ آبادی کی یہ رباعی تو خاص شہرت پا چکی ہے:۔

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم | لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش مند | ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

یہ رباعی حضرت اکبر الہ آبادی نے ۱۹۱۵ء میں کہی تھی جب محرومؔ صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام ''کلامِ محروم چھپا تھا۔ اس کے بعد ان کی کئی کتابیں چھپیں مثلاً کلامِ محروم حصّہ دوم۔ کلام محروم حصّہ سوم۔ گنجِ معانی' رباعیات محروم وغیرہ۔ جہاں تک ''گنجِ معانی'' کا تعلق ہے ساہتیہ اکیڈمی اور انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز اس کی خاص جلدیں خرید کر علمی قدردانی کا ثبوت دے چکی ہیں۔ لیکن یہ علمی قدردانی مولانا آزاد مرحوم کی زندگی تک ہی تھی مولانا آزاد کے بعد ثقافتی امور کے وزیر پروفیسر ہمایوں کبیر مقرر ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی اردو دنیا پروفیسر ہمایوں کبیر سے اس امر کی توقع کرتی ہے کہ وہ اردو کے

اس جلیل القدر شاعر کی جواب کالج کی پروفیسری سے ریٹائر ہوچکے ہیں پوری پوری قدر دانی کریں گے تا کہ وہ فکرِ معاش سے آزاد ہوکر علمی اورادبی خدمات جاری رکھ سکیں۔

(۲)

پروفیسر تلوک چند محرؔوم کی خدمات

اردو کے نامور شاعر پروفیسر تلوک چند محرؔوم کی عمراس وقت کم وبیش بہتر برس ہے' موصوف کی ساری زندگی اُردو کی خدمت میں گزری ہے۔ مختلف غیر سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں انھوں نے اُردو کے استاد کی حیثیت سے جو خدمات انجام دی ہیں اور اُردوادب میں جوگراں بہا اضافہ کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ موصوف حال ہی میں دلی کے کیمپ کالج سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے بہتر برس کی عمر ایسی نہیں ہے کہ جس میں انسان معاشی مشقتیں برداشت کرے۔ اس لیے محروم صاحب کواب سے کم وبیش دس برس قبل حصولِ معاش سے بے نیاز ہوجانا چاہیے تھا لیکن اگراب تک ایسا نہ ہوسکا تو یہ ہماری قومی حکومت کی جس نے بہت سے اہلِ قلم حضرات کے وظائف مقرر کرکے ادب نوازی کا ثبوت دیا ہے' کوتاہ نظری تھی۔

محرؔوم صاحب کی شاعرانہ عظمت سے ان چند سطروں میں کیا بحث کی جاسکتی ہے یہاں تو ہمیں ان کی حب الوطنی اور قوم پرورانہ قلمی خدمات کی طرف توجہ دلانا ہے جس کی وجہ سے انھیں کبھی کسی سرکاری کالج میں ملازمت نہ مل سکی جہاں سے وہ پنشن کے حقدار ہوتے۔ اور زندگی کے آخری ایام بے فکری اور پورے انہماک سے ادب کی خدمت میں گزار سکتے۔ سب کو معلوم ہے جنگ آزادی کے دوران چوں کہ محروم صاحب نے اپنی قومی نظموں سے ہندوستانیوں کے قلب میں حریت اور وطنیت کا جذبہ بیدار کیا اس لیے وہ سی۔آئی۔ڈی اور حکومت کی نظروں میں معتوب رہے۔ لیکن اب جب کہ ہندوستان آزاد ہوگیا انھیں ان کی اس خدمت اور قربانی کا صلہ ضرور ملنا چاہیے۔ ہم وزارت امورِ ثقافت کو جوایک ادب نواز ہستی جناب ہمایوں کبیر کے ہاتھ میں ہے۔ توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ وہ محروم صاحب کا وظیفہ مقرر فرما کر اہلِ اردو کو ممنون فرمائیں۔

(پیامِ مشرق، ۲۸ اگست ۱۹۵۸ء)

(۳)

تلوک چند محرؔوم

حال ہی میں جناب تلوک چند محرؔوم ۷۲ سال کی عمر میں پنجاب کیمپ کالج سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ آپ وہاں فارسی

کے پروفیسر تھے۔

جناب محرومؔ صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی پوری زندگی علم وادب کی خدمت میں گزری ہے اور کوئی صوبہ اور ریاست ایسی نہیں ہے جہاں ان کی درسی کتابیں نہ چل رہی ہوں۔ تقسیم سے قبل ان کی سرگرمیوں کا مرکز لاہور تھا۔ جہاں ان کی شاعری کا وہ غلغلہ تھا کہ علامہ اقبال مرحوم تک اس سے متاثر ہوئے۔ اور یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ ''انگریزی ادب میں جو رتبہ کیٹس کو تھا وہی اپنے تلوک چند محروم کو اُردو شاعری میں حاصل ہے'' دوسرے چوٹی کے ادباء اور شعراء نے بھی انھیں خراجِ تحسین ادا کیا۔ عبدالمجید سالکؔ نے کہا ''تلوک چند ہندوؤں ومسلمانوں کی پوری نسل کے معلّم ہیں۔ اور اس کے لیے ہمیں ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ جناب تلوک چند محرومؔ کے پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں اور چار زیرترتیب ہیں۔ چھپے والے مجموعوں میں فارسی کلام بھی شامل ہے۔ انھوں نے بچوں کی بعض نظمیں بھی خوب کہی ہیں۔

ایک وہ شخص جس کی پوری زندگی علم وادب کی خدمت میں گزری ہو ضروری ہے کہ ریٹائر ہونے پر حکومت کی طرف سے اس کی کچھ مدد کی جائے' حکومت قومی ادیبوں اور شاعروں کو نواز رہی ہے۔ اور یہ اس کا مستحسن اقدام ہے۔ امید ہے کہ جناب تلوک چند محرومؔ بھی حکومت کی ادب نوازی سے محروم نہ رہیں گے اور ایک قومی اور مجلسی شاعر کو اس عمر میں یہ سمجھنے کا موقع نہ دیا جائے گا کہ زمانے نے اس کی قدر نہ کی۔ پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب ثقافتی وزیر کو اس طرف خصوصی توجہ کرنی چاہیے۔

(الجمعیۃ، ۵ر ستمبر ۱۹۵۸ء)

(۴)

تلوک چند محرومؔ

تلوک چند محروم کا ان ادباء وشعرا میں شمار ہوتا ہے جن پر ملک بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے آپ کے متعلق فرمایا تھا کہ ''اُردو میں محروم صاحب کو وہی درجہ حاصل ہے جو انگریزی میں کیٹس کو تھا'' تقسیم کے بعد ایک مرتبہ آپ لاہور تشریف لے گئے تو جناب صلاح الدین صاحب ایڈیٹر ادبی دنیا نے فرمایا کہ ''محروم صاحب کے ہندوستان چلے جانے کی بنا پر ہم ایک بڑے سرمایہ سے محروم ہوگئے۔''

واقعہ یہ ہے کہ محرومؔ صاحب کی بڑی ادبی خدمات ہیں اسی لیے انھیں ہند اور پاکستان دونوں جگہ پر قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اسی بناء پر ہم نے وزارت تعلیم کو متوجہ کیا تھا کہ اب جب کہ وہ کیمپ کالج سے جہاں وہ فارسی اور اُردو کے پروفیسر تھے ریٹائر ہوگئے ہیں انھیں اسی طرح وظیفہ ملنا چاہیے جس طرح کہ بعض دوسرے ادباء وشعراء کو دیا جارہا

ہے۔ یہ دوسری مرتبہ ہے جب ہم حکومت کو متوجہ کر رہے ہیں۔ اور ہمیں توقع ہے کہ اس بار ہماری آواز صدا بہ صحرا ثابت نہ ہوگی۔

(صابر)

(الجمعیۃ دہلی ۱۰؍نومبر ۱۹۵۸ء)

(۵)

پروفیسر تلوک چند محروم، اُردو کا مایۂ ناز شاعر

پچھلے دنوں معاصرِ عزیز ''الجمعیۃ دہلی'' کا ایک شذرہ ہماری نظر سے گزرا تھا۔ جس میں پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب وزیر امور ثقافت و سائنسی تحقیقات کی توجہ اس امر کی جانب دلائی گئی تھی کہ اُردو کے شاعرِ اعظم پروفیسر تلوک چند محرومؔ کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں معقول ماہانہ وظیفہ ملنا چاہیے۔ تاکہ پروفیسر صاحب موصوف اطمینانِ قلب سے اُردو کی خدمت جاری رکھ سکیں۔

ہم معاصرِ عزیز ''الجمعیۃ'' کی اس تجویز کی پُر زور الفاظ میں تائید کرتے ہیں۔ اور پروفیسر ہمایوں کبیر سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اُردو کے اس جلیل المرتبہ شاعر کی خدمات کی پوری طرح قدر کریں گے۔ اور ان کے لیے ایک معقول ماہانہ وظیفہ جو ان کے شایانِ شان ہو مقرر فرما کر ساری اُردو دنیا کو شکر گزار ہونے کا موقع دیں گے۔

پروفیسر تلوک چند محروم کو آج ہندوستان اور پاکستان کے شعراء میں جو ممتاز مقام حاصل ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تلوک چند محروم نے اُردو شاعری میں ایسا گراں قدر اضافہ کیا کہ تاریخ ادب اُردو انھیں صفِ اوّل کے شعراء میں نہایت ممتاز مقام دینے پر مجبور ہے جس شاعر کے کلام کی آج سے چالیس برس پہلے حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم نے تعریف کی ہو۔ جسے علامہ اقبالؒ نے اُردو کا کیٹس کہا ہو جس کے متعلق شیخ سر عبدالقادر، مولوی عبدالحق، اور علامہ برجموہن کیفیؔ نے تعریفی مقالے لکھے ہوں۔ جسے مولانا عبدالمجید سالکؔ نے ہندوستان و پاکستان کی پوری ایک صدی کا معلم اخلاق کہا ہو جس کا کلام ہندوستان و پاکستان کی متعدد یونی ورسٹیوں اور اسکولوں کی درسی کتب میں شامل ہو اور جن سے پوری ایک نسل فیض یاب ہوئی ہو اس کی قدردانی ایک طرح سے علم وفن کی قدردانی ہے۔

ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کے دَور میں تلوک چند محرومؔ کی سیاسی شاعری نے پوری ایک نسل کے حوصلوں کو بڑھایا اور اہلِ وطن کو منزل کی طرف پوری تیز رفتاری سے چلنے پر آمادہ کیا۔ اِن تمام خدمات کا اعتراف آزاد ہندوستان کی حکومت کے ان فرائض میں داخل ہے۔ جن کا تعلق علم وفن کی قدردانی سے ہے۔

ابھی حال ہی میں انجمن ترقی اُردو پاکستان کے ہفتہ وار اخبار ''قومی زبان'' نے تلوک چند محروم کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تلوک چند محرومؔ ایک فرد واحد کا نام سہی لیکن اب یہ نام ایک ادبی روایت بن گیا ہے۔ ایک جاندار ادبی روایت جو گزشتہ نصف صدی سے اُردو شاعری کا سرمایہ افتخار ہے۔

حضرت محرومؔ کی شاعری کا آغاز اس زمانہ میں ہوا جب اُردو دنیا ایک نئی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ اور حالی جیسے دردمندوں کے نغمے ہر طرف گونج رہے تھے۔ شاعری میں نئے نئے موضوعات دخل پا رہے تھے۔ اور اس کے نتیجہ میں شعراء کا قومی' سماجی اور سیاسی شعور پوری طرح نمایاں ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ فطرت پرستی کا میلان بھی اپنے عروج پر تھا۔ حضرت محروم کی شاعری میں ان تمام رجحانات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے' ان کی تصنیف'' گنج معانی'' ہمارے شعری ادب میں ایک ایسا گراں قدر اضافہ ہے۔ جس کا مطالعہ ہر لحاظ سے سچی ادبی مسرت کا حامل ہے۔''

(قومی زبان۔ کراچی ۱۶رنومبر ۱۹۵۸ء)

ہمیں یقین ہے کہ پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب پوری فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے حضرت محرومؔ کے کمالِ فن کا اعتراف کریں گے اور انھیں وہ تمام مادی سہولیات بہم پہنچائیں گے جو بڑھاپے میں فن کاری کی تخلیقِ فن کے لیے اشد ضروری ہوتی ہیں۔

(روزنامہ پاسبان، بنگلور ۹ ردسمبر ۱۹۵۸ء)

(۲)

پنڈت تلوک چند محروم کی عزت افزائی

حکومت پنجاب مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے جناب تلوک چند محرومؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا محروم صاحب نے ادبِ اردو کی جو گراں بہا خدمات انجام دیں ہیں اس پر ہندوستان فخر کرتا ہے اور اگلی پچھلی نسلیں فخر کرتی ہیں۔ جناب تلوک چند محرومؔ کی اعزازیابی کے سلسلے میں یہ واقعہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ حکومت پنجاب اردو کے اس حق کو نظر انداز نہیں کرتی جو پنجاب پر اس کا مانا ہوا حق ہے۔

ہمیں تعجب ہے کہ حکومت پنجاب نے محرومؔ صاحب کی جو عزت افزائی کی اس کی تقلید حکومت ہند اور اس کی ساہتیہ اکاڈمی کیوں نہیں کرسکتی۔ محرومؔ صاحب کئی کتابوں کے مصنف و موئف ہیں جن میں خصوصیت سے قابلِ ذکر گنجِ معانی۔

رباعیات محرومؔ ۔کاروانِ وطن' نیرنگ' خیال' شعلہ نوا' اور بہارِ طفلی ہیں۔ان میں سے ایک ایک کتاب پر ساہتیہ اکاڈمی انعام دے سکتی ہے۔ ہم پنڈت جواہر لال نہرو اور پروفیسر ہمایوں کبیر کی توجہ اس مسئلہ کی جانب مبذول کرانی چاہتے ہیں کہ جناب تلوک چند محروم کی ادبی خدمات کا اعتراف ازبس ضروری ہے ان کی عزت افزائی علم وادب کی عزت افزائی ہے۔حکومت پنجاب نے محروم صاحب کی جو بروقت عزت افزائی کی اُس نے حکومتِ ہند اور ساہتیہ اکاڈمی کے لیے ایک فوری مسئلہ پیدا کر دیا ہے کہ جناب تلوک چند محروم کا حق دیر تک نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(پیامِ مشرق۔دہلی ۱۴/اپریل ۱۹۶۲ء)

(۷)

شعلۂ نوا

جناب تلوک چند محرومؔ کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔اس میں تین دور قائم کر کے ہر ہر دور کی غزلیں علیحدہ شائع کی گئی ہیں پہلا دور ۱۹۰۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۰ء پر ختم ہوتا ہے۔دوسرا دور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا۔لیکن ان تینوں ادوار کی غزلوں میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

جناب محرومؔ نظم گو شاعر ہیں اور اتنے جید و پُر گو کہ ان کی نظموں کے متعدد مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔اس لیے قدرتاً ان کی غزلوں میں بھی رنگ غالب وہی ہونا چاہیے جو نظموں میں پایا جاتا ہے۔یعنی وہی سادگی بیان وزبان' وہی خلوصِ جذبات وتاثرات۔اس میں شک نہیں کہ غزلیں کلاسکل انداز کی ہیں۔لیکن دور از کار اور مبہم تلمیحات سے پاک ہیں۔جناب محروم کی نیک نفسی و پاکیزگی احساس ان کی غزلوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے اور اس لحاظ سے کہ ان میں صحیح درسِ زندگی بھی دیا گیا ہے وہ بہترین نظم کی بھی حیثیت رکھتی ہیں۔

(نگار۔جون ۱۹۶۲ء)

(۸)

تلوک چند محرومؔ

(مرتب جگن ناتھ آزاد)

محرومؔ صاحب کا نام اردو شعرا کی فہرست میں بہت اونچے مقام پر ہے۔نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے آپ اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ نے اُردو نظم کے گیسو کو ہر انداز سے سنوارا ہے۔نظم' غزل' رباعی' قطعہ جمل

اصنافِ سخن میں آپ نے دادِ سخن دی ہے۔ اس کتاب میں آپ کے فن اور تخلیقات سے متعلق مختلف اصحاب کے ۲۴ مضامین شامل ہیں۔ ان میں سر عبدالقادر۔ برجموہن دتاتریہ کیفی' جوش ملسیانی' دیانرائن نگم قابلِ ذکر ہیں۔ کتاب میں محروم صاحب کی چار تصویریں بھی شامل ہیں۔ ۱۹۰۶ء کی ایک تصویر بڑی نادر ہے۔

(آج کل۔ دہلی۔ نومبر ۱۹۵۹ء)

(۹)

کاروانِ وطن

محروم ہمارے بزرگ شاعروں میں اونچا مقام رکھتے ہیں شاعری ان کے نزدیک فقط حسن کاری یا تفریح و تفنن نہیں۔ انھوں نے اس کے سماجی اور اجتماعی منصب کو تسلیم کیا ہے اور ہمیشہ اسی روش پر گامزن رہے ہیں۔ ان کی نظموں کا رنگ انفرادی نہیں' یہ ذاتی مسرتوں یا غموں کا ترانہ نہیں۔ بلکہ ان کا رُخ پورے ملک اور قوم کی طرف ہے اگر شاعر کے فرائض میں ملک و قوم کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنا بھی شامل ہے تو محروم کی شاعرانہ عظمت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ کاروانِ وطن میں آزادی سے پہلے کی نظمیں ہیں اور بعد کی بھی۔ محروم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ زندگی کے مایوس لمحوں میں بھی انھوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

محروم کی شاعری میں کہیں بھی بے دلی کے آثار نظر نہیں آتے اور انھوں نے ہر جگہ یقین کی شمع کو روشن رکھا ہے۔ کاروان وطن کی اشاعت سے ایک ایسے شاعر کا ذہنی کارنامہ سامنے آگیا ہے جو نصف صدی سے قومی زندگی کے لیے ہر موڑ پر وطن کی عظمت کے ترانے گا رہا ہے۔ (آل انڈیا ریڈیو، دہلی)

گوپی چند نارنگ

(۱۰)

بہارِ طفلی

تلوک چند محروم استادِ فن ہیں۔ ان سے اُردو دنیا بخوبی واقف ہے۔ ان کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''بہارِ طفلی'' بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے لکھی ہوئی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس طرح ان کو دوسرے اصنافِ شاعری پر قدرت حاصل ہے اسی طرح بچوں کی زبان لکھنے پر بھی پوری قدرت حاصل ہے اور ان کی قدرت کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ بچوں کے مشہور شاعر محمد شفیع نیر صاحب نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔ اور ان کو خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔ کتاب کی بہت

سی نظمیں بچوں کو یاد کرا دینے کے لائق ہیں۔

(معارف۔ اعظم گڑھ۔ جون ۱۹۶۲ء)

(۱۱)

کاروانِ وطن

جناب تلوک چند محرومؔ اُردو کے مشہور و معروف اور نغز گو شاعر ہیں جن کی شاعری محتاجِ تعارف نہیں۔ انھوں نے بیسویں صدی کے اوائل سے شعر کہنا شروع کیا اور اس دوران میں انھوں نے نہ معلوم کتنی غزلیں، نظمیں اور رباعیات کہیں۔ کاروانِ وطن ان کی سیاسی منظومات کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ گنجِ معانی اور رُباعیاتِ محروم   کاروانِ وطن میں ۱۹۰۶ء سے لے کر اس وقت تک کی سیاسی نظمیں شامل ہیں اور اسی کے دو حصے ہیں۔ فریادِ جرس اور منزل۔

کاروانِ وطن کی نظموں سے محرومؔ کی صرف شاعرانہ قادر الکلامی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ ان کے بے پناہ جذبۂ حب الوطنی کا بے ساختہ اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ چناں چہ تلوک چند محروم کے زیرِ نظر مجموعے میں گوکھلے' تلک' سودیشی تحریک' سائمن کمیشن'، 'گول میز کانفرنس' کمیونل اوارڈ' قحطِ بنگال' پاکستان' جشنِ آزادی' مہاتما گاندھی' کشمیر' ۲۶ رجنوری۔ آزاد' غرض اس قسم کے سبھی موضوعات پر نظمیں پائی جاتی ہیں اور اس لیے بقولِ حضرت نیاز فتحپوری'' ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی گزشتہ نصف صدی کی تاریخ بھی ہے' جذباتی تصور بھی۔''

(نیا دور لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۶۰ء)

(۱۲)

رباعیات محروم

جناب تلوک چند محرومؔ اس دور کے اساتذۂ سخن میں ہیں اور اُردو شعر و ادب پر ان کی نظر استادانہ ہے۔ بقول سر عبدالقادر مرحوم'' انھوں نے اپنی عمر بھر کی محنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے'' اُردو کے اصنافِ سخن میں رُباعی بہت مشکل صنف ہے۔ اس لیے دوسرے اصنافِ سخن کے مقابلے میں رُباعیات کے مجموعے کم ہیں۔ لیکن جناب محروم جس درجہ کے غزل گو اور نظم گو ہیں اسی درجہ کے رُباعی گو بھی ہیں۔ اور ان کی رُباعیات کا ایک مجموعہ عرصہ ہوا چھپ چکا ہے۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ جس میں مختلف عنوانات کے تحت بڑی حکیمانہ

اور سبق آموز رُباعیات ہیں ۔ اُردو رباعیوں کے علاوہ آخر میں چند فارسی رُباعیاں بھی شامل ہیں ۔ یہ مجموعہ جناب محروم کے کلام کی پختگی و بلندی، زبان کی حلاوت وسلاست اور بیان کی دل کشی ودلآویزی کا نمونہ ہے۔ مجموعے کے شروع میں اکبرالہ آبادی کی ایک منظوم تقریظ کے علاوہ ڈاکٹر اقبال اور علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی کے پُر مغز دیباچے ہیں ۔جن میں رُباعیاتِ محروم کی مختلف حیثیتوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ اپنی فنی اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اربابِ ذوق کے مطالعے کی چیز ہے۔

(''معارف'' اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۵۹ء)

(۱۳)

رُباعیاتِ محروم

جناب تلوک چند محروم ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔محرومؔ صاحب آج کل ہندوستان میں مقیم ہیں ۔ اُردو زبان کے سلسلے میں ان کی خدمات مسلم ہیں۔ ان کی رُباعیات کا زیرِ نظر مجموعہ دوسری بار شائع ہوا ہے۔ دیباچہ طبع اول اورینٹل کالج کے پروفیسر شیخ محمد اقبال محروم نے ۴۲ء میں لکھا تھا جو کتاب کے آغاز میں شامل ہے اور دیباچہ طبع ثانی علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی نے تحریر کیا ہے۔ گرد پوش پر حضرت جوش نے لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رباعیاں بعض مقامات اپنی روحانیت کے باوجود اُردو کے سنجیدہ ادب میں جو بہت قلیل ہے ایک گراں بہا اضافہ کر دیں گی۔ کتاب قرینے سے طبع ہوئی ہے۔ قیمت تین روپے بارہ آنے ۔ ناشر رسالہ بیسویں صدی ترکمان گیٹ، نئی دہلی ۔

(ہمایوں ۔ لاہور ۸رفروری ۱۹۵۵ء)

(۱۴)

رباعیات محروم

منشی تلوک چند محرومؔ دنیائے ادب میں تعارف کے محتاج نہیں ۔ آپ کی رُباعیات کا مجموعہ ۱۹۴۷ء میں چھپا تھا۔ اب دوبارہ زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ کتاب نہایت حسین وجمیل چھپی ہے۔ طبع ثانی کا دیباچہ علامہ دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے۔ ابوسعید ابوالخیر خیام، اور سرمد فارسی کے مشہور، زمانہ رُباعی گوشاعر ہیں ۔ اُردو میں اکبر، حالی، جوش، رواں اور محروم نے اس صنف میں دادِ سخن دی ہے۔ فلسفہ، اخلاق، مذہب، انسان دوستی اور خدا پرستی محروم صاحب کے طبعی موضوعات ہیں لیکن فکر و نظر اور شعر و شاعری کے دوسرے تمام لوازم بھی آپ کی رُباعیات میں بھی پورے طور پر موجود ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ گراں قدر مجموعہ اہلِ ملک سے پوری داد حاصل کرے گا۔ اور ملک کی یونی ورسٹیاں جہاں اُردو پڑھائی جاتی ہے اسے اپنے

نصاب میں شامل کرنے کی سعادت حاصل کریں گی۔ ملنے کا پتہ۔ رسالہ بیسویں صدی۔ نئی دہلی۔

(آج کل۔ دہلی۔ اپریل ۱۹۵۵ء)

(۱۵)

منشی تلوک چند محروم

منشی تلوک چند محروم ان کہنہ مشق شعرائے اُردو میں سے ہیں جنھوں نے اپنی کاوشوں سے یہ اعتراف کروایا ہے کہ واقعی اُردو کی نشو و ارتقاء میں پنجاب کا زبردست ہاتھ ہے۔ موجودہ تہذیب وتمدن سے بہت دور میانوالی کے ضلع سے محروم کی نوائے دلفریب اُردو کے گلزار میں گونجتی ہے اور آج سے نصف صدی پیشتر تمام احباب کو اس امر کے قبول کرنے پر مجبور کردیتی ہے کہ پنجاب کی سرزمین میں اُردو کے فروغ کے اربعہ عناصر اقبال' ظفر علی خاں' سر عبدالقادر اور محروم کا بہت زبردست ہاتھ ہے۔ آپ کا مجموعہ کلام عرصہ ہوا سر عبدالقادر کے پیش لفظ کے ساتھ گنجِ معانی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اب رُباعیات محروم منصۂ شہود پر آتی ہیں۔ رُباعی پر قدرت حاصل کرنا ایک اُستادِ فن کا کام ہے اور محروم نے رُباعیات میں حمد و مناجات' انسان' مذہب' دنیا' جذبات' پیری اور شعر و شاعری' غرض یہ کہ موضوع کو بطرزِ احسن نبھایا ہے۔ اُردو شاعری میں رُباعیات محروم کا مقام بہت بلند ہے۔

(روزانہ ہند۔ کلکتہ، ۱۷ اپریل ۱۹۵۵ء)

(۱۶)

گنجِ معانی

تلوکِ چند محروم ایک فردِ واحد کا نام سہی لیکن اب یہ نام ایک ادبی روایت بن گیا ہے۔ ایک جاندار ادبی روایت جو گزشتہ نصف صدی سے اُردو شاعری کا سرمایہ افتخار ہے۔

حضرت محرومؔ کی شاعری کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب کہ اُردو دنیا ایک نئی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ اور حالی جیسے دردمندوں کے نغمے ہر طرف گونج رہے تھے۔ شاعری میں نئے نئے موضوعات دخل پا رہے تھے۔ اور اس کے نتیجہ میں شعراء کا قومی اور سیاسی شعور پوری طرح نمایاں ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ فطرت پرستی کا میلان بھی اپنے عروج پر تھا۔ حضرت محروم کی شاعری میں ان تمام رجحانات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

''گنجِ معانی'' چودہ حصّوں میں منقسم ہے اور الگ الگ عنوانات کے تحت کلام بڑی خوش اسلوبی سے جمع کر دیا گیا

ہے پہلا حصّہ حمد ومعرفت کی نظموں سے متعلق ہے جن میں شاعر نے خدا کی ذات اور صفات کو شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ دوسرا حصّہ ''جذبات فطرت'' ہے اس میں دل سے دو دو باتیں ''ایّامِ غم'' اور ''موت'' جیسی اعلیٰ درجہ کی نظمیں شامل ہیں۔ تیسرا حصّہ 'مناظر قدرت کی عکاسی کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں موسموں کی مختلف کیفیتوں اور نیچر کے گونا گوں مظاہر کو ایک پرستارِ حسن کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس حصّے کی تقریباً سبھی نظموں میں شاعر کا لہجہ بڑا سبک اور گداز ہے۔ اور ''آہنگ وہیئت'' کے خوبصورت تجربے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً نظم ''بادِ بہاری'' اس طرح شروع ہوتی ہے۔

گلشنِ آفاق میں پھول کھلاتی ہوئی

ناچتی گاتی ہوئی

جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی

عطر اڑاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی

اس سلسلے کی تمام نظموں میں شاعر نے نادر تشبیہات اور دل نشیں استعارات سے بہت کام لیا ہے۔

چوتھے حصّے میں رامائن کے مختلف سین شعری لباس میں پیش کیے گئے ہیں۔ چکبستؔ کے بعد محرومؔ کو اس سلسلے میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے رامائن کے بعض مناظر یا واقعات کو اُردو نظم میں بڑی خوبصورتی سے منتقل کیا ہے۔ اس کے بعد کا حصّہ پند ونصائح سے متعلق ہے۔ اس میں شاعر نے اگرچہ ''ناصح'' کا کردار ادا کیا ہے۔ مگر شعریت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ چھٹے اور ساتویں حصّے میں سعدی کی گلستاں کے بعض اشعار اور شکسپیر کے بعض مضامین کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ''یادِ رفتگاں'' کے عنوان سے چند نظمیں یک جا کی گئی ہیں۔ جن میں سرورؔ جہاں آبادی نادرؔ کاکوروی، چکبستؔ اور مولانا گرامی وغیرہ کی وفات پر دلی تاثر کا اظہار کیا گیا ہے۔ ''نور جہاں کا مزار'' اس حصّے ہی کی نہیں بلکہ پوری کتاب کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ نواں حصّہ ''طوفانِ غم'' ہے۔ اگرچہ اس میں مختلف نظمیں ہیں لیکن اس حصّے کو ایک مسلسل نظم ہی سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ تمام نظمیں حضرت محروم نے اپنی اہلیہ کی وفات پر ۱۹۱۵ء میں کہیں۔ ان نظموں میں ایک فرد کی محبت پر سچی محبت کا جو اظہار ملتا ہے وہ اُردو شاعری میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس کے بعد ''تقریبات'' کے عنوان کے تحت وہ تمام نظمیں ملتی ہیں جو مختلف موقعوں پر کہی گئیں۔ اگرچہ ان کی نوعیت ہنگامی اور وقتی ہے لیکن بعض نظمیں مثلاً ''مادرِ مہجور'' اور ''نرگس کے پھول'' مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اچھی شعری تخلیقات ہیں۔ اس کے بعد تضمینات ہیں۔ اقبال، غالب، ناصر علی اور صائب کے اشعار کی تضمینات اپنی بے ساختگی کے لحاظ سے خاصے کی چیزیں ہیں۔

''گنجِ معانی'' کا بارہواں حصّہ قطعات پر مشتمل ہے۔ اور اس کے بعد ''کلام عاشقانہ'' ہے۔ جو مصنف کے ابتدائی زمانے کی یادگار ہے۔ اُس میں ''نامہ دُل ربا'' ناکام آرزو'' ''شب غم'' ''نگاہِ ناز سے مجھ کو نہ دیکھو'' اور ''پیغام'' جیسی خوبصورت نظمیں شامل ہیں۔ آخر الذکر نظم اُردو کی عشقیہ شاعری میں اپنی نوعیت کی منفرد کاوش ہے۔ اس میں شاعر نے بادِ صبا کو ''پیغامبر'' بنایا ہے اور محبوب کے نام اپنا پیغام اس دردبھرے لہجے میں دیا ہے:

بھاری ہیں صدمے فرقت کے　　　ٹوٹے ہیں پہاڑ مصیبت کے

پائے ہیں نتیجے الفت کے　　　راتیں غم کی دن آفت کے

دونوں کا کام رُلا دینا

یہ طور اگر تھے نفرت کے　　　پہلے ہی سے تھا جتلا دینا

اے بادِ صبا اے بادِ صبا

میرا پیغام سُنا دینا

''کلامِ عاشقانہ میں غزلیں بھی شامل ہیں۔ اِن غزلوں میں اچھے شعر اگر چہ موجود ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان میں وہ ''تیور'' نہیں جو کہ عاشقانہ نظموں میں پائے جاتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ حضرت محروم بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور اُن کا مزاج غزل کے انتشار سے گہری مطابقت نہیں رکھتا۔ آخر میں ''قندِ پارسی'' کے عنوان سے فارسی کلام شائع کیا گیا ہے۔

''گنجِ معانی'' ہمارے شعری ادب میں ایک ایسا گرانقدر اضافہ ہے جس کا مطالعہ ہر لحاظ سے سچی ادبی مسرت کا حامل ہے۔

(''قومی زبان'' کراچی)

(۱۷)

بہارِ طفلی

مجموعہ ہے جناب تلوک چند محروم کی ان نظموں کا جو انھوں نے بچوں کی تربیتِ اخلاق کے لیے لکھی تھیں جناب محروم ملک کے ان شعراء میں سے ہیں، جنھوں نے ہمیشہ کام کی باتیں کہیں۔ اور یتبعھم الغاوون کی صف میں سے ہمیشہ الگ رہے۔ افسوس کہ اردو مدارس کا نصاب وضع کرنے والے عشقیہ شاعری کا انتخاب تو ضرور دے دیتے ہیں (جو قطعاً نہ ہونا

چاہیے) اور ایسی نظموں کو چھوڑ دیتے ہیں جو بچوں کے اخلاق کی اصلاح کے لیے ضروری ہیں ۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر جناب محروم کی یہ کتاب بچوں کے نصاب کا ضروری جز وقرار دی جائے ۔

(نگار۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء)

(۱۸)

کاروانِ وطن

اُردو کے نامور شاعر اور مسلمہ استاد جناب تلوک چند محرومؔ کے کلامؔ کے دو مجموعے ''گنجِ معانی'' اور ''رباعیات محروم'' اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں ۔ اب یہ تیسرا مجموعۂ کلام کاروانِ وطن حال ہی میں شائع ہوا ہے ۔ یہ مجموعہ ان کی سیاسی شاعری کا مرقع ہے اس کے دو حصے ہیں ۔ ایک حصہ فریاد جرس' اور دوسرا منزل کے شاعرانہ نام سے موسوم ہے ۔ فریادِ جرس میں عہد غلامی یعنی ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کا کلام ہے ۔ اور منزل میں آزادی کے بعد کا کلام ہے ۔ پورے مجموعہ میں تقریباً ۱۸۸ نظمیں اور قطعات ہیں ۔ بعض نظمیں خاصی طویل ہیں ۔

محروم کی غزل سرائی اور رباعی گوئی سے ادبی حلقے پہلے سے واقف ہیں لیکن ان کی سیاسی شاعری سے کم لوگوں کو واقفیت تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نیم سرکاری ملازم تھے ۔ اس لیے ان کی سیاسی نظمیں ہمیشہ دوسرے نام سے شائع ہوتی تھیں ۔ چناں چہ ان کی ایک شاہکار نظم جو انھوں نے بہادر شاہ ظفر مرحوم کے ایک مشہور مصرعے

اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

پر بطور تضمین کہی تھی اسی دورِ اخفا کی یادگار ہے ۔ آزادی کے بعد والی نظموں میں ''پاکستان کو الوداع'' اور صوفی الہ داد خاں'' بڑی موثر اور جاندار نظمیں ہیں ۔ محروم کی سیاسی نظموں میں مولانا حالی کی مصلحانہ شاعری کا رنگ جھلکتا ہے ۔ اور ہر نظم اور ہر شعر میں سادگی کے ساتھ خلوص و صداقت نمایاں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے محض دماغ ہی نہیں بلکہ قلب و وجدان متاثر ہوتے ہیں ۔ اس لحاظ سے یہ نظمیں وطنیت وقومیت کے درس کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

(معارف، اعظم گڑھ نومبر ۱۹۶۱ء)

(۱۹)

گنجِ معانی

اُردو کے مشہور شاعر جناب تلوک چند محروم ربع صدی قبل ''گنجِ معانی'' کے نام سے اپنا کلام شائع کر کے ادب

کے افق پر ابھرے تھے۔ اس طویل مدت میں اُردو شاعری نے کئی رنگ بدلے سینکڑوں شاعر سامنے آئے۔ کئی ابھرے اور کئی ایسے گم ہوئے کہ ان کا نام بھی لوگوں کو یاد نہ رہا۔ مگر محروم تخلص کے اعتبار سے محروم ہی اپنے مقام سے محروم نہیں ہو سکے۔ آج بھی ان کے کلام میں وہی تازگی موجود ہے جو پچاس سال قبل تھی۔ جس کا ثبوت ''گنجِ معانی'' کے دوسرے ایڈیشن کے مطالعے سے ملتا ہے۔ پونے چھ سو صفحات کا یہ مجموعہ دہلی کتاب گھر نیا محلہ پل بنگش دہلی نے شائع کیا ہے۔ کتاب کا دیباچہ سر شیخ عبدالقادر مرحوم کا لکھا ہوا ہے، جو اپنی جگہ ایک پُر مغز اور مبسوط مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم، ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور جوش مسلیانی کی آراء بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ قریب قریب ہر نظم، غزل، قطعہ، یا رُباعی کے ساتھ تاریخ تحریر بھی درج ہے۔ جس سے محروم کی شاعری کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا کلام ۱۹۰۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ محروم کی شاعری میں سوز و گداز، اصلاح، منظر نگاری، خدا ترسی، انسانی ہمدردی اور جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ لطیف طنز، مناظرہ مابین ملا کمال موہوم و علامہ اقبال مرحوم'' اسی طرح نکات شیکسپیئر کے ایک علیحدہ باب میں محروم صاحب نے شکسپیر کے خیالات کو اُردو اشعار میں پیش کیا ہے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری نے جب انار کلی لاہور میں دفتر کھولا تھا تو اس موقع پر محروم صاحب نے چند شعر کہے جنھیں پڑھ کر وہ دور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے مختصر یہ کہ ''گنجِ معانی'' ایک ایسا مجموعہ کلام ہے جسے ہر اُردو داں بالخصوص پاکستان کے ہر صاحب ذوق کی لائبریری کی زینت بننا چاہیے۔

(نوائے وقت، لاہور۔ ۲۴؍جون ۱۹۵۷ء)

(۲۰)

گنجِ معانی

یہ برصغیر کے مشہور قادر الکلام شاعر جناب تلوک چند صاحب محروم کا مجموعہ کلام ہے جو دوسری مرتبہ شائع ہوا ہے۔ ساڑھے پانچ سو صفحات کی یہ کتاب حسنِ معنوی کے ساتھ حسن ظاہری کی بھی آئینہ دار ہے۔ شیخ عبدالقادر مرحوم نے طبع اول پر جو دیباچہ لکھا تھا وہ اب بھی شامل ہے، گنجِ معانی شاعر کی ایک بہترین تازہ تصویر سے بھی مزین ہے۔

حضرت محروم نے اپنے مجموعۂ کلام کو حسب ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) کلامِ معرفت (۲) جذبات فطرت (۳) مناظرِ قدرت (۴) رامائن کے سین (۵) سیرِ گلستاں (ترجمہ اشعار از گلستاں سعدی) (۷) نکات شیکسپیئر (۸) یادِ رفتگاں (۹) طوفانِ غم (۱۰) تقریبات (۱۱) تضمینات (۱۲) قطعات (۱۳) عاشقانہ کلام (۱۴) قندِ پارسی (فارسی زبان میں غزلیں۔ تضمینات اور قطعات)

محروم شاعر فطرت ہیں۔ اُردو شاعری میں ان کی نظم کا مقام بہت بلند اور منفرد ہے۔ اور اہلِ ذوق کے لیے ان

کے اس رنگا رنگ مجموعے میں سینکڑوں جنّتیں آباد ہیں ۔ حضرت محروم کم از کم پچاس سال سے لکھ رہے ہیں ۔ مگر ان کا کلام اب بھی جوان ہے۔ بلکہ اس کے تاثر اور قوت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان کا مجموعہ کلام ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

(الحمراء' لاہور ۔ جون ۱۹۵۷ء)

(۲۱)

گنجِ معانی

ہماری اُردو شاعری میں تلوک چند محروم ایک خاص مقام رکھتے ہیں' تمام اصناف سخن پر آپ کو عبور حاصل ہے۔ زبان نہایت صاف اور حلاوت آمیز ہے آپ کے اشعار میں جذبات کا شور و غل نہیں بلکہ زندگی کے مختلف مسائل بڑی متانت کے ساتھ جھلک رہے ہیں آپ نے اپنی شاعری کی بنیاد انسان کی عالمی برادری کے استحکام پر رکھی ہے۔ حُزنیہ اشعار کو جس رقت آمیز انداز میں آپ نے پیش کیا ہے وہ انھیں انفرادیت کی سطح پر لے آتا ہے۔

گنجِ معانی آپ کے موثر کلام کا ایک گراں قدر مجموعہ ہے اس تصنیف میں محروم صاحب نے سیکڑوں موضوعات کو اپنے خاص رنگ میں پیش کیا ہے۔ بعض انگریزی اور فارسی مقولوں کو اُردو کا لباس پہنا کر اپنے ملکی ادب کی بہت بڑی خدمت سر انجام دی ہے۔

گنجِ معانی میں بے شمار نظموں کے علاوہ غزلیات بھی شامل ہیں جنھوں نے اس کتاب کو زیادہ پُرکشش بنا دیا ہے۔ آخری حصّے میں آپ کا فارسی کلام بھی زیب قرطاس ہے۔ جس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت محروم کی علمی استعداد کافی وسیع ہے۔

۱۹۳۲ء میں گنجِ معانی پہلی بار شائع ہوئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا ہے۔ گنجِ معانی اُردو میں ایک قابلِ قدر صحیفہ ہے۔

(قندیل، لاہور ۲۳/ جون ۱۹۵۷ء)

(۲۲)

تلوک چند محروم

جناب تلوک چند محروم اُردو زبان کے ایک قادر الکلام، شیریں زبان اور شیوہ بیان شاعر ہیں' ان کے کلام میں

رنگینی، دلآویزی اور پختگی جوہر شناسانِ ادب سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔

لاریب کہ ان کی شاعری ادب و اخلاق کا ایک حسین و جمیل مرقع اور پاکیزہ ترین خیالات و جذبات کا روشن آئینہ ہے جس میں ان کی شاعرانہ عظمت کے خدوخال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اور ان خدوخال کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ اس عزت و شہرت کے یقیناً مستحق ہیں جو انھیں دنیائے ادب میں حاصل ہے۔

محروم تخلص ہونے کے باوجود تلوک چند کی اس خوش قسمتی کا کیا جواب ہے کہ ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں شہرتِ عام اور بقائے دوام کی سند پا چکا اور بڑے بڑے سخنور، ادیب اور نقاد اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔

شعر و ادب کی دنیا میں یہ عز و شرف شاذ و نادر ہی کسی شاعر کو نصیب ہوتا ہے کہ ہر مکتبِ خیال کے لوگ اس کی تخلیقات کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھیں۔ لیکن محروم صاحب اس شرف و اختصاص سے بھی محروم نہیں اور ان کی کامیابی و کامرانی کی دلیل یہ ہے کہ مسٹر جگن ناتھ آزاد ایسے نامور اور بلند پایہ شاعر ان کے فرزند ارجمند ہیں جن کو صحیح معنی میں جناب تلوک چند محروم کا ''خلف الصدق'' اور جانشین کہا جا سکتا ہے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

زیرِ تبصرہ کتاب جس کا نام تلوک چند محروم ہے مسٹر جگن ناتھ آزاد ہی کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے جس میں انھوں نے اپنے والد ماجد کے متعلق ان تمام اکابر شعراء و ادباء کے مضامین و مقالات کو جمع کر کے ترتیب دیا ہے جنھوں نے محروم کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر بصیرت افروز نقد و تبصرہ کیا ہے۔

ان نقادوں اور تبصرہ نگاروں میں ہندو پاکستان کے بہت سے سربرآوردہ اہلِ قلم کے ساتھ سر عبدالقادر مرحوم شیخ محمد اقبال پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، علامہ کیفی، دیا نرائن نگم، مدیر ''زمانہ'' کان پور۔ اور جوش ملسیانی جیسے بلند پایہ سخن شناس اور سخن گو بھی شامل ہیں۔

یہ کتاب ادارہ فروغ اُردو'' لکھنؤ نے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کی ہے۔ اور تلوک چند محروم کی شخصیت کو سمجھنے اور ان کے کلام کو صحیح تنقید کی روشنی میں پرکھنے کے لیے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

(پیامِ مشرق ۲۱ر اگست ۱۹۵۹ء)

(۲۳)

گنجِ معانی

محروم صاحب پنجابی ثم دہلوی اُردو شعر و ادب کے بڑے پرانے خادموں میں سے ہیں اور ان کی نظمیں اور غزلیں اس وقت ملک کے اونچے رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ جب بہت سے موجودہ ادیبوں اور شاعروں کا وجود بھی نہ تھا۔ کہنہ مشقی خود ایک دلیل فضیلت ہے۔ لیکن محروم صاحب محض پرانے کہنے والے نہیں۔ اچھے کہنے والوں میں شروع سے رہے ہیں اور رفتہ رفتہ ان کا کلام قدرۃً اور زیادہ جلا پاتا گیا ہے۔

ان کی قدرتِ سخن اور قدرتِ زبان کا ایک شاہد عادل اُن کے ذوق کا تنوع اور ہمہ گیری بھی ہے۔ انھوں نے کہنا چاہیے کہ کچھ نہ کچھ ہر موضوع پر لکھ ڈالا ہے اور جو کچھ بھی کہا پڑھنے کے قابل ہے رنگ تغزل سب پر مستزاد۔ دماغ کے عقب میں دل ہر جگہ موجود۔ یہ مجموعہ دیوان کی نہیں کلیات کی جگہ ہے (کلیات کا لفظ ہی جدید شاعری نے متروک کر دیا ہے۔ حالاں کہ کوئی دوسرا لفظ اس جامع لفظ کا جانشیں موجود نہیں)۔

پہلا ایڈیشن ۲۵ سال قبل ۱۹۲۲ میں نکلا تھا۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ حضرت اکبر نے داد اس سے بھی برسوں پیشتر یوں دی تھی:

ہے داد کا مستحق کلام محروم　　　لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم

ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز　　　ان کی نظموں کی ہے ملک میں دھوم

اور اکبر محض سخن گو نہ تھے، سخن سنج بھی تھے۔

۹۷۸ صفحہ کے گنجِ معانی کا دیباچہ سر عبدالقادر مرحوم کے قلم سے ہے حمد و معرفت سے جذبات فطرت مناظر قدرت سے لے کر یادِ رفتگاں، طوفان غم اور عاشقانہ کلام تک متعدد ابواب ہیں اور ان کے ماتحت بہت سی نظمیں ہیں۔ شیکسپیئر اور سعدی اور رامائن کے ترجمے بجائے خود جاذبِ نظر ہیں۔ اور نوحوں میں غالبؔ، گرامیؔ، چکبست، نادر کاکوروی وغیرہ کے ماتم ۔اور سب سے بڑھ کر راشد الخیری کا نوحہ فارسی میں ہے۔

تضمینات کے حصہ میں اُردو کلام کے علاوہ غالبؔ، صائب، ناصرؔ علی اور سعدی کے فارسی کلام پر بھی تضمینیں ملتی ہیں۔ آخر میں ۱۴، ۱۵ صفحات کا ایک مستقبل عنوان ''قندِ پارسی'' فارسی کلام کے لیے وقف ہے۔ غیر مسلموں میں اب اُردو ہی کے کہنے والے کیسے قابل قدر ہو گئے۔ پھر فارسی کہنے والے تو آنکھوں پر بٹھانے کے قابل ہیں۔

محرومؔ کے یہاں نمونے رزم و بزم، سوز و گداز۔ پند و موعظمت، شوخی و ظرافت سب ہی کچھ مل جاتے ہیں۔ پھر بھی شاعر کا اصلی رنگ غم و حُزن کا ہے۔ سوز ان کے ہاں ساز پر اور غم ان کے کلام میں نشاط پر غالب نظر آتا ہے۔

(صدق جدید۔ لکھنؤ ۲۹ رنومبر ۱۹۵۷ء)

(۲۴)

گنجِ معانی

غالباً ۱۹۳۲ء میں یہ گراں قدر مجموعۂ نظم لاہور سے بڑی آب و تاب کے ساتھ چھپا تھا۔ مقامِ شکر ہے کہ دوبارہ یہ مجموعہ اضافے کے ساتھ منظرِ عام پر آگیا ہے۔ محروم صاحب نے نصف صدی سے زیادہ اُردو کی خدمت کی ہے' وہ ایک وہبی شاعر ہیں' نظریوں کی بحث' خارجیت اور داخلیت کے جھگڑوں اور اسی قسم کے جدید فروعات سے ان کو سروکار نہیں وہ شاعر ہیں اور پُر خلوص شاعر ان کے یہاں حمد و معرفت بھی ہے' جذباتِ فطرت بھی' مناظرِ قدرت پہ انھوں نے بہت لکھا ہے ''یادِ رفتگاں'' اور ''طوفانِ غم'' میں ان کے دردمند دل کے شاہکار ملتے ہیں۔ آخر میں فارسی کلام بھی ہے۔

محرومؔ صاحب کی شہرۂ آفاق نظم ''نور جہاں'' کس نے نہیں پڑھی۔ وہ ایک نظم ہی محروم کے درجۂ شاعری کو متعین کرنے کے لیے کافی ہے۔ مضامین کے تنوع اور قادر الکلامی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اُردو میں اس نوعیت کے مجموعے بہت کم ہیں۔ یوں تو اس کے علاوہ محروم صاحب کی رُباعیات کا مجموعہ الگ چھپ چکا ہے۔ لیکن یہ مجموعۂ نظم ان کی شاعری کی پوری اور صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ بہت سی نظمیں مختلف جگہ کورس میں شامل ہیں لیکن اب اس کتاب کو ہی اُردو کے امتحانات اعلیٰ کے کورس میں شامل ہونا چاہیے۔

کلامِ محروم سے مثالیں پیش کر کے اس کی اہمیت اور افادیت کا ثبوت دینا کلامِ محروم سے بے انصافی کرنا ہے۔ کیوں کہ محروم کا سارا کلام مُستند' مُعتبر، پختہ اور پُر مغز ہے' ہر زمانے میں مشاہیر انھیں دادِ سخن دیتے آئے ہیں۔ اکبر الہ آبادی' ڈاکٹر مولوی عبدالحق' جوش ملسیانی کی رائیں کتاب میں درج ہیں۔ سر عبدالقادر اس کے دیباچہ نگار ہیں۔ ہندوستانی عناصر کی تلاش ہو تو کلامِ محروم میں بہت ملیں گے۔ آج کے زمانے کا شاعر اخلاقیات کے خلاف عام بغاوت کا اعلان کر کے قبولِ عام کی سند حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سعدی کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا۔ محروم بھی درسِ اخلاق دیتے ہیں لیکن شاعرانہ انداز کو نہیں چھوڑتے ہمیں اُمید ہے کہ اُردو کا یہ نادر مجموعہ اہلِ ذوق سے حسبِ سابق خراجِ تحسین حاصل کرلے گا۔ اور ہاتھوں ہاتھ بکے گا۔

(آج کل۔ دہلی۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء)

(۲۵)

تلوک چند محروم

نثری کتابوں میں یہاں صرف دو کا ذکر کافی سمجھتا ہوں ان میں سے ایک جگن ناتھ آزاد کی تالیف ''تلوکِ چند محروم'' ہے، یہ ایک پرانے اور سلجھے ہوئے شاعر کا تعارف ہے اس میں مختلف لوگوں کے مضامین ہیں جن میں سے چند محروم کی زندگی اور بیشتر ان کی شاعری کے متعلق ہیں۔

محروم نے مناظرِ فطرت کی مصوری اور اخلاقی مضامین کے بیان میں اپنا جوہر دکھایا ہے۔ ان کی زبان سادہ ہے' رُباعی ہو یا غزل، منظر نگاری ہو یا حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ' ہر جگہ وہی وضعدار' سادہ اور صاف آدمی دکھائی دیتا ہے۔ تہذیب کی بناوٹ' الفاظ کی بازیگری' پیچ در پیچ باتیں' اس کی ذات سے اتنی ہی دور ہیں۔ جتنی میانوالی نئی دہلی سے۔ البتہ یہ کتاب کچھ تشنہ سی ہے۔ بہتر ہوتا اگر اس میں کم سے کم دو مضامین ایسے ہوتے جو ان کی زندگی اور شاعری پر پوری روشنی ڈالتے۔

خورشید الاسلام

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو، دہلی)

(۲۶)

گنجِ معانی

تلوک چند محروم ہمارے ان شاعروں میں سے ہیں جن کا نام ہر جگہ عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور جن کی تخلیقات پر مختلف مکاتبِ فکر کا فکری اختلاف کچھ اثر نہیں ڈال سکتا۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں اس بزرگ شاعر کی کوئی نہ کوئی نظم نہ پڑھی ہو۔ تلوک چند محروم کی بہت سی ایسی نظمیں بھی ہیں جو آج سے بیس پچیس سال پیشتر پڑھی گئی تھیں۔ مگر آج بھی جب یہ نظمیں ہمارے سامنے آتی ہیں تو وہی ذوق شوق زندہ ہو جاتا ہے جو پہلی بار انھیں نصاب کی کتابوں میں دیکھ کر ہمارے دلوں میں پیدا ہوا تھا۔ وقت کے سمندر میں کئی ادبی تحریکوں کے طوفان آئے اور ختم ہو گئے۔ مگر ہمارے یہ بزرگ شاعر چپ چاپ روشنی کا مینار بنے کھڑے ہیں اور برابر روشنی دیتے جا رہے ہیں۔

گنجِ معانی تلوک چند محرومؔ کے کلام کا مجموعہ ہے، جو پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ آج اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ یہ مجموعۂ کلام ساڑھے پانچ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ شروع میں سر عبدالقادر مرحوم کا دیباچہ بھی ہے۔

(ادبِ لطیف، لاہور، جولائی ۱۹۵۷ء)

(۲۷)

تلوک چند محروم

پروفیسر تلوک چند محرومؔ وطن عزیز کے ان چند گنے چنے مایۂ ناز اور معروف شاعروں میں سرِ فہرست ہیں جو نصف صدی سے اُردو زبان اور ادب کی بے لوث اور مفید خدمت انجام دیتے رہے اور آج بھی جن کی ذات میدان ادب کے شہسواروں کے لیے اکتسابِ علم کا موجب بنی ہوئی ہے۔

وہ نہ صرف متعدد کتابوں کے مصنف ہی ہیں بلکہ وطن کی تقسیم سے قبل اور اس کے بعد برصغیر کے بلند پایہ ادیبوں' مفکروں اور ناقدوں سے دادِ فن وسخن پا چکے ہیں۔ انہی ادیبوں' مفکروں' اور ناقدوں کے مقالوں کو جمع کر کے جناب جگن ناتھ صاحب آزاد نے ایک کتابی شکل میں ''تلوک چند محروم'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

سر عبدالقادر' علامہ کیفی۔ سر شیخ محمد اقبال' علامہ تاجور، جوش ملسیانی' عدم' عطاء اللہ' حکیم ممتاز حسن احسن اور ایسے ہی دوسرے ممتاز اہلِ قلم کے مضامین اس کتاب کے صفحات کی زینت بنے ہیں۔ آخر میں میرے والد کے عنوان سے خود مؤلف جگن ناتھ آزاد کا مقالہ ہے۔ جس کو محروم صاحب کی سوانح حیات کے سلسلہ میں حرفِ آخر ہی سمجھنا چاہیے۔

''تلوک چند محروم'' ایک طرف محروم کی عظیم شخصیت پر سیر حاصل تبصرہ ہے تو دوسری طرف .... فن مقالہ نگاری وتنقید کے سلسلہ میں روشنی کا ایسا مینار ہے جس سے موجودہ اور آنے والے بقدرِ فکر ونظر فائدہ اٹھا سکتے ہیں قابل مبارک باد ہیں۔

جناب جگن ناتھ آزاد صاحب کہ جنھوں نے تلوک چند محروم کی اشاعت سے نہ صرف اپنے والد محترم کی بچی خدمت انجام دی ہے بلکہ اردو زبان وادب کو مفید سرمایہ پہنچایا ہے۔ یہ کتاب ادارہ فروغ اُردو لکھنو نے شائع کی ہے۔

(۲۸)

گنجِ معانی

بھارت میں اُردو پس ماندگی کا شکار ہوگئی ہوتی اگر چند لوگ ایسے نہ ہوتے جو اس کو بڑھاوا دینے کی مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں چند ایک بزرگ ہستیاں ایسی رہ گئی ہیں جنھیں اُردو سے محبت ہے اور جن کا دم اُردو کے لیے غنیمت ہے۔ اُردو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ان کی بکری کتنی ہے' دہلی کے اشاعت گھروں سے پتا چلا ہے کہ موضوعات میں زیادہ تنوع ملتا ہے۔ میں ایسے کئی ایک شاعروں اور ادیبوں کو جانتا ہوں جو عرصہ سے نامور ہیں۔ لیکن جن کے مجموعے اب بھی شائع ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس زبان کا اب کوئی مستقبل نہیں لیکن یہ

احساس انھیں تخلیق ادب سے مانع نہیں رکھتا۔ لیکن ایک بات جس پر وہ تاسف کا اظہار کرتے ہیں یہ ہے کہ اگر ایک طرف بھارت میں اُردو کے ساتھ سرد مہری ہوتی جارہی ہے تو دوسری طرف پاکستان میں اسے اس کا موزوں مقام نہیں دیا جارہا ہے۔

اس وقت میرے پاس دہلی کے نامور شاعر تلوک چند محروم کا تازہ ترین مجموعہ کلام ''گنجِ معانی'' ہے جو ایک طرح ساری زندگی کی ریاضت کا حاصل ہے۔ پانچ سو صفحوں کے اس مجموعے میں تقریباً تمام ہی اصناف شامل ہیں۔ غزلیں بھی نظمیں بھی رباعی بھی ہے اور قطعات بھی (جس کے ضمن میں یہ صراحت ضروری ہے کہ اس صنف کے نامور متقدمین میں سے تھے) ان کے علاوہ شیکسپیئر کے تراجم بھی ہیں اور رامائن کی تلخیص بھی مختصر الفاظ میں اُردو شعراء کے دائرے میں شامل ہر چیز اس خزینہ کا سرمایہ ہے' اپنی بیوی کی موت پر شاعر نے جو نوحہ لکھا ہے۔ وہ میتھو آرنلڈ۔ شیلے اور ٹینی سن کے مرثیوں کی یاد دلاتا ہے' ان کی نیچرل شاعری بھی ''سوزِ غم'' سے ماورئی نہیں ہے۔ ایک ایسی نظم ''خطا کس کی ہے'' میں وہ خود ہی کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ وہ خود حسنِ فطرت سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔

(ایوننگ نیوز، دہلی ۵ر جولائی ۱۹۵۷ء)

(۲۹)

گنجِ معانی

یہ ایک استادانہ تصنیف ہے۔ جدید میں قدیم اور قدیم میں جدید کا امتزاج رکھنے والے محروم کی ''گنجِ معانی'' کی مکرر اشاعت اپنے اندر وسعتِ مضمون رکھتی ہے ہر نظم مصنف کے ذہن رسا وجدت کا مرقع ہے' احساس ان کی زبان ہے۔ اور یہ احساس سطحی نہیں جس طرح ان کی شاعری ایک میکنکی فعل نہیں ہے' وہ محض شاعرانہ کرتب بازی سے کام نہیں لیتے' وہ مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے لیکن قائل کرنے کی ضرور کوشش کرتے ہیں۔

اپنے ذہن کی وسعت پذیری کے باعث وہ کسی ایک میدان میں محبوس نہیں رہتے۔ انھوں نے حالیؔ اور اسمٰعیل میرٹھی کی روح کو اپنے میں جذب کیا ہے۔ سرور جہاں آبادی اور چکبست سے بھی انھوں نے اثر قبول کیا ہے۔ پنجاب کے ایک گم نام گوشے سے اُبھرنے والے اس شاعر کے لیے اقبال کا تاثر قبول کرنا باعثِ رسوائی نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کی انفرادیت بہر حال قائم ہے اگر چہ وہ کئی ایک کے مرہون ہیں۔

محروم کا نظریۂ زندگی تنگ نہیں ہے۔ وہ راسخ الاعتقاد ہیں لیکن علیحدگیت پسند نہیں۔ وہ کسی ایک کے نہیں ہیں۔ پھر بھی سب کے ہیں۔

''ڈزورتھ کی ''ڈیفوڈلز'' اور ''ککو'' کی مانند محروم کی نیچرل شاعری بھی اپنے اندر بڑا جذب و کشش رکھتی ہے۔ ان کی قدرتی شاعری میں کثرت پرستی جھلکتی ہے۔ جیسا کہ بھائی ویر سنگھ اور شینی کی شاعری میں نمایاں ہے۔ جب وہ قدرت کی منظر نگاری کرتے ہیں تو وہ اتنی حسین آرائی کرتے ہیں کہ ان کی نظمیں ٹرنر کی منظری مصوری کا کیف پیدا کرتی ہیں ''ابرِ بہار'' بسنت'' اور ''شفقِ شام'' قدرت کی رنگا رنگی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ان میں فلسفیانہ روش شاید نہ ہو لیکن جو خد و خال قدرت کے نمایاں ہوتے ہیں وہ حسین ترین فنکاری کا نمونہ ہیں۔

یورپ میں ہومر کی مثنویاں ہر صدی میں شاعری کی چشمۂ تاثر بنی رہی ہیں بھارت میں ایسی ہی عظمت رامائن اور مہابھارت کو حاصل ہے۔ محروم نے بھی اس سرچشمہ سے فیض پایا ہے۔ رامائن کے بعض منظروں کی پیش کش انھوں نے نہایت ہی دل پذیر انداز میں کی ہے۔

محروم شاعری برائے شاعری سے بیگانہ ہیں ٹالسٹائی رسکن کے مانند ان کی تخلیق کی محرک ایک مقصدیت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی طرزِ ادا پوپ سے مشابہ ہے۔ اگرچہ وہ ان کی طرح غیر منطقی نہیں۔

محروم سخت کلامی سے پرہیز کرتے ہیں۔ انھیں اپنے جذبات کے اظہار پر پسندیدہ قابو حاصل ہے۔ کسی نکتہ کو وہ اتنا طول نہیں دیتے کہ اس کا حقیقی حُسن ضائع ہو جائے۔ اور وہ مبالغہ بن جائے۔ ان کا تخیل شفاف ہے۔ اور اظہارِ خیال بھرپور۔ اپنی بیوی کی موت کا نوحہ بھی کرتے ہوئے وہ نالہ و شیون پر نہیں اُتر آتے۔ بلکہ اس کے اظہار میں ایک انوکھا سوز و گداز صبر و تحمل اور ساکت شدت پیدا کرتے ہیں۔

چکبستؔ، گرامیؔ اور غالب کی یاد میں اُن کے نوحے محض اشکبار نہیں ہیں بلکہ روح کو اعلیٰ بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔

محروم کی غزلیں اور عشقیہ نظمیں فرسودہ اسوۂ عشق کی کہانیاں نہیں ہیں۔ ان میں عیش کی فراوانی تو ہے لیکن ان کا ساقی جام اور شراب درباری مشاعروں کی استعمال کردہ اصطلاحوں سے الگ مفہوم رکھتی ہیں۔ یہ روش نشاطِ روح ہے۔ کیوں کہ وہ صوفی ہیں۔

ان کی سادگی پرکار ہے۔ ان کا فن تصنع سے عاری ہے۔ اس میں معصومیتِ طفلی کے ساتھ ساتھ اندیشہ دردِ عشق بھی ہے' ان کی شاعری زندگی سے فرار نہیں جیسا کہ اُردو شاعری کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے وہ آفاقی اور غیر متعلقہ نہیں ہے بلکہ ارضی ہے۔ وہ انسان کے غم کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن اس میں ہارڈی کا الم انگیز لہجہ نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری قانع انسان کی رجائیت کن ایک ایسے دل کی آواز ہے جو راضی برضا ہے۔ ان کے دل کی دھڑکنیں سادہ لوحوں کے لیے ہیں۔ خود پسندوں کے لیے نہیں۔

(ٹربیون۔ انبالہ۔ ۱۱راگست ۱۹۵۷ء)

(۳۰)

گنجِ معانی

تلوک چند محروم ہمارے دور کے بزرگ شاعروں میں سے ہیں۔ وہ پچھلی نصف صدی سے شعر کہتے آرہے ہیں' وہ اس شہرۂ آفاق کے زمرے میں شامل ہیں جس کے دوسرے روشن ستارے اقبال' ظفر علی خاں اور حسرت وغیرہ ہیں۔ وہ اپنے دور کے بہترین ماہانہ رسالوں مثلاً مخزن' جو کہ اب بند ہوچکا ہے اور زمانہ (کانپور) وغیرہ کے لیے لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ان کا ایک مجموعۂ کلام شائع ہوا تھا۔ جو ایک طویل عرصہ تک دستیاب نہ ہوسکا۔ اس لیے ایک دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی جس میں بعد کے دور کی تخلیقات کو بھی شامل کردیا جائے۔ لیکن یہ کام اتنا بھاری تھا کہ وہ اپنی ضعیفی کے دنوں میں اس کا بوجھ اپنے اوپر نہ لے سکتے تھے۔ لیکن یہ ہماری خوش بختی ہے کہ یہ کام ان کے فرزند جگن ناتھ آزاد نے جو بذاتِ خود اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں اپنے سر لیا۔ نتیجہ زیرِ نظر "گنجِ معانی" (شائع کردہ دہلی کتاب گھر) میں ہمیں وہ تمام تخلیقات ملتی ہیں جو شاعر نے اب تک لکھی ہیں۔ سوائے رباعیات اور سیاسی نظموں کے کوئی دو سال پہلے ان رباعیات کا ایک مجموعہ شائع ہوچکا ہے۔ اور جہاں تک سیاسی نظموں کا سوال ہے وہ غالباً اس وقت زیرِ ترتیب ہیں۔ وہ جلد چھپنے والی ہیں۔

"گنجِ معانی" بلند پایہ شاعری کا ایک نمونہ ہی نہیں بلکہ پچھلے پچاس سالوں میں اُردو شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات کی ایک تصویر ہے۔

(انڈین۔ پی۔ ای۔ این۔ بمبئی۔ جولائی ۱۹۵۷ء)

(۳۱)

نیرنگِ معانی

حضرت محروم کو خدا تا دیر سلامت رکھے' ان کا شمار دورِ حاضرہ کے معمر ترین بزرگ اور ممتاز اُردو شعراء میں ہوتا ہے نصف صدی کی لمبی مدت انھوں نے اُردو کے گلستانِ سخن کی آبیاری میں صرف کی ہے۔ اُردو کے معدودے چند ہی شعراء ایسے نکلیں گے جنھوں نے اتنی طویل مدت تک اپنی شہرتِ سخن وری کا پرچم لہرایا ہو۔ حضرت محروم بڑے پُر گو شاعر ہیں اور شاعری کے قریب قریب تمام اصناف میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ وہ غزل لکھتے ہیں' رُباعی گو ہیں۔ سیاسی' قومی' وطنی اور دوسرے موضوعات پر انھوں نے بکثرت نظمیں لکھی ہیں' اس سے پہلے ان کے کلام کے کئی مجموعے' گنجِ معانی' رُباعیات محروم۔ کاروانِ وطن' شعلۂ نوا اور بہارِ طفلی کے ناموں سے چھپ چکے ہیں۔ نیرنگ معانی حضرت محروم کی نظموں کا ایک اور

مجموعہ ہے جو حضرت محروم کے نامور صاحبزادے جگن ناتھ آزاد کی ایک تمہید اور پروفیسر عبدالقادر سروری کے دیباچہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ نیرنگِ معانی میں حضرت محروم کی (۷) نظمیں، تسکین روح، چراغ راہ اور جذبات فطرت کے عنوانوں کے تحت جمع کردی گئی ہیں۔ پہلے عنوان کے تحت چار نظمیں آئی ہیں۔ دوسرے عنوان کے تحت (۳۱) نظمیں اکھٹی کی گئی ہیں۔ حضرت محروم بڑے کامیاب نظم گو شاعر ہیں۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کی شاعری کے جوہر پوری طرح اسی صنفِ سخن میں نکھرے ہیں۔ ان کے کلام کا امتیازی وصف دردمندی اور افتادگی ہے۔ شرافتِ نفس کے بغیر یہ دردمندی پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ شرافتِ نفس، دردمندی اور انسانیت دوستی یہ سب حضرت محروم کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ حفیظ جالندھری نے حضرت محروم کی شاعری کے بارے میں بالکل صحیح کہا ہے کہ اُن کی شاعری ہر لحاظ سے انسان کے قلب ونظر میں شریفانہ بلند نظری پیدا کرنے کا فریضہ انجام دیتی نظر آتی ہے۔ حضرت محروم بڑے ہی وسیع القلب اور بلند نظر شاعر ہیں۔ ان کی نظر میں صداقت اور حق کا بڑا احترام ہے۔ اسی لیے وہ ہر دین دھرم کے پیشواؤں اور ہادیوں کی دل سے عزّت کرتے ہیں اور ان کی خدمت میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں ''سیرت نبوی کی ایک مثال''۔ ''شہادت حسین''۔ ''کربلا'' امیر المومنین حضرت علیؓ کی زندگی کا ایک واقعہ ''حضرت مسیح اور بچے''۔ گورونانک۔ ''رام''۔ ''سری کرشن''۔ مہاتما ہنس راج''۔ وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ ''سیرت نبوی کی ایک مثال'' والی نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو۔ کوئی راسخ العقیدہ مسلمان بھی اس سے بڑھ کر اور کیا کہہ سکتا ہے۔

مبارک پیشوا جس کی ہے شفقت دوست دشمن پر
مبارک پیش رو جس کا ہے سینہ صاف کینے سے
انھی اخلاق کی خوشبو ابھی اطراف عالم میں
شمیمِ جانفزا لاتی ہے مکے اور مدینے سے

''گورونانک'' کا ایک شعر ہے:

گونجتا پھرتا پیامِ صلح کل ہے زیرِ چرخ
دھوم اطرافِ جہاں میں چار سو نانک کی ہے

سری کرشن جی کی مدح میں عرض کرتے ہیں :

تجلّی گاہ عرفاں کردیا میراں کا دل جس نے

نگاہِ سوز کو بخشی ضیائے مستقل جس نے

چلی آتی ہے عالم میں مسلم داوری جس کی

ہمارے دور میں بھی ہے مقدم برتری جس کی

نظیرِ اکبر آبادی نے جس کے گیت گائے ہیں

حفیظِ خوشنوا کے لب پہ یہ نغمے جس کے آئے ہیں

لکھی ہے شوق سے خواجہ حسن نے داستاں جس کی

ظفر نے نظم کی ہیں ذوقِ دل سے خوبیاں جس کی

وہ متھرا آج بھی ہے اس کے جلوؤں کی تمنائی

مشامِ جانِ حسرتؔ میں جہاں سے بوئے انس آئی

مبارک روز ہے یہ عید میلادِ کنہیا ہے!

محبت کا وسیلہ ہند میں یادِ کنہیا ہے!

شاعر اوروں کی نسبت کہیں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ خوشی اور غمی کے واقعات سے سب ہی متاثر ہوتے ہیں لیکن عام آدمی کے تاثر اور شاعر کے تاثر میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ''جذباتِ فطرت'' کے تحت ایسی ہی نظمیں جمع کر دی گئی ہیں جو مختلف واقعات عالم سے متاثر ہو کر حضرت محروم نے لکھی ہیں' اپنی زندگی کے ایک واقعہ سے حضرت محروم بہت متاثر ہیں' یہ حادثہ ہے ان کے ترکِ وطن کا۔ اصلاً وہ اس علاقہ کے باشندے ہیں جو اب پاکستان میں شامل ہے۔ تقسیم ہند کے خونچکاں حادثہ نے حضرت محروم سے ان کا وطن چھڑا دیا۔ لیکن اس کی جاں بخش یاد ان کے دل سے محو نہ ہو سکی۔ ''محروم کا وطن'' ''الوداع''۔ ''سودائے خام''۔ ''گارڈن کالج راولپنڈی کی یاد''۔ دریائے سندھ کی یاد'' اُسی یادِ وطن میں لکھی ہوئی نظمیں ہیں۔ ''دریائے سندھ کی یادگار'' کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

پنگھٹ اسی صورت کے اسی شان کے ہوں گے

ساماں دلِ شوریدہ کے ہیجان کے ہوں گے

کچھ ان میں ابھی تک مری پہچان کے ہوں گے

افسوس رسائی مری ہوگی نہ وہاں تک

اب رویئے ایامِ گزشتہ کو کہاں تک

اور ''سودائے خام'' میں یہ تڑپ اور دلسوزی ملاحظہ ہو :

اے کاش مجھ کو پھر نظر آئے وہ سرزمیں

صحرا بھی جس کے صحنِ گلستاں سے کم نہیں

آغاز تھا جہاں مرا، انجام ہو وہیں

اتنا ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں

سودائے خام ایک غریب الدیار کا

مختصر یہ کہ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری '' یہ کہنا کوئی بات نہیں کہ فکرِ لطیف اور حسنِ بیان کا یہ مجموعہ اُردو کے شعری سرمایہ میں ایک مستحسن اضافہ ہے اس لیے دلی خیر مقدم کا مستحق ہے''۔

(مبارز الدین رفعت - سیاست حیدرآباد دکن، ۱۸/ جون ۱۹۶۲ء)

(۳۲)

تلوک چند محروم

''شعر و شاعری'' کی اس سے جامع اور اس سے مختصر تاریخ اور کیا ہو سکتی ہے کہ شاعری مرکب ہے دو لفظوں سے ''سوز و ساز'' دنیا بھر کی شاعری کا بہ نظر تعمق جائزہ لیجیے۔ سوز و ساز' کی گوناگوں کیفیتوں کی جلوہ آرائیاں ہی نظر آئیں گی۔ اسے یوں سمجھے :

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

(غالبؔ)

''نوحہ غم'' کے ''المیہ'' میں عشق کی بے تابیاں۔ حُسن کی کج ادائیاں۔ وفا جفا' ہجر و وصال' شامِ غم اور شبِ فراق' شکوہ و شکایت' نوحہ خوانی اور ماضی کے سہانے خواب:

یاد نہ کر دلِ حزیں بھولی ہوئی کہانیاں

کی ترجمانی کی حق ادا ہو جاتا ہے اور نغمۂ شادی کے طربیہ میں ''جام و مینا'' بہاریہ کیفیات' منظر نگاری' دربارِ حُسن کی شان و شوکت' وارفتگی حسن اور جنونِ عشق کی مدح سرائی' قصائد، جذباتی گیت' سہرے اور پند و نصائح کے دفتر قلم بند ہو جاتے اور محفل و نشاط میں مردہ دلوں کو گرماتے ہیں۔ غم اور خوشی کی عبارت کا عنوان ہی زندگی ہے۔ اور زندگی ہی میں سوز ساز کے جذبات فطرت نے ودیعت کر رکھے ہیں۔ یہ موروثی اور فطری جذبات جو آدمِ گل کی خمیر میں سموئے ہوئے ہیں' شعر و شاعری کے روپ میں پردے سے باہر آنے کے لیے مجبور ہیں۔ زندگی کی قدروں میں رونے اور ہنسنے کے مقام ایک جیسے ہیں۔ جغرافیائی محلِ وقوع لسانی حدیں اور مخصوص تمدن کے اعتبار سے یہ مرحلے ہر انسان کی منزلِ حیات میں پیش آتے ہیں جب کہ وہ ان جذبات کے اظہار کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ چاہے نثر میں ہوں یا نظم میں بہر حال ہر ملک اور ہر قوم میں ''سوز و ساز'' کی ترجمانی کا حق عموماً شاعر کے حصہ میں آتا ہے۔

غور کیا جائے تو انسان سرتاپا ''مرقعِ غم'' ہے۔ لمحات مسرّت کوتاہ ہوتے ہیں اور اپنے پیچھے دھندلکوں میں ''غم'' کی یاد چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک ہنگامہ کے ہا' ہو میں زندگی کی منزلیں تو طے ہوتی ہیں۔ لیکن ''داغ ہائے غم'' دنیا کے سود و زیاں، رنج و محن' مصائب و مشکلات کے ہر موڑ پر تازہ ہو اُٹھتے ہیں۔ غرض دہرِ ناپائیدار کے لمحاتِ نشاط ناپائیدار اور رنج و غم کے داغ پائیدار ثابت ہوتے ہیں جو ہر آنے والی نسل کے سپرد کر کے ''بارِ غم'' سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔

اس کلیہ کے پیش نظر جہاں ''رزمیہ اور بزمیہ'' شاعری کی تفریق و تخلیق فارسی شعراء کی مرہونِ منّت ہے وہاں عربی شاعری میں رجز اور مراثی عوامی شاعری کی رُوح ہیں۔ رجز کے مقابلے میں مراثی دردناک المیہ کی وہ منہ بولتی تصویریں ہیں جنھیں پڑھنے اور سننے والے کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو جھلک اُٹھتے ہیں یہ مراثی عربی شعراء کے کمالِ فن کے وہ نمونے ہیں جنھیں بقائے دوام کی سند حاصل ہے' اور یہ حقیقت ہے کہ عربی اور فارسی کے باکمال شعراء کی شعر و شاعری میں ''ساز'' کی نسبت سے سوز خواص و عوام میں مقبول ہے۔ ساز کے پردے میں سوز کی ابتدا کرتے ہوئے رومی کہتا ہے :

بشنو از نے حکایت میکند

و ز جُدائی ہا شکایت میکند

اب اُردو ''شعر و شاعری'' کے ہر دور کے مقبول عام کلام کو لیجے۔ سوز نے وہ رنگ جما رکھا ہے کہ ساز پھیکا ہو کر

رہ گیا ہے۔ اسی سوز کے علم بردار' اُستادِ فن' یگانہ روزگار تلوک چند محروم دورِ حاضر کے اقلیمِ سخن کے وہ تاجدار ہیں جو بجا طور پر

خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

کا دعویٰ بابانگِ دہل کرسکتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۷ء تک دیارِ ہند کے نامور شاعروں' ادیبوں' صحافیوں اور استادانِ فن نے جو کچھ کہا اور لکھا کہ اس کا کوئی پہلو کوئی گوشہ تشنہ رہ گیا جس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہو۔ یقیناً نہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ جس خلوص وعقیدت کا اظہار کیا گیا ہے وہ بذاتِ خود اتنا مکمل اتنا عظیم ہے کہ محروم کی ذات سے لے کر ان کی عظیم المرتبت شاعری کے تجزیئے کا عکس پڑھنے والوں کے دل اور دماغ پر چھا جاتا ہے اور وہ محروم کو دل کے ''آئینہ'' میں پا کر وفورِ عقیدت سے سرِ نیاز جھکا دیتا ہے۔

اب دیکھیے ''تلوک چند محروم'' میں تلوک چند محروم سے مالک رام تعارف کرا رہے ہیں۔

''منشی تلوک چند صاحب محروم پنجاب کے ایک ریگ زار میں پیدا ہوئے جسے عرفِ عام میں میانوالی کہتے ہیں۔ عمر کا بیشتر حصہ عیسیٰ خیل کے پہاڑی علاقے میں بسر کیا۔ اوائل عمر سے ہی شعر وسخن کا شوق ہے' لیکن آج تک کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ تاہم کلام ایسا پختہ ہے کہ اُن پر اہلِ زبان ہونے کا دھوکا گزرتا ہے۔''

وقار انبالوی کہہ رہے ہیں۔

> ''محروم کی مادری زبان ڈیرہ خانی پنجابی ہے۔ لیکن وہ اُردو کا شاعر ہے۔ خیال کے علاوہ محروم کے ہاں الفاظ کا ذخیرہ اتنا ہے کہ اُسے پنجابی کہنے کی جرأت نہیں ہوسکتی''۔

علامہ کیفی فرماتے ہیں۔

محروم صاحب دنیائے ادب میں تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کی طبیعت ہمہ گیر اور آپ کا تخیل بلند و مستحکم اور بیان دل کش ہے۔ آپ کا شمار اُن اساتذہ میں ہے جن کی غائر نظر حال اور مستقبل تک پہنچتی ہے۔ آپ کے کلام کی پختگی اور اسلوب کی دل آویزی ملک کے نقادوں سے خراجِ تحسین وصول کرچکی ہے۔''

(فرمودہ عبدالقادر)

> ''خدا داد لطفِ سخن اور موزونی طبع سے انھیں حصہ وافر ملا ہے' اور اُن کا کلام مقبولِ عام سے محروم نہیں رہا ہے۔ اُن کے کلام میں جو بات زیادہ پائی جاتی ہے وہ کیفیتِ غم ہے۔ بہار ہو یا خزاں قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر اُن کے دل کا

کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے۔ شاعر سراپا درد ہو گیا۔"

ان آرا کے بعد اور کیا باقی رہ جاتا ہے جسے پیش کیا جائے۔ "کلامِ محروم" اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ جو جواہر پارے رہتے ہیں وہ بھی یقیناً منظرِ عام پر آجائیں گے مجھ جیسا ہیچ میرز کلامِ محروم کے ادبی محاسن بیان کرنے سے قاصر ہاں کلامِ محروم کے اثرات جو دل پر چوٹ لگانے کے باعث بنتے ہیں۔ اُن کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ:

نالہ پابندِ نے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

لیکن محروم نے نالہ کو پابندِ نے کر کے دکھا دیا :

لمسِ مضراب فقط خالقِ نغمہ ہی نہیں
لمسِ مضراب سے ہوتے ہیں شرر بھی پیدا

کلامِ محروم کو جستہ جستہ پڑھیے اور محسوس کیجیے کہ ساز کے پردے میں سوز بول رہا ہے۔ بقول وقار انبالوی "محروم کا نقشِ اوّل سے آخر تک دھندلا نہیں اور یہ دلیل ہے اس امر کی کہ محروم پیدائشی شاعر ہے۔

ذرا ملاحظہ فرمایئے۔ محروم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں:

اس دورِ کمالات میں پسپا ہوں میں
نقشِ قدم قدم کا جویا ہوں میں
سائنس کی تم ترقیاں گنواؤ
انسان کی مصیبتوں کو گنتا ہوں میں

کہیے اس رباعی کا کوئی جواب ہے۔

دورِ حاضر کی بات سنیے :

تغیّر پسند ہے زمانہ کا مزاج
تبدیل ہوئے جاتے ہیں رسم اور رواج

پہلے تھا جنونِ عشق عریانی کوش

برہم زنِ ہوش حُسنِ عریاں ہے آج

(دیا نند کپور، ہفتہ وار کارواں لکھنو ۔۲۴ مئی و کیم جون ۱۹۶۰ء)

(۳۳)

تلوک چند محروم

اس کتاب کے ذریعے ہندو پاک کے مشہور شاعر حضرت تلوک چند محروم کے شعری خدمات کو سراہتے ہوئے ملک کے صفِ اوّل کے اہلِ قلم حضرات نے اپنی نگارشات کے ذریعے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی جیتے جی قدر افزائی کا رجحان اُردو ادب میں دھیمی رفتار ہی سے سہی بڑھ ضرور رہا ہے جس کی قدر کی جانی چاہیے۔ گزشتہ سالوں جوش ملسیانی کے شعری جذبات کا نمائندہ طور پر اعتراف کیا گیا تھا۔ اسی طرح حیدر آباد میں ادبیاتِ اُردو کے زیرِ اہتمام حضرتِ امجد کا جشن الماسی منایا گیا اور پھر ''الشجاع کراچی'' نے اپنا ایک نمبر بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی خدمات کے اعتراف میں شائع کیا اور اب جگن ناتھ آزاد صاحب نے اپنے والد کے شعری خدمات کے اعتراف میں ایک مفید کتاب مرتب کردی ہے۔ اس کتاب میں محروم کے حیات و کلام پر ملک کے نمائندے لکھنے والوں کے تیرہ بصیرت افروز مقالے شریک کیے گئے ہیں۔ جن میں سر عبدالقادر' پنڈت کیفی' ڈاکٹر محمد اقبال' مالک رام' ڈاکٹر نارنگ، علی جواد زیدی اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ نے دل نشین پیرائے میں محروم کے فن اور ان کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ حضرت محروم بلا شبہ اُردو کے ممتاز شاعر اور عظیم بزرگ ہیں جن کی خدمات کا اعتراف مناسب اور موزوں وقت پر کیا گیا۔ اُن کے نورِ نظر آزاد صاحب نے ایمانداری سے اپنا فرض منصبی ادا کردیا اور اس بات کو عملی طور پر صحیح ثابت کر دکھایا کہ اگر ''پدر نہ تواند پسر تمام کند'' ہم اپنے پڑھنے والوں سے گزارش کریں گے کہ وہ اس اہم ادبی تاریخ کا ضرور مطالعہ کریں۔ طباعت و کتابت اور ترتیب کی نفاست بھی قابلِ مبارک باد ہے اور باعتبارِ مواد قیمت بھی مناسب ہے۔

(سب رس حیدر آباد، ستمبر ۱۹۵۹ء)

(۳۴)

تلوک چند محروم

تلوک چند نے اپنے لیے ''محروم'' کا تخلص پسند کیا تھا اور وہ آج اُن کے نام کا ایک جزو بن گیا ہے۔ جسے کسی

صورت میں بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ اُن کا تخلص اُن کے نام کا جزو تو بن گیا۔ قسمت کا جزو نہیں بنا۔ محروم کسی لحاظ سے بھی محروم نہیں کہے جا سکتے۔ اِن کی شاعری جو کم و بیش آج سے نصف صدی پیشتر شروع کی گئی تھی زندہ و تابندہ شاعری ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ اُن کے صاحبزادہ جگن ناتھ آزاد اگر باپ سے آگے نہیں بڑھ سکا تو اُن کے قریب قریب ضرور چل رہا ہے۔ اور آج اس سعادت مند بیٹے نے اپنی سعادت مندی کا ثبوت تلوک چند محروم کے نام کی کتاب سے دے دیا ہے۔ یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو اُردو کے کئی مشاہیر نے محروم کی ذات اور اُن کی شاعری کے متعلق لکھے ہیں۔ ان مشاہیر میں سر عبدالقادر۔ پنڈت کیفی۔ جوش ملسیانی' ممتاز حسن' فطرت' علی جواد زیدی بھی شامل ہیں۔

(ادبِ لطیف۔ جنوری ۶۰ء)

(۳۵)

محروم کی شاعری میں جذبۂ حُبِ وطن

تلوک چند صاحب محروم کے مجموعۂ کلام ''کاروانِ وطن'' کا مطالعہ کرنے کے بعد کوئی شخص یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محروم صاحب کی شاعری کی روح اُن کا جذبۂ قوم پرستی ہے۔ ہندوستان کی غلامی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

افسردہ ہے دل بہار میں بھی

تاراجِ خزاں چمن ہے اپنا

دم گھٹنے میں کیا کسر ہے باقی

مانندِ قفس وطن ہے اپنا

یہ تھا وہ احساس جو غلام ہندوستان کے متعلق محروم کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا اور اُن کے منہ سے بے ساختہ جو دُعا نکلی وہ یہ ہے۔

اے خداوندِ مہ و مہر دعا ہے تجھ سے

اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کردے

قعرِ پستی سے نکلنے کو ہیں بے تاب بہت

غیب سے خود کوئی سامان مہیا کردے

صومعے رشیوں کے تاریک نظر آتے ہیں

پھر ہمالہ کی گپھاؤں میں اُجالا کردے

ہندوستان کے دوسرے لیڈروں کی طرح محروم کا نظریہ بھی یہی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد ہندوستان کی آزادی اور تعمیر وترقی کے لیے ضروری ہے اور یہ اتحاد ایک بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ محروم کی ایک نظم کا عنوان ہی ''ہندو مسلمان'' ہے اس نظم کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

مٹے جھگڑا الٰہی کب یہاں ہندو مسلماں کا

بنے کب مشترک ہندوستاں ہندو مسلماں کا

غضب ہے ایک گھر کے رہنے والے یوں لڑیں باہم

جھگڑنا ہے بہم شورِ زناں ہندو مسلماں کا

بہاریں ہند میں کب آئیں اور سرسبز دیکھیں ہم

نہالِ اتفاقِ جاوداں ہندو مسلماں کا

محروم بھی ملک کی آزادی سے کبھی مایوس نہیں ہوئے اور اُن کی اُمیدوں کی پیشن گوئی بھی حسب ذیل تھی۔

گلشن میں بزمِ گل کے پھر اہتمام ہوں گے

کب تک خزاں کے جھونکے محوِ خرام ہوں گے

منزلِ گہِ تمنا یونہی کشش کیے جا

جو آج سست رَو ہیں کل تیز گام ہوں گے

محروم کا نظریہ ہے کہ امن اور شانتی کا راج کسی خاص قوم اور فرد کا نہیں اور اس تخیل کو رام راج کے نام سے حسب ذیل اشعار میں پیش کیا ہے۔ پہلا ہی مصرعہ کس قدر جامع ہے' گویا رام راج کی پوری تعریف ہے۔

نہ مظاہرے، نہ مقابلے، نہ ستم کشی نہ ستم گری

نہ قتیلِ تیغِ جفا کوئی، نہ اسیرِ غم کوئی ناتواں

نہ کسی کا درد ہے لادوا، نہ کوئی غریب ہے بے نوا

نہ ہے تیر آہِ نشانہ جو، نہ بلند ہے علمِ فغاں

کہیں بغض ہے نہ عناد ہے، کہیں فتنہ ہے نہ فساد ہے

نہ فریب پردۂ دوستی، نہ جفا طرازئ دشمناں

چلے جاؤ دامنِ کوہ سے جوکنارِ بحرِ رواں تلک

کہیں لہلہاتی ہیں کھیتیاں، کہیں مسکراتے ہیں گلستاں

یہی وہ زمانہ ہے جس کے ہم بہ ہزار شوق ہیں منتظر

یہ ہیں رام راج کی برکتیں یہ ہیں رام کی خوبیاں

محروم کا قوم پرستی کا جذبہ اُن کے ترانۂ آزادی میں ایک نئے رنگ سے جھلک رہا ہے۔

صبا پھر لے کے آئی ہے پیامِ جشنِ آزادی

ہے گلزارِ وطن میں اہتمامِ جشنِ آزادی

یہ جلسے یہ چراغاں یہ سرور و نُور کا عالم

ہے صبحِ جنت الفردوس شامِ جشنِ آزادی

اسی دن کے لیے قرباں کیے بیٹھے تھے جو سب کچھ

دلِ احرار سے پوچھو مقامِ جشنِ آزادی

وطن کے تشنہ کاموں کو صلائے عام دے ساقی

کہ پھر گردش میں ہے کاس الکرامِ جشنِ آزادی

تلوک چند محروم کا جذبۂ آزادی صرف اپنے وطن ہندوستان تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ پورے ایشیا کی آزادی کا جذبہ اُن کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے اور ایشیا کے ممالک پر یورپ کے سامراجیوں کی حکومت اور ایشیا کے عوام کو ایشیا کے وسائل و ذرائع سے محروم کر کے یورپ کو مستفیض کرنے کے طریقے کے خلاف محروم کے تاثرات اور ان کا احتجاج ملاحظہ ہو:

در حقیقت ہے یہ خونِ آرزوئے ایشیا

جامِ یورپ میں جو رقصاں ہے مئے عناب رنگ

رنگِ روئے ایشیائی اُڑ کے جا پہنچا وہاں

اس قدر رنگین نہ تھا پہلے خیابانِ فرنگ

ایشیا کے متعلق بھی محروم کی اُمیدوں اور توقعات نے کتنا صحیح اندازہ کیا ہے۔ آج سے دس سال قبل جن خیالات کا انھوں نے اظہار کیا تھا وہ آج عملی جامہ پہن چکے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں دہلی کی ایشیائی کانفرنس میں محروم صاحب نے یہ نظم پڑھی تھی۔ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

آئے ہیں ٹھان کر یہ محبانِ ایشیا ہوگا بلند پھر علمِ شانِ ایشیا

اب صاف ہو رہا ہے وہ میدانِ ایشیا بازی گرِ فرنگ رہا ہے جو مدّتوں

ایشیا کی روحانیت اور انسانی اخلاق پر کتنا بڑا بھروسہ ہے۔ کہتے ہیں۔

گوتم، مسیح اور محمد کے باوجود دنیا میں کیوں ذلیل ہو انسانِ ایشیا

غرض یہ کہ محروم صاحب کی شاعری کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ قومی جذبہ اُن کے جذبات شعری کا ایک بڑا محرک ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس مختصر تبصرہ میں جن نظموں کے اشعار کا حوالہ دیا گیا وہ محروم صاحب کی تصنیف کاروانِ وطن کی ہیں۔ کاروانِ وطن مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے شائع کی ہے جو ۴۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور جس کو محروم صاحب نے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے نام سے معنون کیا ہے۔

(اختر صدیقی، نئی دنیا دہلی۔)

(۳۶)

تلوک چند محروم

پنڈت تلوک چند محروم کے نام نامی سے کون شخص ناواقف ہوگا۔ اور غالباً ہم میں سے کم ہی ایسے ہوں گے جنھوں نے اپنے بچپن میں کورس کی کتابوں میں اُن کی نظمیں نہ پڑھی ہوں۔ لگ بھگ آدھی صدی کے پھیلاؤ میں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ان کی ادبی شخصیت اپنے پورے جاہ و جمال کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بآسانی یہ بات کہہ

سکتے ہیں کہ اُن کے یہاں گزشتہ دور کی وہ تمام صحت مند اور روشن روایات موجود ہیں جو آنے والے دور کے ادب کو روشنی اور زیبائش عطا کریں گی۔ اُن کے یہاں درد مندی' انسان دوستی' حُب الوطنی' وسیع النظری اور زندگی سے محبت کے وہ اعلیٰ جذبات کارفرما ہیں جنھوں نے اُن کے فن کو جلا بخشی اور لازوال بنا دیا۔ اُن کے کلام کی اثر آفرینی' حرارت اور تیکھا پن ایسی نمایاں خصوصیات ہیں جن سے کوئی زندہ اور متحرک دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جگن ناتھ آزاد نے اُن کے فن، شخصیت، آرٹ اور زندگی پر مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے مضامین ایک جگہ اکھٹا کر کے واقعی ایک بلند اور قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ اس کتاب میں جو چوبیس مضامین پر مشتمل ہے اور جو تقریباً اتنے ہی مضمون نگاروں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ پنڈت جی موصوف کی زندگی اور فن کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے اور ادب میں اس کا صحیح مقام متعین کیا جائے۔ یہ مضامین جو مختلف رسالوں اور مختلف مقامات پر شائع ہوئے تھے۔ آزاد نے ایک جگہ جمع کر کے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا اور اس طرح ایک ادیب کی حیثیت سے اپنی ادبی ذمہ داری اور ایک بیٹے کی حیثیت سے اپنی فرزندانہ سعادت مندی کا پورا ثبوت دیا ہے۔ کتابت اور طباعت معیاری ہے۔

(خانقاہی۔ شاہراہ، دہلی)

(۳۷)

تلوک چند محروم

محروم کی بلند قامت ادبی شخصیت کے سایے میں اُردو شاعری کی کئی نسلیں پروان چڑھی ہیں۔ بہت کم شاعروں کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ ۳۰ر برس پہلے اُن کے کلام کی محبوبیت اور مرغوبیت کا جو عالم رہا ہو وہ آج بھی اُسی آب و تاب کے ساتھ قائم و دائم نظر آئے۔ کلام محروم کی اسی دل نوازی کا راز دراصل' اُن کی عظیم فن کاری میں مُضمر ہے۔ اُن کی شاعری سارے اُردو ادب میں اپنے منفرد خدو خال رکھتی ہے اور یہ خدوخال اتنے ستھرے اور تیکھے ہیں کہ اُن کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ آزاد کے متذکرہ مجموعے میں محروم ایک شاعر اور ایک انسان کی حیثیت سے پیش کیے گئے ہیں۔ اس مجموعے کے لگ بھگ تمام مضامین مطبوعہ ہیں مگر انھیں ایک سنگم پر جمع کر کے آزاد نے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کتاب کا حسنِ ظاہری بھی بڑے پاکیزہ مذاق کا اظہار کرتا ہے۔

(تعمیر۔ سری نگر۔ ستمبر اکتوبر ۵۹ء)

(۳۸)

کاروانِ وطن

یہ جناب تلوک چند محروم کا تازہ ترین مجموعۂ کلام ہے۔ جنابِ محروم کی ہستی اُردو ادب کی دنیا کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اُن کی عظمت کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ جب بھی شیدایانِ اُردو ادب جناب محروم کا نام سنتے ہیں تو اُن کو فوراً علامہ اقبالؒ اور اُن کے ہم محفل یاد آتے ہیں۔

جناب محروم کی شاعری کی ابتدا بیسویں صدی کے شروع میں ہوئی ہے اور تب سے لے کر آج تک آپ برابر اپنی تخلیقات پیش کرتے آئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آپ نے اُردو شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کر کے ایسے شہ پارے پیش کیے ہیں جن کا اُردو ادب میں اپنا مخصوص مقام ہے۔ چناں چہ جب ہم محروم کی ''گنجِ معانی'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ شاعرِ محروم کو ادبی اور نیچرل موضوعات پر نظمیں کہنے کے علاوہ غزل گوئی میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ جب محروم کی رُباعیات پر نظر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مشکل ترین صنفِ شاعری کو بھی جناب محروم نے قابو میں کرلیا ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ جناب محروم کی بچوں کی نظمیں نظروں سے گزرتی ہیں تو آپ چھوٹے بچوں کے برگزیدہ شاعر کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اب جناب محروم کی زیرِ نظر کتاب ''کاروانِ وطن'' کو لیجیے۔ یہ اُن کی سیاسی منظومات کا مجموعہ ہے۔ یہ منظومات بجائے خود اس بات کی آئینہ دار ہیں کہ ان کا قومی شعور بھی حیران کُن حد تک پختہ ہے۔ اور ان کی فکر و نظر کی وسعتوں پر وطن کی محبت بھی ہر وقت مسلّط رہی ہے۔

''کاروانِ وطن'' دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے کو ''فریادِ جرس'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور اس میں محروم کی وہ سیاسی نظمیں شامل ہیں جو کہ اُنھوں نے اپنی شاعرانہ زندگی کے آغاز سے ۱۹۴۷ تک کہی ہیں۔ ان نظموں کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنابِ محروم اپنی تخلیقات کے ذریعہ جہاں ایک طرف سے جنگِ آزادی کو تیز کرنے کے لیے اپنے ہم وطنوں کو دعوتِ عمل دیتے رہے ہیں وہاں دوسری طرف سے یہ ہندوستانیوں کو اپنی عظمت کا احساس دلانے، ان کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کرنے اور اُن کے قومی و ملّی شعور کو پختہ بنانے میں بھی اپنا حصّہ خاطر خواہ طور پر ادا کرتے رہے ہیں۔ محروم بھی کبھی اس بات کے حق میں نہیں تھے کہ غلام ہندوستان کے باسیوں کو مجبوری و بے نوائی کے عالم میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا چاہیے بلکہ اس بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان عوام کو میدانِ عمل میں کود کر آہنی عزم کے ساتھ آزادی کی جنگ لڑنی چاہیے اور غلامانہ زندگی پر انھیں جنگِ آزادی لڑتے ہوئے میدانِ کارزار میں جامِ شہادت نوش کرنے کو ترجیح دینی چاہیے۔ اس کا اندازہ جناب محروم کی ایک نظم ''اسیر ذکرو کچھ رہائی کی باتیں'' سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ نظم اُنھوں

نے ۱۹۰۸ء میں کہی ہے، اس کو بھی کاروانِ وطن کے حصّہ ''فریادِ جرس'' میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ نظم دراصل بہادر شاہ ظفر کے ایک مصرعہ کی تظمین ہے۔ اس میں محروم نے ارشاد فرمایا ہے :

یہ مجبوری و بے نوائی کی باتیں
یہ ناطاقتی نارسائی کی باتیں
زمانے کی بے اعتنائی کی باتیں
یہ ہیں سربسر جگ ہنسائی کی باتیں
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

پر و بال اپنے اسیرو سنبھالو
اُٹھو اور پھڑک کر قفس توڑ ڈالو
بگڑ جاؤ پھندے سے گردن نکالو
بہم ہو کے بگڑی ہوئی کو بنالو
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

ایک اور جگہ محروم اس نظم میں ارشاد فرماتے ہیں :

نہ سنگِ اسیری کو سینے پہ دھرنا
جو مرنا تو صحنِ گلستاں میں مرنا
اگر کچھ حمیت ہے یہ کام کرنا
پھڑکنا، تڑپنا، اُچھلنا اُبھرنا
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

محروم کبھی بھی قنوطیت پرست نہیں تھے۔ وہ اپنی نظموں کے ذریعہ عام طور پر ہندوستانیوں کو ایک شاندار مستقبل کی بشارت دیتے تھے اور اُنھیں یقین کامل تھا کہ ایک نہ ایک دن ہندوستانی عوام کی جدوجہد آزادی رنگ لائے گی۔ اور وہ

محبوبۂ آزادی سے ہمکنار ہوکر رہیں گے۔ملاحظہ ہواُن کی ایک نظم ''جلوۂ اُمید'' یہ بھی ''کاروانِ وطن'' کے حصّہ فریادِ جرس کے اوراق کی زینت بنی ہے ۔ اس نظم میں محروم نے ارشاد فرمایا ہے۔

گلشنِ ہندوستاں میں پھر بہار آنے کو ہے

رنگِ نو سے لالہ و گل پر نکھار آنے کو ہے

اور بھی چل جم کے تُو اے صرصرِ آہِ سحر

ظلمتِ غم کی گھٹا میں انتشار آنے کو ہے

آگے چل کر اس نظم میں محروم فرماتے ہیں ۔

مُلک اپنا روکشِ صد گلستاں ہوجائے گا

اور صیادِ فلک خود باغباں ہوجائے گا

محروم ہمیشہ قوم پرستی کی حمایت کرتے آئے ہیں ۔ وہ ابتداء سے اس نظریئے کے مؤید رہے ہیں کہ فرقہ پرستی ایک بہت بڑی لعنت ہے اُنھیں ان عناصر سے بھی سخت نفرت رہی ہے جو فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکاتے رہے ہیں ۔ چناں چہ جس زمانے میں انگریزوں نے ہندوستان میں کمیونل ایوراڈ جاری کیا اور اس کے مطابق انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ کی ایک خلیج حائل کرنے کی کوشش کی تو محروم نے اس کی مخالفت کی جنھوں نے ایک نظم کمیونل ایوارڈ میں ارشاد فرمایا ہے۔

اعلانوں اور فرمانوں سے بھارت کو خوب ہی جکڑا ہے

پہلے کچھ اور ہی صورت تھی اب اور طرح سے پکڑا ہے

رسّی اب فرقہ واری کی گردن میں اس کی ڈالی ہے

کس طاقت سے کس حیلے سے یہ پھانسی ٹوٹنے والی ہے

محروم کی ''کاروانِ وطن'' کے نصف سے زائد حصّہ میں اُن کی آزادی سے قبل کی اور کئی نظمیں شامل کیا گیا ہے جو کہ اُنھوں نے آزادی کے بعد ارشاد فرمائی ہیں اور کتاب کے اُس حصّہ میں جگہ جگہ پر محروم نے اس بات پر مسرّت اور شادمانی کا اظہار کیا ہے کہ آخر کار ہندوستان کی جنگِ آزادی بارآور ثابت ہوئی اور ہندوستان آزاد ہوگیا لیکن اس کے ساتھ

یہ حقیقت بھی محروم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں کہ اگر اس دورِ آزادی میں بھی ہندوستانی عوام غفلت سے کام لیں تو ان کی آزادی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ ملاحظہ ہو اس کی ایک نظم صبر ہمارا جیت گیا اس نظم میں محروم نے ارشاد فرمایا ہے ؎

اُس وقت کو ہمدم یاد نہ کر وہ دورِ غلامی بیت گیا

جب جور و ستم سب ہار گئے اور صبر ہمارا جیت گیا

لیکن اس بات کو بھول نہ جا اے ساکنِ منزل آزادی

غفلت سے تری نذرِ طوفاں ہوجائے نہ ساحلِ آزادی

محروم کو اس بات کا بھی کافی دُکھ ہے کہ سیکولر ہندوستان میں بھی کچھ شکست خوردہ فرقہ پرست عناصر فرقہ واریت کی آگ کو بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہیں ایک نظم میں ان عناصر کو چیلنج کرتے ہوئے محروم نے کہا ہے :

ہند میں جس کو نہیں منظور جمہوری نظام

ہند سے کیا اُس کو مطلب ہند سے کیا اُس کو کام

خواہ ہندو خواہ مسلم ہو تعصب کا غلام

ڈھونڈلے وہ ہند سے باہر کہیں اپنا مقام

فرقہ داری سے ہے بالا تر ہماری سر زمیں

کتاب کے اس حصے میں کشمیر کے متعلق بھی کئی نظمیں شامل ہیں۔ جن کے عنوانات یہ ہیں۔ خطاب بہ کشمیر، پیام صلح اور کشمیر میں طرفین کا ملاپ۔ اس کے علاوہ اس میں کئی ایسی نظمیں بھی قارئین کو ملیں گی جن میں باپو گاندھی۔ پنڈت نہرو اور ہندوستان کے ماضی و حال کے تمام برگزیدہ رہنماؤں کو عقیدت کے پھول پیش کیے گئے ہیں۔ آزاد ہندوستان کے بہت سے تاریخی واقعات پر بھی جناب محروم کی تخلیقات اس حصہ میں موجود ہیں۔ الغرض ''کاروانِ وطن'' کی اشاعت سے سیاسی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ صفحات ۲۱۴ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ اُردو کے مشہور و معروف نقاد جناب نیاز فتح پوری نے دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔

(روزنامہ ''خدمت'' سری نگر، ۶ ستمبر ۔ ۱۹۶۰ء)

(۳۹)

تلوک چند محروم

یہ اُن مقالوں اور تبصروں کا مجموعہ ہے جو تلوک چند محروم کی شخصیت اُن کے مجموعۂ کلام (گنجِ معانی) اور اُن کی شاعری وغیرہ کے بارے میں لکھے گئے اور مختلف رسائل اور کتابوں میں چھپ چکے ہیں۔ آخر میں فاضل مولف کا جو خود بھی اُردو کے مشاہیر شعراء میں ہیں، ایک مقالہ شامل ہے۔ جس میں محروم کی زندگی کے اُن گوشوں کو اُجاگر کیا گیا ہے جو بقول مولف ''اُن (محروم) کے تخلص کے ساتھ گہرا معنوی ربط رکھتے ہیں'' تلوک چند محروم اُردو کے مشہور اور کہنہ مشق شاعر ہیں، اور یہ کتاب اس لحاظ سے یقیناً مفید اور کار آمد ہے کہ اس سے ان کے کلام، ان کے فن، ان کی شاعری کے وطنی اور قومی پہلو، اُن کے فلسفۂ غم، اُن کی شاعری کے وصفِ خاص، صلح و محبت کی تلقین اور اُن کی شخصیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

(''نیا دَور'' لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۰ء)

(۴۰)

کاروانِ وطن

''کاروانِ وطن'' اپنے رنگ برنگی سیاسی منظومات کے لباس میں ملبوس نگاہوں کے سامنے ہے۔ فریضۂ ادب کا تقاضہ ہے کہ کچھ کہوں لیکن ادب مانع ہے کہ ذرا سوچ سمجھ کر لب کشائی کی جرأت کرنا صحافت متقاضی ہے کہ کچھ لکھا جائے۔ مگر قلم عذرِ لنگ پیش کرتا ہے۔ کہ کچھ کہنے سے کچھ لکھنا اور بھی دُشوار ہے۔ منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کانوں میں گونج کر فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن قلم کے بنائے ہوئے نقوش، نقوش فی الحجر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کاغذ پر بکھرے ہوئے الفاظ گردشِ ایّام کے قدموں سے پامال ہو کر بھی معدوم نہیں ہوتے۔ اربابِ فکر و نظر ہر زمانہ میں ان کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ''کاروانِ وطن'' پر اپنی رائے کو ضبط تحریر میں لاتے وقت پارے کلکِ رعب میر کارواں سے لغزش کر جائے اور اربابِ انتقاد سے دامن چھڑانا مشکل ہو جائے۔ یہ لمبی چوڑی تمہید کیوں۔ اس لیے کہ مجھ سے ''کاروانِ وطن'' پر تبصرے کی فرمائش کی گئی ہے۔ کاروانِ وطن کے میر کارواں (مصنف) پر تبصرے کی فرمائش کی گئی ہے۔ کاروانِ وطن کے میر کارواں (مصنّف) ہندوستان کی ادبی دنیا کے عظیم تر شاعر اور کہنہ مشق ادیب جناب تلوک چند محروم ہیں۔ وہ محروم جن کو سوائے تخلص کے اور کسی حیثیت سے محروم نہیں کہا جا سکتا۔ جن کا دامنِ فکر علم و ادب کے انمول جواہرات سے بھرا ہوا ہے۔ جن کے علمی و ادبی خزانے سے دنیا فیض اُٹھا رہی ہے۔ وہ محروم کہ جن کے کاشانۂ سخن سے کسی کا ادبی ذوق محروم نہیں جاتا۔ بقدرِ طلب ادب کے جواہر پاروں سے مالا مال ہو کر رہتا ہے۔ جن کا فیض بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے لیے عام ہے۔ یہ

ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایسی مستثنیٰ شخصیت کومحروم کے نام سے موسوم کیا جائے۔

''کاروانِ وطن'' پر اظہارِ خیال سے پہلے منشی تلوک چند محروم کے بارے میں اس لیے کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ آپ کی ادبی شخصیت دنیائے ادب میں جانی پہچانی اور مانی ہوئی شخصیت ہے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم' علامہ اقبال مرحوم' مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم' علامہ نیاز فتح پوری' عرش ملسیانی' جوش ملیح آبادی وغیرہ جیسی نقاد اور نکتہ رس ہستیوں نے آپ کی قادر الکلامی اور افکارِ بلند کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ قلب سے داد دی ہے۔ یہی سب سے بڑا تعارف اور سب سے بڑی تعریف ہے۔

سیاست کے سنگلاخ مضامین کو شعر وادب کے نرم و نازک الفاظ پہنا کر اُن میں شاعری کا حُسن' نکھار اور بانکپن پیدا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ حسن وعشق کی رنگینیاں' سوز وگداز کی کیفیتیں اور لطافتیں سیاسی نظموں میں سمودینا شاعر کے کمال کی معراج ہے۔ سیاسی منظومات وقت کے تقاضوں کی ترجمان ہوتی ہیں جو اپنے وقت میں کتنی ہی کامیاب اور مقبول کیوں نہ ہوں۔ لیکن وقت گزرتے ہیں تقاضے ختم ہوجاتے ہیں۔ اور سیاسی نظمیں بے جان ہوجاتی ہیں۔ آنے والا زمانہ اُنھیں ''نقشِ لوحِ مزار سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ لیکن ایک باکمال شاعر غزل کا حُسن' غزل کا نکھار اور غزل کا بانکپن سیاسی نظموں کے قالب میں ڈھال دیتا ہے تو سیاسی نظمیں بھی وقت اور ماحول کی سرحدیں پار کرکے ادب کے سدا بہار گلشن میں گلہائے شاداب کی طرح ہمیشہ تروتازہ رہتی ہیں اور اُن کی مقبولیت میں زمانوں کا قُرب وبُعد کوئی فرق نہیں پیدا کرسکتا۔

''کاروانِ وطن'' موصوف کی سیاسی نظموں کا ضخیم مجموعہ ہے۔ جس میں آزادی کے بعد کی تمام نظمیں آپ کے صاحبزادے جناب جگن ناتھ آزاد نے بڑی خوش اسلوبی سے ترتیب دی ہیں۔

''کاروانِ وطن'' کے مطالعہ کے بعد مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ منشی تلوک چند محروم نے سیاسی نظموں میں وہ تمام کیفیتیں سمودی ہیں اور وہ سارے محاسن جذب کردیے ہیں جو سبک مزاج غزل میں پائے جاتے ہیں۔ دور گزرتے جائیں گے۔ شام وسحر بدلتے رہیں گے لیکن کاروانِ وطن کا نغمہ سرا جرس وطن کے راگ سنانے سے باز نہ آئے گا۔ زمانے کی نیرنگیاں ''کاروانِ وطن'' کا رُخ نہ موڑ سکیں گی۔ اور کاروانِ وطن ہر نئی نسل کو نئی اُمنگیں نئے ولولے اور نئے عزائم دے کر منزلِ مقصود کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

''کاروانِ وطن'' کی پہلی منزل ''دعا'' کی شکل میں سامنے آتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ موصوف کے دل میں حبُ الوطنی کا سچا درد موجود ہے۔ وطن کو غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑا دیکھ کر صدقِ دل سے دعا مانگتے ہیں کہ:

اے خداوندِ مہ و مہر دعا ہے تجھ سے
اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کردے

مصرعۂ ثانی پر جب غور کرتا ہوں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ محرومؔ عام شاعروں کی طرح تقلید پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ گہرے مشاہدات اور کافی تجربات کے بعد جب ایک رائے قائم کرلیتے ہیں پھر اُسے حسین الفاظ کا جامہ پہنا کر شعر کے رُوپ میں پیش کرتے ہیں۔

ایک عام شاعر کے ذہن میں ''اختر'' اور ''ثریا'' میں جو فرق ہے مشکل ہی سے آئے گا۔ ہر ستارہ کو اختر کہا جاتا ہے' لیکن ثریا ہر ستارہ کو نہیں کہا جاسکتا۔ حالاں کہ بعض ستارے جسامت میں ثریا سے کہیں زیادہ بڑے اور روشن ہیں اور سب کو اختر ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن موصوف کی دور رس نگاہ نے جائزہ لے لیا کہ ہر ستارہ ثریا تک کی بلندی نہیں پاسکتا۔ یہ بڑے بڑے روشن ستارے کسی وقت بھی سائنس دانوں کی گرفت میں آسکتے ہیں۔ لیکن ثریا تک پہنچنے کے لیے ایسے ایسے ترقی یافتہ کتنے زمانوں کو حال سے ماضی میں دھکیلنا پڑے گا۔

غالباً یہی وہ باریک بینی تھی جس نے موصوف کو عام شعرا سے متمیز بنادیا اور آپ کی پروازِ فکر نے ''ثریا'' کا صحیح اندازہ کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہر اختر کو ثریا کی رفعت نصیب نہیں ہے''۔ اسی خیال کو مناسب اور دل کش الفاظ کا جامہ پہنا کر دعائیہ انداز میں یوں پیش کردیا۔

اے خداوندِ مہ و مہر دعا ہے تجھ سے
اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کردے

موصوف کی سیاسی نظموں میں مولانا حالی مرحوم کا رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے۔ حالی کے کلام آشنا جب ''کاروانِ وطن'' کی نظمیں پڑھیں گے تو اُنھیں محسوس ہوگا کہ حالی مرحوم آج بھی محروم کی زبان میں پند و نصائح فرما رہے ہیں۔

جس طرح حالی مرحوم نے ''مدوجزرِ اسلام'' میں طعن و طنز کے میٹھے اور خوش گوار انجکشن دے دے کر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے چونکا دینے کی کوشش کی تھی۔ محروم کے یہاں بھی وہی انداز نظر آتا ہے۔ وہی شیریں زبان' وہی دل نشیں اندازِ بیاں' وہی دل میں اُتر جانے والے تیر و نشتر۔ چناں چہ ہندوؤں کی قدیم خوش حالی اور موجودہ زبوں حالی کا تقابل ''اگلے ہندو'' کے عنوان سے مسدّس نظم فرمایا ہے۔ تقابل میں شعر ملاحظہ ہوں:

اگلے ہندو

گلوں سے ہے جس طرح رونق چمن کی
یونہی اُن کے دم سے تھی زینت وطن کی

آج کے ہندو

انھی کی ہیں اے وائے اولاد ہم بھی
زمانے میں ننگِ اجداد ہم بھی

نظم کے آخری بند کی بیت میں فرماتے ہیں :

بلندی وہ اُن کی، یہ پستی ہماری
نہ ہونے سے بدتر ہے ہستی ہماری

ہندوستان کی پھوٹ پر آپ بالکل حالیؔ مرحوم کے انداز میں طنز فرماتے ہیں :

اسی فکر میں مرگئے چارہ گر ہے بیمار ویسے کا ویسا مگر

~~~~~~~~~~~~~~~~~~

نہ لیڈر یہاں کے بہم متفق نہ پبلک نہ اہلِ قلم متفق

~~~~~~~~~~~~~~~~~~

تقسیم ہند سے پہلے آپ کا وطن مالوف ڈیرہ اسمٰعیل خاں تھا جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں چلا گیا۔ تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ فسادات اور خوں خواریوں کی بنا پر آپ کو بھی اپنے عزیز وطن کو خیر آباد کہنا پڑا۔ اس موقع پر ''پاکستان کو الوداع'' کے عنوان سے ایک طویل نظم کہی ہے۔ نظم کیا ہے دل کی دبی دبی آہیں' جذبات و فراقِ وطن کے نالے ہیں۔ اس دل خراش نظم کا ہر شعر شدّتِ جذبات اور بے پناہ حُب الوطنی کا ترجمان ہے۔ حالی مرحوم کی شستہ زبان اور دل نشیں انداز میں کچھ مدح و ستائش بھی ہے۔ وطن کی جدائی پر اظہارِ غم بھی۔ اہلِ وطن کے بے وفائی پر شکوہ شکایت بھی ہے۔ پاکستان پر حسین طنز بھی۔ نمونۃً چند اشعار پیش کر رہا ہوں۔

اے مرے پیارے وطن میرے بزرگوں کے وطن

اے مری راحت کی دُنیا اے مرے اچھے وطن

~~~~~~~~~~~~~~~~~~

عمر بھر تیری وفاداری کا دم بھرتا رہا

مدح تیری شعر میں زیبِ رقم کرتا رہا

تونے لیکن اے وطن مجھ کو دیا، انعام خوب

زندگی کے دورِ آخر میں ہوا انعام خوب

آہٹ آزادی کی پاکر ہوگیا دیوانہ تو

آدمیت کی فضلیت سے ہوا بے گانہ تو

~~~~~~~~~~~~~~~~~~

ہوگیا رقصِ جنوں میں آہ کتنا بے خبر

جامۂ تہذیب پھینکا تن سے اپنے پھاڑ کر

~~~~~~~~~~~~~~~~~~

تیری آزادی کے صدقے میں ہمیں ہجرت ملی

جذبۂ ذوقِ وفا کی ہم کو یہ قیمت ملی

~~~~~~~~~~~~~~~~~~

تو پھلے پھولے رہے تجھ پر کرم اللہ کا

دُور دامن سے ترے شعلہ ہماری آہ کا

~~~~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~~~~

''کاروانِ وطن'' پر تفصیل سے کچھ لکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ مجھے اتنا وقت نہ مل سکا جو مکمل طور پر کاروانِ وطن'' کا مطالعہ کر کے تفصیلی طور پر اظہار رائے کر سکتا۔ کم سے کم مطالعہ اور کم سے کم وقت میں مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ اربابِ ذوق ''کاروانِ وطن'' میں وہ سب کچھ پائیں گے جو بلبل کو چمن میں اور انسان کو وطن میں حاصل ہوتا ہے۔

(اُردو ٹائمز بمبئی)

(۴۱)

تلوک چند محروم

اُردو کے مشہور شاعر تلوک چند محرومؔ کی شخصیت اور شاعری پر مضامین کا ایک مجموعہ ''تلوک چند محروم'' کے نام سے شائع ہوا ہے جسے جگن ناتھ آزاد نے مُرتب کیا ہے۔ اس میں سر عبدالقادر اور پنڈت کیفی سے لے کر مالک رام، حامد علی خاں، جے کرشن چودھری اور گوپی چند نارنگ تک پُرانے اور نئے لکھنے والوں کے تاثرات یک جا ہو گئے ہیں۔ محروم ان شاعروں میں سے ہیں جو مخزن کے دور سے آج تک عروس اُردو کی آرائش و زیبائش میں مصروف ہیں۔ یوں تو انھوں نے ہر صنف میں دادِ سخن دی ہے مگر نظموں اور رُباعیوں میں اُن کا کارنامہ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کے خلوص اور ریاض سے اُردو کے چمن میں اب تک بہار ہے۔ اس مجموعے میں بیشتر مضامین صرف تعارف و تاثر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ اُن کی فطرت نگاری اور قومی شاعری کے محاسن اور واضح کیے جاتے۔ آزاد کا مضمون محروم کی شخصیت کا ایک اچھا خاکہ ہے۔ لیکن پرستار نے پارکھ کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ پھر بھی اس مجموعے سے ہمارے ایک محترم اور محبوب شاعر کی کچھ خصوصیات عوام کے سامنے آجاتی ہیں۔

(آل احمد سرور، بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

(۴۲)

کاروانِ وطن

حضرت تلوک چند محروم کا یہ مجموعۂ کلام ان کی سیاسی نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک ''فریادِ جرس'' دوسرا ''منزل''۔ پہلے میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کی نظمیں ہیں اور دوسرے میں آزادیٔ وطن کے بعد کی۔ شروع میں جناب

جگن ناتھ آزاد نے حضرتِ محروم کی سیاسی شاعری کا پسِ منظر پیش کیا ہے۔ اور حضرت نیاز فتحپوری نے ''حرفے چند'' کے عنوان سے موصوف کی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

اس مجموعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب محروم نے سیاسی مسائل پر کس قدر کہا ہے۔ مگر چوں کہ آزادی کے قبل ان کی بیشتر سیاسی نظمیں اخبارات و رسائل میں بغیر نام کے شائع ہوا کرتی تھیں' اس لیے ان کی یہ خصوصیت عام طور پر منظرِ عام پر نہ آسکی۔ امید ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد حضرت محروم کو سیاسی شاعری کے میدان میں صحیح مقام حاصل ہوگا۔ اور جس رتبۂ بلند کے وہ مستحق ہیں' اس سے محروم نہ رہیں گے۔ کیوں کہ بقول اکبر الہ آبادی:

ہے داد کا مستحق کلام محروم

یہ مجموعۂ کلام کوئی نصف صدی کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس زمانے کا شاید ہی کوئی اہم سیاسی واقعہ یا موضوع ہو جس کو شاعر نے نظم نہ کیا ہو۔ مگر موضوع چاہے کتنا ہی جذباتی اور واقعہ کتنا ہی موثر اور ہیجان انگریز ہو توازن اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں پایا۔ اور بقول جناب نیاز فتحپوری'' ان کے جذبات کا خلوص' اندازِ بیان کی متانت گویا ایک ٹھہرا ہوا سمندر ہے جو طوفان سے زیادہ گہرائی اپنے اندر رکھتا ہے اور ان کی شاعری محض ماتم ملک وملت نہیں بلکہ مکمل داستان ہے۔ ان کے دردِ مندانہ احساسات کی اور خود اُن کے نفسیات وبطون کی جس کی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔''

(جامعہ، نئی دہلی)

(۴۳)

تلوک چند محروم

زیرِ نظر مجموعہ ہندوستان اور پاکستان کے ان ممتاز ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے اظہارِ خیال و رائے پر مشتمل ہے۔ جو وقتاً فوقتاً جناب تلوک چند محروم کی ادبی' علمی اور شاعرانہ شخصیت پر مختلف اخبارات اور ادبی رسالوں کے ذریعہ منصۂ شہود پر آتا رہا ہے۔ علامہ محروم کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر جن مشاہیر شعر وادب نے روشنی ڈالی۔ اگر چہ وہ تمام ہی صفِ اوّل کے اہلِ قلم اور صاحبِ فہم وبصیرت ادیب ہیں۔ لیکن ان میں بعض شخصیتیں ایسی بھی ہیں جن کے لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ:

''مستند ہے اُن کا فرمایا ہوا''

ان حضرات میں سر عبدالقادر' علامہ برج موہن دتا تریہ کیفی۔ حضرت جوش ملسیانی' مالک رام' علی جواد زیدی

وغیرہ کے اسمائے گرامی کا ذکر خصوصیت سے کیا جاسکتا ہے۔ ان مضامین سے صرف جناب محروم کی شعری اور ادبی اہمیت ہی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ لکھنے والوں کے خلوص اور اُن کے نقد و نظر کی پاکیزگی کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے جہاں ہمیں علامہ محروم کے علمی اور ادبی درجہ و مقام کے تعین و تعارف میں مدد ملتی ہے وہاں اس حقیقت کی جانب بھی ایک واضح رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ اُردو شعر و ادب کے زیرِ سایہ مشترکہ تہذیب و کلچر کی بنیادیں کس قدر حقیقی اور مبنی بر انسانیت ہیں اور وہ اُردو زبان و ادب نے جو معاشرہ پیدا کیا اس پر پورا ملک کس درجہ فخر کرسکتا ہے۔

اس مجموعۂ مضامین میں ''میرے والد کے زیرِ عنوان مؤلف (جناب جگن ناتھ آزاد) کا بھی ایک مقالہ شریکِ اشاعت ہے۔ جگن ناتھ آزاد علامہ محروم کا سعادت مند بیٹا ہے اور جب ایک لائق بیٹا اپنے قابلِ فخر باپ کے لیے کسی اظہارِ خیال پر آمادہ ہوگا تو اس میں ادب و احترام کے غیر معمولی احساسات بھی ہوں گے اور باپ کی عظمت و بزرگی کا تصور بھی اس کی حسیات پر پوری طرح چھا جائے گا۔ لیکن جگن ناتھ آزاد نے اپنی تمام سعادت مندیوں کے باوجود باپ کی زندگی پر جس انداز سے لکھا ہے وہ عقیدت و سعادت کا نیاز مند اظہار نہیں بلکہ واقعات و کیفیات کے ایک صاف شفاف سرچشمے کی رونمائی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے مقالہ کے مطالعہ سے بھی محسوس ہوسکتا ہے کہ جو محروم بیرونی مجلسوں اور پبلک زندگی میں ہمارے سامنے تھے وہ اپنی گھریلو زندگی میں کس منصب و مقام کا مالک ہے اور بحیثیت انسان' انسانیت سے اس کے کیا روابط ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کے مقالہ کے بعد علاّمہ محروم کی زندگی کی ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور ہم اس تصویر پر جتنا فخر بھی کریں کم ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اس مجموعہ کا عام طور پر مطالعہ کیا جائے اور محروم نے زندگی کی راہیں جس طرح طے کی ہیں انھیں نظر انداز نہ کیا جائے۔

(بے باک سہارن پور، ۷رد سمبر ۱۹۵۹ء)

(۴۴)

کاروانِ وطن

یہ جناب محروم کی قومی' وطنی اور سیاسی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں تقریباً ۱۸۰ طویل و مختصر نظمیں ۵ سیاسی غزلیں اور کچھ رُباعیات و قطعات شامل ہیں۔

جناب محروم اُردو زبان کے اساتذۂ سخن میں سے ہیں' اور آزاد و حالی کے شاعرانہ اسالیب کا اُن پر گہرا اثر ہے۔ وہ شروع ہی سے قومی و وطنی جذبات سے سرشار رہے اور اپنے ان جذبات کا اظہار موقع بہ موقع کرتے رہے۔ ملک میں رونما ہونے والے چھوٹے بڑے اہم واقعات پر موصوف نے پورے خلوص اور دردمندی سے قلم اُٹھایا' چوں کہ اُن میں سے بیشتر نظمیں وقتی موضوعات پر کہی گئی تھیں۔ اس لیے اخبارات و رسائل میں شائع ہوکر مقبول بھی ہوئیں اور آج ان نظموں نے

''کاروانِ وطن'' کی صورت میں قومی سرمایہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی و وطنی شاعری کا بہت بڑا درجہ ہے۔ اُردو میں معدودے چند ایسے مشاہیر شعرا ملیں گے جنھوں نے اپنے پیچھے قومی شاعری کا ایک بہت بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کے بعد ایسے نظم نگار شعراء میں ہمیں صرف آزاد، حالی، شبلی، اکبر، چکبست، ظفر علی خاں، اقبال، سیماب، جوش اور ساغر نظامی کے نام ملتے ہیں، جن کے یہاں قومی شاعری کا بہت بڑا اور بے حد قیمتی ذخیرہ ہے۔ یوں دو چار یا دس بیس قومی نظمیں ہمیں ہر اچھے شاعر کے یہاں مل جاتی ہے۔

''کاروانِ وطن'' کی نظموں میں خلوص ہے۔ سنجیدگی اور ایک قسم کی سادگی ہے۔ حضرت محروم نے اپنے رنگ میں موضوعات کا احاطہ بڑی خوبی سے کیا ہے۔ کتاب کی تمہید حضرت محروم کے فرزند جگن ناتھ آزاد کی ہے۔ اور ''حرفے چند'' کے عنوان سے مولانا نیاز فتحپوری نے حضرت محروم کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔

(شاعر بمبئی، اکتوبر ۱۹۶۱ء)

(۴۵)

تلوک چند محروم

اُردو کی تازہ ترین کتاب ''تلوک چند محروم'' ہے یہ نہ تو محروم صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے اور نہ ان کی سوانح حیات بلکہ یہ مجموعہ ہے ان مضامین کا جو محروم صاحب اور ان کی شاعری کے متعلق آج تک لکھے گئے ہیں۔

آیئے آخر میں اُردو شاعری کے متعلق بھی کچھ باتیں کرلی جائیں۔ آصف الدولہ نے ایک موقع پر میر تقی میر سے یہ کتنے پتے کی بات کہی تھی کہ میر صاحب اچھا شعر خود اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔ افسوس ہے کہ میر کی نزاکت طبع اس خیال کا وزن برداشت نہ کرسکی' اور اُنھوں نے آصف الدولہ سے منہ موڑ لیا۔ لیکن یہ جملہ جو شعر کی عظمت کے ساتھ ساتھ خود آصف الدولہ کی شعری بصیرت کا اچھا ثبوت ہے اگر صحیح ہے تو کہنا غلط نہ ہوگا کہ پچھلے چند مہینوں میں کوئی ایسا شعری کارنامہ ہمارے سامنے نہیں آیا جس نے لوگوں کو چونکا دیا ہو یا غیر معمولی طور پر اپنی طرف متوجہ کیا ہو۔ ادبی رسالوں کی اگر ورق گردانی کی جائے تو اندازہ ہوگا کہ ہماری شاعری کا عام رجحان غزل کی طرف ہے' وہ شعراء جن کی شاعری بڑی حد تک نظریاتی ہوتی تھی اور جو قدرتاً نظم ہی کو اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ بناتے تھے انھوں نے بھی اب غزل کے دامن میں پناہ لینی شروع کردی ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے لیکن اس کا پہلو یقیناً عبرت ناک ہے کہ غزل کے میدان میں بھی نئے تجربے نہیں کیے جا رہے ہیں بلکہ پرانے شاعروں کی زمینوں اور ان ہی کے ردیف قافیوں پر طبع آزمائی کی جارہی ہے۔

جہاں تک آزاد نظم کا تعلق ہے اس کا رواج ختم ہوتا جارہا ہے جس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے چمنستان کی

آب وہوا اس نوخیز پودے کو راس نہ آئی۔

ریڈیو کی ضرورتوں نے ہماری شاعری کی ایک قدیم صنف کو نئے انداز سے از سرِ نو زندہ کیا ہے۔ میرا اشارہ منظوم ریڈیائی ڈراموں کی طرف ہے۔ جس کی کامیاب مثالیں شکنتلا اور انارکلی ہیں جو حال ہی میں کامیابی سے نشر کیے گئے۔ آپ اس کو نئے تجربے کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

(محمد عتیق صدیقی، آل انڈیا ریڈیو، دہلی کے شکریہ کے ساتھ)

(۴۶)

بہارِ طفلی

حضرت تلوک چند محروم کی ایسی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جو صرف بچّوں اور لڑکوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اس کا دیباچہ زورؔ صاحب نے اور مقدمہ شفیع الدین صاحب نیّر نے لکھا ہے۔ شفیع الدین صاحب نیر نے بچوں کے لیے نظمیں لکھ کر اُردو دنیا میں کافی مقبولیت حاصل کی ہے حضرت محروم نے بچوں کے لیے نظمیں لکھ کر اُردو دنیا میں کافی مقبولیت حاصل کی ہے حضرت محروم نے بچوں کے لیے جس دل کش انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے معمولی نوشت وخواند سے واقفیت رکھنے والے کے دل کو موہ لینے کے لیے کافی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے۔

''بچوں کی ذہنی تربیت میں ''بہارِ طفلی'' صحیح معنوں میں نویدِ بہار ثابت ہوگی۔ اُمید ہے کہ اہلِ اُردو اس مجموعے کا شایانِ شان خیر مقدم کریں گے اور یقین ہے کہ بچے اسے شوق سے پڑھیں گے۔ نہ صرف ہر مدرسے کے کتب خانہ میں اس کا موجود ہونا ضروری ہے بلکہ میری رائے ہے کہ اچھے بچوں کو مدارس کی طرف سے جو انعامات دیے جاتے ہیں ان میں اس کتاب کو شامل رکھنا چاہیے۔''

(محمد اکبر الدین صدیقی۔ سب رس حیدر آباد، ستمبر واکتوبر ۱۹۶۱ء)

(۴۷)

تلوک چند محروم

ایک اور اچھی کتاب جس کا نام ''تلوک چند محروم'' ہے ابھی چھپ کر آئی ہے۔ یہ تقریباً دو درجن مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف لوگوں نے مختلف اوقات اور مختلف رسالوں میں اُردو کے مشہور شاعر تلوک چند محروم پر لکھے تھے۔ جگن

ناتھ آزاد نے جو خود بھی مشہور و مقبول شاعر ہیں اُنھیں جمع کر کے کتابی صورت دے دی ہے۔ یہ کتاب بھی بہت خوبصورت چھپی ہے۔ اگر سادگی میں دل کشی پیدا ہو جانا ہی جشن ہے تو اس اعتبار سے یہ کتاب حسین بھی ہے۔

عجیب بات ہے کہ اُردو میں ابھی تک یہ رواج نہیں کہ زندہ شاعروں یا ادیبوں پر کتابیں لکھی اور چھاپی جائیں۔ صرف اقبال ایک ایسے شاعر تھے جن پر اُن کی زندگی ہی میں بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ کتاب کے مُرتب جگن ناتھ آزاد نے اس روایت کو توڑا ہے۔ انھوں نے دیباچے میں صراحت کی ہے کہ مضامین و مقالات کے ایسے ہی مجموعے جگر، جوش، فراق، اور حفیظ کے بارے میں بھی شائع کیے جائیں گے۔

اس مجموعے میں ''مخزن'' والے شیخ عبدالقادر، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، منشی دیا نرائن نگم، مالک رام مصنّف ذکرِ غالب اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے فاضل انشاء پردازوں کے مضامین شامل ہیں۔ یوں تو ہر مضمون محروم کی شاعری کے کسی نئے پہلو پر روشنی ڈالتا ہے لیکن خصوصیت سے مالک رام کا مضمون جو جون ۱۹۳۴ء کے رسالہ ''زمانہ'' کان پور میں شائع ہوا تھا اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مقالہ ''محروم کی شاعری کا قومی و وطنی پہلو'' بہت ہی اچھے لکھے گئے ہیں۔

اگرچہ محروم شاعری کی کسی ایک ہی صنف یا ایک ہی موضوع میں بند نہیں ہیں۔ لیکن ان کی شاعری میں حاوی پہلو قومی و وطنی شاعری کا ہے۔ انھوں نے آسان، شیریں، دلکش اور پُر اثر زبان میں بچوں اور بڑوں کے لیے سینکڑوں اخلاقی اور قومی، سیاسی، اور رومانی نظمیں لکھی ہیں۔ ایک پوری نسل نے محروم کی آواز کو سنا اور اس کا اثر قبول کیا ہے اگرچہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے نہیں لیکن بہت سے اہلِ زبان سے نک سکھ سے درست اور دل میں اُتر جانے والی رکھتے ہیں۔ فن اور قواعد کا پورا احترام ان کی شاعری میں موجود ہے۔ ان کی غزل کا رس جس اور نظم کا بہاؤ دونوں ہی ہر طرح قابلِ تحسین ہیں۔ خصوصاً رباعی کہنے میں امجد حیدر آبادی کے بعد ان کا کوئی حریف نہیں۔ اکبرالہ آبادی نے ان کا کلام سن کر کہا تھا:

ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز

اُن کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

تلوک چند محروم پر اعلیٰ درجے کے علمی اور انتقادی مضامین کا مجموعہ ہمارے دل میں گرمی اور ذہن میں روشنی پیدا کرنے والا ہے اس لیے ہر طرح قابلِ قدر ہے۔

(نثار احمد فاروقی، آل انڈیا ریڈیو، دہلی کے شکریے کے ساتھ)

(۴۸)

بہارِ طفلی

تقریباً ایک سو صفحات پر مشتمل نظموں کا مجموعہ ہے جو اچھے سفید کاغذ پر دیدہ زیب کتابت اور اعلیٰ طباعت کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس میں جناب تلوک چند محروم صاحب کی جو ایک اچھے اور بلند پایہ شاعر ہیں اپنی کہی ہوئی نظمیں شامل ہیں۔ چوں کہ یہ مجموعہ بچوں کی ذہنی تربیت کے مقصد کے تحت مرتب و شائع کیا گیا ہے۔ اس لیے اس میں شامل نظموں میں اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ ان میں سہل و سلیس الفاظ استعمال ہوں۔ اور معانی و مطالب پیچیدہ نہیں بلکہ واضح ہوں۔ جو جلد اور بآسانی بچوں کی سمجھ میں آسکیں۔ اس مجموعہ میں جو نظمیں شامل ہیں ان میں کچھ ایسی ہیں جو بچوں کے لیے تفریح طبع کا سامان بھی مہیا کرتی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو بچوں کو نصیحت دیتی ہیں۔ غرض تمام نظمیں بچوں کی ذہنی تربیت و تعمیر کے لیے مفید ہیں۔ بعض نظموں میں بچوں میں خودداری' وطن پرستی' ذمہ داری، انصاف، محنت اور ان میں دیانتداری و رواداری کا جذبہ پیدا کرنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔ محنت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے چند اشعار اِس مجموعہ کے ملاحظہ ہوں۔

فارغ جہاں میں کوئی نہیں کام کاج سے
مجبور ہے ہر ایک جہاں کے رواج سے

قدرت بتا رہی ہے یہ اپنے نظام سے
ہے کارگاہِ دہر کی تکمیل کام سے

خورشید و ماہ انجم تاباں ہیں کام میں
مصروف ہیں کسی نہ کسی انصرام میں

وطن پرستی کا سبق ان اشعار میں دیا گیا ہے۔

سب سے اچھا دیس ہمارا

(نئی دنیا۔ دہلی، ۳؍جون ۱۹۶۱ء)

(۴۹)

تلوک چند محروم

اُردو ادب سے معمولی شناسائی رکھنے والے اصحاب بھی تلوک چند کے نام اور کام سے واقف ہیں۔ شاعری قدرت کا عطیہ ہوتی ہے۔ اس بات کا سب سے بڑا زندہ ثبوت تلوک چند محروم کی ذاتِ گرامی ہے ورنہ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ میانوالی کا ایک لڑکا اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایسی معرکتہ آلارا نظمیں لکھے کہ وہ زمانہ ومخزن میں شائع ہوں اور بڑے بڑے مشاہیر اُن کے قدر داں ہوں۔

تلوک چند محروم اُردو کے ایک بزرگ اور مؤقر شاعر ہیں۔ اُردو میں کئی تحریکیں اٹھیں اور ختم ہوگئیں۔ آسمان ادب پر کئی ستارے اُبھرے اور ڈوب گئے مگر تلوک چند محروم کی شخصیت ہر مکتبۂ فکر کے نزدیک آج بھی محترم و معزز ہے۔ آپ کی غزلیں بھی بڑی بلند پایہ ہیں مگر انھیں مجسم عظمت و شہرت نظموں اور رباعیوں کی وجہ سے ہوئی۔ اُردو کا شاید ہی کوئی پڑھنے والا ہو جسے ''نور جہاں کا مزار'' کے ایک دو بند یاد نہ ہوں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں اسی عظیم شاعر کے فن کے بارے میں اُن کے قدر دانوں اور مدّاحوں نے مضامین لکھے ہیں جنھیں محروم کے خلف الرشید اور مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد نے ترتیب دیا ہے۔ لکھنے والوں میں سر عبدالقادر، علاّمہ کیفی، جوش ملسیانی، ممتاز حسن احسن، عدم، مالک رام، گوپی چند نارنگ، حامد علی خاں اور کئی دیگر مشاہیر شعراء اور ادباء شریک ہیں۔

محروم صاحب جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی بڑے انسان بھی ہیں مگر زیرِ تبصرہ کتاب میں ان کی شخصیت کے بارے میں صرف آزاد صاحب کا ہی مضمون شامل ہے۔ شخصیت کے بارے میں کچھ اور مضامین شامل کردیے جاتے تو کتاب زیادہ ضخیم ہوجاتی۔ تلوک چند کے مطالعہ سے نہ صرف اُن کے فن اور شاعری کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ بلکہ ان کی شاعری کا انتخاب بھی سامنے آجاتا ہے۔

کتاب مجلد ہے اور عمدہ کتابت و طباعت سے آراستہ۔

(س۔م۔ہ، نیرنگِ خیال لاہور۔ اپریل ۱۹۶۱ء)

(۵۰)

تلوک چند محروم

یہ مجموعۂ مضامین جس میں حضرت محروم کی چار مختلف زمانوں کی عکسی تصویریں بھی شامل ہیں۔ ان تحریروں کا مجموعہ

ہے جو اُردو زبان کے اس بزرگ شاعر کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ لکھنے والوں میں سر عبدالقادر، برج موہن دتاتریہ کیفی، شیخ محمد اقبال، دیا نرائن نگم، ڈاکٹر ذاکر حسین، جوش ملسیانی، حامد علی خاں اور مالک رام جیسے مشاہیر ادب بھی ہیں۔ اور تاجور سامری، کیلاش ماہر، اور گوپی چند نارنگ جیسے نو واردانِ بساطِ ادب بھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ محروم صاحب کے فن میں کوئی ایسی مستقل خوبی ہے جو مختلف زمانوں اور مختلف نسلوں کو بیک وقت متاثر کر کے ان سے داد لے سکتی ہے۔ لکھنے والوں نے اپنے اپنے ذوق اور رجحان طبع کے مطابق محروم صاحب کے فن اور ان کے کلام کی تعریف کی ہے اور ایک اچھے شاعری کا کمال یہی ہے کہ مختلف طبائع کے لوگ اس سے یکساں طور پر متکیف ہوسکیں۔ جن آراء کا اظہار کیا گیا ہے اُن میں بعض ایسی بھی ہیں جو غالباً سرسری مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً ہر بھگوان شاد کی یہ رائے کہ ''شاعری میں آپ پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی اور منشی درگا سہائے سرورِ جہاں آبادی کے مقلد نظر آتے ہیں اور ان کا رنگ سخن حاصل کرنے میں آپ نے کافی حد تک کامیابی حاصل کی ہے'' خدا معلوم مضمون نگار اس فیصلے پر کس طرح پہنچ گیا۔ محروم صاحب کا اپنا رنگِ سخن ہے اور وہ ان کے مقلد نہیں بلکہ اُن کی صف میں بیٹھنے کے اہل ہیں۔

سر عبدالقادر نے محروم صاحب کے متعلق لکھا ہے ''میں نے جب تک انھیں دیکھا نہیں تھا اور خط و کتاب کے ذریعے اُنھیں جانتا تھا تو اُن کے کلام سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ صوبجات متحدہ کے کسی حصّے کے رہنے والے ہیں۔ جب ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ پنجاب کے اس گوشے کے رہنے والے ہیں جہاں اُردو کا چرچا بہت کم ہے۔ ضلع میانوالی آپ کا مسکن ہے۔ اس جنگل میں خدا نے وہ خودرو پھول پیدا کیا ہے۔ جس کی خوشبو دہلی اور لکھنو تک پھیلی۔

جہاں تک محروم صاحب کے کلام میں زبان و بیان کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کا تعلق ہے یہ تحریر لاکھ موزوں سہی لیکن یہ حیرت ضرور ہوتی ہے کہ سر عبدالقادر جیسے ناقد کو اُن کے کلام پر یو۔ پی۔ کے کسی باشندے کے کلام کا شبہ کیسے ہوگیا۔ ان کے کلام میں ایک طرح جو سنگینی ہے وہ یو۔ پی۔ کے شاعروں کے کلام میں بالعموم نہیں پائی جاتی اور محروم صاحب کے کلام کی یہ سنگینی ان کے وطن کی دین ہے۔ لطافت و نزاکت شعر کی خوبیاں ضرور ہیں لیکن کلام کی سنگینی بھی ایک وصف ہوتا ہے حیرت ہے کہ محروم صاحب کے کلام پر لکھنے والے اس وصف پر پوری توجہ نہیں دیتے، لیکن ان کے بغیر ان کے کمالِ سخن کو پوری طرح نمایاں نہیں کیا جاسکتا۔ پھر محروم صاحب نے خالص ناصحانہ قسم کی نظموں میں بھی شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔ مثلاً شراب کی مذمت میں ان کا یہ شعر :

فریب دہر نے تدبیرِ جانستانی کی
کہ شکل آگ نے کی اختیار پانی کی

دراصل ہر اچھے شاعری کی طرح محروم صاحب کے کلام پر لکھنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ان کے کلام کو مروجہ

کسوٹیوں پر پرکھنے کی بجائے کسوٹی خود ان کے کلام سے اخذ کی جائے۔

(ماہنامہ تحریک دہلی)

(۵۱)

کاروانِ وطن

''کاروانِ وطن'' علامہ تلوک چند محرومؔ صاحب کی قومی نظموں کا مجموعہ ہے جو ''فریادِ جرس'' اور ''منزل'' دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ فریادِ جرس میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کی اور منزل میں ۱۹۴۷ء سے اب تک کی نظمیں شامل ہیں۔

حضرت محروم ان چند ممتاز بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے اُردو کے پودے کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی ادبی خدمات کو جتنا بھی زیادہ سے زیادہ سراہا جائے کم ہے۔

کاروانِ وطن ایک ایسا صاف و شفاف آئینہ ہے جس میں ہندوستان کی پچاس سالہ قومی تاریخ کی جھلک نظر آتی ہے اور ان نظموں میں حضرت محروم کے قومی شعور کا مطالعہ بخوبی کیا جا سکتا ہے محروم صاحب کے منظومات کے بارے میں ''حرفے چند'' کے زیرِ عنوان علامہ نیاز فتح پوری نے صحیح فرمایا ہے۔

''میں اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود ذہن وفکر کے لحاظ سے وہ مجھ سے بہت بڑے نکلیں گے۔ اتنے بڑے کہ ان کی بالکل ابتدائی نظموں کو سمجھنے کے لیے بھی مجھے ایک قرن پہلے یا ایک قرن بعد۔ پیدا ہونا چاہیے تھا۔''

اس مجموعۂ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بھی محروم صاحب کا وہی خلوص موجود ہے اور اس میں وہی صداقت کارفرما نظر آتی ہے جو خود اُن کی نجی زندگی کا طرۂ امتیاز ہے۔

جناب آزاد نے یہ بہت اچھا کیا کہ اپنے والد بزرگوار کے وطن پرستانہ منظومات کو یک جا کر کے خود محروم صاحب کی زندگی میں شائع کر دیا۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ اکثر شعراء و مصنفین کے جگر پارے ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو پاتے اور ہوتے ہیں تو بہت کم۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ محروم صاحب کا کلام ان کی زندگی ہی میں شائع ہو کر ہمارے قومی ادب کا نمایاں جزو بن گیا ہے۔ اور آئندہ نسلیں اس کے مطالعہ سے مستفید و فضیاب ہوں گی۔

اگر ''کاروانِ وطن'' کو سالِ رواں کی بہترین تخلیق قرار دیا جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حضرت محروم کا کلام ہر طرح سے اس اعزاز کا مستحق ہے۔''

(تیج ویکلی، دہلی)

(۵۲)

تلوک چند محروم

ادارۂ فروغ اُردو لکھنو نے ایک ایسی کتاب شائع کی ہے جس کے بارے میں تفصیل سے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یعنی یہ کتاب اُردو ادب کے بزرگ شاعر تلوک چند محروم کی زندگی اور ادب کے بارے میں ہے۔ اُردو ادب میں ایسی یا اس قسم کی کتابیں کم و بیش ناپید ہی ہیں۔ اور یہ ایک کافی افسوسناک بات ہے۔ اُردو ادب میں ایسی کوئی روایت یا تحریک ٹھیک طرح سے پنپ نہیں سکی کہ اُردو شعراء کے کلام کے علاوہ اُن کی زندگی یا اُن کے ادب سے متعلق بھی کوئی مجموعہ منظرِ عام پر آسکے۔ جو آئے وہ اوّل تو بہت کم تھے۔ دوسرے اُن کی مناسب حوصلہ افزائی نہ ہوسکی۔ اور اس کی ایک خاص وجہ ہے ادھر کچھ برس ہوئے کہ اُردو ادب میں یہ روش پروان چڑھی تھی کہ ہر برس کے اختتام پر اُس برس کا منتخب ادب کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ ایسے ادبی مجموعے (انتھلوجی) کسی بھی ادب کی ترقی اور نشو و نما اور اس کے صحیح جائزے کے لیے بہت ضروری ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ٹریجڈی یہ ہوئی کہ یہ سالانہ ادبی مجموعے اُردو ادب کا سنگِ میل بننے کے بجائے سیاسی پینترہ بازیوں کا شکار ہوگئے یعنی مخصوص مفاد اور مخصوص سیاسی نظریئے کے لوگوں کی مُراد بر آئی۔ اس افراتفری میں کون کون ادیب شہیدِ ادب ہوئے اور کون کون لوگ لہو لگا کر شہیدوں کی صفوں میں شامل ہوگئے۔ یہ ایک طویل تاریخ ہے اس کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے تاہم یہ کہے بغیر بات ادھوری رہے گی کہ کچھ سیاسی تیس مار خاں تو اس حد تک پہنچے کہ خدائے سخن میر تقی میر جس کے سامنے غالب، ذوق، یگانہ، راسخ غرض کہ ہر اُردو شاعر نے سر جھکایا ہے اُسے بھی ''رجعت پسند'' (ری ایکشنری) شاعر قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ اُس عظیم شاعر کی روح ان بچکانہ حرکتوں پر مُسکرا اٹھی اور ان سیاسی شاطروں کو پسینہ آ گیا۔

اس سیاسی ہنگامہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے میرؔ کی سی نزاکت سے کام نہ لیا اور لبِ نازک سے اتنا بھی نہ کہا:

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو

ان لوگوں میں تلوک چند محرومؔ بھی شامل ہیں۔ حضرت محرومؔ نے اُردو ادب کے گزشتہ ساٹھ برسوں کا عروج اور زوال دیکھا ہے اور وقت کے تمام زخم اپنے شاعرانہ احساس میں سمو کر انھیں شعروں کا لباس عطا کر دیا۔ اب تک اُن کے دو ضخیم شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک تو اُن کی رُباعیات کا مجموعہ ''رباعیاتِ محروم'' اور دوسرا اُن کا مجموعۂ کلام ''گنجِ معانی'' محروم صاحب نے علامہ اقبالؔ، سر عبدالقادر، اکبر الہٰ آبادی، برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی جیسی عظیم ہستیوں سے خراجِ عقیدت پایا ہے۔

"تلوک چند محروم ہمارے اُن شاعروں میں سے ہیں جن کا نام ہر جگہ عزّت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور جن کی تخلیقات پر مختلف مکاتبِ فکر کا فکری اختلاف کچھ اثر نہیں ڈال سکتا۔ وقت کے سمندر میں کئی ادبی تحریکوں کے طوفان آئے اور ختم ہو گئے۔ مگر ہمارے یہ بزرگ شاعر چپ چاپ روشنی کا مینار بنے کھڑے ہیں' اور روشنی دیے جا رہے ہیں" "ادب لطیف" پاکستان کے یہ الفاظ اس کتاب اور محروم صاحب کے ادب پر ایک زندہ جاوید تبصرہ ہیں۔ آخر میں ایک بات کہے بغیر جی مانتا نہیں۔ اس کتاب میں کچھ مضامین ایسے ہیں جو نہ ہوتے تو اچھا تھا۔

اس کتاب میں سر عبدالقادر' کیفی صاحب' علامہ اقبال' جوش ملسیانی' مالک رام' علی جواد زیدی اور حامد علی خاں ایسے صاحب نظر ادیبوں کے مضمون شامل ہیں۔

یہ کتاب بہر طور ایک گراں قدر سرمایہ ہے جس پر اُردو ادب ناز کر سکتا ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ اُردو میں اینتھولوجی کا رواج ازسرِ نو قائم کیا جائے گا جس میں سیاسی اور ذاتی مفاد کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔

(سریتا، دہلی، ستمبر ۱۹۵۹ء)

(۵۳)

تلوک چند محروم

حضرت تلوک چند محروم کی شاعری نصف صدی سے زیادہ زمانہ گھیرے ہوئے ہے۔ اس طویل مدّت میں کتنے شاعر طلوع ہو کر غروب ہو چکے ہوں گے لیکن اگر کسی شاعر کی قدردانی اور شاعرانہ عظمت کا اعتراف بلا کسی وقفے کے اتنے زمانہ تک کیا جاتا رہا ہو تو یہ اپنی جگہ خود ثبوت ہوگا اس بات کا کہ ایسے شاعر کے کلام سے لافانی انسانیت کے جاودانی نغمے پھوٹ رہے ہیں۔

محروم صاحب اس درجے کے شاعر ہیں کہ ہر زمانے میں اُن کی یکساں قدردانی اہلِ علم و نظر نے کی۔ زیرِ نظر کتاب "تلوک چند محروم" جسے ممتاز شاعر اور محروم صاحب کے فرزند جگن ناتھ صاحب آزاد نے مرتّب کیا ہے' مجموعہ ہے اُن خراج ہائے تحسین کا جو مختلف زمانوں میں محروم کی شاعری کو ادا کیے گئے۔

خراجِ تحسین ادا کرنے والوں میں سر عبدالقادر' برج موہن' دتاتریہ کیفی' جوش ملسیانی' شیخ محمد اقبال' دیا نرائن نگم' مالک رام' اقبال ورما سحر' علی جواد زیدی' عبدالعزیز فطرت اور خود مُرتب جگن ناتھ آزاد شامل ہیں۔

آزاد صاحب کا مضمون اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ انھوں نے اپنے والد محترم صاحب کی دل کش شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور محروم صاحب کی سادہ باوضع اور امتیاز من و تو سے بلند شخصیت ہی ہے جو ان کی شاعری

میں جاری وساری ہے۔

اکبر الہ آبادی نے جن کے انتقال کو پینتیس سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ چالیس پینتالیس سال قبل محروم صاحب کے کلام کو جو داد دی تھی اس میں چار خصوصیتیں بیان کی تھیں، لفظوں کا جمال، معانی کا ہجوم، سخن مفید اور دانش آموز۔ انہی چار خصوصیتوں کے ساتھ محروم صاحب آج تک فن کی اور انسانیت کی خدمت گزاری کرتے چلے آئے ہیں۔ سچ کہا ہے کہ محروم صاحب نے :

آدمیت کو نہ چھوڑیں ہم غنیمت ہے یہی
کون کہتا ہے صفاتِ قدسیاں پیدا کریں

(قومی آواز لکھنؤ، ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء)

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

سپاس نامے

سپاس نامے

دلّی کے اُردو ادباء، شعراء اور ادب نواز حضرات

کی جانب سے

سپاس نامہ

اعزازیہ واستقبالیہ

بخدمت شریف جناب تلوک چند محرومؔ

زیرِ اہتمام انجمن تعمیر اُردو دلّی

جناب صدر۔ قبلہ محروم صاحب!

انجمن ترقی اُردو دلّی کے اراکین، معاونین و محسنین نے بالخصوص اور دلّی کے ادباء، شعراء، اساتذہ، ناقدین و محققین اور دیگر فن کاروں و علم دوستوں نے بالعموم یہ خبر نہایت مسّرت سے سنی کہ حکومتِ پنجاب نے ملک کے مایۂ ناز استاد پروفیسر منشی تلوک چند صاحب محروم کو خلعت و اعزاز اور مبلغ گیارہ سو روپے کا ہدیہ اُن کی عظیم خدماتِ ادب کی قدر افزائی کے لیے حال ہی میں چنڈی گڑھ میں بدست شری این وی گیڈ گل گورنر پنجاب پیش کیا۔ ہر چند کہ یہ اعزاز بھی محروم صاحب کی شخصیت کے لیے بہت کم اور بہت دیر سے پیش کیا گیا ہے۔ مگر ہمیں خوشی ہے کہ بہر حال حکومت اپنے دانش وروں کی قدر افزائی سے قطعی غافل نہیں ہے۔

حضرات: آپ جانتے ہیں کہ جناب محروم صاحب کی ۷۵ سالہ زندگی درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کی شان دار

تاریخ ہے۔ اور گزشتہ پچاس سال سے میدان علم و ادب میں اُن کی عظیم خدمات مقبول خواص وعوام ہیں۔ ان کی حیات ہی میں اُن کے کلام پر تحقیق کے سلسلے میں پنجاب یونی ورسٹی نے حال ہی میں ڈاکٹریت عطا کی ہے۔ یہ اعزاز بہت ہی کم اربابِ فن کو ملتا ہے۔ اس سے پہلے علی گڑھ یونی ورسٹی میں علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی (بانی انجمن تعمیرِ اُردو) اور حضرت جوش ملیح آبادی کے کلام پر تحقیقی کام کے سلسلے میں دو مقالے پیش کیے گئے ہیں۔ جنھیں پی ایچ۔ڈی کے لیے منظوری دے دی گئی ہے۔ محروم صاحب پر متعدد مقالے اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اُن کی اپنی تصانیف میں گنجِ معانی' رباعیات محروم' کاروانِ وطن' نیرنگ معانی' شعلۂ نوا' بہارِ طفلی' قبول عام حاصل کر چکی ہیں۔ اور چند کتب زیرِ طبع ہیں۔ جن میں سے بچوں کی دُنیا' تصویرِ معانی اور دو آتشہ تو پریس میں ہیں۔

ہم قبلہ محروم صاحب کو پنجاب کا مولوی اسمٰعیل ثانی سمجھتے ہیں۔ اور اُن کی خدمات میں اہلِ دہلی کی جانب سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کا استقبال کرتے ہیں اور حکومت کی جانب سے پیش کیے گئے اعزاز پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ ہندوستان اُنھیں مزید بڑے سے بڑے اعزاز عطا کرے گا۔

پیش کردہ۔ پنڈت آنند موہن زُتشی گلزآر جنرل سکریٹری استقبالیہ کمیٹی و انجمن تعمیر اُردو دلّی۔ بمقام اردو نا ہال اُردو بازار جامع مسجد دہلی۔

بانی انجمن۔ علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی آنجہانی

سرپرست اعلیٰ۔ مجاہدِ ملّت مولانا حفظ الرحمٰن۔ ایم۔ پی۔ وقادر الکلام

علامہ پنڈت زآر زُتشی دہلوی یادگارِ داغ"

صدر۔ جناب میر مشتاق احمد

نائب صدر۔ منشی عبدالقدیر مولوی سمیع اللہ قاسمی

اراکین انتظامیۂ استقبالیہ۔ عزیز وارثی، بہار برنی، مخمور سعیدی' عشرت کرتپوری' اسلم پرویز' ریاض الرحمٰن صدیقی۔

ایڈریس

جناب منشی تلوک چند محرؔوم شاعر اعظم زبان اُردو کی خدمت میں پنجاب سرکار کی طرف سے بہ تقریب سالانہ ادبی دربار منعقدہ چنڈی گڑھ بتاریخ ۳ / مارچ ۱۹۶۲ء زیرِ اہتمام محکمۂ السنہ پنجاب پیش کیا گیا۔

محترمی جناب محروم صاحب!

آپ سرزمین پنجاب کی بہترین ادبی شخصیت ہیں۔ ہندوستان بھر میں آپ کا نام ہر جگہ بڑے فخر و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اہلِ پنجاب کو آپ کی ہستی پر ناز ہے۔ کیوں کہ آپ نے سرزمین پنجاب میں جنم لے کر ملک بھر کے استاد شاعروں پر اپنا سکہ بٹھایا ہے۔ آپ کی اُردو زبان و ادب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے محکمۂ السنہ پنجاب آپ کو ایڈریس پیش کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

آپ کا نام شاعری کی دُنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ کی غیر فانی نظمیں جو آج کے تقاضوں اور محسوسات سے بہت قریب ہیں ہمیشہ ہی ادبی دنیا میں ہیجان پیدا کرتی رہیں گی۔ آپ کے کلام کی پختگی اور زبان کی دلآویزی اکبر الہ آبادی جیسے بلند پایہ نقاد شاعر سے ان الفاظ میں خراجِ تحسین وصول کرچکی ہیں :

ہے داد کا مستحق کلام محروم

لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم

آپ وہ خوش نصیب مصنف ہیں جن کا کلام آپ کی زندگی میں ہی شائع ہوکر مقبولِ خلق ہوگیا ہے۔ آپ جیسے شیریں بیان اور شیریں رقم شاعر کی ہستی دنیائے ادب کے لیے باعثِ فخر ہے۔

آپ کا کلام ادب و اخلاق کا مرقع اور نہایت پاکیزہ خیالات و جذبات کا آئینہ ہے۔ بہت کم شاعر ہوں گے جن کے دل و دماغ پر شراب کی رنگین شاعری سوار نہ ہوئی ہو۔ مگر مذمت شراب میں آپ کی طبیعت کی چاشنی بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

فریب دہر نے تدبیرِ جانستانی کی

کہ شکل آگ نے کی اختیار پانی کی

نہ حُور ہے نہ یہ کوئی پری ہے شیشے میں

رہے خیال کہ آتش بھری ہے شیشے میں

آپ نے تمام عمر محکمہ تعلیم میں بسر کی ہے اور نوجوانوں اور بچوں کے لیے پند و نصائح کے مضامین پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ اخلاق و حکمتِ عملی کے جو رموز آپ نے بیان کیے ہیں وہ صحیح معنوں میں انسانی زندگی کا دستورِ عمل بنتے ہیں۔ چناں چہ آپ کے پند آمیز اشعار کی سلاست، روانی اور تاثیر قابلِ غور ہے :

لوگوں کی ملاقات کو جانا تو نہیں عیب

اتنا بھی نہ جاؤ کہ وہ کہہ دیں کہ نہ آؤ

آپ کی شاعری کا بڑا وصف یہ ہے کہ آپ اپنے غم کو ماتم دنیا کا غم بنا سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسروں کے غم کو اپنے غم کی طرح محسوس کرتے ہیں۔ آپ کے سینے میں ایک ہمدردِ مخلوقات دل ہے۔ جس سے ہر ذی روح کی مصیبت سے آپ متاثر ہوتے ہیں۔ چڑیا کی زاری۔ بلبل کی فریاد، مچھلی کی بے تابی کے عنوانوں والی نظمیں اس صداقت کو پیش کرتی ہیں۔ غم ناک مناظر کے بیان کرنے میں آپ کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

صوفیانہ شاعری میں پنجاب کو نمایاں خصوصیت حاصل ہے۔ آپ کے ہم وطن شاعر بابا فرید سلطان باہو۔ علی حیدر پہلے تصوف میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ توکل، صداقتِ عمل، عملِ صالح کی تلقین، روحانیت کی منازل کا بیان ان صوفیائے کرام کے کلام کا جوہر ہے۔ آپ نے بھی انھی بزرگوں پیروی کرتے ہوئے تصوف کے رموز کو نہایت عمدہ پیرایہ میں اُردو میں نظم فرمایا ہے۔ آپ کا یہ شعر رضا جوئی حق کے ساتھ جذبۂ خودی کو کس خوبصورتی سے پیش کرتا ہے :

زندہ ہیں تری رضا پہ مرنے والے
یہ ڈوب کے ہیں پار اُترنے والے

بے خوف وہی ہیں جن کو ہے خوف ترا
کس سے ڈرتے ہیں تجھ سے ڈرنے والے

آپ نے جس طرح اپنی شاعری میں سبھی بزرگانِ ہند کا یکساں احترام ملحوظ رکھا ہے اسی طرح اُردو زبان کو ہندوستان کی زبان بنانے کی نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں اور جس طرح آپ کا کلام تصنع اور آورد سے پاک ہے۔ اسی طرح آپ کی شخصیت بھی ہر قسم کی بناوٹ اور تکلف سے مبّرا ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ پنجاب کا محکمۂ السنہ آپ کی انکسار آمیز اور پُر محبت شخصیت اور بے بہا ادبی خدمات کو خراجِ تحسین ادا کرنے میں ایک گونہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ اور ہم بارگاہِ الٰہی میں دعا گو ہیں کہ آپ کو تندرستی اور عمرِ دراز نصیب ہو تا کہ آپ کی قلم پنجاب میں اتحاد، حب الوطنی اور انسانی محبت کے بیج بوئے۔ جے ہند!

لال سنگھ، ڈائرکٹر جنرل محکمۂ السنہ پنجاب پٹیالہ

(چنڈی گڑھ، ۳؍ مارچ ۱۹۶۲ء)

سپاس نامہ

بزمِ سخن موتی باغ کی طرف سے جشنِ محروم کے موقع پر

مورخہ ۲۴ / مارچ ۱۹۶۲ء کو پیش کیا گیا

قبلہ محروم صاحب دام اقبالہٗ و دام ظلہٗ

مبارک باد کے مستحق ہیں وہ لوگ جنھوں نے آپ کی شاعرانہ عظمت اور قومی خدمات کے پیشِ نظر آپ کو زرِ نقد اور خلعت پیش کیا ہے۔ پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے دیے گئے اس اعزاز پر ہمیں از حد خوشی ہوئی ہے۔ حالاں کہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی ذاتِ گرامی اور کلامِ بلاغت نظام جو حیات آفریں پیغام کا حامل ہے' اس اعزاز سے کہیں زیادہ کے مستحق ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جس نے اواخرِ بچپن سے لے کر آغازِ پیری تک یہی دعا مانگی ہو کہ:

اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کردے

تو اس دُعا کے قبول ہو جانے پر ہندوستان اس شخص کو اگر قارون کا خزانہ بھی نذر کر دے تو حق ادا نہ ہوگا۔

ارسطو کا کہنا ہے کہ شاعری تفریحِ طبع کے ساتھ ساتھ ہماری ذہنی اور شعوری نشو و نما بھی کرتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں شاعری کا مقصد محض تفریحِ طبع ہی سمجھ لیا گیا اور ہمارے اُردو شعراء نے وقتی داد اور سستی شہرت کی خاطر اہلِ ملک کی اس کوتاہ بینی کو اور بھی پختہ کر دیا جس کے پیشِ نظر ایک خاص رنگ کے شاعر ہمارے دل و دماغ پر چھا گئے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ تمام قوم کا ذہن پست ہو گیا۔ شعور مفلوج ہو گیا اور قومی وقار اور خودداری کا دیوالہ نکل گیا۔

اِدھر متاعِ کارواں لٹ رہی تھی' چمن برباد ہو رہا تھا۔ اور اُدھر قوم کی قوم احساسِ زیاں سے بے خبر کبھی ہجرِ یار پر مصنوعی آنسو بہاتی نظر آتی ہے۔ اور کبھی وصلِ یار پر خیالی عید مناتی۔ یہ درست ہے کہ سب سے پہلے حالی ہی نے ہمیں اس پستی سے آگاہ کیا اور ایک نئی ڈگر پر چلنے کی ترغیب دی۔ مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موجودہ دور کے شعراء میں سے آپ نے حالی کے اثر کو سب سے زیادہ قبول کیا ہے۔ اور اقبال کے بعد آپ ہی ایک واحد شاعر ہیں جس نے حب الوطنی' خودداری اور خود آگاہی کی نشو و نما کی ہے اور اہلِ وطن کے شعور کو از سرِ نو نکھارا ہے۔

آپ کے ادبی کارنامے گنجِ معانی' رباعیاتِ محروم' نیرنگِ معانی' شعلۂ نوا' بہارِ طفلی اور کاروانِ وطن اُردو ادب

میں ایک بیش بہا اضافہ ہیں۔ ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ آپ کا ''کاروانِ وطن'' ہماری جنگِ آزادی کی مسلسل تاریخ ہے۔ یہ ایک ایسا شاہکار ہے جسے نصاب کی صورت میں ایک مدّت مدید تک سکولوں اور کالجوں کے طلباء کو پڑھانا چاہیے۔ کیوں کہ جن پاکیزہ وارفع خیالات کی یہ کتاب حامل ہے۔ اُن کی ضرورت غلام ہندوستان کی نسبت آزاد ہندوستان کو کہیں زیادہ ہے۔

> مذاقِ شعری پر کسی ایک خاص طبقہ یا مقام کی اجارہ داری نہیں۔ یہ نعمت خداداد عیسیٰ خیل کے لق و دق صحرا میں بھی اس طرح نمودار ہوسکتی ہے اور پروان چڑھ سکتی ہے جس طرح دلّی کی رنگین گلیوں اور لکھنؤ کے سرسبز باغات میں۔ آپ کی شاعری جس نے ملک کے مشاہیر ادب سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ اس دعوے کا بین ثبوت ہے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق نے اس ضمن میں بجا فرمایا ہے۔
>
> ''کون کہہ سکتا ہے کہ منشی تلوک چند محروم ایک ایسے مقام کے رہنے والے ہیں جسے اہلِ پنجاب بھی ایک گوشۂ دور افتادہ سمجھتے ہیں۔ اُن کو زبان پر ایسی قدرت اور اُن کے بیان میں ایسی صفائی ہے کہ مدعیانِ زبان میں سے بھی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوسکتی۔''

آج آپ کا خیر مقدم کرتے ہوئے بزمِ سخن فخر محسوس کرتی ہے۔ ہم آپ کو اس اعزاز یابی پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور بارگاہِ عالی میں دُعا کرتے ہیں کہ آپ کا سایہ اُردو ادب پر ہمیشہ قائم رہے۔

ہم ہیں آپ کے دُعا گو

(اراکین بزمِ سخن، موتی باغ نئی دہلی)

سپاس نامہ

گورنمنٹ ایمپلائز ویلفیر، ایسوسی ایشن موتی باغ کی طرف سے ''جشنِ محروم'' کے موقع پر ۲۴ مارچ ۱۹۶۲ء کو پیش کیا گیا۔

قبلہ محروم صاحب!

جب سے آپ نے موتی باغ میں اپنے مبارک قدم رکھے ہیں، اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ سارا ہندوستان سمٹ کر

موتی باغ میں آگیا ہے۔آپ کی ذاتِ گرامی پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ بھارت کے ادب نواز حلقہ میں آپ کا نام نہایت عقیدت سے لیا جاتا ہے اور جہاں کہیں بھی آپ کا ذکر آتا ہے ہم بڑے فخر سے کہا کرتے ہیں کہ جناب محروم صاحب ہمارے موتی باغ میں رہتے ہیں۔

ایسوی ایشن کی کلچرل سرگرمیوں میں آج تک آپ نے جس خلوص اور صدق دلی سے تعاون دیا ہے ہم اس کے لیے آپ کے احسان مند ہیں اور آج آپ کا سواگت کرتے ہوئے ہمیں نہایت خوشی محسوس ہوتی ہے۔آپ کی قومی خدمات' ادبی خدمات سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔آپ نے عہدِ غلامی میں وطن کی رہبری کر کے اپنا حقِ پیغمبری ادا کیا اور آزاد ہندوستان کو قومی اخلاق اور حُبّ الوطنی کی تعلیم دی ہے۔

موتی باغ پڑھے لکھے لوگوں کی کالونی ہے اور بیشتر لوگ ایسے ہیں جن کی تعلیم نے آپ ہی کے کلام بلاغت نظام سے نشو ونما پائی تھی۔آپ کی ادبی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔آپ کا تعمیری اور اصلاحی نقطۂ نظر ملک اور قوم کے لیے مشعلِ راہ ہے' اور آج کے اُردو ادب میں آپ کا مقام علامۂ اقبال سے کم نہیں۔

پنجاب کی سرزمین ادبی لحاظ سے نہایت زرخیز ہے۔اُردو ہو یا پنجابی اسے پنجاب ہی سے اقبال ملا ہے اور پنجاب ہی اس کا وارث رہا ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جس نے اردو کو جوش ملسیانی پنڈت ہری چند اختر اور حفیظ جالندھری اور پنڈت میلا رام وفا ایسے بلند فکر شاعر عطا کیے' اور آج یہ سرزمین آپ کی ذاتِ گرامی پر کیوں نہ فخر کرے۔آپ نے اُردو ادب کی خدمت کی ہے۔قوم و وطن کی خدمت کی ہے اور پنجاب کی سرزمین کو چار چار چاند لگائے ہیں۔حکومتِ پنجاب نے آپ کی عزت افزائی کر کے اپنا وہ فرض ادا کیا ہے جس کے آپ ہر لحاظ سے مستحق ہیں۔گورنمنٹ ایمپلائز ویلفیر ایسوی ایشن موتی باغ نواسیوں کی طرف سے اس عزت افزائی اور فرض شناسائی کے لیے پنجاب گورنمنٹ کو مبارک باد دیتی ہے اور آپ کی خدمت میں نذرِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ہم دعا کرتے ہیں کہ ایشور آپ کا سایہ اُردو ادب پر ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے اور آپ کا روح پرور کلام قوم اور وطن کو ہمیشہ نئی زندگی بخشتا رہے۔

ہم ہیں آپ کے دعا گو

(اراکینِ گورنمنٹ ایمپلائز ویلفیر ایسوی ایشن موتی باغ نئی دہلی)

~~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~~

جگن ناتھ آزاد

(حیات اور ادبی خدمات)

(جلد اول)

مرتبہ: خلیق انجم

اردو کے مشہور و ممتاز شاعر، ماہرِ اقبالیات، ادیب اور نقاد پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر قاضی عبدالغفار، علامہ سیماب اکبرآبادی، سیّد مظفر حسین برنی، ڈاکٹر محمد اجمل نیازی (پاکستان)، صباح الدین عبدالرحمٰن، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر ظ. انصاری، ڈاکٹر مظفر حنفی، مسعود خالد (پاکستان)، حسنین جاوید (پاکستان)، حمید جالندھری (پاکستان)، سیّد ضمیر جعفری (پاکستان)، خواجہ حمید الدین شاہد وغیرہ کے مضامین کا مجموعہ۔ کتاب کے آخر میں ۸۰ صفحات پر تصویریں بھی شائع کی گئی ہیں۔

سائز: $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۸}$

ضخامت : ۴۱۰ صفحات

قیمت : ۲۵۰/روپے

ملنے کا پتا: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۲

گنجِ معانی

(تلوک چند محرومؔ کا پہلا مجموعۂ کلام)

لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم ہے داد کا مستحق کلامِ محرومؔ
ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز

(اکبرؔ الٰہ آبادی)

اس کلام کو پڑھ کر جو گلزارِ شاعری کے رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ منشی تلوک چند محرومؔ ایک ایسے مقام کے رہنے والے ہیں جسے اہلِ پنجاب بھی ایک گوشۂ دور افتادہ سمجھتے ہیں۔ ان کو زبان پر ایسی قدرت اور ان کے بیان میں ایسی صفائی ہے کہ مدعیانِ زبان میں سے بھی ہر ایک کو نصیب نہیں ہو سکتی۔

(ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

محرومؔ صاحب کے کلام میں یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ ہر ایک مضمون پر شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے اظہارِ خیالات کرتے ہیں اور سخن گسترانہ انداز کو کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

(جوشؔ ملسیانی)

تیسرا اڈیشن ——— قیمت: ۱۵۰ روپے

ہندوستان میں ملنے کا پتا:

انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۲

تعمیرِ فکر

جگن ناتھ آزاد

''تعمیرِ فکر'' کے مقالات چار حصّوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصّہ ''اقبالیات'' سے متعلق ہے اور دُوسرا ''تنقید و تحقیق'' سے۔ تیسرے حصّے کو اُنھوں نے ''کچھ شاعری کچھ نثر'' کا ذیلی عنوان دیا ہے جبکہ چوتھے کو ''اُردو کے تعلق سے'' کے تحت شاملِ کتاب کیا ہے۔ لیکن چاروں ابواب کے تحت مشمولہ مقالات میں آزاد کی بُلند پائے کی تحقیق بھی موجود ہے اور اُن کی تنقیدی بصیرت و فہم بھی۔ ''کچھ شاعری کچھ نثر'' والے باب میں ایسے متعدد مقالات موجود ہیں جہاں آزاد نے نئی نسل سے تعلق رکھنے والے اُدبا و شعراء کے فن سے بڑی فراخدلانہ بحث کی ہے اور اُن کے لئے ایسی راہیں ہموار کرنے کی سعی کی ہے جن راہوں پر گامزن ہو کر نئے لکھنے والے ادبی دُنیا میں ایک مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ باب آزاد کو ایک رہبر و رہنما کی صورت میں پیش کرتا ہے۔''

امین بنجارا

پہلا اڈیشن

قیمت ۲۵۰/روپے

ہندوستان میں ملنے کے پتے

انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایوینیو، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲۶۷- جوگی گیٹ، جموں- ۱۸۰۰۰۱